مجموعہ تالیفات

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس اللہ سرہ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(0322-6180738, 061-4519240

هدیۃ الشیعہ

تاریخ اشاعت.................ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ
ناشر.........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.........................ساؤتھ پنجاب پرنٹنگ پریس، ملتان
بائنڈنگ.....................ابوذر بک بائنڈنگ.....ملتان

انتباہ

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمدللہ اس کا کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان

ادارہ اسلامیات.........انار کلی.........لاہور	دارالاشاعت.......اُردو بازار.........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار......لاہور	قرآن محل......کمیٹی چوک......راولپنڈی
مکتبہ رحمانیہ.......اردو بازار .... لاہور	مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار.....پشاور
اسلامی کتاب گھر......خیابان سرسید......راولپنڈی	مکتبہ اسلامیہ.....امین پور بازار.....فیصل آباد
اسلامک بک کمپنی.....امین پور بازار......فیصل آباد	ممتاز کتب خانہ.....قصہ خوانی بازار......پشاور
مکتبہ رشیدیہ......سرکی روڈ......کوئٹہ	مکتبہ ماجدیہ......سرکی روڈ......کوئٹہ
مکتبۃ الشیخ......بہادر آباد......کراچی	مکتبہ عمر فاروق.....شاہ فیصل کالونی.....کراچی
والی کتاب گھر...گوجرانوالہ...مکتبہ ملیہ...اکوڑہ خٹک	مکتبہ نعمانیہ...گوجرانوالہ...اسلامی کتاب گھر...ایبٹ آباد

الامام محمد قاسم النانوتوی ریسرچ لائبریری مردان: 0341-9164891

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K (ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم
اَلْحَمْدُ لِحَضْرَةِ الْجَلَالَةِ وَالنَّعْتُ لِخَاتَمِ الرِّسَالَةِ

اما بعد! ہمارے اکابر میں سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کے اعتبار سے آپ کو اپنے ہم عصر اہل علم پر جو فضیلت وفوقیت عطا فرمائی وہ اظہر من الشمس ہے۔

ادارہ نے حضرت کی جو نایاب علمی تصانیف شائع کی ہیں ان میں آب حیات، تقریر دلپذیر اور زیر نظر کتاب ''ہدیۃ الشیعہ'' شامل ہیں۔

آج سے تقریباً نصف صدی قبل ہمارے بزرگ جناب حضرت مولانا محمد اسلم صاحب رحمہ اللہ (معروف تبلیغی بزرگ، خطیب جامع مسجد نشتر ہسپتال) نے کراچی میں اپنے ''کتب خانہ حقانیہ'' سے شائع فرمائی تھی۔ پھر مستقل طور پر کراچی سے ملتان تشریف لے آئے تھے۔ حضرت ہی نے بندہ کو اس کی اشاعت کی ترغیب دی۔ یوں ادارہ کی طرف سے پرانی کتاب کا عکس ہی شائع ہوتا رہا۔

کتاب ہذا کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اب ادارہ نے اس کو جدید کمپیوٹر کتابت کے بعد شائع کیا ہے جو اولاً حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کیلئے اور ثانیاً حضرت مولانا محمد اسلم صاحب رحمہ اللہ کیلئے صدقہ جاریہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اکابر کے علوم ومعارف کی نشر واشاعت کرنے اور انہیں حرز جاں بنانے کی توفیق عطا فرمائے آمین

والسلام
محمد اسحٰق غفرلہ
صفر المظفر ۱۴۳۶ھ

فہرست عنوانات

اللّٰھم صل علی محمد النبی
الامی وعلی اٰلہ وسلم تسلیما

تقدیم الکتاب

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام
علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے محض اپنے فضل وکرم سے میرے جیسے بے بضاعت اور کم سواد طالب علم کو اس عظیم الشان علمی یادگار کے احیاء کی توفیق بخشی۔ ایک مدت تک تو طباعت کا خیال ہی خیال رہا کیوں کہ طباعت سے پہلے خود کتاب کا موجود ہونا بھی ضروری ہوا اور کتاب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ "کَانَ لَمْ یَکُنْ" اچانک ایسا ہوا کہ ایک علم دوست بزرگ تشریف لائے اور کچھ کتابیں میرے سامنے رکھ دیں کہ ان کی جلد بندی مطلوب ہے۔ کتابیں دیکھیں تو ان میں وہ مقصود بھی موجود تھا جس کی خلش عرصہ دراز سے دل میں رہتی تھی۔

اس وقت تو ان کو بہت اچھا کہہ کر رخصت کیا اور پھر مختلف تدابیر عمل میں لائی پڑیں جن سے وہ بزرگ بہت منت سماجت کے بعد کتاب دینے پر آمادہ ہو گئے۔ کام بڑا تھا جس کے لیے بڑی ہمت درکار تھی اور یہاں ضعف ہی ضعف تھا۔ کتاب پڑی رہی اور سوچ بچار میں کافی وقت گزر گیا۔ اس درمیانی وقفہ میں ایک بڑے ادارہ نے طباعت کا ارادہ کیا اور کتاب بھی لے لی مگر کچھ عرصہ بعد مصروفیت کا عذر کر کے واپس کردی۔ گویا: قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

جس طرح کتاب ہاتھ آئی، ہاتھ سے نکلی، نکل کر پھر ہاتھ آئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب پس وپیش کی مزید گنجائش نہیں۔ کام شروع ہونا چاہیے لیکن جب کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ "عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا" کیونکہ کتاب مسلسل تھی، کوئی پیراگراف، کوئی عنوان یا فصل اور باب وغیرہ اس میں موجود نہ تھا۔ جیسا کہ متقدمین کا طریقہ تھا اور یہ طریقہ اس

وقت کے لیے ناموزوں بھی نہ تھا، وہ لوگ محنتی تھے، کتابوں کے کیڑے تھے، علوم کے قدر دان تھے، عالی ہمت تھے، مطالعہ اور کتب بینی ان کے لیے تفریح ونشاط کے ذرائع تھے۔

مگر اب جبکہ ہمتیں پست ہو چکیں، ذہنی سکون واطمینان بجائے علمی مشاغل کے جھوٹی روایتوں اور قصوں میں تلاش کیا جانے لگا تو ضروری ہوا کہ اب علوم کو سہل وخوبصورت بنا کر پیش کیا جائے تا کہ شائقین کو استفادہ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس لیے ایک صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ کتاب کی تبویب وتصحیح کریں مگر شرمندگی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا "عن ظهر الغيب" ہی لکھا۔ یعنی کتاب دیکھے بغیر اپنی علمی قوت اور زور سے لکھا۔ یہ ایک نئی مشکل تھی جس سے بچاؤ کی یہی صورت نظر آئی کہ دست خود دہان خود پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ تبویب کا کام خود کرنا پڑا۔ مضامین کی مناسبت سے چند ابواب قائم کیے اور ان کے ذیل میں عنوانات لکھے۔

مگر اس کے باوجود بھی کتاب کے مضامین کا احاطہ نہیں ہو سکا کیوں کہ کتاب کی علمی شان کچھ اتنی وسیع اور عالی ہے کہ ہر دو سطر کے بعد ایک نیا استدلال، نیا نکتہ، نیا مضمون موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کثرت سے عنوانات نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ اس لیے کتاب کی وسعت اور جامعیت کو فہرست بھی بتمام وکمال پیش نہ کر سکے گی۔ ہاں تشویق وترغیب کا کام ضرور دے گی۔

کتاب میں مصنف قدس سرہ کی اپنی ایک خاص شان جلوہ گر ہے۔ سوز وگداز اس درجہ ہے۔ گویا تڑپ رہے ہیں کہ مخاطبین حق کو کیوں قبول نہیں کرتے یا مصنف خود ہی ان کے قلوب میں کسی طرح یہ حقائق کیوں نہیں ڈال سکتے۔ علوم عالیہ کی اس رفعت کے باوجود تنزل کا یہ حال ہے کہ بے انتہا بلندیوں سے اُتر کر مشقت کے ساتھ ایک بات کو عام فہم اور سادہ بنا کر پیش فرما رہے ہیں۔ آمد کا یہ حال ہے کہ مضامین ہاتھ باندھے چلے آ رہے ہیں اور بات سے بات پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے مگر اس اعلیٰ علمی شرف کے باوجود ہر جگہ تواضع اور انکسار کھلا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں تعلّی اور ادّعا نہیں ہے۔ پھر خاص بات یہ ہے کہ اہل بیت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق تمام مباحث میں ادب واحترام بہت ہی نمایاں ہے ورنہ آج کل تو یہ توازن جوش وخروش اور قلم کی جولانیوں کی نذر ہو چکا ہے۔

کتاب کی خصوصیات کے بارے میں اگر کچھ عرض کیا جائے تو سب سے پہلی اور بڑی خصوصیت تو یہی ہوگی کہ بانی دار العلوم قدس سرہ کی تالیف ہے اور یہ کسی عقیدت مندی کا اظہار نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کیونکہ مولانا کی علمی اور تحقیقی رفعت وامتیاز کے اپنے اور

پرائے سب ہی قائل تھے اور ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ استدلال میں دونوں پہلوؤں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ یعنی روایت کے ساتھ درایت اور نقل کے ساتھ عقل کا سلسلہ پوری کتاب میں قائم ہے بلکہ اس سے زیادہ عرف اور محاورہ بھی مدنظر ہے۔

تیسری خصوصیت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے متعلقہ آیات کی تفسیر وتشریح ہے جوسراپا الہامی ہے۔ آیات کے لفظی اور معنوی فوائد ایسے عجیب وغریب ہیں کہ بڑی بڑی تفاسیر ان سے خالی ہیں اور "مالا عین رأت ولا اذن سمعت" کے مصداق ہیں۔ چوتھی خصوصیت بعض ایسی آیات اور احادیث پر محققانہ بحث ہے جن کو فریق ثانی استدلال کے طور پر پیش کرتا ہے مگر اس بحث کا امتیاز یہ ہے کہ مصنف قدس سرہ کی تحقیق کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث یا آیت کو فریق ثانی نے اپنی دلیل کیسے سمجھ لیا ہے، یہ تو ہماری دلیل ہے۔ نکات وحکم کا بیان اس پر مزید ہے جو انسانی علم وادراک کا شکار نہیں بلکہ محسوس طور پر عطائے ربانی ہو۔

پانچویں خصوصیت کتاب کے مباحث ومضامین کا تنوع اور توسع ہے جس کے ضمن میں ذیلی علوم ومعارف کافی مقدار میں آ گئے ہیں جو بے حد قیمتی اور نادر ونایاب ہیں جن سے کتاب کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہوگئی ہے اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ کا یہ ارشاد بالکل بجا اور درست ہے کہ ہدیۃ الشیعہ میں تحفہ بمع زوائد ہے۔ چھٹی خصوصیت کتاب کی سلاست اور سادہ بیانی ہے جو مولانا قدس سرہ کی باقی کتب کے مقابلہ میں بالکل نمایاں ہے۔ کتاب کا اکثر حصہ روزمرہ کی زبان ہے۔ بعض مقامات میں (جو بہت قلیل بلکہ اقل ہیں) علمی زبان کی وجہ سے کچھ دشواری پیدا ہوئی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خالص فنی مسائل کے بیان میں یہ دشواری ہر ایک کو پیش آتی ہے۔

آخر میں اپنی اس حقیر کاوش کے متعلق یہ عرض ہے کہ اس امر کی کوشش تو پوری پوری کی گئی کہ عنوانات کو کتاب کے ساتھ کامل ارتباط ومناسبت ہو اور کتاب کی علمی شان کا عکس اور پرتو ہوں۔ مگر چہ نسبت خاک رابعالم پاک؟ کہاں یہ کتاب اور اس کی رفعت اور کہاں ہم اور ہماری کاوش؟ بس مقصد اتنا تھا کہ پڑھنے والے کو کچھ اندازہ ہو جائے کہ کتاب میں کیا ہے۔ وہ کسی قدر ان شاء اللہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اس کے بعد یوں جی چاہتا ہے کہ سوانح قاسمی میں سے سرسید کا وہ بیان نقل کردیا جائے جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے اظہار عقیدت کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ سرسید کی نظر میں

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر سرسید مرحوم نے "علی گڑھ انسٹی

ٹیوٹ گزٹ'' کی اشاعت مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتوی کے متعلق سرسید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے وہ الفاظ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں، اس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدت مندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں۔

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد و افکار اور رُجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کسی بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ تصفیۃ العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے جو ان حضرات کے مابین ہوئی ہے۔ اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں:

''اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے، میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔'' (تصفیۃ العقائد صفحہ ۳ مکتوب سرسید بنام منشی محمد عارف)

متذکرہ بالا مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا کہ ''ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ بنی سنائی سید صاحب (سرسید) کی اولوالعزمی اور دردمندی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن کران کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔''
(تصفیۃ العقائد، صفحہ ۶، مکتوب حضرت نانوتوی رحمہ اللہ بنام منشی عارف صاحب ۱۲)

اس مختصر تقریب کے بعد سرسید کا متذکرہ صدر مضمون درج ذیل ہے:

''افسوس ہے کہ جناب ممدوح (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیو بند انتقال فرمایا، زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے۔ نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دہلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف اور مشہور تھے، ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا

نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دہلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔''

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمر میں دہلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں، ابتداء ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کی ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

بالائے سرش زہو شمندی   می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے، ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رُتبہ کا دل بنا دیا تھا، خود بھی پابند شریعت اور سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت اور سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ باایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انہیں کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے، ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کے تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے برا

جانتے تھے، مسئلہ حب للہ اور بغض للہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو۔ بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔ اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دُنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ سے کچھ کم ہو، اِلّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا، تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے۔ زبانی عقیدت اور ارادت، بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں۔ یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں، دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمارہے۔

(نقل باصلہ از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء صفحہ ۳۶۷و ۳۶۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدُللهِ رَبِّ العَالمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین وَالصَّلوٰة والسّلام علیٰ رَسُوله سیّدنا محمّد نبی الرحمة واٰله وازواجه واهل بیته و ذریته واصحابه اجمعین

سبب تالیف

بعد حمد وصلوٰۃ کے بندہ ہیچمدان گمنام محمد قاسم نام متخلص بخاکپاء علماء ناظران اوراق کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اواخر رجب ۱۲۸۳ھ بارہ سو تراسی ہجری میں مخدوم العلماء مطاع الفضلاء مجمع الکمالات منبع الحسنات زیب طریقت حامی شریعت فخر احباب افتخار اصحاب ملجاء انام مرجع خاص وعام معلم قوانین اطاعت وانقیاد محرک سلسلہ رشد وارشاد جامع کمالات ظاہری وباطنی مخدومنا ومولانا مولوی رشید احمد گنگوہی دام رشدہ وارشادہ نے ایک خط متضمن بعضے خرافات شیعہ جو مولوی عمار علی صاحب کی طرف سے بنام میر نادر علی صاحب ساکن کرتھل نواح الور تھا، اس ہیچمدان کے پاس بایں غرض بھیجا کہ ان خرافات کے جوابات لکھ کر روانہ خدمت مولانا ممدوح کروں۔ اتفاقات سے ان ایام میں حسب ایماء بعض احباب کہ ان سے اشتراک نسبی بھی حاصل ہے۔ اوقات فرصت میں دربارہ اثبات توحید و رسالت بدلائل عقلیہ اوراق سیاہ کرتا تھا، سو کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ بوجہ کاہلی طبع زاد، اس کے جوابات کا لکھنا سخت دُشوار معلوم ہوا اور پھر بوجہ ہیچمدانی اور بے سروسامانی اور کثرت مشاغل روزمرہ اس خیال سے اور بھی دل تنگ ہوتا تھا۔ القصہ بہر طور یہ کار دُشوار تھا مگر مولانا ممدوح کے ارشاد سے ناچار تھا۔ لہٰذا تحریر مضامین توحید ورسالت کو اور وقت پر موقوف رکھ کر خط مذکور کے پہنچنے سے دو تین روز ہی بعد تحریر سابق کے عوض میں خط مذکور کے جوابات لکھنے شروع کیے۔ مگر کچھ تو ہیچمدانی اور بے سروسامانی اور کچھ قلت فرصت اور کچھ سرگردانی اس لیے ایک دفعہ تو نہ بن پڑا، پر اوقات متفرقہ میں لکھ لکھ کر پانزدہم صفر ۱۲۸۴ھ بارہ سو چوراسی میں تمام کیا اور بعد اختتام "ھدیة الشیعة" اوراق کا نام رکھا۔

انتخاب نام کا راز

اور وجہ اس نام رکھنے کی (حالانکہ یہ رسالہ بظاہر مؤید اہلسنت ہے اور اس وجہ سے ہدیہ اہل سنت کہنا مناسب تھا) یہ ہے کہ بہ نسبت اہل سنت شیعوں کے حق میں یہ رسالہ زیادہ تر مفید ہے۔ اہل سنت کے لیے تو اس میں اتنا ہی فائدہ ہے کہ کچوں کے لیے مفید یقین اور پکوں کے لیے باعث اطمینان ہے۔ پر شیعوں کے حق میں اگر انصاف کریں تو ذریعہ حصول ایمان ہے کیونکہ ان اوراق میں اگر استدلال ہے تو تین چیزوں سے استدلال ہے۔ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ کتب معتبرہ شیعہ یا دلائل عقلیہ واضحہ الدلالات سوان تینوں کا مسلم ہونا شیعوں کے نزدیک مسلم۔

کتاب کی کھلی صداقت

مگر یہ سن کر بوجہ گمنامی احقر شاید کسی کو یہ بدگمانی ہو کہ استدلال بھی کرتے ہیں، پر استدلال کرنا کسی کسی کو آتا ہے، سو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ رسالہ موجود ہے۔ ہمارا کہنا باور نہ کیجئے، اس رسالہ ہی کو دیکھ لیجئے۔ صاحبو! دیوانہ ہوں و لیکن بات کہتا ہوں ٹھکانے کی، ببرکت اہل بیت کرام اور صحابہ عظام اُمید یوں ہے کہ ان شاء اللہ منصفان فہمیدہ آفریں ہی کریں گے اور کوئی کہے تو یہ کہے گا:

گاہ باشد کہ کودکِ نادان   بغلط بر ہدف زند تیرے

سو یہ سب سچ ہے۔ اپنے آپ کو کون نہیں جانتا۔ غرض اپنی نسبت جو کچھ کہئے بجا ہے پر اس رسالہ کے مضامین کی حقانیت کا دعویٰ بھی بیجا نہیں۔ ان شاء اللہ بعد ملاحظہ معلوم ہو جائے گا۔

کتاب کے جواب کی صحیح راہ

ہاں نادان متعصب اگر دو چار باتوں میں تکرار کریں تو نادانوں کا کام یہی ہے، ان کی زبان سے قرآن تو چھوٹا ہی نہیں یہ ہیچمدان تو کس شمار میں ہے۔ البتہ دانش مند ذی علم ایسا کریں تو ہمیں بھی شکایت ہے کیونکہ کسی رسالہ یا کسی کتاب کے جواب کے یہ معنی ہیں کہ تمام استدلالات کو باطل کر دیجئے۔ جیسا کہ اس ہیچمدان نے بہ نسبت خط مولوی عمار علی صاحب کیا ہے۔ چنانچہ ان شاء اللہ واضح ہو جائے گا ورنہ ایک دو بات تو ہر کسی کی قابل گرفت ہوتی ہے۔ جناب من بشر ہوں اور بشر بھی سب سے کم تر خدا نہیں رسول نہیں جو غلطی کا احتمال نہ ہو، بھول چوک سے انکار نہیں کیا جاتا، پر کتاب کی صحت اور اعتبار باعتبار اکثر کے ہوتی ہے۔ سو اگر کسی صاحب کو خیال جواب ہو تو بندہ ہیچمدان کی روش پر چلیں۔ یعنی ہر مضمون کے ہر پہلو پر گرفت کریں نہیں تو اس سے بھی کیا کم کہ موافق قواعد علم مناظرہ ہر دعوے کے استدلال پر اعتراض کریں

ورنہ دو چار باتوں کی تغلیط سے کام نہیں چلتا۔ اس کا تو میں بھی خود معترف ہوں کہ خطا و نسیان سے مبرا نہیں کیا عجب ہے کہ کچھ غلطی ہوگئی ہو، القصہ اہل انصاف سے اُمید قوی ہے کہ قطع نظر پریشانی تقریر اس رسالے دعووں اور دلائل پر حرف گیر نہ ہوں بلکہ آفرین اور تحسین ہی سے پیش آئیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور اگر بہ نسبت انبیاء و مرسلین یا بزرگان اہل بیت و اصحاب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اس رسالہ میں کوئی حرف نامناسب دیکھ کر اُلجھیں تو مجھے اس سے بری الذمہ سمجھیں۔ ایسا مذکور کہیں کہیں ناچار ہی بغرض الزام شیعہ آ گیا ہے۔ اس کا بار انہی کی گردن پر ہے۔ یہ سب انہوں نے ہی کرایا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ایسے عقائد سے میں بہزار جان و ہزار زبان بیزار ہوں۔ محبت بزرگان مذکور کو اپنی سعادت اور ان کے حسن اعتقاد کو ذریعہ نجات سمجھتا ہوں مگر مردمان فہمید سے یوں اُمید ہے کہ میرے عذر سے پیشتر ہی شہادت مذہب مجھے معذور سمجھیں۔

نقل روایات میں مصنف کا رویہ

ہاں بوجہ بے سروسامانی احقر کسی شیعہ کو نقل روایات میں کچھ تامل ہو تو البتہ چند وجہ سے بجا ہے۔ اوّل تو کتب شیعہ کے میسر، سنیوں کو کیا غرض جو فراہم کریں، شیعوں کو بحکم مثل مشہور "اہل البیت ادری بمافیہ" یعنی گھر والے گھر کی بات کو خوب جانا کرتے ہیں۔ بلحاظ خوبی مضامین سنیوں کے دینے میں دار و گیر اور طعن و تشنیع اور مضحکہ کا اندیشہ، پھر کوئی سنی لائے تو کہاں سے لائے جو کوئی روایت مفید مطلب سنیاں کی رسالہ میں درج کی جائے، دوسرے یہ کتابیں اگر فرض کر و ملیں بھی تو مجھ سے بے سروسامان کے ملنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں کیونکہ اپنی کتابیں جب پاس نہ ہوں تو دوسروں کی کتابیں کیا ہوں گی۔ تیسرے نقل مشہور ہے "المرء یقیس علی نفسہ" شیعوں کی دروغ مذہبی نے شیعوں کے نزدیک سنیوں کا اعتبار بھی نہیں رکھا، پھر حسب مثل مذکور اگر شیعہ اس سنی مشرب کو بھی جھوٹا سمجھیں تو سمجھ کی بات ہے۔ بالجملہ بوجوہ مذکورہ خاص کر وجہ اوّل اس بات میں کسی شیعہ کو تامل ہو تو بجائے خود ہے۔

تحفہ اثنا عشریہ پر اعتماد

سو اس لیے یہ راست باز بھی عرض پرداز ہے کہ "اَلصِّدقُ یُنْجِی وَالْکِذْبُ یُهْلِکُ" یعنی سچ میں نجات ہے اور جھوٹ میں تباہی، واقعی اس بے سروسامان کے پاس اس قسم کا سامان کچھ نہ تھا، پر ایک تحفہ اثنا عشریہ تھا اور جب تحفہ تھا تو جاننے والے جانتے ہیں کہ سب کچھ تھا، موافق مصرعہ مشہور:

کافی ہے تسلی کو تری ایک نظر بھی

اور کتابیں نہ سہی۔ ایک تحفہ ہی بہت ہے کیونکہ مؤلف تحفہ حجۃ اللہ فی العالمین خاتم المحدثین

والمفسرین عمدۃ المتکلمین زبدۃ المناظرین مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے سنی تو دیوانے ہیں، پر علماء شیعہ بھی (جاہلوں کو میں نہیں کہتا) ان کے تبحر و تحقیق کو بہ نسبت دونوں مذہبوں کے اپنے دل میں تو خوب ہی جانتے ہیں۔ زبان سے کہیں یا نہ کہیں، سو جو روایت روایات کتب شیعہ میں سے اس رسالہ میں منقول ہوئی ہے، ماخذ اس کا یا متن تحفہ مطبوعہ دہلی ہے یا اس کے حواشی ہیں جو غالباً منہیہ معلوم ہوتے ہیں۔ سو تحفہ کا حوالہ اہل انصاف کے نزدیک خود ان کتب کے حوالے سے کم نہیں جن کا نام اس رسالہ میں لکھا گیا۔ اسی وجہ سے اس احقر نے بے تامل ان کتب کا حوالہ رقم کر دیا ہے۔

شیعہ کو ہمدردانہ مشورہ

اور صاحب تحفہ کی راست بازی اور تبحری کے بھروسے منصفان شیعہ کی خدمت میں عرض پرداز ہوں کہ فقط میری بے سروسامانی کے خیال سے بدماغی نہ فرمائیں، نقل کو اصل سے مطابق کر دیکھیں، اکثر کتب منقول عنہا کتب مشہورہ معتبرہ شیعہ ہیں۔ نادر الوجود کمیاب نہیں، اس کا اندیشہ نہ کریں کہ مطابقت ہوئی تو ماننا پڑے گا۔ خدا نے خود فرما دیا ہے "مَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ" پھر کیا اندیشہ ہے، خدا کی فرمائی ہوئی باتوں میں، تو یہ بات پائی نہیں جاتی کہ سمجھ میں آ جائے تو ماننا ہی پڑے؟ اس گنہگار ہیچمدان کی بات میں یہ بات کہاں؟ مع ہذا حق تو ماننے ہی کے لیے ہے۔ اگر حق کو تسلیم ہی کر لیا تو کیا نقصان ہے۔ الغرض تطبیق میں کاہلی نہ کریں، بعد مطابقت اگر فرق نکلے تو وہ میرے ذمہ۔

شیعہ کی دلیرانہ غلط بیانی

مگر میں جانتا ہوں کہ میرے بے کہے شیعہ اس بات کو جانتے ہوں گے، کون نہیں جانتا کہ اہلسنت کے نزدیک جھوٹ بولنا خصوصاً دین کے مقدمہ میں سخت ممنوع اور منجملہ کبائر ہے، ہم وہ نہیں کہ مثل مولوی عمار علی صاحب مشار الیہ پیشوا و پیش امام شیعہ کہ وہ بظاہر مولوی عمار علی صاحب سونی پتی معلوم ہوتے ہیں، غلط اور موضوع کو صحیح اور ضعیف کو قوی اور غیر معتبر کو معتبر کہہ دیں یا محض بے اصل کے جھوٹ سچ کوئی اصل گھڑ دیں۔ چنانچہ ناظران رسالہ ہذا پر واضح ہو جائے گا کہ مولوی صاحب موصوف نے خط مذکور میں کیا کیا ستم کیے ہیں۔ ہم کو یہ گمان تھا کہ شیوۂ دروغ بندی زمانہ سابق کے علماء شیعہ پر ختم ہو چکا مگر غنیمت ہے کہ ان کے خلف الرشید اب تلک بہت باقی ہیں۔ دعوئ ہبۂ فدک حضرت زہراء کی طرف سے سنیوں کی معتبر کتابوں کے حوالے سے بیان کرنا اور حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم اور حضرت زینب رضی اللہ عنہن دختران رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقطع کرنا یہ مولوی عمار علی صاحب جیسے

مقتداو پیشوا شیعہ ہی سے ہوسکتا ہے کیونکہ متابعت بزرگان ایسے ہی بزرگواروں کا کام ہے۔

اگر جھوٹ ہی بولنے کو جی چاہتا تھا تو ایسا بولنا تھا کہ پیش کیا جاسکتا اور کسی کے خیال میں آسکتا مگر ایسا طوفان کہیں نہیں سنا تھا کہ ایک شخص کے سنی ہو جانے کے اندیشہ سے نہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمائے اور نہ آئمہ معصومین کا کچھ پاس ولحاظ کیا۔ حضرت اُم کلثوم بنت سیدۃ النساء کے خلیفہ ثانی سے نکاح کو ذکر نہ کرتا تو اس پر بھی بتکلف محمول ہوسکتا ہے کہ اگر ایک کو ذکر نہیں کیا تو باقیوں سے انکار بھی تو نہیں کیا، پر یہ بات کہ حضرت رقیہ وغیرہا رضی اللہ عنہن دختران سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہ تھیں اور حضرت زہراء کا دعوائے ہبۂ فدک کرنا اہلسنت کی معتبر کتابوں میں ہے۔ ایسا دروغ صریح ہے کہ کسی احتمال پر کسی طرح منطبق نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بعد ملاحظہ رسالہ ہذا ان شاء اللہ میرے اس قول کی صحت بخوبی معلوم ہو جائے گی۔ یہ وہی مثل ہے:...... ''دروغ گویم برروئے تو''

مولوی صاحب کی دروغ گوئی کا ایک دلچسپ پہلو

لیکن بغور دیکھئے تو مولوی صاحب کی بھی اس میں کچھ تقصیر نہیں، آخر مذہب اہل سنت بشہادت کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحیح اور مذہب شیعہ بشہادت کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سراسر غلط ہے اور باوجود اس کے پھر اپنے پیشواؤں کو دیکھا کہ مذہب شیعہ کو حق اور مذہب اہل سنت کو باطل کہتے ہیں تو مولوی صاحب موصوف بحسن اعتقاد بزرگان یہ سمجھ بیٹھے کہ حق غلط ہی باتوں کو کہا کرتے ہیں اور کیونکر نہ سمجھیں۔ آخر مولوی صاحب عمدۂ علماء شیعہ ہیں۔

بعد ازیں کلام اللہ کی تلاوت کا جو بھولے چوکے اتفاق ہوا تو سورۂ احزاب میں یہ آیت نکل آئی "واللّٰه لا یستحیی من الحق" یعنی اللہ تعالیٰ حق بات سے شرم نہیں کرتا چونکہ مولوی صاحب کو بزعم خود کمال اتباع خداوندی مدنظر ہے تو اپنے عندیہ میں غلط باتوں سے پرہیز کرنا خلاف اخلاق خداوندی سمجھ کر جھوٹ بولنے کی شرم طاق میں اُٹھا دھری اور بے ساختہ مثل پیشوایان قدیم (کہ ان کی متابعت بھی بزعم مولوی صاحب موجب سعادت ہے اور حضرات آئمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کے حق میں بددعائیں کی ہیں اور ان کو جھوٹا بتلایا ہے اور ان کی باتوں سے رنج اُٹھایا ہے) انہوں نے بھی افتراء پردازیوں پر کمر باندھی تا کہ ان کی متابعت کے صدقے حضرات آئمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی دُعا نہیں تو بددعا ہی میں شریک ہو جائیں۔

رنگی رس کی اے سکھی تیرے دونوں سبد سہائے ٹھنڈی تتی نیر جوں دونوں آگ بجھائے
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

باب مذہب اہلسنّت موافق قرآن مجید وحدیث پاک ہے اور مذہب شیعہ مخالف ہر دو

اہلسنّت اہل حق اور شیعہ اہل باطل ہیں، دلائل

تفصیل اس بات کی کہ اہل سنت کا مذہب موافق ثقلین یعنی کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے اور شیعوں کا مذہب مخالف ثقلین اور یہ بات کہ پیشوایان شیعہ کے حق میں حضرات آئمہ نے کیا کیا کچھ کہا ہے اس رسالہ مختصر میں سما نہیں سکتی لیکن بطور نمونہ ایک ایک دو دو باتیں عرض کرنی ضرور پڑیں۔ اہل انصاف اسی سے سمجھ جائیں گے۔ مشتے نمونہ خرواری بعد ازاں اس خط کی تردید مناسب وقت کی جائے گی۔ مخدوم من کلام اللہ میں سورۂ بقرہ میں پہلے سیپارہ میں یہ آیت ہے:

"اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ط"

"حاصل اس کا یہ ہے کہ جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے پڑھنے کا، وہی اس پر یقین لاتے ہیں اور جو منکر ہوگا اس سے سوا نہیں کو نقصان ہے۔"

اس آیت کے مضمون کے دیکھنے کے بعد تصور میں نہیں آتا کہ کسی کو دربارہ حقیقت مذہب اہل سنت شک رہے اور جب اس میں شک نہ رہا تو اس کا پہلے یقین ہو جائے گا کہ مذہب شیعہ باطل ہے۔

مضمون آیت پر تفصیلی نظر اور حق تلاوت میں ایمان کا انحصار

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ آیت ہر چند بعض اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی ہے لیکن اس آیت میں گو کسی کی شان میں نازل ہو کتاب اللہ پر ایمان لانے کو انہیں میں منحصر کر دیا ہے جو اسے خوب پڑھتے ہیں حق پڑھنے کا، جب یہ بات انہیں میں منحصر ہوئی تو معلوم ہوا کہ

کتاب اللہ پر ایمان کی علامت یہی ہے کہ اس کو خوب تلاوت کیا کرے، کوئی سی خدا کی کتاب کیوں نہ ہو تورات ہو یا انجیل یا قرآن شریف۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ذہین آدمی کوئی مشکل بات جلد بجھ جائے اور خوب سمجھے اور دوسرے اس کی تعریف میں یوں کہیں کہ بات کو ذہن سے سمجھتے ہیں تو گویہ تعریف اسی کے سنانے کے لیے کی گئی ہے پر حقیقت میں سارے ہی ذہینوں کی تعریف ہے۔ سو بہ نسبت قرآن شریف کے یہ نشانی سوائے اہل سنت کے اور کسی فرقے میں پائی نہیں جاتی۔ خصوصاً شیعہ کہ ان کا تلاوت کرنا تو سب ہی جانتے ہیں۔

اہلسنّت سے ادائیگی حق تلاوت اور شیعہ کی اس سے قطعی محرومی

یہاں تک کہ کلام اللہ کے یاد نہ ہونے میں ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ سو اس کا باعث بجز اس کے اور کیا ہے کہ جیسی تلاوت چاہیے ان سے ویسی تلاوت نہیں ہو سکتی۔ جس قدر کلام اللہ کے پڑھنے میں محنت چاہیے ان سے محنت نہیں ہو سکتی، باقی اہل سنت کا ایسا تلاوت کرنا، جیسا تلاوت کا حق ہے، عیاں ہے اور عیاں راچہ بیان، اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ پڑھتے پڑھتے برزبان ہو جاتا ہے۔

بروئے آیات قرآنی قرآن کا حفظ ہونا حق ہونے کی نشانی

اس آیت سے اشارتاً معلوم ہوا کہ جتنے فرقے اہل اسلام میں معدود ہیں ان میں سے جونسا فرقہ حقانی ہوگا، اسی کو کلام اللہ یاد ہوگا اوروں کو یاد نہیں ہو سکتا اور نہ لازم آئے کہ باطل پر ہو کہ ممدوح خداوند کریم ہوں۔ سو بحمد اللہ تعالیٰ یہ دولت نصیب اہل سنت ہوئی۔ ماسوا ان کے اور سب فرقے اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہے۔ چنانچہ آج تک مسموع نہیں ہوا کہ سوائے اہلسنّت کے کسی اور کو روافض و خوارج میں سے یاد ہوا ہو اور فرقوں کا تو ہندوستان میں وجود ہی نہیں، پر سوائے اہل سنت، روافض البتہ بکثرت ہیں، کوئی قصبہ اور کوئی شہر نہ ہوگا کہ وہاں ان کے غول کے غول نہ ہوں۔ علاوہ بریں نواح لکھنؤ اور اطراف دکن اور اضلاع سندھ میں باوجود کثرت کے تسلط بھی انہیں کا ہے۔ یہاں تک کہ اسی باعث سے تشیع کو ہندوستان میں کمال درجہ کو شیوع حاصل ہوا، ہزاروں عالم شیعہ مذہب موجود، پر حافظ نام کوئی نہ دیکھا نہ سنا اور کسی کے ذمہ اگر شیعوں نے حفظ قرآن کی تہمت لگا بھی دی تو اسے یوں ہی کہتے ہوئے سنا کہ یاد تو تھا پر آج کل کچھ کچا ہو گیا ہے اس لیے فی الحال سنانے سے معذور ہوں اور جو سنانے پر آئیں بھی تو ایک ایک سیپارہ کے سنانے پر آتے ہیں، یہ نہیں کہ ایک جلسہ میں یا دو جلسہ میں پڑھ کر ادھر سے اُدھر کر دیں۔

شیعوں کے حافظ نہ ہونے کا واقعات سے ثبوت

منجملہ حفاظ شیعہ مولوی جعفر علی صاحب پیش امام دہلی جو ورع وتقویٰ وعلم وفضل میں مجتہد زمانہ نہیں تو مجتہد ثانی تو بیشک وشبہ ہیں ان کے حفظ کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان شریف میں غدر سے پہلے بچشم خود اس احقر نے دیکھا ہے کہ جلسہ تلاوت قرآن میں جو دن کو نواب حامد علی خان کی مسجد میں ہوا کرتا تھا، مثل دیگر حضار شیعہ مذہب حمائل میں دیکھ دیکھ کر پڑھتے تھے، اس پر بھی دو جگہ غلط پڑھ گئے اور خداوند کریم کی حق نمائیاں دیکھیے کہ اسی جلسہ میں حفاظ اہل سنت جو بطور سیر آ جاتے تھے اور اہل تشیع دب کر ان کو بھی پڑھنے کے لیے کہتے تو وہ برزبان ہی پڑھتے تھے مگر تا ہم دیدہ عبرت شیعہ کشادہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک شخص سنی المذہب مولوی حافظ عبدالعزیز نام ساکن نجیب آباد کہتے تھے کہ میں کچھ کتب درسیہ میں سے مولوی جعفر علی صاحب سے پڑھا کرتا تھا۔ اتفاقاً کچھ اس کا مذکور آ گیا کہ شیعوں کو کلام اللہ یاد نہیں ہوتا، سن کر فرمانے لگے کہ تم سنو گے؟ میں نے عرض کیا کیا مضائقہ ہے۔ اگر ایک دو جلسہ میں ہو، یا یوں کہا کہ زیادہ زیادہ پڑھے تو کیا مضائقہ ہے مگر پھر مولوی صاحب کہاں تھے۔ بجز اس کے نہ بن پڑی کہ ایک ایک سیپارہ ہر روز سن لیا کرو، جائے غور ہے کہ ایک ایک سیپارہ روز تو بعضے بعضے بندگان خدا از سر نو یاد کر سکتے ہیں؟ وہ حافظ ہی کیا ہوا کہ جس نے ایک جلسہ میں کلام اللہ نہ پڑھ لیا اور میں جانوں کہ مولوی صاحب سے ایک ایک سیپارہ بھی نہ سنایا جاتا۔ یہ بھی ایک دھمکی تھی۔ مولوی عبدالعزیز صاحب مذکور یوں سمجھ کر کہ شاید اب یاد کر کے سنا دیں اور پھر یاد نہ رہے سو، اتنی بات میں سر دست میرا دعویٰ تو غلط ہو جائے گا یا دو چار سیپارہ ان کو یاد ہوں اور ان کو جوں توں سنا کر پھر کچھ حیلے بہانے لے دیں اور ان کو کہنے کو جگہ ہو جائے اس بات پر پکے نہ ہوئے اور نیز یہ بھی مرکوز خاطر ہو گا کہ سب پر عیاں ہو جائے کہ مولوی صاحب کو یاد نہیں، ان کا حافظ کہنا ایک حرف غلط ہے کہ منجملہ اور دروغوں کے زبان زد شیعہ ہو گیا اور اگر مر مار کر ایک دو نے بالفرض بفرض محال کچا پکا یاد بھی کر لیا تو غیرت مندان شیعہ کے لیے تو یہی بات ڈوب مرنے کو بہت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک ایک شہر بلکہ بعضے بعضے ایک قصبہ میں اہل سنت میں سو سو بلکہ زیادہ زیادہ حافظ ہوتے ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ بعضے بعضے قصبات میں اہلسنت ہی کے برابر سرابر شیعی ہوتے ہیں لیکن اہل سنت میں سینکڑوں حافظ ہوتے چلے جاتے ہیں اور شیعوں میں ایک بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ سہارن پور اور پانی پت اور کرانہ میں یہی حال ہے اور وجہ اس یاد نہ ہونے کی (حالانکہ مقتضاء طعن اہلسنت یہ تھا کہ کلام اللہ چھوڑ شیعی تفسیر کبیر بھی یاد کر لیتے، یہی بات ہے کہ جیسا تلاوت کا حق ہوتا ہے ان کو میسر نہیں آتا)۔

شیعہ ادائیگی حق تلاوت سے کیوں محروم ہیں؟

شیعوں کو کلام اللہ سے طبعی لگاؤ نہیں

اور باعث اس کا واللہ اعلم یا تو یہ ہے کہ طبائع انسانی وحیوانی باعتبار غذا کے جیسے مختلف ہیں کہ کسی کو میٹھا بھاتا ہے۔ کسی کو نمکین کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ کسی کو نفرت، انگریزوں کو عطر نفیس سے تنفر اور مچھلی کے اچار سے جسے سونگھ بھی لیجئے تو دماغ چھوڑ جان کی خیر نہیں، رغبت، پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خرم وشادو عیش و آرام سے رہیں اور خوشبو سونگھیں تو مر جائیں۔ ایسے ہی باعتبار امور دینی کے جو غذائے ارواح ہیں، ارواح بنی آدم مختلف ہیں، کسی کو رغبت ہے کسی کو نفرت، کسی کو لذت آتی ہے کسی کی جان نکل جاتی ہے، سو حضرات شیعہ کو بھی کلام اللہ پر محنت کرتے موت نظر آتی ہے۔

شیعہ اپنے اساتذہ کے حق میں گستاخ اور بے ادب ہیں

اور یا یہ ہے کہ جو شاگرد اُستاد کی خدمت میں گستاخ ہوتا ہے عادت الٰہی یوں جاری ہے کہ علم سے بہرہ ور نہیں ہوتا، وجہ اس کی شاید یہ ہے کہ شکر پر وعدہ مزید نعمت ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ" یعنی اگر شکر کرو گے تو البتہ ہم اور زیادہ دیں گے تو اس صورت میں بشہادت عقل کفران پر زوال نعمت متفرع ہونا چاہیے۔ ادھر حدیث میں ہے "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ" یعنی جو کوئی آدمیوں کا شکر نہ کرے گا وہ اللہ کا بھی شکر نہ کرے گا اور ظاہر ہے کہ ہر چند منعم حقیقی خداوند کریم ہے پر دولت علم بواسطہ اُستاد ہی حاصل ہوتی ہے اور نعمت عظمٰی کلام اللہ کے اُستاد حضرات صحابہ ہیں جن میں سے خلیفہ اوّل اور ثالث کو تو بوجہ تالیف مصنف مجازی کہئے تو بجا ہے، پھر ان گستاخوں کو یہ نعمت عظمٰی عطا تو ہو کیوں کر؟

تلاوت کا حق ادا کرنے والوں کے پیرو بھی حصر ایمانی میں شامل ہیں

مگر جیسے اشارہ خداوندی سے یہ نکتہ مذکورہ معلوم ہوا یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ایمان کا ان لوگوں میں منحصر ہونا جو خوب ہی تلاوت کرتے ہیں اور جو حق تلاوت ہے وہ بجالاتے ہیں، تو بہ نسبت ان لوگوں کے ہے جو کلام اللہ کی تلاوت میں تو مقصر ہیں اور بایں ہمہ اپنی ہی سمجھ کے موافق اس پر عمل کرتے ہیں یا ان لوگوں کے حق میں جو ان کے اتباع وتوابع ہیں اور مطلق کم پڑھنے والوں کی یا بالکل نہ پڑھنے والوں کی نسبت حصر نہیں کیونکہ وجہ اس حصر کی ان لوگوں میں جو حق تلاوت ادا کریں۔ بجز اس کے اور

کچھ نہیں کہ جو کسی کتاب کو کثرت سے دیکھے بھالے گا وہی اس کو خوب سمجھے گا اور اس کی حقیقت کو پہنچے گا اور کتاب اللہ پر ایمان اسی کا نام ہے کہ اس کے احکام اور مضامین کو حق سمجھے جو لوگ ان لوگوں کے متبع ہوں گے کہ وہ جیسا تلاوت کا حق ہے تلاوت کیا کرتے تھے اور اس سبب سے اس کی اصل حقیقت کو پہنچ گئے ہیں اور ان کے بتلانے سے موافق عمل کریں گے۔ وہ بھی ایمان سے محروم نہ ہوں گے اور فرقہ مشار الیہا بلفظ "وَمَنْ يَّكْفُرْ" میں داخل نہ ہوں گے، ہاں جو شخص اس کی تلاوت میں مقصر رہا اور بے تقلید کسی اور کے اپنی ہی سمجھ کے موافق اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا تو ایسی محنت والے تو قانون انگریزی میں بھی بہکتے ہیں جس میں چنداں دقائق نہیں ہوتے، کلام اللہ کو جو مخزن تمام علوم اور مجموعہ جملہ دقائق ہے کیا خاک سمجھیں گے بلکہ بالیقین کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے، سو ایسے لوگ جو کتاب اللہ کچھ کہے اور وہ کچھ کہیں، گو اپنے عندیہ میں کتاب اللہ پر ایمان رکھتے ہوں کتاب اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور ان پر یہ قول خداوندی سراپا مطابق ہے "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ" یعنی جو لوگ کتاب اللہ پر ایمان نہ لائے، سو وہی ٹوٹے میں ہیں اور اس آیت میں بھی ان کی طرف اشارہ ہے "يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا" یعنی خدا تعالیٰ اس قرآن سے بہت لوگوں کو بہکا بھی دیتے ہیں۔

آیت کے شان نزول سے بیان مذکور کی شہادت

اور اس تقریر کی صحت کا مؤید قطع نظر اس کے کہ ظاہر ہے ایک یہ بھی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جو کتاب اللہ کو خوب تلاوت کیا کرتے تھے اور اس سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علامتیں جو اس کتاب میں تھیں خوب یاد ہو گئی تھیں اور ان کے مطالب کے سب پہلو ان کے ذہن نشین ہو گئے تھے۔ اسی سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ وہی ہیں ہر طرح سے ان اوصاف کو آپ پر مطابق پایا اس میں اختلاف ہے کہ وہ کتاب کون سی تھی توریت یا انجیل؟ اور وہ لوگ کون تھے یہود یا نصاریٰ؟

ادائیگی حق تلاوت میں سنی اور شیعہ فرقوں میں اکثریت کا لحاظ

بایں ہمہ یہ بھی اہل فہم پر روشن ہے کہ ہیئت مجموعی کی رو سے تمام فرقہ اہل سنت اور علیٰ ہذا القیاس تمام فرقہ شیعہ ایک گنا جاتا ہے۔ سو ہیئت مجموعی اہل سنت کو جدا لحاظ کیجئے اور ہیئت مجموعی شیعہ جدا پیش نظر رکھئے اور دیکھئے کہ اس فرقہ میں کثرت تلاوت اور تلاوت کا جیسا حق ہے پائی جاتی ہے یا فرقہ شیعہ میں اور ہیئت مجموعی کی رو سے سب کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔ ایک کی بات

سب ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے تھوڑی ہے تو تھوڑی اور بہت ہے تو بہت ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک کے احوال کو تمام عالم مجموعہ کی طرف یعنی اپنی طرف منسوب کردیتے ہیں۔ ہاتھ میں کچھ تکلیف ہو تو یوں کہا کرتے ہیں کہ میں بیمار ہوں، یا فلانہ بیمار ہے، علی ہذا القیاس، میں نے کسی کو مارا یا مجھ کو کسی نے مارا یا میں نے کسی کو دیکھا یا مجھ کو کسی نے دیکھا یہ ساری اضافتیں جزء کی کل کی طرف باعتبار مجموعہ کے ہوتی ہیں، یعنی مجموعہ کو ایک سمجھ کر جزء کے حال کو کل کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔ مع ہذا للا کثر حکم الکل سب ہی کا سنا ہوا جملہ اور سب ہی کے نزدیک مسلم ہے، اکثر کی بات و صفات کل ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے سو اکثر دینداران اہل سنت بکثرت تلاوت میں مشغول رہتے ہیں بخلاف شیعہ کہ ان کا حال خود عیاں ہے۔

شیعوں کی ایک راہِ گریز اور اس کا انسداد

اس تقریر کے بعد شاید فاضلان شیعہ اپنے بچاؤ کی یہ سبیل کریں کہ حق تلاوت کے ہمارے نزدیک یہ معنی ہیں کہ بخشوع وخضوع وحضور قلب وتدبر آیات تلاوت کی جائے۔ سو اس بات کی سنیوں میں ہونے کی اور شیعوں میں نہ ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اس لیے بندہ کمترین بھی بطور پیش بندی یہ گزارش کرتا ہے کہ موافق مثل مشہور ہمارا ادھر بھی لکھا ہے اس بات کے تسلیم سے بھی ہمیں انکار نہیں کیونکہ خشوع وخضوع کا باعث بجز حسن عقیدہ یا کثرت تلاوت بہ نسبت کلام اللہ کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ حسن عقیدت کا باعث خشوع وخضوع ہونا تو ظاہر ہے، رہی کثرت تلاوت سو اس کی یہ وجہ ہے کہ اکثر بنی آدم خدا سے غافل دُنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ساعت دو ساعت کے ذکر یا تلاوت سے ان کی غفلت اور رغبت زائل نہیں ہوتی۔ ہاں مدت ہائے دراز تک اگر ذکر کی مشق کیجیے تو مثل اور کاموں کے البتہ بعد دیر یادداشت اور حضور کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ اس وقت خشوع وخضوع آپ پیدا ہو جائے گا مگر ان فرقوں کو ذکر کرنے والے اور تلاوت کرنے والے ہی جانیں تو جانیں، شیعی کیا جانیں؟

اہلسنّت کو کلام اللہ سے حسن عقیدت ہے شیعوں کو نہیں

خیر غرض یہ ہے کہ باعث خشوع وخضوع یا حسن عقیدت ہے یا کثرت تلاوت بلکہ دونوں مل کر باعث حصول خشوع وخضوع ہوتے ہیں۔ سو حسن عقیدت کا اُن لوگوں کے دلوں میں ہونا معلوم جو کلام ربانی کو بیاض عثمانی سمجھتے ہوں۔ ہاں اہلسنّت کے لیے جو کلام اللہ کو بلا کم وکاست وتغیر وتبدل حرفاً حرفاً بجنسہ کلام اللہ منزل سمجھتے ہیں، جتنا کہیے تھوڑا ہے۔ مع ہذا موافق نقل عربی ''الاناءُ

جو مشروع معدہ بلعدہ" سمجھی جاتی ہیں ــ وہی چیز چھٹک کر نکلے گی جو اس کے اندر ہوگی ۔ احوال مجلسوں اور سینوں کو مطابق کر کے دیکھ لیجئے کہ کس کو اس کلام سے زیادہ انتفاع ہے ۔ اہلسنت کا حال تو ظاہر ہے اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ حرز جان سمجھتے ہیں اور جہاں شیعی جزدانوں اور رکابوں میں رکھتے ہیں، سنی رومال بھرے سینوں میں اور جزدانوں میں رکھتے ہیں اور سنی وجہ ہے کہ کلام اللہ کی تعلیم و تعلم سے زیادہ اور کسی چیز کی تعلیم و تعلم کا اہتمام نہیں ۔ سب میں پہلے بچوں کو کلام اللہ ہی پڑھاتے ہیں اور جو سقط وہ سہو ہی کراتے ہیں، کلام اللہ کے سامنے کسی کی نہیں سنتے یہاں تک کہ احادیث کو بھی اس پر مطابق کر کے دیکھتے ہیں ۔ اگر موافق نکلی تو خیر ورنہ موافق مثل مشہور کالائے زبون بریش خاوند اس کو راویوں کے سر مارتے ہیں اور جوں لیتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ راوی کا قصور ہے ۔ القصہ عقل و نقل کی کسوٹی اور دین و دنیا میں امام سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ سب جانتے ہیں، باقی رہے حضرات شیعہ ان کی بے اعتقادی بھی اسی درجہ کی ہے اور کیوں نہ ہو ۔ علامہ کلینی اپنی کتاب کافی میں جو شیعوں کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، وہ وہ روایتیں رقم فرماتے ہیں کہ جن کے دیکھنے سے کلام اللہ کی طرف سے خدانخواستہ بالکل ہی نفرت ہو جاتی ہے، شائقین کی نظر سے ان شاء اللہ جلد ہی گزرتی ہیں ۔

شیعوں کی نظر میں کلام اللہ کی حیرت ناک بے وقعتی

بالجملہ کلام اللہ کی بے اعتباری توریت و انجیل کی بے اعتباری سے بھی چند نمبر زیادہ ہے جو تحریر روایات مشار الیہا ان شاء اللہ اس قول کو آپ تسلیم کریں گے ۔ غرض نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ کلام ربانی کا نام ہی ان کی اصطلاح میں بیاض عثمانی ہو گیا ہے اور اپنے آپ بے کہے سنے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ منجملہ ثقلین کلام اللہ کے ساتھ تو ہمیں تمسک میسر نہیں ۔ ادھر تلاوت کلام ربانی کے انداز اور مجلس مرثیہ و کتاب خوانی کی تعظیم و توقیر کے موازنہ سے خود ظاہر ہے کہ شیعوں کے دل میں کلام اللہ کی مرثیوں کے برابر بھی قدر و منزلت نہیں، گو زبان سے نہ کہیں ورنہ اس کے کیا معنی کہ کلام اللہ کے پڑھنے والے کو بھی حقہ پی لینے میں کچھ دریغ نہ ہو اور محفل مرثیہ و کتاب میں کیا مقدور جو کوئی حقہ کی طرف دیکھ بھی سکے ۔ بہر حال اکثر شیعہ اس بات پر شاہد ہیں کہ کلام اللہ کی عظمت ان کے دلوں میں چنداں نہیں، گو اقل قلیل اہل سنت میں بھی ایسے ہوں کہ ان کا حال ان کے قال کے موافق نہ ہو، باقی رہی کثرت تلاوت اس کے کہنے کی کچھ حاجت نہیں یہ تو شیعوں کے اقرار سے بھی بفضلہ تعالیٰ نصیب اہل سنت ہی ہوا ہے ۔

حق تلاوت سے خشوع وخضوع مراد لینے میں نہ شیعہ کی مطلب برابری ہے اور نہ یہ احتمال آیت شریفہ پر چسپاں ہوتا ہے

القصہ اگر علماء شیعہ حق تلاوت کو بمعنی خشوع وخضوع رکھیں تو ہمیں تو کچھ انکار نہیں کیونکہ خشوع وخضوع بھی اگر ہے تو اہل سنت ہی میں ہے، پر اس کو کیا کیجئے کہ نظم ونسق کلام اللہ اسی طرف ہے کہ حق تلاوت سے کثرت تلاوت ہی مراد ہے کیونکہ اول تو حق تلاوت "یتلونہ" کا مفعول مطلق ہے اور مفعول مطلق سب جانتے ہیں کہ بمعنی فعل مذکور یا اس کے اقسام میں سے ہوتا ہے سو کثرت تلاوت تو بیشک اقسام تلاوت میں سے ہے پر خشوع وخضوع داخل تلاوت نہیں بلکہ امور خارجیہ میں سے ہے، کون نہیں جانتا کہ تلاوت زبان کا کام ہے اور خشوع وخضوع دل کے احوال میں سے ہے اور یہ بھی نہ سہی "اُولٰئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ کاالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمْ" پر محمول کرنا اس بات کو مقتضی ہے کہ ایمان تلاوت موصوف پر متفرع ہو۔ چنانچہ جو لوگ فنون بلاغت سے آشنا ہیں وہ اس بات سے بھی آشنا ہیں اور اسی واسطے "یؤمنون" بصیغہ استقبال فرمایا "آمنوا" نہ فرمایا۔

حق تلاوت سے خشوع وخضوع مراد لینے کی صورت میں ترتیب معانی کا اُلٹ جانا

طرفہ یہ ہے کہ در صورتے کہ حق تلاوت بمعنی خشوع وخضوع ہو معاملہ برعکس ہو جائے گا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایمان سے یا تو معنی مشہور مراد لیجئے یا بمعنی کمال انقیاد وتسلیم جسے ایمان کامل کہتے ہیں۔ رکھئے یا تصدیق معانی مقصودہ جو مراد خداوندی ہے قرار دیجئے۔ سو بہر صورت معاملہ برعکس ہے ایمان بمعنی مشہور یعنی تصدیق "لا اِلٰہَ الا اللّٰہ محمّد رسول اللّٰہ" کا خضوع وخشوع سے پہلے ہونا تو کسی پر مخفی ہی نہیں، سب جانتے ہیں کہ ایمان ہی سے بقدر ایمان خضوع وخشوع پیدا ہوتا ہے نہ کہ برعکس۔ رہا ایمان بمعنی کمال انقیاد سو وہ بھی اسی طرح خضوع وخشوع تلاوت سے مقدم ہے کیونکہ وہ سبب ہے اور یہ مسبب مع ہذا آیت۔

"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں ان کے دل اللہ کی یاد سے، سن لو! اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل۔"

بھی اسی طرف مشیر ہے کہ ایمان کامل باعث کثرت ذکر اور موجب حصول اطمینان قلب جو عین توجہ الی اللہ اور حضور قلب ہے ہوتا ہے کیونکہ اطمینان قلب کا حاصل ہونا بجز نفوس مطمعنہ کے جو کامل الایمان ہوتے ہیں، متصور نہیں چنانچہ بدیہی ہے باقی رہا ایمان بمعنی تصدیق وعلم مراد خداوندی، سووہ بھی بشہادت آیت: "اِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرىٰ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عرفوا مِنَ الْحَقِّ"......"اور جب سنتے ہیں اس کو جواترا رسول پر تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو اُبلتی ہیں آنسوؤں سے، اس وجہ سے کہ انہوں نے پہچان لیا حق بات کو۔"

حال خضوع سے جو اس آیت میں بضمن "تَرىٰ اَعْيُنَهُمْ تفيض من الدمع" مذکور ہے، مقدم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ جب سنیں وہ لوگ کہ جن کا اوپر سے ذکر ہے اس کلام کو جو رسول پر نازل کی گئی ہے تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو کہ آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں۔ بسبب اس کے کہ جان لیا انہوں نے حق بات کو۔ سو اس سے یہ بات صاف روشن ہے کہ انہوں نے کلام اللہ کو سن کر مضامین حق دریافت کیے، اس سبب ان کا یہ حال ہوگیا کہ آنسوؤں کا تا نتا بندھ گیا ہے یعنی بسبب حق کے دریافت ہو جانے کے ان کے دلوں میں خشوع وخضوع پیدا ہوگیا، نہ یہ کہ رونے اور خشوع وخضوع کے باعث ان کو حق بات معلوم ہوگئی ہے، غرض درصورتے کہ حق تلاوت بمعنی خشوع وخضوع ہو تو بہر طور ترتیب بالعکس ہوئی جاتی ہے۔

حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد لینے کی صورت میں ترتیب معانی کا ٹھیک اور درست رہنا

ہاں اگر حق تلاوت سے کثرت تلاوت مراد ہو تو تینوں صورتوں میں ترتیب بطور خود رہے گی کیونکہ بے ایمانوں اور ضعیف الایمانوں کو تو کثرت تلاوت موجب آگاہی حقائق ودقائق کلام ربانی ہی ہوتی ہے اور باعث ہدایت اور رفع شکوک اور سبب حسن عقیدت جو عین ایمان ہے، ہو جاتی ہے۔ سو اگر ایمان سے بمعنی مشہور مراد ہو تو بایں طور کثرت تلاوت باعث حصول ایمان ہے اور اگر کمال ایمان مراد ہے تب بھی یہی بات ہے کیونکہ کثرت تلاوت سے دم بدم غفلت زائل ہوتی جاتی ہے اور لحہ بہ لحہ ملکۂ یادداشت اور حضور قلب ترقی پکڑتا ہے اور صفاً آئینۂ قلب کی زیادتی اور انوار تجلیات کے ہجوم کا باعث ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے تصدیق قلبی محکم اور مستحکم ہو جاتی ہے اور کمال انقیاد پیدا ہوتا ہے۔ باقی رہا ایمان بمعنی علم مراد خداوندی سو اس کا کثرت تلاوت پر متفرع اور

مترتب ہونا تو سب ہی پر ظاہر ہے، کون نہیں جانتا کہ ایک کتاب کا کثرت سے مطالعہ کرنے والا اس کے مطلب کو بہ نسبت ان لوگوں کے جو اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اکثر صحیح ہی سمجھتا ہے۔

آیت مذکورہ میں ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اب ایک شبہ باقی رہا وہ یہ ہے کہ آیت "اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنَاهُمُ" سے ایمان کا تلاوت موصوف پر متفرع ہونا ہر چند ظاہر ہے۔ چنانچہ مبتداء کو بقید مذکور مقید کرنا اور "اُولٰئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ" کا اس پر محمول کرنا اور "یُؤْمِنُوْنَ" کہنا اور "آمنوا" نہ کہنا سب اسی طرف مشیر ہیں مگر احتمال یہ بھی تو ہے کہ بطور معلوم تلاوت کرنا ایمان کی فقط علامت ہو اور ترتب اور تفرع کا کچھ لحاظ نہ ہو اور ظاہر ہے کہ بعضی اشیاء کی علامتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ ان اشیاء ہی کے سبب پیدا ہوتی ہیں جیسے دھواں دور سے جہاں سے آگ نظر نہ آتی ہو، آگ کی علامت ہے اور اس پر آگ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا وجود آگ کے وجود کی فرع ہے، آگ کا وجود اس کے وجود کی فرع نہیں۔ سو ایسے ہی اگر تلاوت (موصوف) ایمان کی علامت بھی ہو اور پھر ایمان ہی سے پیدا بھی ہوتی ہو اور بغرض بیان علامت ہی جناب باری نے یہ فرمایا ہو تو کیا حرج ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عمدہ توجیہ کو چھوڑ کر ایسے احتمال ضعیف کو لینا اوّل تو یہی دلیل کم فہمی ہے۔ خصوصاً خدا کے کلام میں کہ اس میں بالاتفاق اگر ہوگی تو عمدہ توجیہ مراد خداوندی ہوگی۔ دوسرے "سَلّمنا" لیکن اس کا کیا جواب کہ بیان علامت سے تو غرض یہی ہوتی ہے کہ وہ شے جس کی یہ علامت ہے متمیز اور متبین ہو جائے، سو جب تک علامت خود متمیز اور متبین نہ ہوگی تب تک بیان علامت بیکار ہے خدا کے کلام میں بیہودہ بیکار باتوں کا ہونا منجملہ محالات ہے اور چونکہ خشوع و خضوع امر مخفی ہے اس کو علامت ایمان مقرر کرنا تعریف مجہول بالمجہول اور تشریح مخفی بالمخفی کی قسم میں سے ہے البتہ کثرت تلاوت ایک امر محسوس ہے اس کو اگر علامت کہیے تو زیبا ہے اور پھر قطع نظر اس کے مفید ترتیب مذکور مع ہذا خضوع و خشوع کو باعتبار عادت کے مستلزم، چنانچہ مذکور ہوا۔ سو اس صورت میں علامت ہونا بھی صحیح ہو گیا اور خضوع و خشوع کی طرف بھی اشارہ ہو گیا اور ترتیب و تفریع بھی ہاتھ سے نہ گئی اور حق تلاوت کا مفعول مطلق ہونا بھی صحیح و درست رہا اور کسی طرح کی تکلیف کی ضرورت نہ پڑی۔

آیت مذکورہ کے ذیل میں ایک اور فائدہ

جب اس شبہ کی تردید سے فراغت پائی تو ایک اور فائدہ گوش گزار اہل فہم ہے وہ یہ ہے کہ قید

"آتیناهم" سے یوں خیال میں آتا ہے کہ جن لوگوں کو کتاب نہیں دی گئی یعنی اس کو مانتے ہی نہیں، چہ جائیکہ مان کر غلط سمجھ جانا، ان لوگوں میں سے اگر کوئی حافظ ہو جائے تو مضائقہ نہیں، یا یوں کہیے کہ اس کو ایسی تلاوت جسے تلاوت کا حق کہتے ہیں، میسر آ جائے تو آ جائے، پر ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب ملی ہے یعنی انہوں نے اس کو تسلیم کیا، کثرت تلاوت وہاں ہی ہوگی جہاں حق ہی حق ہوگا کچھ کجی نہ ہوگی کیونکہ کثرت تلاوت جسے تلاوت کا حق کہتے ہیں، علامت ایمان ہے تو فقط انہی کی نسبت ہے جو اس کو تسلیم بھی کرتے ہیں، نہ کہ ہر کسی کے حق میں، اس صورت میں یہ جو مشہور ہے کہ برنس نصرانی کو کلام اللہ یاد تھا کیا عجب ہے کہ صحیح ہووے۔ بہر حال بعلامت "يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ" یوں معلوم ہوتا ہے کہ بشارت "اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ" فرقہ اہلسنت کے لیے ہے اور حضرات روافض منجملہ "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ" ہیں جس کے یہ معنی ہیں اور جو لوگ کتاب اللہ سے پھر گئے، سو وہی ٹوٹے میں ہیں۔

اس ایک آیت کی طرح اور بھی آیت قرآنیہ مذہب اہلسنّت کو حق اور مذہب شیعہ کو باطل قرار دیتی ہیں بغرض اجمال صرف ایک پر اکتفا کی گئی

اب التماس یہ ہے کہ سو آیت مذکورہ آیات کثیرہ حقیت مذہب اہل سنت اور بطلان مذہب شیعہ پر دلالت کرتی ہیں اور کیوں کر دلالت نہ کریں، جس قدر عقائد مخصوصہ مذہب شیعہ اور فروع خاصہ مذہب مذکور ہیں، بتمامہا مخالف کلام اللہ ہیں اور مذہب اہلسنّت سراپا کلام اللہ پر مطابق اور وجہ اس کی یہی ہے کہ بسبب تلاوت کے حق ادا کرنے کے اہلسنّت تو مغز سخن ربانی کو پہنچے اور شیعہ بسبب اس کے کہ کثرت تلاوت بوجوہ مذکورہ ان کو میسر نہ آئی، دقائق کلام اللہ کو نہ سمجھے مگر چونکہ آیت مذکورہ کے ذکر کرنے سے یہ نکتہ معلوم ہو گیا تو اہل عقل بالاجمال سمجھ جائیں گے کہ بیشک آیات ربانی مخالف مذہب شیعہ ہوں گی اور مذہب اہلسنّت بتمامہا موافق قرآن مجید، تو قطع نظر اس کے کہ آیت مذکورہ حقیت مذہب اہلسنّت و بطلان مذہب شیعہ پر جداگانہ بھی دلالت رکھتی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ تقریر بالا سے واضح ہو جائے گا اور آیات کے حوالے سے بھی حقیت مذہب اہلسنّت اور بطلان مذہب شیعہ پر دلالت کرتی ہے چونکہ اس وجہ سے یہ آیت اور آیات کی بھی نیابت کرتی ہے تو اس کو کیا بیان کیا گویا سب ہی کو بیان کر دیا۔ اس وجہ سے اور آیات کے بیان سے مقصر ہوں۔ مع ہذا اگر تمام آیات مخالفہ مذہب شیعہ کو لیجیے تو ایک دو نہیں جو سہل ہو بکثرت بلکہ

اکثر آیات کلام اللہ عقائد واحکام واصول وفروغ مذہب شیعہ کو رد کرتی ہیں اور مذہب اہلسنت کی حقیت اور حقانیت پر شاہد ہیں۔ اس رسالہ مختصر میں سب کی گنجائش کہاں؟ خصوصاً جبکہ بقدر فہم ان کی شرح بھی کیجئے اور ان سے اہلسنت کی حقانیت اور ان کے مذہب کی حقیت اور اہل تشیع کے مذہب کے بطلان پر استدلال بھی لایئے۔

استدلال آیت مذکورہ پر شیعوں کی طرف سے ایک لچر شک وشبہ

لہٰذا ایک ہی آیت پر کہ وہ ایک ہی سب کے قائم مقام اور مفید خاص وعام ہے اکتفا کر کے اس قدر اور گزارش کرتا ہوں کہ شاید کسی شیعی المذہب کو اس آیت کی ہدایت کو سن کر بسبب کجی طبیعت اور ضلالت طبع زاد اور تعصب نہاد یہ شبہ ہو کہ یہ آیت ہے تو کیا ہوا۔ ایک جملہ قرآنی ہے سو قرآن کا نعوذ باللہ منہ کیا اعتبار ہمارے اعتقاد کے موافق کمی کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ بیشی اور افزائش اور تبدیلی الفاظ بھی ظہور میں آئی ہے۔ پھر عجب نہیں کہ یہ آیت بھی منجملہ الحاقات اہل سنت ہووے۔

شبہ کا ایک پہلو سے جواب

سو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ مذہب محققین شیعہ اس بات میں یا تو یہ ہے کہ کلام اللہ میں نہ کمی ہوئی نہ بیشی، چنانچہ استاد علامہ کلینی حضرت صدوق اس کے قائل ہیں، یا یہ ہے کہ کمی تو ہوئی ہے زیادتی نہیں ہوئی۔ غرض زیادتی کا نہ ہونا اجماعی اور آیت مرقومہ سے انکار نہیں ہو سکتا مگر یہ چونکہ دونوں مذہب مخالف مرویات کلینی ہیں جو اصح الکتب شیعہ ہے اور نیز ذہن نشین اکثر شیعہ بھی یہی ہے کہ کلام اللہ میں کمی، زیادتی دونوں ہوئی ہیں۔ ادھر ہمارے بعض مطالب مذکورہ بھی اسی پر مبنی ہیں اس جواب پر قناعت نہیں ہو سکتی۔

شبہ کا دوسرے پہلو سے جواب

اس لیے دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اور شیعوں کے مذہب کے بطلان ہی کی دلیل ہے۔ بحمد اللہ باقرار شیعہ اتنا تو معلوم ہوا کہ مذہب تشیع کا اعتبار نہیں کیونکہ ماخذ احکام دین سب میں اوّل کلام اللہ ہی تھا۔ جب اس کا اعتبار نہیں تو جو باتیں شیعی بزعم خود کلام اللہ سے ثابت کرتے ہیں، اگر بفرض محال ثابت بھی ہو جائیں تو بدرجہ اولیٰ قابل اعتبار نہ ہوں گی۔

کلام اللہ پر بے اعتباری ظاہر کرنا خود اپنے خیال کی بیخ کنی ہے

مع ہذا ثقلین جو متفق علیہ طرفین ہیں، اس بات پر شاہد ہیں کہ کلام اللہ اور عترت دونوں کے

ساتھ تمسک رہے گا تو گمراہی پیش نہ آئے گی۔ پھر جب کلام اللہ سے جو موافق حدیث مذکور دونوں میں اعظم ہے تمسک میسر نہیں تو یہ شہادت عقل سلیم ہدایت بھی نہیں سراپا گمراہی ہے۔ غرض حضرات شیعہ اگر یہ احتمال پیش کریں تو یہ تو اور اُلٹے اپنے ہی پاؤں میں تیشہ مارنا ہے۔

کلام اللہ پر سے اعتبار اُٹھ جانا احادیث پر سے اعتبار کو پہلے کھو دیتا ہے

ادھر بالبداہت اور بالاجماع کسی فرقے کی کوئی حدیث اس درجے کو شائع و ذائع نہیں ہوئی جس درجے کو کلام اللہ شائع ذائع ہوا ہے اور نہ اس طرح سے کسی حدیث کے سارے راوی اس کی روایت میں متفق اللفظ پھر جب کلام اللہ کا اعتبار نہیں اس کا کاہے کو ہوگا۔ پھر جس میں راویان احادیث شیعہ کے احوال کو اور ان احادیث کے تعارض کو دیکھئے تو بے اعتباری میں نہایت ہی کو پہنچ جائیں گی۔ بہر حال اگر یہ شبہ علماء شیعہ پیش کریں اور اکثر مواقع میں پیش کرتے ہیں تو ہمارے لیے، بہت تخفیف تصدیع ہے۔

کلام اللہ میں کمی و بیشی کا خیال تلاوت اور حفظ قرآن کا خاتمہ کر دیتا ہے

مع ہذا شیعوں ہی کے اقرار سے ہمارا وہ دعویٰ جو تقریر شرح آیات مسطورہ میں گزرا ہے۔ خدا ساز ثابت ہو گیا کیونکہ جب قرآن میں اس درجہ کو کمی و بیشی ہے تو پھر جسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن ہی نہ ہوا، اب اگر شیعی اسے یاد بھی کرلیں اور تلاوت کا جیسا حق ہے ویسی طرح تلاوت کریں تب بھی فی الواقع تلاوت قرآن اور حفظ قرآن نہ ہوگا۔

حضرات اہل بیت کا عمل قرآن میں کمی و بیشی کے خیال کو لغو ثابت کرتا ہے

دوسری تمام روایات امامیہ میں موجود ہے کہ تمام اہلبیت اسی قرآن کو پڑھتے تھے اور اسی کے عام و خاص سے تمسک کرتے تھے اور بطور استدلال اسی قرآن کی آیات کو پیش کرتے تھے اور اسی کی آیات کی تفسیر کرتے تھے اور حضرت امام حسن عسکری کی طرف جو تفسیر منسوب ہے تو اسی قرآن کی ہے لفظاً لفظاً اور اہل بیت اپنے لڑکوں اور باندیوں اور خادموں اور اہل و عیال کو یہی قرآن تعلیم فرماتے تھے اور اسی قرآن کے پڑھنے کا نمازوں میں حکم فرماتے تھے۔

قرآن کا حد درجہ شائع ہونا خود اس میں کمی و بیشی کے خیال پر ضرب کاری لگاتا ہے

مع ہذا قرآن مجید کا موافق نزول کے لوگوں کو پہنچانا اور ان کو سکھانا باجماع اُمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ فرض تھا اور یقیناً معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو

کوئی مشرف باسلام ہوتا تھا، اوّل کلام اللہ سیکھتا تھا، بعدازاں لوگوں کے سکھانے میں مشغول ہوتا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی ہزاروں نے کلام اللہ سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ بعضے بعضے غزوات میں ستر ستر حافظ شہید ہوئے ہیں۔ بعدازاں آج تک تمام اطراف میں یہاں تک کہ دیہات میں اہل اسلام کلام اللہ کی تلاوت کو سب عبادتوں پر بڑھ کر سمجھتے ہیں اور رات دن نماز میں اور نماز سے باہر کلام اللہ کے پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں اور ہر لڑکے کو اوّل جو مکتب میں بٹھلاتے ہیں تو سب سے پہلے کلام اللہ ہی یاد کرانا شروع کراتے ہیں۔ بالجملہ قرآن مجید مثل کلینی وتہذیب نہیں کہ براہ تقیہ کسی کونے میں صندوق میں مقفل بند رہے، کبھی تنہائی میں ڈرتے ڈراتے کہ مبادا کوئی سنی نہ آجائے ایک دو صفحہ مطالعہ کرلیا اور اس پر ایسے کثیر الوجود کہ ہر شہر ہر دیار میں سینکڑوں ہزاروں ہیں۔ کلینی وتہذیب کو ہندوستان میں تلاش کیجئے تو کہیں کہیں نکلے گی۔ علیٰ ہذا القیاس ایران میں سمجھئے کیونکہ اوّل تو رعایا سلطانی میں اہل سنت بکثرت ہیں، سنا تو یوں ہے کہ شیعوں سے زیادہ ہوں۔ آئندہ خدا جانے اور شیعوں میں سے بھی کلینی وتہذیب نہ ہر کسی کے کام کی نہ ہر کوئی اسے سمجھے جو خواہ مخواہ بہم ہی پہنچائے، باقی سوا ان کے اور ممالک میں کلینی وتہذیب کا پتہ تو کیا ملے نام بھی کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ بایں ہمہ اگر ایک دو نسخہ کہیں مل بھی جائے تو بیشتر غلط ملتے ہیں۔ صحیح تو قسمت ہی سے ملتا ہے بخلاف کلام اللہ کے ہر دیار میں بکثرت موجود۔ یہاں تک کہ کوئی کتاب کسی مذہب کی ہو یا کسی علم عقلی کی۔ ایسی کثیر الوجود نہیں پھر عام وخاص کو اس کی ضرورت ایک ایک گھر میں متعدد کلام اللہ رکھے ہوئے ہیں۔ حفظ وتصحیح کا یہ اہتمام کہ ہزاروں حافظ حرف حرف گنا ہو از بر زیر کی تعداد معلوم رسم خط میں بیسیوں کتابیں موجود، پھر بایں ہمہ کسی عاقل کی عقل میں آسکتا ہے کہ کلینی اور تہذیب میں تو الحاق نہ ہونے پائے اور شیعوں کے نزدیک من کل الوجوہ معتبر اور معتمد رہے اور اصح الکتب کہلائے اور کلام اللہ میں الحاق ہو جائے اور اس کا کچھ اعتبار نہ رہے۔

قرآن مجید کی بے پناہ شہرت عقل کے نزدیک خلیفہ ثالث کے دامن کو الزام سے پاک کردیتی ہے

جس زمانہ فرض کیجئے اس میں فلانے شخص نے کلام اللہ میں سے کم کردیا یا اس میں کچھ بڑھا دیا، جیسے شیعوں کو خلیفہ ثالث کی طرف بدگمانی ہے تو ایک دو کلام اللہ میں بڑھایا گھٹایا گیا ہوگا تمام ملک عرب اور ملک روم اور ملک ایران اور یمن کے مصاحف میں (کہ ان کے خلیفہ ہونے سے پہلے یہ

تمام ممالک تحت تصرف اسلام ہو چکے تھے اور سوائے ملک عرب کے کہ وہ سارا کا سارا مسلمان ہو چکا تھا اور ممالک کے باشندوں میں سے بھی لکھوکھا آدمی مسلمان ہو چکے تھے اور قرآن کو فرمان خداوندی سمجھ کر ہر کوئی حرز جان سمجھتا تھا اور مجموعہ ایمان تصور کر کے اس کی یادگاری اور تلاوت میں مشغول تھا، کمی وبیشی ہرگز قرین عقل نہیں۔ علاوہ بریں اس زمانہ میں حفاظ کی نوبت لکھوکھا کو پہنچی تھی۔ خلیفہ ثالث نے ان کے سینوں سے کیونکر نکال دیا ہوگا کہ تمام عالم میں قرآن محرف ہی مروج ہو گیا، ان وجوہ کے نظر کرنے کے بعد اہل عقل کا تو یہ کام نہیں کہ قرآن مجید کی نسبت اس بات کے قائل ہوں کہ اس میں کچھ کمی یا بیشی وقوع میں آئی ہو اور جب قرآن مجید اس درجہ کو صحیح اور معتبر ہوا، کوئی کتاب اس کے ہمسنگ نہیں اور تفسیر امام حسن عسکری میں اوّل سے آخر تک تمام آیات بجنسہا موجود ہو دیں تو اوّل تو آیت "اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ الخ" سے استدلال کرنا صحیح اور درست ہوا۔

قرآن کی حفاظت کا ثبوت خود قرآن کی زبانی

دوسرے اگر کلام اللہ ہی کی آیات سے کلام اللہ کے بجنسہا محفوظ ہونے پر استدلال کریں تو درصورت یہ کہ طریقہ استدلال صحیح ہو واجب التسلیم ہوگا۔ اس لیے کلام اللہ کو جو ہم نے تجسس کیا تو آیات کثیرہ اس پر شاہد نکلیں کہ کلام اللہ تاہنوز موافق نزول کے بجنسہا باقی ہے کسی قسم کا تغیر یا تبدل اس میں وقوع میں نہیں آیا، نہ کمی ہوئی اور نہ بیشی ہوئی، نہ کسی لفظ کے عوض میں دوسرا لفظ مشہور و معروف ہو گیا۔ سب کو لکھ کر اس مضمون کو ثابت کیجئے۔ اس کی تو گنجائش نہیں۔ فقط ایک آیت کا لکھنا ضروری سمجھ کر ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۂ حجر میں ارشاد ہے: "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" یعنی ہم نے آپ پر اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ فقط۔ اب جائے غور ہے کہ باوجود اس پختہ وعدہ کے جو مؤکد بچند تاکید ہے۔ چنانچہ واقفان علم معانی واقف ہیں۔ پھر نہ جانے خلیفہ ثالث نے کیا ستم کیے ہیں کہ قرآن اصلی کا بالکل نام ونشان مٹا دیا۔ اللہ اللہ کیا کچھ قدرت وطاقت تھی کہ نعوذ باللہ خدا کی بھی نہ چلنے دی۔ سورتیں کی سورتیں نکال ڈالیں اور آیتیں کی آیتیں بدل دیں، زہے نصیب اہلسنت جن کے ایسے پیشوا ہوں۔

شیعوں کے غلط خیال کے شرمناک نتائج

باقی رہا یہ احتمال کہ خداوند ذوالجلال وعدہ کر کے پھر گئے ہوں۔ سو یہ خیال خود محال ہے۔ خداوند صادق القول ایسی تاکیدوں سے وعدہ محکمہ فرمائے اور پھر پھر جائے اور حفاظت نہ کرے مع ہذا

کلام اللہ ہی میں یہ بھی آیت ہے۔ ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ'' (یعنی اللہ تعالیٰ ہرگز خلاف وعدہ نہیں کرتا۔) مگر شاید کسی شیعہ مذہب کو یہ احتمال پیش آئے کہ خلیفہ ثالث کے زمانے میں یا جس کو یوں کہئے کہ اس نے کلام اللہ میں کمی وبیشی کی ہے اس کے زمانہ میں خداوند اکرم ٹال گیا ہو یا اپنے وعدہ کو بھول گیا ہو، سو اس کا جواب خداوند کریم نے اپنے آپ کلام اللہ میں فرما دیا ہے۔ آیت الکرسی تو شیعوں کو بھی یاد ہوگی اس میں یہ جملہ موجود ہے ''لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ'' یعنی نہ اونگھ ہی خدا کو آ دباتی ہے اور نہ نیند ہی۔ ادھر سورہ مریم میں فرماتے ہیں...

''وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا'' یعنی تیرا رب بھولنے والا نہیں۔ سورۃ طٰہٰ میں یوں ارشاد ہے ''لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى'' نہ بھٹکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔ اس آیت نے اس احتمال کو بھی مرتفع کر دیا کہ خداوند کریم نے نگہبانی قرآن کا قصد تو کیا ہو، پر تدبیر میں غلطی ہوئی ہو، یا بوجہ غلطی قرآن کے بدلے کسی اور چیز کی حفاظت کر بیٹھے ہوں۔ جب یہ سب احتمالات مرتفع ہو چکے تو اب اس غلام خاندان نبوی کی علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ بعد اس وعدہ محکم اور عدم موانع کے جو خداوند کریم سے حفاظت نہ ہو سکی تو بجز اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے نزدیک خلیفہ ثالث میں (نعوذ باللہ من ہذا القول) خدا سے بھی زیادہ زور اور بل تھا کہ خدا کا ارادہ پیش نہ گیا درحالیکہ تم خلیفہ ثالث کے اس قدر معتقد ہو کہ خدا کو بھی اتنا نہیں سمجھتے تو خلیفہ ثالث ہی کے ساتھ ہی کیوں نہیں ہو لیتے (نعوذ باللہ نقل کفر کفر نہ باشد) اگر یہی تمہارے خیال ہیں تو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہو کے کیا پورا پڑے گا مبادا قیامت کو خلیفہ ثالث تمہیں بھی خدا تعالیٰ کی حفاظت سے نکال کر کبھی کبھی کے بدلے لینے لگے اور خدا کو شیعان علی سے شرمانا پڑے۔

اسی سلسلے میں کلینی کی افتراپردازی اور مرتبہ قرآن میں خلل اندازی

یا یوں کہو کہ یہ ہمارا عقیدہ غلط ہے اور کلینی جو تمہارے نزدیک اصح الکتب ہے، اس کی یہ روایت سراسر بہتان اور دروغ ہے۔

''عن هشام بن سالم عن ابى عبدالله اِنَّ القرآن الّذى جاءَ به جبرئيل الى محمّد صلى الله عليه وعلى اٰله وسلّم سبعة عشر الف اٰياتٍ''

''یعنی ہشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ قرآن جو حضرت جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ اس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں۔'' فقط

اب دیکھئے کہ یہ کلام اللہ جواب موجود ہے اس میں کل قریب چھ ہزار آیتوں کے ہیں تو شیعوں کی اس روایت کے موافق کوئی دو تہائی کلام اللہ چوری گیا، اس سے بہتر تو یہی تھا کہ خداوند کریم ذمہ کش حفاظت نہ ہوتے۔ اس کی حفاظت کے بھروسے اُمتیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے فکر ہو بیٹھے ورنہ بہت ہوتا تو اتنا ہی نقصان ہوتا جتنا توریت وانجیل میں ہوا تھا سو جو لوگ کہ توریت وانجیل کی تحریف کے اثبات کے درپے ہوئے ہیں وہ بھی یوں نہیں کہتے کہ توریت وانجیل میں اتنا کچھ نقصان ہوا ہے بلکہ بعد تحقیق یوں معلوم ہوتا ہے کہ علماء یہود ونصاریٰ نے قدر قلیل کی بیشی کی ہے۔ سو وہ بھی جہاں کہیں کوئی بات مسلمانوں کے مفید مطلب دیکھی ہے یا کوئی ایسا حکم ہوا ہے کہ اس کے مروج رہنے میں امراء کو دُشواری ہوئی ہے ایسی جگہ امراء سے کچھ لے کر دے کر بدل دیا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ القصہ حسب مقولہ شیعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس اہتمام اور اس انتظام کے کہ قرآن مجید کی خداوند کریم نے خود حفاظت کی۔ قرآن مجید غیر محفوظ اور غیر معتبر ہونے میں توریت وانجیل سے بڑھ گیا حالانکہ ان کا حافظ محافظ نہ خدا تھا نہ کوئی پیغمبر، ہاں علماء دُنیا پرست کہ آیات خداوندی کا بیچ دینا اور احکام کا بدل ڈالنا اور تحریف کا کرنا ان کا کام ہی تھا۔ اس کے فقط پڑھنے پڑھانے والے اور جاننے پہچاننے والے تھے۔ حافظ ونگہبان ہونا کجا۔ شاید اس فرقہ کے نزدیک کلام اللہ کے توریت وانجیل سے بڑھ کر ہونے کے یہی معنی ہیں کہ بے اعتباری میں ان سے بڑھا ہوا ہے۔

حفاظت قرآن کے دو لچر احتمالات اور ان کے دندان شکن جوابات

یہاں علماء شیعہ دو احتمال پیش کریں تو کریں ایک تو یہ کہ کلام اللہ لوح محفوظ میں محفوظ ہے، دوسرا یہ احتمال کہ غار سر من رائے میں حضرت امام مہدی حافظ قرآن موجود ہیں۔ سو اوّل احتمال کا پوچ ہونا تو ظاہر ہے اوّل تو یہ ہے کہ اگر بالفرض "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کا یہی مطلب ہے تو ہمیں کیا ہم سے اس وعدہ کرنے کے کیا معنی، ہمارے مفید مطلب تو یہ بات ہے کہ اس قرآن کی حفاظت کرتے جو ہمارے پاس ہے تا کہ احکام خداوندی کے معلوم ہونے میں شک وشبہ نہ رہتا۔ دوسرے وہاں کی حفاظت کرنے کی کیا ضرورت تھی، اگر لوح محفوظ تک کسی کے دین کی دسترس ہوتی تو البتہ حفاظت کا موقع بھی تھا۔ تیسرے آیت مذکورہ میں اوّل تنزیل کا ذکر فرمایا۔ بعد ازاں حفاظت کا وعدہ کیا ہے اس ترتیب سے بلاغت شناسان قرآنی کو خود معلوم ہے کہ قرآن منزل کی حفاظت مدنظر ہے نہ کہ اس قرآن کی جو لوح محفوظ میں محفوظ ہے۔ چوتھے اگر یہی مطلب ہے تو یہ فضیلت تو

توریت وانجیل میں بھی موجود ہے۔ قرآن میں کیا فوقیت ہوئی، مع ہذا یہاں حفاظت کا وعدہ کیا وہاں نہ کیا، اس کا کیا ثمرہ نکلا۔ پانچویں یہ ہے کہ اس آیت میں اسماء قرآنی میں ذکر اس کو ذکر کیا۔ لفظ قرآن یا کتاب وغیرہ ذکر نہ فرمایا تو یہ بھی اسی غرض سے ذکر فرمایا ہے کہ قرآن میں امکان کمی و بیشی تغیر وتبدل کا کسی کو احتمال باقی نہ رہے۔

قرآن مجید کے نام ذکر کا موقع استعمال اور اسکی مفید تشریح

چونکہ یہ بات تمہید طلب ہے تو ہمیں لازم ہے کہ اس کی تمہید بیان کر کے اصل مطلب کو روشن کر دکھلائیں۔ اس لیے یہ گزارش ہے کہ بسبب اعتبارات اور اوصاف مختلفہ اور حیثیات متعددہ کے ایک ایک چیز کے متعدد نام ہوا کرتے ہیں اور پھر وہ نام اپنے اپنے موقع ہی میں استعمال ہوتے ہیں، ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص کسی کا باپ بھی ہوتا ہے اور کسی کا بیٹا بھی اور علیٰ ہذا القیاس کسی کا بھائی کسی کا بھتیجا، کسی کا چچا کسی کا بھانجا، کسی کا ماموں ہوتا ہے۔ غرض ایک شخص ہے اور اس کے القاب بہت ہیں، پر وہ سب القاب یکساں برابر نہیں بولے جاتے، اپنے اپنے موقع میں مستعمل ہوتے ہیں۔ بیٹا اپنے باپ کو بیٹا کہہ کے نہیں پکار سکتا، گو وہ کسی کا بیٹا ہے اور اسی طرح باپ بیٹے کو باپ کہہ کر نہیں پکار سکتا۔ اگر چہ وہ اپنے بیٹے کا باپ ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک حاکم کلکٹر بھی ہوتا ہے، مجسٹریٹ بھی ہوتا ہے مگر چونکہ کلکٹری، مجسٹریٹی کا کام مختلف اور جدا جدا ہے تو کلکٹری کے کاغذات میں بلقب کلکٹر لکھتے ہیں اور مجسٹریٹی کے کام کاغذات میں بلقب مجسٹریٹ اور بر عکس نہیں کر سکتے۔

اسی طرح قرآن شریف کے بھی بہت سے القاب اور اسماء ہیں اور ہر ایک لقب کا مدار ایک جدا اعتبار اور نئے نئے اوصاف پر ہے۔ قرآن تو بلحاظ مقرو ہونے کے کہتے ہیں، یعنی قرآن کو قرآن اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ اس کی قرأت کا اتفاق ہوتا ہے اور مصحف اور کتاب بایں لحاظ کہتے ہیں کہ اس میں صحف یعنی اوراق ہوتے ہیں اور ان اوراق میں اس کو لکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ذکر بایں وجہ کہتے ہیں کہ غافلوں اور جاہلوں کے لیے مذکر اور گنہگاروں کے واسطے پند دلبند ہے یعنی باعث یادگاری باری ہے اور پندِ خداوند ہے۔ سو اس لقب کا استعمال جب ہی صحیح ہوگا کہ مقابل میں غافل اور جاہل اور گنہگار ہوں مگر سب جانتے ہیں کہ موصوف بوصف غفلت وجہل و گناہ اگر ہے تو یہ انسان ہے۔ ملائک ان عیوب سے مبرا ہیں تو جب تک کلام اللہ لوح محفوظ میں تھا، اس لقب کا بولنا صحیح نہ تھا کیونکہ اس موقع میں نہ کوئی غافل نہ تھا نہ جاہل تھا نہ گنہگار تھا وہاں تک اگر رسائی تھی تو فقط ملائک کو تھی۔ سو

ان کو ان باتوں سے کچھ سروکار ہی نہیں۔ہاں جب نوبت تنزیل کی پہنچی اور معاملہ حضرت انسان سے پڑا تو البتہ اس لقب کا استعمال صحیح ہوا کیونکہ غرض انزال،تنزیل سے یہی ہے کہ غافلان نوع بشر کے لیے مذکر اور واعظ ہو۔پھر جب "اِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" فرمایا تو ضمیر اسی لفظ کی طرف راجع فرمائی۔ اس لیے لازم پڑا کہ حفاظت بھی اسی موقع میں ظہور میں آئے کہ جہاں اس لقب کا استعمال صحیح ہو۔

دوسرے سوال کا مسکت جواب

باقی رہا دوسرا احتمال،اس کا یہ حال ہے کہ اول تو حضرت امام مہدی کا غار سر من رائے میں مخفی ہونا ہی ایک افسانہ غلط ہے جب کلام اللہ کا باوجود اس قدر تواتر کے کچھ اعتبار نہ رہا ایسی روایات بے سرو پا کا جن کے،راوی فقط دو چار مکار ہوں کیا اعتبار اور درصورت یہ کہ وہ بات بھی قرین قیاس نہ ہو تب تو قابل قبول عقل کسی عاقل کے نزدیک بھی نہیں اور جن روایات سے حضرت امام مہدی کا یہ افسانہ مروی ہے وہ کچھ ایسی ہی ہیں بلکہ اس سے بھی کمتر ہیں ہم۔یہ بات تو ہرگز متصور ہی نہیں کہ حضرت امام مہدی کو کلام اللہ یاد ہو،یہ کام تو اہلسنت جماعت کا ہے۔حضرت امام مہدی کو ان کا تشبہ کاہے کو گوارا ہوگا۔ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوم فَهُوَ مِنْهُمْ" ہاں ان کے پاس کلام اللہ ہو اور حضرت امام اس کلام اللہ کو لیکر اسی اندیشے سے اس غار میں جا چھپے ہوں کہ مبادا ان کے پاس کلام اللہ معتقدان خلیفہ ثالث کی نظر نہ پڑ جائے تو البتہ ایک ٹھکانے کی بات ہے لیکن اہل فہم سے سوال ہے کہ یہ احتمال پہلے احتمال سے اس بات میں کیا کم ہے کہ ہمارے حساب سے ویسا ہی لوح محفوظ میں ویسا ہی غار سر من رائے میں،نقل مشہور ہے ویسا ہی کنواں ویسی ہی کھائی بلکہ بلحاظ وجہ پنجم اس کلام اللہ کی حفاظت کا وعدہ ہی نہیں جو بزعم شیعہ حضرت امام کے پاس ہو اہل فہم کے نزدیک اس کا ذکر کہنا ہی صحیح نہیں،ذکر کہنا تو جب صحیح ہو کہ اُمتی اسے پڑھیں پڑھائیں،غار سر من رائے میں کون جائے اور کون اس سے فائدہ اُٹھائے بلکہ وعدہ ہے تو اسی کلام اللہ کی حفاظت کا ہے کیونکہ اس کا ذکر ہونا ظاہر ہے۔پھر حضرت امام کا کلام اللہ اگر اسی کلام اللہ کے موافق ہے تو فبہا ورنہ اس صورت میں حضرت امام ہی کا کلام اللہ غلط ہوگا۔بالجملہ ایسے لغویات کو خداوند کریم کی طرف نسبت کر کے مفت دین اسلام کو بٹا لگاتے ہیں۔سبحان اللہ! یہ عجب تماشہ ہے کہ جناب باری نے وعدہ حفاظت تو اس لیے کیا تھا کہ اُمت محمدی کو کل کو درباره علم احکام کچھ دقت نہ پیش آئے دین محمدی میں کوئی رخنہ نہ پڑے،یہ دین قیامت تک برابر روشن رہے۔مگر افسوس کہ تاہم وہی خرابی کی خرابی (برسر) رہی (نعوذ باللہ) غار سر من رائے میں محفوظ ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ خداوند کریم حفاظت کے وقت اتنا بھی نہ سمجھے کوئی اجنبی آدمی سنے گا تو کیا کہے گا۔

شیعوں کا لغو خیال یہود اور نصاریٰ کے مقابلے کیلئے ایک راہ کھولتا ہے

ہماری صلاح یہ ہے کہ اس بات کو شیعہ کسی یہودی نصرانی کے سامنے تو زبان پر بھی نہ لائیں، ہمارے سامنے کہیں تو شاید ہم بپاس اتحادِ کلمہ گوئی یوں سمجھ کر کہ شیعوں کی خفت فی الجملہ اپنی ہی خفت ہے، سکوت بھی کر جائیں کیونکہ اوّل تو یہودیوں کو اس قسم کی خرافات کو سن کر اس بات کے کہنے کی گنجائش ملے گی کہ ہماری توریت بھی آخر لوحِ محفوظ میں محفوظ ہے۔ سوائے اس کے سورۂ احقاف سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے پاس توریت بجنسہٖ موجود تھی اور اس میں بنی آدم کی طرح انہوں نے کچھ تغیر و تبدل نہ کی تھی ورنہ وہ یوں نہ کہتے:

"اِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ"

"یعنی بیشک ہم نے سنی ہے ایک کتاب جو نازل کی گئی ہے موسیٰ کے بعد تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے ہے۔ یعنی توریت کی تصدیق کرتی ہے۔"

سو اس بات کا یقین کہ کلام اللہ توریت کی تصدیق کرتا ہے۔ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کو توریت کے بجنسہٖ ہونے کا یقین ہو یا کلام اللہ توریت محرف کا مصدق ہو، سو دوسرا احتمال تو شیعوں کے نزدیک بھی غلط ہے کیونکہ جنات نے جو کلام اللہ سنا تھا تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یا ایسے ہی کسی اور سے نہ سنا تھا اور اگر یہودیوں کی پرخاش کا کچھ اندیشہ نہ ہو اور یہ سمجھ کر کہ کچھ توریت بجنسہا باقی ہو اور فقط اس میں تحریف نہ ہونے کا ان کو ایسا یقین ہو جیسے امامیہ کو الحمد اور قل ھو اللہ کے بجنسہا ہونے کا یقین ہے۔ فخریہ یوں کہنے لگیں کہ ہمارا قرآن تو غار سرمن رائے میں محفوظ ہے، تمہاری توریت بتلاؤ کہاں محفوظ ہے یا اتفاقات سے وہ آیات سنی ہوں جو توریت کی ان عبارات کے جواب تک صحیح وسالم ہیں۔ موافق اور مطابق ہیں اور فقط اسی توافق اور تطابق کے باعث انہوں نے کلام اللہ کو مصدق توریت سمجھا ہو تو اس صورت میں ہو سکے ہے کہ توریت محرف بھی ہو اور کلام اللہ غار سرمن رائے میں محفوظ ہو اور اس وجہ سے کلام اللہ کو توریت پر فوقیت ہو اور یہود سے نہ شرمائیں لیکن قطع نظر اس کے کہ یہ فوقیت کس درجہ کو نا کارہ فوقیت ہے مشکل ہی رہے گی۔

اگر یہود سے پالا جیت بھی گئے تو نصاریٰ ان کی نہیں چلنے دیں گے

یہودیوں سے پالا جیت بھی گئے تو انگریزوں سے کس منہ سے بات کریں گے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حافظ انجیل باتفاق شیعہ وسنی آسمان چہارم پر زندہ موجود ہیں۔ غار سرمن رائے میں

تو حضرت امام کو اس بات کا بھی شاید اندیشہ ہو کہ مبادا کوئی معتقد خلیفہ ثالث رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھرتا پھراتا یہاں نہ آ نکلے اور ان کے کلام اللہ کو چھین کر جلا دے یا معاذ اللہ دشمنان امام کو شہید کر دے اور جو مصلحت کہ اخفا اور خفا سے تھی، ہاتھ سے نکل جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو بے کھٹکے ہیں چوتھے آسمان تک کس کے مقدور جو جا کے چھیڑے، ہاں البتہ ایک بات ہو سکتی ہے کہ ان سے یوں کہا جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اول تو حافظ انجیل ہونا غیر مسلم ہو مگر یہی بعینہ احتمال بہ نسبت حضرت امام موجود ہے بلکہ بدرجہ اولیٰ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خود انجیل نازل ہوئی، ان کو یاد نہ ہونا نہایت مستبعد بخلاف حضرت امام کے کہ قرآن ان پر نازل نہیں ہوا۔ مع ہذا کلام اللہ کے یاد ہونے میں اہلسنّت کی مشابہت لازم انجیل کے یاد ہونے میں کوئی خرابی نہیں۔ دوسرے ہم نے مانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل بھی ہوں گے اور ان کو انجیل یاد بھی ہو لیکن چونکہ انجیل منسوخ ہو چکی ہے تو بعد نزول عیسیٰ علیہ السلام وہ یاد ہونا کچھ مفید نہ ہوگا بخلاف حضرت امام کے کہ ان کا کلام اللہ کا یاد رکھنا بعد ان کے خروج کے کام دے گا اور شیعان علی کو جو مدت دراز سے بناچاری بیاض عثمانی پر عمل کرتے ہیں کلام اللہ اصلی ہاتھ آئے گا اور دیرینہ تمنا پوری ہوگی۔

عیسائیوں سے نبرد آزمائی کیلئے اس عقیدہ سے دست برداری لازم ہے کہ حلت و حرمت کی تبدیلی آئمہ کے دست قدرت میں ہے

مگر یہ تدبیر جب مفید ہے کہ شیعہ ہمارا کہنا سر دھریں اور اس اعتقاد سے کہ اماموں کو تبدیل احکام حلت اور حرمت وغیرہ کا اختیار ہے اوّل اس سے دست بردار ہوں اور نوادر کی اس روایت پر قلم پھیر دیں۔

عَنْ مُحَمَّد بِنْ سَنَان عَنْ اَبِیْ جَعْفر قَال کُنْتُ عِنْدَہٗ فَاَجْرِیْتُ اِخْتلَافَ الشِّیْعَة فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَزَلْ مُنْفَرِدًا بِالْوَحْدَانِیَّة ثُمَّ خَلَقَ مُحمدًا وعلیًا و فَاطمه والحسن والحسین فَمَکثُوْا الف دَهْرٍ فَخَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَ اَشْهَدَ هُمْ خَلْقهَا وَاَجْرٰیٰ طَاعَتَهُمْ عَلَیْهَا وَفوض اَمْرَهُم اِلَیْهِمْ یحلُّونَ مَا یَشَاؤُنَ وَیُحَرِّمُوْنَ مَا یَشَاؤُنَ.

”حاصل اس روایت کا یہ ہے محمد بن سنان بیان کرتا ہے کہ میں حضرت امام ابو جعفر یعنی امام محمد باقر کے پاس تھا، اتفاق سے میں نے شیعوں کے باہم مختلف ہونے کا ذکر چھیڑا۔ یعنی یہ پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ شیعان علی دین میں باہم مختلف ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ محمد بن سنان حق اللہ تعالیٰ پہلے تو ہمیشہ سے اکیلا تھا کوئی دوسرا تھا ہی نہیں، پھر پنجتن کو پیدا کیا، پھر بعد ہزار دھر کے اور اشیاء

کو پیدا کیا اور پنجتن کے سامنے سب کو موجود کیا اور پنجتن کی اطاعت ان کے ذمہ پر رکھی اور ان کے کاروبار سب پنجتن کے حوالے فرمائے۔ سو وہ جو چاہیں حلال کر دیں اور جو چاہیں حرام کر دیں۔" فقط

الغرض اس روایت کے سیاق سے اختلاف شیعہ کی وجہ یہ نکلی کہ پنجتن میں کسی نے ایک بات حلال رکھی تو دوسرے نے اسے حرام کر دی، سو کوئی ان کا مقلد ہو گیا کوئی ان کا۔ دوسری روایت کلینی کی بھی اسی روایت سے ہم زبان ہے اس سے بھی دست برداری لازم ہے۔

......"عَنْ مُحَمَّد بن الحسن المثيمى عَنْ اَبِىْ عَبْدُ اللّٰه قَال سَمِعْتُهُ يَقُوْل اِنَّ اللّٰه اَدَّبَ رَسُوْله صلى اللّٰه عليه وسلّم حَتّٰى قَوَمَه عَلٰى مَا اَرَادَ ثُمَّ فوَّضَ اِلَيْهِ دِيْنَهٗ فَقَالَ مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فخذوهُ وَمَانهٰكُمْ عَنْه فَانْتَهُوْا فَمَا فَوَّضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى رَسُوْلِه فَقَدْ فَوَّضَهُ اِلَيْنَا."

"اس کا حاصل یہ ہے کہ محمد بن حسن میثمی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھلایا اور سیدھا جیسا اپنا جی چاہے تھا بنایا پھر اپنا دین اس کے سپرد کیا اور کلام اللہ میں سورۂ حشر میں سب کو حکم دیا کہ جو کچھ رسول دے یعنی جو کچھ فرمائے اسے قبول کرو اور جس سے منع کرے اس سے ہٹ رہو، سو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا تھا وہی ہمارے بھی سپرد کیا۔"

پہلی روایت سے فقط پنجتن ہی کا اختیار در باب تبدیل احکام معلوم ہوتا تھا اور اس روایت سے ثابت ہوا کہ وہ اختیار اور اماموں کو بھی حاصل ہے اس لیے کہ جو تفویض اوّل روایت میں تھی وہی اس روایت میں بھی ہے، سو وہی معنی بلاشک مراد ہوں گے۔

بے اصل روایات کی بے بنیاد توجیہ

مگر شاید کوئی شیعہ مذہب اس کی یہ توجیہ کرے کہ اس تفویض اور تحریم اور تحلیل کے یہ معنی ہیں کہ وہ اجتہاد کر کے لوگوں کو احکام بتلا دیں، آخر اہل سنت بھی تو انبیاء اور علماء کے اجتہاد کے حجت ہونے کے قائل ہیں۔ شیعہ اگر چاردہ معصوم کے اجتہاد کے معتبر ہونے کے قائل ہو گئے تو کیا گناہ ہوا، یا یہ توجیہ گھڑیں کہ خداوند کریم نے ان کو سب کی استعدادیں اور قابلیتیں دکھلا کر، چنانچہ ظاہر عبارت روایت اوّل یہی ہے۔ پنجتن کو حکم دیا ہو کہ ان کی استعدادوں کے موافق جو کچھ سمجھ میں آئے احکام مقرر کر دو۔ سو اگر یہ ہو تو کیا خرابی ہے لیکن اہل عقل پر پوشیدہ نہ ہوگا کہ اجتہاد کی تاویل کرنی تو بعینہ ایسی ہے جیسے کہا کرتے ہیں۔ من چہ میگویم وطنبور من چہ میگوید۔ چنانچہ استعداد والے

خود سمجھتے ہیں کہ اس توجیہ کو عبارت روایت اوّل سے کچھ علاقہ نہیں۔ نیز مخالف مذہب شیعہ ہے کہ وہ آئمہ کی نسبت اجتہاد کی تہمت لگائی موجب منقصت سمجھتے ہیں ان کی فرمائی ہوئی باتیں سب منجملہ وحی آسمانی سمجھتے ہیں۔ باقی رہا استعدادوں کو دکھلا کر کارخانہ دین کا سپرد کردینا۔ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں تو شیعہ تو تسلیم نہ کریں گے اثناعشریہ چھوڑ تمام امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام کو تمام احکام کی تبدیلی کا اختیار ہے۔ اگر استعداد پر ہی مدارکار ہے تو تبدیل کے اختیار کے کیا معنی۔ جیسی استعداد ہو ویسا ہی حکم ہونا چاہیے، بدلہ کیوں چاہیے بہر حال کوئی توجیہ بن نہیں پڑتی۔

تفویض کے خیال کی قرآن بیخ کنی کرتا ہے

اگر جواب مذکور سے سرخرو ہونا مدنظر ہے تو اس روایت کو زیر قلم کریں اور ہرگز کچھ اندیشہ نہ کریں کیونکہ جناب باری کا بھی یہ حکم اسی طرف ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کلام اللہ کی شان میں کلام اللہ ہی میں یوں فرماتے ہیں: "تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" مطلب یہ ہے کہ کلام اللہ میں ہر چیز کا بیان ہے ہم نہیں سمجھتے تو کیا ہوا سمجھنے والے سمجھتے ہوں گے۔ خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر جب کلام اللہ ہی میں سب کچھ آگیا تو تفویض کہاں رہی بلکہ اس صورت میں تو لازم ہے کہ جو کچھ حضرت نے یا آئمہ نے فرمایا ہو وہ شرح قرآن مجید ہو، اپنے اختیار سے کچھ نہ فرمایا ہو۔

تفویض کا خیال قرآن کو کتب منسوخہ کی حیثیت دیتا ہے

القصہ ہماری صلاح یہ ہے کہ ان دونوں روایات پر قلم پھیر کر پھر جواب مذکورہ بالا سے انگریزوں وغیرہ اعداء دین کے مقابل میں اُمید سرخرو ہونے کی رکھیں نہیں تو ان کے منہ میں بھی زبان ہے، سنیوں کو تو بوجہ اتحاد ملت کے کچھ لحاظ بھی ہوگا۔ انہیں کیا لحاظ ہے ایسا نہ ہو کہ وہ یوں کہنے لگیں کہ ہماری انجیل اگر کلام اللہ سے منسوخ ہوگئی ہے تو سارے احکام تو منسوخ نہیں ہوئے۔ آخر اخلاق کی باتیں اور بہت سے احکام حلت اور حرمت کے بدستور باقی ہیں اور عقائد میں تو مسلمانوں کے مقولہ کے موافق کچھ فرق پڑا ہی نہیں۔ حضرت آدم کے وقت سے لے کر اب تک وہی عقائد چلے آتے ہیں۔ چنانچہ کلام اللہ میں سورۂ مائدہ میں خود موجود ہے:

"وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ"

"یعنی نازل کی ہم نے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف سچی کتاب کہ وہ پہلی کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے۔"

سو تمہارے کلام اللہ کا بھی یہی حال ہے کہ اماموں نے مناسب وقت دیکھ کر بہت سے احکام تبدیل وتغیر کر دیئے۔ چنانچہ پہلی روایت سے یہ خوب طرح واضح ہوا ہے کیونکہ اختلاف شیعہ کی وجہ حضرت امام باقر نے یہی بیان کی ہے۔ پھر حضرت امام مہدی کے پاس اگر وہ کلام اللہ محفوظ بھی ہو تو کیا حاصل وہ دین تو بدل ہی گیا کوئی اور ہی کلام اللہ بنانا چاہیے، نہیں تو یہ ایسا ہی قصہ ہے جیسا حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمہارے عقیدے کے موافق آخری زمانہ میں نازل ہوں گے اور باوجودیکہ انجیل کے حافظ ہیں، پھر بسبب اپنے دین کے منسوخ ہو جانے کے انجیل پر عمل نہ کریں گے بلکہ کلام اللہ پر عمل کریں گے۔

تفویض کی شکل میں ظہور حضرت امام مہدی کے وقت قرآن کی وہی حیثیت ہوگی جو انجیل کی بوقت نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوگی

باقی رہا یہ احتمال کہ شاید حضرت امام مہدی انہیں احکام پر عمل کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ محمد بن بابویہ قمی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کرتے ہیں:

وَعَنْ اَبِیْ عَبْدُ اللّٰہِ اَنَّہٗ قَالَ اِنَّ اللّٰہ تعالٰی اخی بَیْنَ الْاَرْوَاحِ فِی الْاَزْلِ قَبْلَ اَنْ یَخْلُقَ الْاَجْسَامَ بِالفی عامٍ فَاِذَا قَامَ قَائِمِ اَھْلِ الْبَیْتِ وَرِثَ الْاَخَ مِنَ الَّذِیْنَ اخا بَیْنَھُمَا فِی الْاَزْلِ وَلَمْ یُوْرِثِ الْاَخَ مِنَ الْوِلَادَۃِ.

”یعنی حضرت امام ابو عبداللہ نے جو حضرت امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب ہے یوں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں روحوں کے پیدا کرنے سے دو ہزار برس پہلے روحوں میں آپس میں بھائی بندی کرادی ہے۔ سو جب امام مہدی نکلیں گے ازل کی بھائی بندی کے حساب پر وراثت جاری فرمائیں گے اور جو نسل کی روح سے بھائی ہوگا اسے وراثت نہیں دلائیں گے۔“

اب دیکھئے کہ اس روایت سے صاف یوں ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام مہدی کلام اللہ کے احکام کے موافق بالکل عمل نہ کریں گے اور یہ حکم جو نسبی بھائی کے وارث ہونے کا ہے اسے موقوف کردیں گے اور اس روایت سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ بھائیوں کی وراثت کا حکم جو سورۂ نسا میں ”یوصیکم اللہ“ کے رکوع میں ہے وہ کوئی خلیفہ ثالث کی نعوذ باللہ کچھ کرتوت نہیں بلکہ عین حکم الٰہی ہے ورنہ اس کے موقوف ہونے کی حضرت امام مہدی کے وقت پر کیا تخصیص تھی۔ الغرض جب تک اثناء عشریہ اس مذہب سے کہ امام کو سب احکام کے منسوخ کردینے کا اختیار ہے دست بردار

نہ ہوں گے۔ تب تک انگریزوں کے سامنے اپنے کلام اللہ کے محفوظ ہونے کے مقدمہ میں جو آیت "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" سے مستفاد ہوتا ہے منہ نہ کر سکیں گے۔

تفویض سے انکار میں نصاریٰ و یہود سے گلوخلاصی ملنے کے علاوہ ختم نبوت پر ایمان پختہ ہوتا ہے

اور ہماری اس صلاح کے ماننے میں فقط ان کا یہی فائدہ نہیں کہ نصاریٰ اور یہود سے جیت جائیں، نہیں بلکہ لفظ خاتم النبیین جو سورۂ احزاب میں ہے اس پر بھی ایمان درست ہو جائے گا، نہیں تو یہودیوں کی طرح یہ عتاب ان پر بھی رہے گا۔ "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" یعنی کیا تم تھوڑی سی کتاب پر تو ایمان لاتے ہو اور تھوڑی پر نہیں لاتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ بات تو انبیاء میں سے بھی کسی کسی کو میسر آتی ہے کہ نئی شریعت لائے اور پہلے احکام بدل جائیں بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبی ہوئے سب توریت ہی پر عمل کرتے رہے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی یہ بات میسر نہیں آئی کہ خدا نے دین کا مقدمہ انہیں سپرد کر دیا ہو بلکہ جو کچھ انہوں نے احکام مقرر کیے سب حسب فرمان خداوندی مقرر کیے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تو در کنار کلام اللہ سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہ اختیار نہ تھا کیونکہ سورۂ انعام میں یہ آیت موجود ہے "قُلْ لَا اَجِدُ فِيْمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا الآیۃ" جس کا حاصل یہ ہے کہ کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ نہیں پاتا ہوں بیچ اس چیز کے جو میری طرف وحی کی گئی ہے کوئی چیز حرام کسی کھانے والے پر مگر فلانی اور فلانی، اس آیت کے مضمون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حرام کرنے اور حلال کرنے کا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہ تھا، حلت حرمت کا مدار وحی پر تھا، دوسرے کئی جگہ آیا ہے "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" حاصل اس کا یہ ہے کہ سوائے خدا کے اور کوئی حاکم نہیں اور اگر بالفرض خدا نے اُمت کے احکام ان کے سپرد بھی کر دیے ہوں۔ تب بھی ہمارے امام کچھ ان سے اس بات میں کم نہ رہے اور یہی احکام کی تبلیغ کے لیے رسول اور نبی ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

"يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ"......

"یعنی اے رسول پہنچا دے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے۔"

الغرض اس طریق سے یہود اور نصاریٰ کی پرخاش سے بھی نجات ہو جائے گی.... اور اپنا ایمان بھی درست ہو جائے گا۔

حق کے زور سے ابن بابویہ آخر سنیوں کا ہمزبان ہوگیا

اور شاید کچھ یہی سوچ سمجھ کر شیخ صدوق اعنی ابن بابویہ نے کتاب الاعتقادات میں اس عقیدہ سے ہاتھ اُٹھایا اور ہمارے نزدیک اس حساب سے وہ صدوق اسم بامسمیٰ ہو گئے مگر سنیوں سے دامن چھڑانے کے لیے سب اہل تشیع کی طرف سے نیابۃً یوں کہہ اُٹھے "مَنْ نَسَبَ اِلَیْنَا اَنَّا نَقُوْلُ اِنَّهُ اَکْثَر مِنْ ذَالِکَ فَهُوَ کَاذِبٌ" یعنی جو یوں کہے کہ شیعہ یوں کہتے ہیں کہ کلام اللہ اس سے زیادہ تھا جواب لوگوں کے پاس ہے اور جس کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں وہ جھوٹا ہے۔ انہوں نے چاہا تھا کہ سنیوں کو جھوٹا بنائیں پر خدا سچوں کو سچا ہی کرتا ہے۔ خدا ساز علامہ کلینی نے اس دروغ کا بار اپنے سر اُٹھایا یایوں کہیے علامہ صدوق کو جھوٹا بنایا۔ چنانچہ ان کی روایت کلام اللہ کے سترہ ہزار آیت ہونے کے باب میں اوپر مرقوم ہو چکی، کسی نے سچ کہا ہے حق برزبان جاری شود۔ خیر کہاں تک حضرات شیعہ کی ناانصافی اس باب میں بیان کیجیے۔ منصفوں کے لیے اس قدر بھی بہت ہے ہمیں کوئی عاقل منصف ایسا نظر نہیں آتا جو "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" سے بجز اس کے کچھ اور معنی سمجھے کہ اس میں ہرگز کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ خلیفہ ثالث ہو یا خلیفہ اوّل اور دوم۔

آیت مذکورہ سے سنیوں کی فضیلت کا انکشاف

بلکہ انصاف سے دیکھیے تو شہادت صرف اس آیت میں سنیوں کی بڑی فضیلت نکلتی ہے۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جو کام کسی کے اہتمام اور انتظام اور حکم سے ہوا کرتا ہے۔ اگر چہ حقیقت میں اسے اور ہی کوئی کرے پر عرف میں وہ مہتمم ہی کی طرف اور منتظم اور حاکم ہی کی جانب منسوب ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی بادشاہ کسی رسالہ یا پلٹن کو خزانہ کی حفاظت کے لیے مقرر کرے۔ سو رسالدار یا صوبہ دار ان پانچ سپاہیوں کو پہرہ پر مقرر کر دیتے ہیں اور پھر نوبت بنوبت اور نمبروار اس پہرہ کو بدلتے رہتے ہیں اور آپ آرام کرتے ہیں اور سپاہی پہریدار چوروں، قزاقوں کو دفع کرتے رہتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ حقیقت میں محافظت سپاہی پہریدار کرتے ہیں پر چونکہ رسالداروں اور صوبہ داروں کے حکم سے کرتے ہیں تو بڑی سرکاروں میں رسال داروں اور صوبہ داروں ہی کا نام ہوتا ہے اور سپاہیوں کا کیا ہوا، رسالداروں اور صوبہ داروں ہی کا کیا سمجھا جاتا ہے۔ اس واسطے اگر کہیں

ایسے موقع پر کوئی معرکہ کا کام بن پڑتا ہے تو گو سپاہیوں کو بھی قدر قلیل انعام ملنے پر رسالداروں اور صوبہ داروں کو بیش قرار انعام ملتا اور عہدوں کی ترقی ہوتی ہے۔ اسی طرح سنی بھی موافق حکم الٰہی کے اس خزانہ بیش بہا کی محافظت کرتے ہیں اور چونکہ اوراق میں فقط خوب حفاظت نہ ہو سکتی تھی تو اس لیے اس کو اپنے سینوں میں گویا جان کے ساتھ رکھتے ہیں تاکہ بے دینوں اور شیاطین کو اس کے چرانے کی دسترس نہ ہو سوا ُلٹے چور کوتوال کو ڈانٹیں۔ شیعہ سنیوں ہی کو چور بتانے لگے سو یہ وہی مثل ہے نیکی برباد گناہ لازم۔ اگر شیعوں سے سنی کچھ انعام و اکرام اس خدمت کا مانگتے جب ہی یہ تہمت لگائی ہوتی خدا کے دینے میں اتنا بخل کیوں ہے تیل جلے سرکار کا کلیجہ پھٹے مشعلچی کا۔ ہم جو دُنیا میں دیکھتے ہیں تو کلام اللہ کی محافظت سنی ہی کرتے ہیں، ایک ایک بستی میں بعضی بعضی جا پانچ سو (۵۰۰) حافظ موجود ہیں مگر چونکہ یہ ان کی حفاظت موافق ارشاد خداوندی کے ہے تو یہ ان کا کیا خدا ہی کا کیا سمجھنا چاہیے اور سنیوں کو ملازم خاص اور محکوم باختصاص سمجھئے اس لیے خداوند کریم نے اس محافظ کو اپنی طرف نسبت کیا اور یہ فرمایا "وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں لیکن شیعوں کو محکومان نافرمان کی مانند جانئے بلکہ بمنزلہ باغیوں کے یا چوروں کے قرار دیجئے کیونکہ یہ فرقہ محافظان کلام ربانی کے جو ایک خزانہ بے بہا ہے دشمن ہیں اور خزانوں کے محافظوں کے قزاق اور باغی اور چور ہی دشمن ہوتے ہیں۔ غرضیکہ یہ آیت "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ" بھی بآواز بلند یہی کہتی ہے کہ مذہب اہل سنت حق ہے اور مذہب شیعہ باطل۔ پر سننے کے لیے کان شرط ہیں جن کانوں پر "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ" کی مہر لگی ہوئی ہو یعنی یہ مضمون ان پر صادق آتا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگائی ہے وہ کیا سنیں اور کس کی سنیں مگر ہمیں اپنی طرف سے سمجھانے میں قصور نہ کرنا چاہیے جیسے شیخ صدوق ایک بات مانتے ہیں ایسے ہی شاید مولوی عمار علی صاحب یا کوئی اور عالم یا جاہل اس بات کو بھی مان جائے مگر چونکہ متعصب کو حق بات کا ماننا ہر چند کتنی ہی صاف و روشن کیوں نہ ہو بہت دُشوار ہوتا ہے تو اس تقریر کو سن کر شاید کوئی شیعہ مذہب یوں کہنے لگے ہم نے مانا کہ کلام اللہ سارا کا سارا صحیح اور سنیوں کی روش کی خوبی بھی اس سے ہویدا پر یہ تو کہیں نہیں کہ ابوبکر کو بھی ماننا ہی چاہیے۔ اس لیے یہ آیت سوم مع اپنے ماحصل کے لکھی جاتی ہے۔ تیسری آیت:

"اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"

''یعنی تم لوگ اگر ہمارے پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو کیا ہوگا، اللہ اس کی مدد کرنے والا ہے پہلے بھی اس کی اس نے مدد کی ہے جب کہ کافروں نے اسے نکال دیا تھا جبکہ ایک وہ تھا اور ایک اس کے ساتھ اور تھا جب وہ دونوں غار میں تھے کب جس وقت وہ اپنے ساتھ دینے والے سے یوں کہ رہا تھا کہ تو غمگین مت ہو، ہمارے ساتھ تو اللہ ہے۔''

اس آیت میں بنظر انصاف غور کیجئے اور منہ زوری کو چھوڑیئے، دیکھئے یہ آیت کدھر کو لے جاتی ہے، سنیوں کی طرف کھینچتی ہے یا شیعوں کے گھر کا راستہ بتلاتی ہے ہمیں اس جگہ مرزا کاظم علی صاحب لکھنوی کا مقولہ جو بڑے متبرک علماء شیعہ میں سے تھے اور قدوۃ الزماں مولوی دلدار علی صاحب مجتہد بھی ان کے معتقد تھے، یاد آتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اور کسی کو تو جس کسی کا جو کچھ جی چاہے سو کہے پر خلیفہ اوّل کا برا کہنے والا تو ہمارے نزدیک بھی کافر ہے۔ اہل محفل میں سے کسی نے عرض کی کہ قبلہ آپ کیا فرماتے ہیں، مذہب تو اس کے خلاف ہے انہوں نے جواب دیا کہ میں کیا کہتا ہوں خدا کہتا ہے صحابی اور صاحب کے معنی میں کچھ فرق نہیں۔ سو خدا بھی خلیفہ اوّل کے صحابی ہونے کا گواہ ہے کیونکہ صاحب کے لفظ سے جو اس آیت میں موجود ہے شیعوں سنیوں کے اتفاق سے ابوبکر صدیق ہی مراد ہیں۔ سبحان اللہ اہل انصاف ایسے ہوتے ہیں جیسے مرزا کاظم علی صاحب تھے اور وہ کچھ ایسے ویسے نہ تھے علم و زہد میں شیعوں کے نزدیک وہ بھی شہرۂ آفاق تھے، کونسا عالم شیعہ مذہب ہے جو ان کو نہیں جانتا اور ان کو نہیں مانتا اور ان کا بھی اس بات میں کچھ قصور نہیں، اس آیت کو جس پہلو سے پلٹ کر دیکھئے کہیں گنجائش گفت وشنود کی نہیں ہر طرف سے سنیوں ہی کا مطلب نکلتا ہے۔

آیت سوئم کی بصیرت افروز تشریح

شرح اس معما کی یہ ہے کہ اوّل تو لفظ صاحب جو لصاحبہ میں ہے وہ عربی زبان میں صحابی کے ہم معنی ہے دوسرے لفظ لاتحزن جس کا یہ مطلب ہے کہ غمگین مت ہو۔ وہ اسی پر دلالت کرتا ہے کہ ابوبکر صدیق عاشق صادق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمن با اخلاص تھے ورنہ ان کو غمگین ہونے کی کیا ضرورت تھی بلکہ محل خوشی تھا کہ ان کے دشمن موافق عقیدہ شیعہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خوب قابو میں آئے ہوئے تھے، کفار جو اس وقت پاس آ گئے تھے پکار کے بھی نہیں تو کسی قسم کی کھڑ کے ہی سے انہیں مطلع کر دیتے تا کہ (نعوذ باللہ منہا) وہ اپنا کام کرتے، اگر کہیں انصاف کی آنکھیں مول ملیں تو ہم حضرات شیعہ کے لیے مول لیں اور ان کو دیں تا کہ وہ کچھ تو پاس رفاقت خلیفہ اوّل کریں۔

جو پاس مہر و محبت یہاں کہیں ملتا   تو مول لیتے ہم ایک اپنے مہرباں کیلئے

اور جو یہ بھی نہ ہوتو یہی سمجھیں کہ ان کو اس وقت اپنی جان کا خوف نہ ہوا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی کا افسوس رہا اور غم ہوا تو اس بات کا کہ دیکھئے یہ دشمن حق یعنی کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا کر بیٹھیں اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی فرمائی اور فرمایا کہ غم کی کیا بات ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے تو غمگین مت ہو۔

حزن کے معنی سمجھنے میں بعض غیر منصفوں کی فاش غلطی

اس جگہ بعضے ناانصاف یوں کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیق کو اس وقت اپنی جان کا ہراس تھا کچھ پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا غور کرنے کی جگہ ہے اس بات کا یہ مطلب ہوا کہ خداوند کریم کو (نعوذ باللہ) عربی بولنی بھی نہیں آتی۔ فصاحت و بلاغت تو درکنار اور یہ جو کلام اللہ کے اعجاز بلاغت کا شہرہ ہے یہ فقط یاروں کی گھڑی ہوئی بات ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو کچھ بھی عربی جانتے ہیں وہ بھی اتنی بات تو جانتے ہیں کہ عربی زبان میں حزن کا لفظ غم کی جگہ اور فراق محبوب یا تمنا کے فوت ہو جانے کے محل میں استعمال کرتے ہیں اور جہاں جان پر بنتی ہے اور ڈر کا مقام ہوتا ہے خوف کا لفظ استعمال کرتے ہیں کلام اللہ سے زیادہ تو کوئی کتاب عربی زبان کی فصیح اور بلاغت آمیز نہیں دیکھیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر گئے اور خداوند کریم نے پوچھا کہ موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ یہ میری لاٹھی ہے چلتے پھرتے اس پر سہارا رکھوں ہوں اور بکریوں کے لیے اس سے پتے جھاڑوں ہوں اور اس میں میرے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ادھر سے حکم ہوا کہ اسے ڈالیو انہوں نے جو ڈالا تو وہ ایک اژدھا تھی، یہ اُلٹے پاؤں ایسے بھاگے مڑ کے بھی نہ دیکھا۔ اس وقت خداوند کریم نے فرمایا:

"اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنِّی لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ"......

یعنی تو ادھر آ اور ڈر مت میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس اژدھا سے اپنی جان کا اندیشہ ہوا۔ تب بھاگے اسی لیے خدا نے تسلی فرمائی کہ ڈر مت یوں نہ فرمایا "لَا تَحْزَنْ" یعنی رنجیدہ نہ ہو اور اسی طرح جب انہوں نے ایک قبطی کو مار ڈالا اور فرعون کے لوگوں نے ان کے مار ڈالنے کا ارادہ کیا تو یہ وہاں سے ڈر کے بھاگے، اس موقع میں فرماتا ہے "فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا" یعنی نکلے۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں سے ڈرتے ہوئے اور سوا اس کے اور بیسیوں جگہ خوف کا لفظ کلام اللہ میں موجود ہے جہاں کہیں ہے، یہی معنی ہیں اور جہاں غم کا مقام دیکھا وہاں یہی حزن کا لفظ استعمال کیا ہے

سورۂ یوسف میں جس موقع میں حضرت یعقوب غم فراق یوسف میں ہائے یوسف ہائے یوسف کہا کرتے تھے اور انہیں یاد کیا کرتے تھے اور حضرت یعقوب کے اور بیٹوں نے یوں کہا کہ تم یوسف کو یاد ہی کرتے کرتے مرجاؤ گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے یہ جواب منقول ہے "اِنَّمَا اَشْکُوْ بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" یعنی میں اپنے رب سے اپنی پریشانی اور اپنا غم کہوں ہوں بلکہ بہت سی آیات سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ حزن کے اور معنی ہیں اور خوف کے اور معنی ہیں ایک دوسرے کی جگہ نہیں بولا جاسکتا۔ "تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَنْ لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا" یعنی جب پکے مسلمان مرنے لگتے ہیں تو فرشتے رحمت کے ان پر اُترتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نہ تم ڈرو اور نہ تم غمگین ہو اگر خوف اور حزن کے دونوں کے ایک معنی ہوتے تو مکرر کہنے کی کیا ضرورت تھی، صحیح یہی ہے کہ غم اور چیز ہے اور خوف اور چیز ہے خوف اسے کہتے ہیں کہ کچھ آگے کو اندیشہ ہو اور غم یہ ہے کہ بالفعل دل کی تمنا ہاتھ سے نکل جائے۔ غم خوشی کے مقابلہ میں بولتے ہیں خوف اطمینان کے مقابلے میں خوشی اور اطمینان اور غم اور خوف کے معنی بیان کرنے میں مجھے یہ شرم آتی ہے کہ کوئی کیا کہے گا یہ کون سی مشکل مخفی باتیں ہیں جنہیں کوئی نہ سمجھتا ہو پر کیا کیجئے ایسے ناانصافوں سے پالا پڑا ہے کہ شاید اب بھی ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ لہٰذا اتنا اور کہنا پڑا کہ جب کسی کا کوئی مرجاتا ہے تو اس پر جو حالت پیش آتی ہے اسے غم تو کہتے ہیں پر خوف اور ڈر کوئی نادان بھی نہیں کہتا، ہاں مرنے سے پہلے جس موقع میں موت کا اندیشہ ہوتا ہے اس اندیشہ کو البتہ خوف کہتے ہیں پر رنج کوئی نہیں کہتا اگر کسی کا لڑکا کسی دیوار پر چڑھ جائے اور وہاں سے اندیشہ گر کر مرجانے کا ہو تو اِس اندیشہ کو البتہ خوف کہتے ہیں لیکن کوئی نادان بھی اسے غم نہیں کہتا۔ القصہ غم عین مصیبت کے وقت جو حالت ہوتی ہے اسے کہتے ہیں اور خوف مصیبت کی آمد آمد کی کیفیت کا نام ہے۔ ایک کو دوسرے سے کچھ لگاؤ نہیں جو حضرات شیعہ ہٹ دھرمی کر کے "لَا تَحْزَنْ" کے معنی "لَا تَخَفْ" گھڑلیں۔

شیعوں کی کج فہمی کی ایک پُر مذاق توجیہ

مگر ایک طرح وہ بھی سچے ہیں، ان کے یہاں تو قاعدہ کلیہ ہے کہ اُلٹے معنی سمجھتے ہیں مولوی عمار علی صاحب نے ناحق کے معنی حق سمجھے۔ چنانچہ اس کا بیان گزر چکا اور تمام شیعوں نے محافظوں کا نام چور رکھا۔ علی ہذا القیاس یہاں بھی اگر وہ ایسا کریں تو سنیوں کو کیا شکایت ہے بلکہ خوش ہونے کی جگہ ہے کیونکہ اصل مطلب میں تو شریک ہی نکلے لفظوں اور اصطلاح ہی کا فرق رہا سو یہ کیا بڑی بات ہے۔ مصرع

ہر یکے را اصطلاح دادہ ایم

حاصل تمہارے ان کے اختلاف کا یہ نکلا حق کا نام ان کی اصطلاح میں ناحق ہے اور محافظ کا نام ان کی اصطلاح میں چور اور حزن کا نام ان کے نزدیک خوف ہے مگر جیسے کوئی انگریز نابینا مسلمانوں کی محفل میں کسی کو کسی کی نسبت بابا کہتے ہوئے سنتا ہے تو اپنی اصطلاح کے موافق اس وقت انگریز بیٹی کے معنی اور بنیا دادا کے معنی سمجھتا ہے ایسے ہی حضرات شیعہ نے اگر "لَا تَحزَنْ" کے معنی "لاتخف" کے سمجھ لیے تو ان کا کچھ قصور نہیں، سنیوں کو لازم ہے کہ ان کی اصطلاح کے موافق ان سے باتیں کریں۔ آخر حدیث میں تو یہ مضمون ہے "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُولِهِم" یعنی لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے موافق گفتگو کیا کرو اور اگر بپاس خاطر شیعہ "لاتحزن" کو بھی ہم بمعنی "لَاتَخَفْ" ہی سمجھیں، تب بھی ہمارا چنداں نقصان نہیں، ہمارا اِدھر بھی لیکھا ہے اس لیے کہ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے ابوبکر مت ڈر۔ سو ظاہر ہے کہ ابوبکر جو خوفناک ہوں گے اور ان کو اپنی جان کا کھٹکا ہوگا تو اسی سبب سے ہوگا کہ کفار کو ان کے ساتھ دشمنی ہوگی اور وہ دشمنی بھی بوجہ اسلام اور ایمان ہوگی نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے کیا معنی اور وہ بھی پھر اس قدر کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ خدا تو مسلمانوں کی طرف داری اور حمایت کرتا ہے "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُحْسِنِيْنَ" اور اس قسم کے کلمات سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے سب کا ماحصل یہی ہے کہ اللہ اچھوں کے ساتھ ہے مومنوں کے متقیوں کے اچھے کاموں کے کرنے والوں کے ساتھ ہے کہیں اوّل سے آخر تک کلام اللہ میں یہ نہیں کہ اللہ کافروں کے مرتدوں کے منافقوں کے ساتھ ہے۔

اللہ کی معیت کی وضاحت

اور کوئی کہے کہ اللہ سب کے ساتھ ہے، مومن ہو یا کافر کلام اللہ میں موجود ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ" یعنی اللہ ہر چیز کو محیط ہے۔ جب ہر چیز کو محیط ہوا تو ہر چیز کے ساتھ بھی ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ساتھ ہونا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک تو یہی اکٹھے ایک مکان میں رہنا اس میں فقط تن بدن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اگرچہ دلوں میں فرق ہو، اس قسم کی ہمراہی تو طوطے اور زاغ کی سی ہے۔ دوسرا دلوں سے ساتھ رہنا جیسے کوئی بادشاہ کسی بے کس کو جس کے سب دشمن ہوں یوں کہے کہ تو اندیشہ نہ کر ہم تیرے ساتھ ہیں اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ ہمیں تیرا خیال ہے ہمارے دل میں تیرا دھیان رہے گا ہم تیری حمایت پر ہیں۔ اس صورت میں کچھ لازم نہیں کہ بادشاہ اور وہ ایک مکان میں ہوں تو وہ اس کے ساتھ ہو نہیں تو نہیں ہاں البتہ تا مقدور امداد اور اعانت چاہیے۔ سو جہاں کہیں "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ" یا اسی طرح اور کچھ آیا ہے تو اس سے دوسرے معنی مراد ہیں۔

چنانچہ سب جانتے ہیں نہیں تو اس میں متقیوں ہی کی کیا تعریف نکلی اور انہیں کی کیا تسلی ہوگی۔ سو خاص کر اس آیت میں تو محض تسلی ہی کے لیے یہ کہا گیا ہے اور اوپر سے مددگاری ہی کا بیان ہے۔

آیت معیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدد کا ثبوت

باقی یہ کوئی شبہ کرے کہ اوپر سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے کا بیان ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد تو نہیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اتنی بات تو بازاری بلکہ جولا ہے کی لونڈیاں بھی جانتی ہیں کہ غلام کی اہانت اور اس کی رُسوائی وہ میاں ہی کی رُسوائی گنی جاتی ہے، انگریزوں کی رعیت کو اور ملازموں کو اگر ان کے غنیم ستاتے ہیں تو انہیں کیوں اتنا برا معلوم ہوتا ہے کہ فوج کشی کرتے ہیں اور ہزاروں آدمیوں کا خون کراتے ہیں۔ مع ہذا ہم نے غدر کے ایام میں دیکھا ہے کہ جس نے تحصیل دار یا پولیس دار کو بچالیا تھا وہ خیر خواہ سرکار گنا جاتا تھا۔

سو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مددگاری بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مددگاری ہے اسی لیے ہمارے منانے وقت تو یوں فرمایا: "فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰه" اور مدد کے وقت دونوں ہی کی مدد کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو خدا کی مدد کی اطلاع کی تو یوں کی "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" یعنی خداوند کریم خبر رسانی میں اس قصہ کی تو فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ذکر فرماتے ہیں اور یوں کہتے ہیں "فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰه" یعنی اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی فلانے وقت مدد کی اور جس وقت کہ مدد کی تو دونوں کی مدد کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدد کی اطلاع کی تو یوں کی "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" یعنی اللہ تعالیٰ ہم دونوں کے ساتھ ہے اور چونکہ ایک لفظ یعنی معنا سے دونوں کی مددگاری کا بیان فرمایا اور دو لفظ نہ کہے یعنی "مَعِیَ وَمَعَکَ" نہ فرمایا جس کے یہ معنی ہوتے کہ خدا میرے بھی ساتھ ہے اور تیرے بھی ساتھ ہے تو اس سے اور بھی واضح ہو گیا کہ جس طرح سے خدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اسی طرح حضرت صدیق اکبر کے ساتھ تھا، سو اس میں تو ہم جانتے ہیں کہ شیعہ بھی بناچاری ہمارے شریک ہوں کہ خدا وند کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امداد اور عنایت اور محبت اور اعانت سے تھا تو حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بھی اسی انداز سے سمجھنا چاہیے۔ مع ہذا لفظ "ثَانِیَ اثْنَیْنِ" جس کا یہ مطلب ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک اور بھی تھا یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ضمیر مفعول "الا تنصروہ" سے حال واقع ہوا ہے۔ سو اس صورت میں یہ لفظ بھی بآواز بھی کہتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مددگاری خداوندی میں شریک ہیں۔

آیت معیت میں شیعوں کی طرف ایک عبارتی دھوکا اور اس کا جواب

اور اگر شیعہ یوں کہنے لگیں کہ یہ لفظ "اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ" کے ساتھ مربوط ہے اور اس کی ضمیر مفعول سے حال واقع ہوا ہے اور یہ مطلب ہے کہ جس وقت کفار نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ سے نکالا تھا اس وقت وہ اکیلے نہ تھے ان کے ساتھ ان کا ایک رفیق بھی تھا اور اس کو نصرت سے کچھ تعلق نہیں، نصرت سے تعلق جب ہو کہ اس لفظ کو لفظ "نَصَرَهُ اللّٰهُ" سے علاقہ ہو تو اس تقدیر پر ہماری طرف سے یہی جواب ہے۔ شکر بدہان تو چشم ماروشن دل ماشاد

اگر یہ مطلب ہو تو ہماری عین تمنا ہے کیونکہ اتنا تو شیعوں کو معلوم ہوا کہ کفار کو جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تھی ویسے ہی ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی عداوت تھی باقی کوئی یوں کہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو کفار نے نہیں نکالا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمراہ لے لیا تھا، سو اس کا جواب شیعہ دیں کیونکہ یہ معنی تو ہم نے انہیں کی طرف سے بیان کیے ہیں اور اگر ہمیں سے پوچھتے ہو، تو ہمیں سے سنئے۔ جناب من بشہادت کلام اللہ کفار نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس طرح سے نہیں نکالا کہ ہاتھ پکڑ کر باہر کر دیا ہو یا دھکے دینے کا اتفاق ہوا ہو۔ مثلاً

دار الندوہ کے واقعہ کی اصل شکل

بلکہ صورت یہ ہوئی تھی کہ دار الندوہ میں جو ابوجہل کی بیٹھک کا نام تھا اور وہ خانہ کعبہ کے پاس تھی جہاں اب حنفی مصلے بنا ہوا ہے اور اب وہ جگہ داخل حرم محترم ہو گئی ہے وہاں کفار مجتمع ہوئے اور اس بات کا مشورہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کرنا چاہیے یا مار ڈالنا مناسب ہے یا کہیں انہیں نکال دیجئے۔ اس مشورہ کی اطلاع خداوند کریم نے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کر دی، آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رفیق ولی سمجھ کر ساتھ لیا اور غار ثور میں تشریف لے گئے پھر تین دن کے بعد سواری اور راہ کا بندوبست کر کے دونوں صاحب مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔

چنانچہ اس بات کی طرف بطور اختصار سورۂ انفال میں جناب خداوند کریم اشارہ فرماتے ہیں:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ

"یعنی وہ بھی یاد ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ کفار تیرے ساتھ مکر کرنا چاہتے تھے اور ان کا یہ ارادہ تھا کہ تجھے قید کر لیں یا قتل کر دیں یا نکال دیں، ادھر وہ یہ مکر کر رہے تھے ادھر خدا ان کے ساتھ

مکر کر رہا تھا، یعنی تجھے اطلاع کردی، پھر غار میں تیری حفاظت کی یہاں تک کہ مدینہ منورہ خیریت سے پہنچا دیا اور کیوں نہ ہو اللہ تو سب سے زیادہ مکر جانتا ہے۔"

اس قصہ کو غور کیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہاتھ پکڑ کر نہیں نکالا تھا اور اگر یوں کہیے کہ ایذا کے درپے ہونا نکالنا ہے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہونے کی انہیں کون سی راحت تھی بلکہ اس سے پہلے بھی انہیں تو نکال دیا تھا نہ ابن دغنہ انہیں ہٹا کے لائے اور کفار سے ان کے باب میں گفت و شنود کرے نہ وہ بیٹھیں یہ روایت سنیوں کی کتابوں میں تو موجود ہی ہے پر عقل بھی یوں ہی کہے ہے کہ یوں ہوا ہو تو کچھ عجب نہیں کیونکہ خداوند کریم نے "اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" کے ضمن میں اس بات سے متنبہ کردیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی کفار دشمنی رکھتے تھے نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کیوں تسلی کرتے اور خدا کیوں ان کے ساتھ ہوتا اور ہمیں تو اتنا بھی بہت ہے کہ خدا ان کے ساتھ اسی طرح ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔

اس تقریر کے سننے کے بعد یقین یوں ہے کہ شیعہ اس احتمال کو زبان پر بھی نہ لائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس لیے ساتھ لے لیا تھا کہ وہ کہیں کفار کو اطلاع نہ کردے کیونکہ اس احتمال کی جڑ بنیاد تو اس آیت کے ہر ہر لفظ نے ایسی اکھاڑی ہے کہ شیعہ اپنے سر کو قیامت تک پٹیں تو نہ جمے گی۔ مع ہذا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) کچھ ایسے کم فہم نہ تھے ان کی عقل کا تو ایک عالم دیوانہ ہے کیا وہ اتنی بھی نہ سمجھے کہ اس اندیشہ کے سو دفعیہ ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی اوّل سے اطلاع ہی نہ کرتے کہ میں غار ثور میں جا کر چھپوں گا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ شیعوں کے امام تو نہ تھے کہ ان کو علم "ما کان و ما یکون" یعنی ازل ابد کے سب وقائع کی خبر تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتلاتے یا نہ بتلاتے، اُن کو آپ اطلاع ہو جاتی۔ ماسوا اس کے تقیہ تو ایسے وقت میں ضرور ہی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شیعوں کے نزدیک ایک تقیہ کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار میں چھپ جانا بھی ہے خیر یہ قصہ تو تقیہ کی اصل جیسی ہے سو ہے ان شاء اللہ آگے معلوم ہو جائے گا۔ پر شیعوں کے مذہب کے موافق تو ایسے وقت میں تقیہ فرض ہو جاتا ہے اور جھوٹ بولنا مباح، بلکہ ضرور چنانچہ اماموں نے جو اصحاب ثلاثہ یا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف کی ہے اور وہ ان کی کتابوں میں موجود ہے، اس کو شیعہ یوں کہتے ہیں کہ اماموں نے بوجہ تقیہ جھوٹ کہہ دیا تھا (نعوذ باللہ منہا) القصہ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جھوٹ بول کر ابوبکر

کے دل سے غارِ ثور کی طرف جانے کا احتمال نکال دیا ہوتا کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ان کو ساتھ لیا اور ایک جان کا وبال خرید اتنہا ہوتے تو بے کھٹکے ہوتے ان کے ساتھ وہ اندیشہ جس اندیشہ کے لیے انہیں ساتھ لیا تھا اور دوبالا ہوگیا، اگر وہ کسی بہانہ سے وہاں سے نکل کر کفار کو اطلاع کر دیتے تو بظاہر کون مانع تھا یا جس وقت کفار وہاں آ کھڑے ہوئے اس وقت بول اُٹھتے تو وہی مثل ہو جاتی کہ مینھ سے بھاگے پرنالے کے نیچے جا کھڑے ہوئے، دھوپ سے بچے پر آگ میں گر پڑے۔ القصہ اگر ابوبکر کے ساتھ لینے میں یہی مصلحت تھی تو یہ تو مصلحت سے کوسوں دور ہے۔

ملا عبداللہ مشہدی کی بے اختیارانہ حق گوئی

اسی واسطے ملا عبداللہ مشہدی نے اظہار الحق میں لاچار ہو کر انصاف کی راہ سے یہی کہا کہ نفس الامر تو یوں ہے کہ یہ احتمال بہت ہی بعید ہے مگر وہ نقل مشہور ہے کہ ستر برس کا رام جی میں بیٹھا ہوا نکلے ہے نکلتے ہی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ حق بول اُٹھیں اور اپنے بیگانہ کا کچھ لحاظ نہ کریں، اب ہم سے سنئے کہ ملا عبداللہ مشہدی کا کہنا سب بجا اور درست اور اس کے حق ہونے میں کچھ شک نہیں اور اس وجہ سے اگر ان کی کتاب مذکور کو اظہار الحق کہیں تو پھبے ہے اور ہم کو بھی اس بات کی تسلیم سے انکار نہیں، اگرچہ ملا مذکور شیعہ مذہب ہیں۔ متاع نیک ہر دوکان کہ باشد

مگر ستم تو یہ ہے کہ شیعہ حتیٰ کہ علماء بھی باوجودیکہ ملا عبداللہ مذکور کو اپنا مقتداء دین سمجھتے ہیں اس بات میں ان کی بھی نہیں سنتے، ہر چند ملا مذکور آخر کو یہی کہہ اُٹھے کہ عجب کیا ہے جو خلیفہ اوّل کو جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمراہی اور ہمدمی کے لیے اس لیے اختیار کیا ہو کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کر دیا تھا اور اکثروں سے پہلے مسلمان ہوئے تھے اور اکثر ملازم خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہتے تھے لیکن کیا امکان جو حضرات شیعہ روبراہ ہوں بلکہ عجب نہیں کہ مجتہد الزماں کے یہاں سے ان کے لیے بھی حکم تبرا صادر ہو۔

سفرِ ہجرت کی حقیقت حال

خیر کوئی مانے یا نہ مانے پر دل سب کا سنی ہوں یا شیعہ یہی گواہی دیتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہمراہ لے جانا فقط اس وجہ سے تھا کہ ان کو کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وزیر مشیر اور معین اور مددگار سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا محب خاص اور ہمدم باختصاص جانتے تھے اور کیوں نہ سمجھیں۔ شیعہ سنی کون نہیں جانتا کہ انہوں نے ابتداء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی رفاقت سے کفار کے ہاتھ سے کیا کیا ایذائیں سہیں اور کس قدر جفائیں اُٹھائیں اور کس قدر مال لٹایا اور کیا کیا کر دکھلایا۔ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مول لیا اور قید کفار سے چھڑا کر آزاد کیا اور علیٰ ہذا القیاس اللہ اور رسول کی خوشنودی کی اور سب اپنا خانماں برباد کیا۔ پس درصورت ان کے مکہ میں چھوڑ جانے کے ایک تو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین کامل تھا کہ کفار ان کو اور مجھے یکساں سمجھتے ہیں جو کفار نابکار نے میرے لیے تجویز کیا ہے ان کے لیے ہے۔ انہوں نے بیشتر کفار سے مقابلہ کیا ہے اور ان کو بارہا یہ وعظ و پند کیا ہے کہ دین اسلام دین حق ہے، بت پرستی چھوڑو، اگر سعادت مدنظر ہے اتباع نبوی اختیار کرو، اگر ان کو یہاں ہی چھوڑ گیا تو کفار ان کو ہرگز زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ہاں عمر کو اگر ساتھ نہ لوں تو کچھ مضائقہ نہیں کہ ان سے کفار کو چنداں پرخاش نہیں اور بایں ہمہ ان کے طرح طرح کے لحاظ پاس ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ ابوجہل کے جو رئیس کفار ہیں بھانجے ہیں باقی اور اصحاب کو کفار نگونسار کچھ راس و رئیس دین و ایمان نہیں سمجھتے۔ پھر اس پر ان کے بچاؤ کے اور بہت وجوہ ہیں پر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت کفار کی آنکھوں میں خار ہے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر لہو کے گھونٹ پیتے ہیں، یہ اگر مارے گئے تو بڑا رکن ایمان و اسلام ڈھ جائے گا اور ایسا رفیق شفیق اور ایسا مخلص کہ اس کا اخلاص و محبت دل میں اثر کرتا ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

بایں ہمہ ایسے سفر پُر خطر میں بے رفیق کے نہیں گزرتی، پھر رفیق بھی ایسا چاہیے کہ نہ جان سے دریغ ہو نہ پاس آبرو ہو زن و فرزند کی محبت سے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے دل پر غالب ہو اور اس پر گرم و سرد زمانہ دیکھے ہوئے تجربہ کار سیر و سفر مرد ہوشیار یگانہ روزگار بلند ہمت عالی فطرت، یار بے تکلف، محب صمیم راز دار قدیم ہو جس سے دل کی بات کھلے، دل خالی ہو غم و حیرانی وحشت و پریشانی اس کی صحبت سے دور ہو۔ سو مجموعہ ان اوصاف کا سوائے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے کسی اور میں نہ پایا۔ اسی لیے عین دوپہر کے وقت آپ ان کے گھر تشریف لائے اور حاضری پکوا کر دونوں مخدوم عالم اور خادم ہمدم رونق افروز غار ثور ہوئے اور عبداللہ بن ابی بکر کو کہ فرزندار جمند پسر کلان حضرت صدیق کے تھے جاسوسی کے لیے مقرر کیا کہ مشورہ کفار سے جو کچھ وہ درباب طلب و تلاش حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کریں، شب کو آگاہ کرتے رہیں۔

واقعہ سے شیعہ کی خام خیالی کا جواب

اگر خاندان صدیقی کو کچھ بھی عداوت ہوتی تو یہ معاملے کہیں ہو سکتے اور اگر بالفرض والتقدیر بفرض محال ایسے مشورے پیش بھی آتے تو اس سے بہتر کینہ کشی کا وقت ان کے پھر کون سا ہاتھ آتا، انعام کفار

جدا لیتے اور اپنا کام جدا کرتے۔ حضرات شیعہ ہی اپنی کتابوں کو دیکھ کر فرمائیں کہ میں نے اس قصہ میں کیا جھوٹ ملا دیا ہے۔ سرمو اگر فرق پائیں تو جو چاہیں سو کریں، منصفوں کو تو بے اس کے کہنے نہیں بن پڑتی کہ ایسے وقت کی ہمدمی اور ہمراہی اور اس اہتمام اور انتظام سے ان کا ساتھ لینا ایسی بڑی فضیلت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس شب بستر پر سو رہنا بھی اس کے ہمسنگ نہیں ہوسکتا۔

غدر میں سب نے دیکھا ہوگا کہ تلاشی کے وقت اگر مجرم نہیں ملا تو حکام نے ان لوگوں سے کچھ پرخاش نہیں کی جو اس مقام پر ملے ہاں جس کو رفیق و مددگار مجرم دیکھا، اس کو بھی مجرم ہی سمجھا، ہائے افسوس کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں مقبول نہ ہو۔ فقط اس شرم سے کہ مسلمان کہلاتے ہیں اگر خدا کے کلام کو نہ مانیں گے تو جواب کیا دیں گے۔ اس آیت کو جبراً کرہاً اگر سر دھرتے ہیں تو ہزار طرح کی نامعقول تاویلیں گھڑتے ہیں۔ پر چند مفتریان سیہ باطن تیرہ دروں کی گھڑی گھڑی باتوں کو ایسا دل و جان سے بے حیلہ و حجت قبول کرتے ہیں کہ اگر اس کے قبول کرنے کو کلام اللہ کے قبول کرنے سے موازنہ کریں تو کلام اللہ کا تسلیم کرنا اس کے پاسنگ بھی نہیں ہوتا۔

آیت معیت کی منصفانہ ترجمانی

ہمیں اس میں شک بھی نہیں کہ حضرات شیعہ کے دل میں اس آیت سے اول وہلہ یہی معنی آتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اگر اس وقت رنج تھا تو یہی تھا کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بے بس و بے کس ہیں۔ میں ایک تن تنہا کیا کرسکتا ہوں، مبادا دشمنان دین جو پاس پاس کو پھرتے ہیں اس طرف کو جھانک اٹھیں اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ہلاک کر جائیں اور ہماری حسرتیں اور تمنائیں سب دل کی دل میں رہ جائیں مگر چونکہ کمال درجہ کی بے بسی اور بے سروسامانی کو امداد و اعانت لازم ہے۔ چنانچہ کلام اللہ میں ہے:

حَتّٰی اِذَا اسْتَیْاَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا جَاءَھُمْ نَصْرُنَا

"یعنی جب کہ نا اُمید ہوگئے رسول اور انہیں یہ وہم ہوا کہ یہ وعدے جو درباب نصرت اور مددگاری کے ہم سے تھے مبادا خیال شیطانی ہوں ہم اپنی غلط فہمی سے اس کو وعدہ خداوندی سمجھتے ہوں۔ آئی ان کو ہماری مدد۔"

اس مایوسی میں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باعتبار ظاہر کے پیش آئی تھی نزول امداد ہوا اور یہ بشارت ہوئی کہ "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" اے ابوبکر! مایوس اور غمگین نہ ہو، تسلی رکھ

ہمارے ساتھ خدا ہے۔ القصہ اس وعدہ صادق نے ظہور فرمایا اور کفار نگونسار کے شر سے ان دونوں بندگانِ خاص کو بچا کر بحفظ تمام مدینہ میں پہنچایا اور پھر دین کو یہ رونق دی کہ اظہر من الشمس ہے، سو دُعا دینی چاہیے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جان کو کہ نہ وہ اتنے غمگین ہوتے نہ اس کا یہ ثمرہ مترتب ہوتا کہاں ان کے صدقہ سے یہ نصرت ہو کہاں ملک ایران وغیرہ قبضہ کفار سے چھوٹیں اور شیعوں کو ٹھکانہ ملے مگر اس نااہلی کو دیکھئے کہ شکرانہ کے بدلے ان کے ساتھ وہ کرتے ہیں کہ کوئی اپنے محسن کے ساتھ نہ کرے۔ مرا بخیر تو اُمید نیست بذ مرسان

آیت معیت میں شیعوں کی ایک اور مضحکہ خیز تاویل اور اس کا بطلان

اس مقام میں بعضے متعصب لاچار ہو کر بہت پیچ وتاب کھا کر شاید کہیں تو یہ کہیں کہ واقعی اس زمانہ تک تو ابوبکر صدیق ایسے ہی تھے جیسے خدا کے کلام سے سمجھا جاتا ہے مگر وہ بات پھر نہ رہی ہوگی۔ یہ شبہ اس قابل نہیں کہ کوئی اس کے جواب کی طرف متوجہ ہو بلکہ شیعوں کو لازم ہے کہ اس بات کو منہ پر نہ لائیں۔ مبادا کوئی ہندو انگریز سن کر یوں بکنے لگے کہ ایسے خدا ہی کو سلام ہے جسے چار دن کے بعد کی خبر نہ ہو اور اگر بفرض محال حسب گفتار شیعہ نقل کفر کفر نہ باشد خدا کو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان اطواروں کی جو ان سے بعد میں ظہور میں آئے، خبر نہیں بھی تھی اور بھولے چوکے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی تب لازم تھا کہ اپنی اس بات کی پچ کرتا اور جوں توں ابوبکر صدیق کو راہ راست پر لاتا، خدا تھا کچھ ناخدا تو نہ تھا کہ باد مخالف میں لاچار ہو کر بیٹھ رہے، بندوں کو تو اپنی بات کی پچ ہوتی ہے خدا تو خدا، ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں تو یوں کہا کہ ہم اس کے ساتھ ہیں اور ادھر یوں سنا دیا کہ "لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ یا مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ " دونوں آیتوں کا یہی مطلب ہے کہ خدا کی بات بدلی نہیں جاتی اور پھر اس پر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیا یہاں تک کہ شیطان نے اسے آدبایا، یا یوں کہئے (نعوذ باللہ) خدا ساتھ تو تھا پر خدا سے شیطان کے مقابلہ میں کچھ نہ ہو سکا۔ "تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ علوًا كَبِيرًا"، بجز شیعوں کے اور کسے یہ دلبری ہے کہ ایسی بات منہ پر لا سکے۔

آیت معیت کے الفاظ بھی شیعوں کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں

یہ نہیں سمجھتے کہ اوّل تو "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" یہ ایسا جملہ ہے کہ عربی کے محاورہ کے موافق اس میں سے ہمیشگی کی بُو آتی ہے جو لوگ عربی جانتے ہیں اور فن بلاغت کے قواعد سے واقف ہیں وہ

خوب جانتے ہیں بلکہ اتنی بات تو یقین یوں ہے مولوی عمار علی صاحب بھی جانتے ہوں۔ دوسرے ہم نے مانا اس جملہ سے کچھ ہمیشگی نہیں نکلتی پر اتنی بات تو شیعوں کو بھی تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ اس وقت خاص میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس خدا کی ہمراہی اور ہمدمی میں شریک تھے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خدا کبھی علیحدہ ہو گئے ہوں اور ان کی ہمراہی اور طرف داری چھوڑ دی ہو۔ سو "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ تو دائمی نکلا۔ اس صورت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حصہ بھی دائمی ہوگا کیونکہ دونوں کے حصے رلے ملے ہوئے ہیں بٹے ہوئے نہیں۔ ایک مع کا لفظ دونوں کے واسطے ہے، دو لفظ جدا جدا نہیں یعنی "مَعِیَ و مَعَکَ" نہیں فرمایا، تیسرے ہم اس سے بھی درگزرے۔ ہم یوں کہتے ہیں کہ شیطان کا مقولہ سورۂ ص میں یوں منقول ہے:

"فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ"

"یعنی شیطان قسم کھا کر کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھے قسم ہے تیری عزت کی میں سب ہی بنی آدم کو بہکاؤں گا مگر جو تیرے چھٹے ہوئے بندے ہیں تو نے انہیں اپنے لیے چھانٹ لیا ہے۔"

کیونکہ وہ میرے دست قدرت سے باہر ہیں وہ تیری پناہ میں آ گئے ہیں۔ سو چونکہ تو ان کے ساتھ ہے اور وہ تیری پناہ میں ہیں وہاں میرا کچھ قابو نہیں چل سکتا اور سورۂ حجر میں "اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ" کے بعد بطور تصدیق کے شیطان کے مقولہ کے جواب میں خداوند کریم کی طرف سے یوں ارشاد ہے "اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَان" یعنی شیطان کو کہا جاتا ہے کہ تو اس بات میں سچا ہے جو میری پناہ میں آ گئے ہیں ان پر تیرا بس نہیں چل سکتا۔ اب بعد اس کے غور فرمائیے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پناہ خداوندی میں آ جانا تو اس آیت ہی سے ثابت ہے یعنی "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" سے صاف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک دفعہ تو صدیق اکبر پناہ خداوندی میں آ گئے اور خدا کے دربار میں اور سرحد میں گویا داخل ہو گئے، پھر بعد اس کے جو وہاں سے نکلے تو شیطان کے نکالے تو نکل ہی نہیں سکتے اور کس نے نکالا اور اگر یوں کہئے کہ خدا ہی نے اپنی پناہ سے نکال دیا تو یہ خیال خود غلط ہے کیونکہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یغیر ما بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ

"یعنی اللہ تعالیٰ اپنی راہ ورسم کو کسی قوم کے ساتھ جب تک نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ اپنے طور و انداز کو نہ بدل دیں۔"

معیت حق صدیق کی ذات کے ساتھ تھی

اور خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے اغواء شیطانی اور بے استدراج خداوندی اپنی روش بدل لیں، یہ محالات میں سے ہے اس واسطے کہ یہ بدیہات میں سے بلکہ اظہر من الشمس ہے کہ ہر قسم کے کام کے لیے ایک استعداد ہے۔ داد و دہش کے لیے سخاوت چاہیے، مارنے مرنے کے لیے شجاعت چاہیے، سو ایسے ہی برے کام اور گناہ کی باتوں کے لیے بھی ایک استعداد اور قابلیت چاہیے۔ سو وہ قابلیت اگر تھی تو خدا نے چھانٹا ہی تھا کس خوبی پر؟ (نعوذ باللہ) خود کلام ربانی ہی میں یہ موجود ہے:

"اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ط"

"یعنی بری چیزیں بروں کے لیے اور برے بری چیزوں کے لیے اور اچھی چیزیں اچھوں کے لیے اور اچھے اچھی چیزوں کے لیے۔"

بلکہ اس موقع میں جو یوں ارشاد ہوا "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ ان سے جدا نہ ہوگا۔ سو وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ" یعنی اللہ مؤمنوں کے ساتھ ہے بعد لفظ "لَا تَحْزَنْ" کے فرماتے تو یوں بھی گمان ہوتا کہ اللہ کی ہمراہی ایمان کے ساتھ مشروط تھی۔ جب ایمان گیا ہمراہی بھی ساتھ گئی اور درصورتیکہ بے کسی شرط کے ہمراہی ہو تو وہ دائمی ہوگی اس میں زوال کا احتمال نہیں، قرابت کی وجہ سے جو ارتباط ہوتا ہے وہ قابل زوال نہیں ہوتا اور آپس کی دوستی میں جو بوجہ اخلاق اور احسانات وہمدردی کے ہوئے ہیں وہ جب ہی تک رہتے ہیں کہ اخلاق اور احسان باقی رہیں۔ اسی واسطے دوستی ٹوٹ جاتی ہے رشتہ نسبی نہیں ٹوٹتا۔ القصہ نسب کے حقوق جان کے ساتھ ہوتے ہیں اور دوستی کے حقوق احسان کے ساتھ۔ سو چونکہ "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" فرمایا ہے اور "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ" وغیرہ جو کسی وصف پر دلالت کرے نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ ابوبکر کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی ہمراہی جان کے ساتھ ہے کسی وصف کے ساتھ نہیں، پھر اگر خدا کی ہمراہی بدل جائے تو موافق آیت مذکورہ بالا "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ الآية" کے کسی وصف میں تغیر آنا ضرور ہے اور جب اوصاف کے تغیر اور تبدل پر معیت اور ہمراہی میں بھی تغیر آیا تو معلوم ہوا کہ وہ معیت اور ہمراہی ان اوصاف ہی کے سبب تھی بے وجہ نہ تھی اس صورت میں لازم آوے گا کہ خدا سے بڑی چوک ہوئی کہ اُس وصف کا نام نہ لیا یا خداوند کریم بھول گیا اور "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ" کی جگہ مثلاً "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" فرمادیا۔ (نعوذ باللہ من سوء الفہم) خداوند کریم اور چوک جائے یا بھول جائے خدا کی تو یہ شان ہے جیسے کلام اللہ میں آیا ہے "لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى" یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرا رب نہ چوکے نہ بھولے۔

آیت میں معنا کا لفظ حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رُتبہ کا آئینہ دار ہے

انصاف اگر ہو تو اس لفظ "مَعَنَا" سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رُتبہ کچھ لگ بھگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رُتبہ کے ہے جو ایک قسم کی معیت ان دونوں کے واسطے خداوند کریم نے بیان فرمائی۔ سو یہ بات بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ صدیق اکبر ان کو کہا جائے اور تمام اُمت محمدی اور سوائے اس کے اور اُمت ہائے ماضیہ سے ان کو افضل سمجھا جائے۔ جب کہیں ان کے رُتبہ اور مقام کی سرحد اعلیٰ مقام نبوت کی سرحد اسفل سے متصل ہو اور یہ لیاقت بہم پہنچے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بات میں شریک ہوں۔ سو یہ بات شیعہ سنی سب جانتے ہیں کہ ایسا مقام جو مقام نبوت سے متصل ہو، بجز صدیقیت اور کوئی نہیں کیونکہ کلام اللہ میں بعد انبیاء کے صدیقین ہی کو ذکر کرتے ہیں۔ سو اس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کی اُمت کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رُتبہ اس نبی کے رُتبے سے متصل ہی نیچے ہوتا ہے۔ سو چونکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تو اور نبیوں کی نبوت سے بالاتر ہے تو اس اُمت کے صدیق اکبر کا رُتبہ اپنی اُمت کے صدیقوں کے مرتبہ سے تو بڑھ کر ہی ہے اور اُمتوں کے صدیقوں کے مرتبہ سے بھی بالاتر ہوگا۔ اب بس کیجئے کہ منصفوں کے لیے یہ بھی بہت ہے اور متعصبوں کو خداوند کریم اگر سمجھائے تو شاید مانیں، ہم جیسوں کی کاہے کو مانیں گے مگر ہمیں بطور نصیحت اِس قدر کہنا لازم ہے کہ خداوند کریم جس کے ساتھ ہوتا ہے اس کے دشمنوں کی خیر نہیں ہوتی۔

شیعوں کی ایک اور راہ گریز اور اس کی روک تھام

اس کے بعد کوئی کہے گا تو یہی کہے گا "لا تحزن انّ اللّٰہ مَعَنَا" حقیقت میں خدا کا مقولہ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقولہ ہے خداوند کریم فقط ناقل اور راوی ہے کچھ اپنی طرف سے نہیں فرماتے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس وقت صادر ہوا اسے بعینہ نقل کر دیا۔ جیسے فرعون کا "اَنَا رَبّکم الاعلیٰ" کہنا یعنی میں تمہارا بڑا رب ہوں، یا ابلیس کا "اَنَا خَیْرٌ مِنْهُ" کہنا یعنی میں آدم سے بہتر ہوں، بعینہ نقل کر دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر چند رسول ہیں لیکن پھر بھی انسان ہیں اور یہ مثل مشہور ہے "الانسان مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَاءِ وَالنِسْیَانِ" سو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ غلطی ہوگئی ہو تو کیا بعید ہے جواب اس کا یہ ہے کہ واقعی شیعوں کے لیے یہ بات بڑی مایۂ افتخار ہے لازم تو یوں ہے کہ عید بابا شجاع سے اس کی

خوشی کم نہ ہو، اگر چہ کسی سنی ہی کی بتلائی سہی، مطلب کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنالیا کرتے ہیں۔ سنی تو ان کے قدیمی اُستاد ہیں اور اُستاد بھی کون سے جن سے کلام اللہ سیکھا جس کا رُتبہ حقیقی باپ سے بھی بڑھ کر یہ بات بھی اگر ان سے سیکھ لی تو کیا مضا ئقہ ہے مگر اتنا کہنا میرا بھی ماننا چاہیے کہ سورہ نجم کو ساری کی ساری نہیں تو اتنے ہی کلمہ کو ساقط کر دو۔

"وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰیٓ ان ھُوَاِلاَّ وَحْیٌ یُّوْحٰی"...... "یعنی ہمارا پیغمبر جو کچھ ہمارے حوالے سے کہے ہے وہ کچھ اپنے جی سے نہیں تراش لیتا بلکہ وہ نری وحی ہے۔"

اس میں کسی طرح کا رلاؤ نہیں نہ کچھ دخل فصل ہے نہ وہم کا یا عقل کا کچھ دخل ہے۔ خلیفہ ثالث نے امیر المؤمنین علی مرتضیٰ وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے کلمات اور آیات کیا سورتیں کی سورتیں جو خلافت پر دلالت کرتی تھیں، کلام اللہ سے نکال دیں تم اس کی پاداش میں ایک آیت فی الجملہ اثبات فضیلت خلیفہ اوّل میں کارآمد ہے۔ اگر نکال ڈالو تو از قبیل "جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِثْلُھَا" کے ہوگی بلکہ اس سے بھی کم کیونکہ اس آیت کے معنی تو فقط اتنے ہی ہیں کہ بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی ہے سو یہاں برابری کیا۔ آدھوں آدھ کی بھی نسبت نہیں تقریباً گیارہ ہزار آیت کے بدلے میں ایک آیت کو کون برابر کر دے گا اور پھر وہ بھی ایسی کہ اس کے جاتے رہنے سے کوئی حق تلفی نہیں ہوتا۔ خلیفہ ثالث نے تو یہ کمال کیا کہ اتنی آیتیں بھی نکال دیں اور آیتوں کو نکال کر عوام کی آنکھوں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق بھی نہ رکھا۔ خیر یہ بات تو دور جا پڑی۔ حاصل یہ ہے کہ آیت "وَمَا یَنْطِقُ الخ" صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا خدا ہی کا کہا ہے خاص کر ایسی بات کہ جو منجملہ اخبار غیب ہے کیونکہ خدا کی معیت تو کچھ آنکھوں سے نظر نہیں آتی بلکہ اخبار غیب میں سے بھی اوّل قسم، اس لیے آیت "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" ہمسنگ آیات تشابہات ہے ان میں عقل کو کسی طرح دخل نہیں ہوسکتا جو کوئی یونہی کہے کہ عقل کے وسیلے سے بہت سے وقائع آئندہ کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ خسوف کسوف اکثر واقفان علم ہیئت کو معلوم ہو جاتے ہیں سو اگر ایک واقعہ بالفعل کی کچھ اطلاع عقل کے وسیلے سے ہوگئی ہو تو کیا عجب، ہاں اگر کوئی حکم علت حرمت کا ہوتا تو البتہ اس میں اجتہاد کی گنجائش تھی، احتمال ہوسکتا تھا کہ جیسے پچھلے اماموں نے اجتہاد کیے ہیں اگر کسی بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا ہو تو کیا عجب، چنانچہ سنی اجتہاد نبی کے قائل ہیں۔ مضمون "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" میں کوئی احتمال بجز اس کے نہیں کہ جو کچھ آپ کی زبان پر جاری ہوا وہ سب القائے ربانی تھا کوئی احتمال مفید مطلب شیعہ اس آیت کے

پاس کو بھی نہیں پھٹکتا، چسپیدگی تو چیز دیگر، حق یہی ہے کہ اگر ابوبکر حسب اعتقاد شیعہ مقبولان بارگاہ الٰہی میں سے نہ ہوتے اور انجام ان کا ارتداد اور کفر پر ہوتا تو اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تسلی ہی نہ فرماتے، کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر جھوٹ بولتے۔

تقیہ کا عذر لنگ

اور تقیہ کو کوئی کہے تو اوّل تو تقیہ وہاں ہوتا ہے جہاں اندیشہ کسی قسم کا ہو۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ پہلوان نہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ کمزور نہ تھے ان میں تو ایک پہلوان کیا بہت سے پہلوانوں کا زور تھا، تنہائی میں ابوبکر کے مار ڈالنے کا بہت عمدہ موقع ہاتھ آ گیا تھا، وہاں کون پوچھتا تھا مار کر کہیں چل دیتے، دوسرے تقیہ کرنا تھا تو تلطف اور اخلاق زبانی کفایت کرتے تھے۔ سو وہ کچھ تسلی اور تشفی ہی کے الفاظ میں منحصر نہیں، ہم جیسے جنہیں گفتگو کا سلیقہ نہیں بہت سے تلطف کے الفاظ تراش سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو افصح العرب والعجم تھے اور اگر تسلی ہی کے الفاظ کی ضرورت تھی تو اور بہت سی صورتیں تھیں، اس جھوٹ کی کیا ضرورت تھی اور (نعوذ باللہ منہا) ہم سے تو نہیں کہا جاتا، اگر شیعوں کے کہے موافق جھوٹ ہی بولنا تھا تو کچھ توریہ کر لیا تھا، اگر ''ان اللہ معنا'' کی جگہ ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ'' فرما دیتے تو تسلی کی تسلی ہو جاتی، بات کی بات بن جاتی ان کی تسلی ہو جاتی، آپ جھوٹ سے بچ جاتے۔ ابوبکر (نعوذ باللہ) اگر منافق تھے تو یوں سمجھ جاتے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤمن اور اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور اگر مؤمن تھے اور پھر مرتد ہو گئے تو ایسے کلام میں سچے رہتے خدا کی طرف بھول چوک کا احتمال نہ ہوتا کیونکہ جب تک وہ مؤمن رہے جب تک اللہ تعالیٰ بھی ان کے ساتھ رہے۔ جب ان کے دل سے ایمان نکل گیا، خدا نے بھی ان کی ہمراہی چھوڑ دی۔

لصاحبہ سے متعلق لطیف ودقیق تشریح اور صحابی وصاحب کا مفہوم

اس تقریر کے بعد ایک تنبیہ پر خاتمہ کرتا ہوں۔ اتنا یاد رہے کہ شاید بعضے عقل کے دشمنوں کو یہاں یہ خلجان پیش آئے کہ کلام اللہ میں یوں ارشاد ہے: ''وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ'' ...... ''یعنی نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس کی زبان وہی تھی جو اس کی قوم کی زبان تھی۔''

سو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی موافق اس قاعدہ کے عرب کے محاورہ میں گفتگو کرتے ہوں گے اور چونکہ اس بات کی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تفہیم مطالب میں فرق نہ ہوں تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ کلام اللہ بھی عرب کے محاورے میں ہو اور یہ ظاہر ہے کہ صاحب عربی

زبان میں فقط بمعنی ہمراہی ہے۔ اس کو صحابی کے ہم معنی سمجھنا ایک طرح کی ناانصافی ہے کیونکہ صحابی تو اصطلاح شرع میں اس شخص کو کہتے ہیں کہ ایمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھوڑی دیر یا بہت دیر رہا ہو اور بعضے علماء کا یہ مذہب ہے کہ طول صحبت بھی شرط ہے، بہرحال ایمان داخل مفہوم صحابی ہے۔ سو لفظ صاحب اوّل تو اصطلاح میں معروف نہیں بلکہ اصطلاح شرع میں لفظ صحابی مستعمل ہوتا ہے۔ دوسرے "سَلَمْنَا" کہ صاحب بھی مستعمل ہو لیکن کلام اللہ تو عرب کے محاورہ کے موافق اترا ہے اصطلاح کے موافق نہیں اترا، تیسرے ہم نے مانا کلام اللہ سے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صحابی ہونا بھی ثابت ہوا اور اس وجہ سے بدلالت التزامی ان کے ایمان کا بھی پتہ لگا مگر کوئی یہ تو بتلائے کہ اس آیت سے تادم مرگ ان کا ایمان پر قائم رہنا کہاں سے نکلا۔ سو جو شخص ان کے ارتداد کا قائل ہو۔ اس آیت سے اس کا التزام معلوم۔

صاحب بمعنی صحابی نہ ہو تو بھی کچھ قدح نہیں

جواب اسی وہم کا یہ ہے ان کا ایمان اور پھر ایمان پر قائم دائم رہنا تو بایماء کلمات طیبات "اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ" اور "اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ" اوپر مرقوم ہو چکا۔ حاجت تکرار نہیں پھر جب ایمان تو یوں ثابت ہوا اور ہمدمی اور مصاحبت لفظ "صاحبه" سے ثابت ہوگئی تو صحابیت میں کیا کسر باقی رہ گئی جس کا انتظار ہے اس صورت میں اگر صاحب مرادف صحابی بھی نہیں تو نہ ہو۔ مع ہذا لفظ صاحب کا مشہور ہونا اور صحابی کا اصطلاح شرح میں مشہور ہونا تو باعتبار اس زمانہ کے ہے اور اگر اس زمانہ میں بھی یوں ہی تھا تو یہ ایسا قصہ ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام محمد مشہور تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو آپ کی بشارت دی تو احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے بشارت دی۔ چنانچہ سورہ صف میں مذکور ہے القصہ جب دو لفظ مرادف اور ہم معنی ہوا کرتے ہیں گو ایک مشہور ہو مگر گہہ و بے گاہ اس کی جگہ دوسرا لفظ بھی بول دیا کرتے ہیں۔ باقی یہ کہنا کہ کلام اللہ عربی محاورہ میں ہے اس کا کسے انکار ہے پر اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ کلام اللہ میں ہے اس کے وہی معنی مراد ہیں جو عرب کی زبان میں اس کے معنی تھے۔ صلوٰۃ زکوٰۃ، صوم حج یہ جتنے اس قسم کے الفاظ ہیں سب کے سب اپنے معانی اصل سے منقول ہیں اور اصطلاح شرعی مراد ہے سو ایسے ہی لفظ صاحبہ کو سمجھنا چاہیے۔

نقل معنی کی حقیقت صورت

اور قاعدہ کلیہ اس کا یہ ہے کہ جب کوئی رسول آتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ نئے احکام لاتا ہے اور ایک

کارخانہ ہی نیا ہو جاتا ہے اور اکثر ایسے نئے نئے مضمون پیش آتے ہیں کہ اس کو اور اس کے تعلق کو ان کی تفہیم کی اکثر ضرورت پڑتی ہے مگر چونکہ وہ احکام اور وہ مضامین پہلے سے معلوم نہیں ہوتے تو ان کے مقابلہ میں کوئی لفظ موضوع اس زبان میں نہیں ہوا کرتا ناچار آپ وضع کرنا پڑتا ہے لیکن ہر زبان کا دستور ہے کہ جب اس زبان کے مشاقوں کو کسی نئی وضع کی ضرورت ہوتی ہے تو پہلے ہی الفاظ مستعملہ میں سے کسی ایسے لفظ کو مقرر لیتے ہیں کہ اس کے معنی اول سے نئے معنی کو کچھ مناسبت ہو۔ چنانچہ واقفان فن عربیت کو لفظ صوم صلوٰۃ کے دونوں معنوں قدیم اور جدید کے تصور سے یہ عقدہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ سو ایسا ہی لفظ صاحب اور لفظ صحابی کو سمجھئے مگر چونکہ لفظ صاحب کے اصلی معنی کی تفہیم کی بھی اکثر ضرورت پڑتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس اس لفظ کے معنی شرعی کی بھی اہل زبان کو اکثر ضرورت ہوتی ہے تو بایں لحاظ فرق کے لیے صاحب کو اکثر پہلے معنوں میں بولتے ہیں اور صحابی کو اکثر دوسرے معنوں میں مگر بایں ہمہ صاحب دوسرے معنوں میں بھی اطلاق کیا جاتا ہے لیکن اضافت کے وقت چونکہ تو ہم التباس نہیں رہتا تو لفظ صاحب ہی کو اصطلاح شرع میں استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ احادیث پر اور خطب آئمہ پر عبور رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں۔ القصہ اصطلاحات شرع سے کلام اللہ خالی نہیں بلکہ جو لفظ کہ شرع میں کسی معنی کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ کلام اللہ یا حدیث میں پایا جائے گا تو معنی شرعی ہی مراد ہوں گے۔ احتمال معنی اصل کا کرنا محض سفاہت ہوگی، صوم صلوٰۃ زکوٰۃ سے کلام اللہ میں معنی شرعی کے مقابل میں مستعمل ہوا ہے اور اس سے معنی لغوی مراد لینے درایت سے بہت دور ہیں اور مسلمنا کہ لفظ صاحب سے جو صاحبہ میں ہے معنی شرعی مراد نہ ہوں تب عرفی معنی اس لفظ کے وقتیکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف ہو۔ معنی شرعی کے مطابق ہوں گے کیونکہ کفار زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو اہل زبان تھے جب اس لفظ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کرتے تھے اور اس سے کسی کی طرف اشارہ کرنا مدنظر ہوتا تھا تو یہی معنی مراد لیتے تھے کہ فلانا شخص ہمارے ساتھ سے نکل گیا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہولیا اور ان کے زمرہ میں داخل ہو گیا ہمارے دین سے نکل بھاگا، محمدی دین اختیار کر لیا۔

اس مضمون کا ماحصل علماء شیعہ فرمائیں کہ کیا ہوتا ہے۔ پھر جائے حیف ہے کہ کفار تک اس لفظ سے وقت اضافت یہی معنی سمجھتے ہوں حالانکہ ان کی اصطلاح نہیں، نہ سمجھیں تو حضرات شیعہ نہ سمجھیں مگر ہم جانیں بزعم خود اچھا کرتے ہیں۔ کفار سے مطابقت اور موافقت تو آخر ممنوعات شرعی میں سے ہے اور یہ کیا ابھی تو شروع ہے رفتہ رفتہ کفار سے یہ خلاف پیدا کریں گے کہ

برخلاف ان کے صوم وصلوٰۃ وغیرہ الفاظ سے بلکہ سارے کلام اللہ سے حتی المقدور کچھ اور ہی معنی سمجھا کریں گے اور ہم اس سے بھی درگزر صاحب کے لغوی ہی معنی ہیں اور کسی طرح معنی شرعی کے مراد لینے کی گنجائش نہیں۔ تب لفظ "لَا تَحْزَنْ" اور "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" کو کہاں کھودیں گے۔ صاحب کے لفظ سے نہیں ان دونوں سے ایمان ثابت ہوگیا۔ چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا، بہرحال ان کا صحابی ہونا بطور اصطلاح شرع کے اس آیت سے ثابت ہوگیا۔

لفظ صاحبہ میں بہ نسبت لفظ صحابی زیادہ فضیلت ہے

بلکہ ہمارے نزدیک اس صورت میں اور دُگنی فضیلت ہو جائے گی۔ لفظ صاحب سے اصطلاح شرعی مراد ہوتی تو وہ بات ہرگز نہ ہوتی۔ شرح اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب کے لفظ سے جو ہمراہی مراد ہوگی تو اسی ہمراہی کی طرف اشارہ ہوگا جو "اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ" سے ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ لفظ "اذ" جو "اذ یقولُ" میں ہے وہ پہلے "اِذْ" کا جو "اِذْھُمَا" میں ہے بدل ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ ہماری نصرت اس وقت ہوئی جب وہ دونوں غار میں تھے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہمراہی سے یوں کہہ رہے تھے اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے وقت کی ہمراہی اسی کا کام ہے کہ اس سے زیادہ کوئی مخلص نہ ہو اور سچ بھی تو ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانبازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں خاص کر اس وقت دُشوار کی ہمراہی اور رفاقت ایسی نہیں کہ اس کا انکار کیا جائے۔ اگر خداوند کریم اس کی طرف اشارہ نہ فرماتے تب کچھ حاجت نہ تھی۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ رفاقت اور ان کا اخلاص ایسا شہرۂ آفاق ہوا ہے کہ ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ شیعہ زبان سے انکار کریں تو کیا ہوا، دل میں ان کے بھی یہی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر دُنیا میں کوئی کسی کا رفیق نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے رفیقوں میں کچھ ان کا رُتبہ بڑھ کر نہیں دیکھتے، نہیں بلکہ جس کی رفاقت اور اخلاص نہایت کو پہنچ جاتے ہیں تو عرف میں اسے شیعہ سنی ہندو مسلمان سب یارِ غار کہتے ہیں رفاقت میں ایسا رُتبہ کے ضرب المثل اور مشبہ بہ ہو جائے بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ اوروں کی رفاقت کو ان کی رفاقت کے ساتھ ایسی نسبت ہو جیسے نور چہرہ کو نور قمر یا نور خورشید کے ساتھ نسبت ہے کون نہیں جانتا کہ کجا آفتاب کجا آدمی کا چہرہ۔ آدمی کیسا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو آفتاب کے نور سے لاکھوں درجہ کم اِس کا نور رہتا ہے۔ اس کے شرف کے لیے یہی بہت ہے کہ اس کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ ایسا ہی اوروں کی رفاقت اور دوستی کو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت اور دوستی سے بدارج کم سمجھنا چاہیے، ان کو یہی

شرف بہت ہے کہ ان کے ساتھ اوروں کو تشبیہ دیتے ہیں اور جس کی رفاقت اور دوستی کی تعریف کرتے ہیں تو اس کو یارِ غار کہتے ہیں۔ القصہ اس تقدیر پر وہ صحابہ میں بھی فرد اکمل ہوں گے اور کیوں نہ ہوں۔ زبان خلق نقارۂ خدا، ان کا یارِ غار ہونا اور صدیق ہونا سب عام وخاص پر روشن ہے دوست ودشمن سب ان کو اِسی لقب سے پکارتے ہیں اب یہاں بس کیجئے۔

شیعوں کی طرف سے خلافت صدیقی پر نکتہ چینی

مگر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر افضل بھی ہوئے تو کیا ہوا، خلافت تو بظاہر علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کا حق تھا کیونکہ وہ چچا کے بیٹے اور داماد تھے اور مشہور ہے کہ داماد بمنزلہ فرزند ہوتا ہے تو اس صورت میں خلافت بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اگر پہنچتی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچتی، ابو بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کون ہوتے تھے جو خلافت دبا بیٹھے اور اس سے بھی قطع نظر کیجئے، اپنے بعد ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ کر دینا تھا وہ بھی نہ ہوا۔ وصیت کی تو خلیفہ ثانی کے لیے کی۔

جواب: سو اس تو ہم کا جواب اوّل تو یہی ہے کہ خلافت کو سلطنت پر قیاس کیجئے تو البتہ یہی تو ہم پیدا ہوتا ہے لیکن اہل فہم پر پوشیدہ نہ ہوگا کہ خلافت نبوت ارکان دین میں سے بھی رُکن عظیم اور سلطنت دُنیا کے اُمور میں سے بھی نہایت درجہ کو قبیح، پھر جب حقیقت دُنیا اور دین ہی میں اتنا تفاوت ہو کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا تو اس کے اعلیٰ درجہ اور اس کے اعلیٰ درجہ میں کچھ لگاؤ ہی نہ ہوگا جو ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جائے۔ ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ہاں خلفائے انبیاء کو اگر خلفاء علماء اور خلفاء فقراء پر قیاس کیا جائے تو البتہ قیاس کا موقع بھی ہے، علم وفقر بھی اُمور دینی میں سے ہیں مگر یہ بھی سب جانتے ہیں کہ خلافت علم اور خلافت فقر میں یگانگت اور قرابت کی وجہ سے ترجیح نہیں ہوتی، فضیلت اور کمالات کے باعث ترجیح ہوتی ہے۔ چنانچہ لفظ خلافت ہی خود اس بات پر دلالت کرتا ہے اس لیے خلافت بمعنی نیابت ہے اور نیابت کا استحقاق اس کے لیے ہوتا ہے جو کہ منیب کا کام دے سکے اور اگر چند آدمی موصوف بایں صفت ہوں تو وہ ان میں مقدم ہوگا جس میں کمالات اور فضائل منیب اوروں سے زیادہ تر ہوں گے۔ بموجب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت مابعد انبیاء کے سب پر ثابت ہوگئی تو پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق کے ہونے کے کیا معنی، ہاں یہ مسلم کہ خلافت کی لیاقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی رکھتے تھے لیکن افضل پھر افضل ہے، باقی رہا دبا بیٹھنا، ہم پوچھتے

ہیں کہ جب سب میں زیادہ استحقاق خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی میں ہوا تو خلافت کو اگر دبا ہی لیا تو کیا بیجا کیا؟ اپنا حق تھا دوسروں کا حق چھینتے تو جائے گرفت بھی تھی۔

مع ہذا واقفان فن سیر جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ ہونے کے قصے کی خبر ہے خود جانتے ہیں کہ انہوں نے خلافت خود دبائی تھی یا بجبر واکراہ ان کے سر دھرنی پڑی۔ باقی رہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خلیفہ کر دینا اس کا جواب بھی یہی ہے کہ خلافت میں قرابت کو مداخلت نہیں ورنہ حضرت فاطمہ زہرا اور حسنین رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مقدم تھے۔ رہا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا عورت ہونا اور علی ہذا القیاس حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا لڑکا ہونا موافق آئین سلطنت کچھ مانع جانشینی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھا، سلطنت میں بوقت ضرورت اکثر عورتوں اور لڑکوں کو قائم مقام کر دیتے ہیں گو اور ہی کوئی نگراں حال رہے۔ القصہ اگر حال نبوت مثل حال سلطنت دُنیا ہے اور قرابت باعث ترجیح ہے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر بھی مستحق نہ تھے نہ وقت وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا حق تھا نہ اپنی خلافت کے وقت اس وقت حق تھا تو حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا تھا اور اگر حال نبوت مثل حال سلطنت نہیں اور قرابت کو اس میں کچھ دخل نہیں بلکہ افضلیت باعث تقدیم ہونی چاہیے تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کر دیا تو کیا بیجا کیا۔ کسی اپنے کو کر دیتے یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے نزدیک اوروں سے افضل نہ ہوتے تو البتہ جائے اعتراض تھی۔

باب وعدہ خلافت واستخلاف

مع ہذا کلام اللہ سے بھی یہی نکلتا ہے کہ جو کچھ ہوا بجا ہوا اور یہی عین صواب تھا۔ اگر یقین نہ ہو تو آیت چہارم موجود ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ م بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا. يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا. وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

”یعنی وعدہ کیا ہے اللہ نے بعضے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور اچھے اچھے عمل کیے اس بات کا کہ ان کو زمین کا خلیفہ اور بادشاہ بنا دے گا، جیسا ان سے پہلوں کو اور ان کے لیے اس دین کو جو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے چھانٹ رکھا ہے اور پسند کر رکھا ہے خوب جما دے گا اور ان کو بعد اس کے کہ اندیشہ اور خوف رہا کرتا تھا، امن دے گا کہ وہ پھر میری ہی عبادت کیا کریں

گے اور کسی کو ذرہ برابر عبادت میں میرا شریک نہ کریں گے اور جو لوگ بعد اس نعمت کے کفران نعمت کریں اور ناشکری کریں وہی ہیں اصلی فاسق طاعت سے نکلے ہوئے۔"

اس آیت کا حاصل یہ ہوا جو کلام اللہ کو سمجھتے ہیں وہ تو سمجھتے ہی ہیں اور جو نہیں سمجھتے وہ ترجموں سے مطابق کر دیکھیں، آج کل سینکڑوں ترجمہ کے کلام اللہ ملتے ہیں کچھ کمی نہیں۔

آیہ تمکین معتقدات شیعہ سے کسی طرح مطابق نہیں

اب میری سنئے یہ وعدہ ہر کسی سے نہیں ہوا، اس زمانہ کے مؤمنوں سے ہوا ہے یعنی صحابہ سے ہوا ہے کیونکہ "اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا" کے بعد "مِنكُمْ" بھی بڑھایا ہے۔ اس کا حاصل یہی ہوا کہ یہ وعدہ انہیں سے ہے کہ جو تمہارے زمانے میں مؤمن ہیں، پچھلوں کو اس لفظ کے ذکر کرنے سے اس وعدہ سے علیحدہ کر دیا ہے تو اب حضرت امام مہدی کا تسلط روئے زمین پر اس وعدہ سے علیحدہ ہے اور پھر اس پر یہ وعدہ بھی اس زمانہ کے تمام مؤمنوں سے نہیں ہوا بلکہ بعضے سے چنانچہ لفظ "من" جو "مِنكُمْ" میں ہے اس کا ماحصل یہی ہے بلکہ جب لفظ من ضمیر کے اوپر داخل ہوگا، اس کا یہی مطلب ہوگا یا ابتداء کے معنی ہوں گے جو اس جگہ ابتداء کے معنی کسی کے نزدیک بن ہی نہیں سکتے تو بیشک بعض ہی کے معنی ہوں گے کیونکہ بیان کے لیے تو فصحاء کے کلام میں ضمیر پر آتا ہی نہیں اور اگر بالفرض بفرض محال یوں ہی کہیں کہ من یہاں بیان کے لیے ہے اور اس کا ہم ہرگز خیال نہ کریں کہ کلام اللہ خدا کا کلام ہے اور وہ بھی معجز نظام کسی ایسے گنوار ہندوستانی کا نہیں کہ ہدایت النحو وغیرہ رسالے عربی زبان کے پڑھ کر عربی کی ٹانگ توڑنے لگے تب بھی شیعوں کی مشکل ہی رہے گی۔ اس صورت میں تمام صحابہ مراد ہوں گے۔

حتیٰ کہ خلفاء ثلاثہ بھی اس لیے کہ جب تک تو وہ بھی مسلمان ہی تھے مرتد نہ ہوئے تھے اور اگر وہ منافقین میں سے تھے اور کبھی مسلمان ہوئے ہی نہ تھے تب بھی وہ تو داخل ہی رہیں گے جو ان کے عقیدہ کے موافق بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتد ہوئے ہیں اور جو آیات مرتدین کے بیان میں آئی ہیں شیعوں کے نزدیک ان کے حق میں وارد ہوئی ہیں۔ اس صورت میں اوّل تو یہ لازم آئے گا کہ جو جو مرتد ہو گئے ان سے اِس بات کا وعدہ تھا کہ ان کے لیے دین پسندیدہ کو جما دیں گے، وعدہ کر کے خدا نے خلاف وعدہ کیا کیونکہ اگر خدا دین کو جما دیتا تو پھر نفس اور شیطان سے کہیں اکھڑ سکتا جو وہ مرتد ہو گئے۔ مع ہذا ان کے حال میں یوں بھی بیان فرماتے ہیں کہ جب ان سے یہ وعدہ پورا ہوگا، اس وقت وہ میری ہی عبادت کریں گے یہاں تک کہ ذرہ برابر کسی کو میری طاعت میں شریک نہ کریں گے یا یوں کہیئے کہ یہ بھی ایک وعدہ ہے اخبار نہیں۔ بہرحال اس صورت میں لازم آئے گا کہ تا دم باز

پسین وہ اسی حال پر تھے جس کے انعام میں یہ وعدہ ہوا تھا یعنی ایمان اور عمل صالح۔ چنانچہ اہل فہم "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" سے یہی معنی سمجھتے ہیں کہ باعث اس وعدہ کا ایمان اور عمل صالح ہیں۔ پھر نہ معلوم کہ باوجود ان سب باتوں کے وہ کیونکر مرتد ہو گئے دو حال سے خالی نہیں یا یوں کہو کہ خدا نے خلاف وعدہ کیا یا خدا سے آئندہ کی خبر میں غلطی ہوئی۔

جن سے وعدہ تھا ان کو تمکین ہی حاصل نہ ہو سکی لہٰذا وعدہ پھر بھی غلط نکلا

اور یہ سب نہ سہی "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ" سے وہ چار پانچ صاحب ہی مراد ہیں جو بزعم شیعہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان رہے اور مثل دیگر صحابہ مرتد نہ ہوئے اس صورت میں "مِنْ" اگر "مِنْكُمْ" میں بیان کے لیے ہوگا تو بیشک ان سب کے ساتھ اس وعدہ کا پورا ہونا چاہیے کیونکہ وہ سب صاحب اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے مسلمان ہو لیے تھے حالانکہ ان میں سے یہ سب وعدے سوا حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور کسی کے لیے پورے نہیں ہوئے۔ حضرت ابوذر غفاری اور سلمان فارسی اور حضرت بلال بلکہ حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حال تو ظاہر ہی ہے اور حضرت امام ہمام سبط اکبر کا حال یہ ہے کہ چھ مہینہ کے لیے وہ خلیفہ تو ہو گئے پر چاہیے ان کو کسی طرح کی تمکین دین حاصل ہوئی ہو ہرگز ظہور میں نہیں آئی۔ خاص کر شیعوں کے نزدیک کیونکہ امیر معاویہ جو ان کے نزدیک بالاتفاق کفار اور منکرین امامت آئمہ میں سے ہیں تمام خلافت پر غالب اور مستولی تھے اور پھر امن تو ہرگز میسر ہی نہیں آیا نہیں تو خلافت ہی کیوں ان کے حوالہ کرتے اور کیوں ساری عمر تقیہ میں گزارتے اور حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی سنیوں کے نزدیک خلافت اور تمکین کچھ حاصل تھی۔ شیعوں کے نزدیک تو ہرگز حاصل نہیں کیونکہ دین شیعہ اس زمانہ میں بھی مخفی ہی رہا اور حضرت کو تقیہ ہی کیے بنی۔ شیخین کی تعریف ہی کیا کیے یہ کبھی نہ ہوا کہ کھل کھیلیں اور بے کھٹکے ہو کر خلوت جلوت میں برابر یکساں گزاریں۔ چنانچہ اس کی سند آگے ان شاء اللہ تعالیٰ معلوم ہو جائے گی اور علیٰ ہذا القیاس امن موعود یعنی کفار کے شر سے حضرت امیر کو بھی بطور شیعہ حاصل نہیں ہوا وہی امیر معاویہ ہمیشہ تنگ کرتے رہے اور آپ کے ہاتھ سے اکثر ملک نکال لیا۔ بہر حال سب سے اگر وعدہ ہو تو کلام بالکل لغو ہو جائے گا۔

استخلاف بمعنی توطن کسی طرح موزوں نہیں

اور اگر من کے بیانیہ ہونے کے ساتھ استخلاف کو بھی بمعنی توطن لیجیے جیسا کہ بعض علماء شیعہ

نے تاویل کی ہے اور بمعنی تسلط نہ لیجئے تو قطع نظر اس کے کہ من کا ضمیر پر بیانیہ ہونا خلاف استعمال عرب ہے اوّل تو یہ مشکل ہے کہ استخلاف کے ساتھ جب لفظ "فِی الْاَرْضِ" ہوتا ہے تو تسلط ہی کے معنی مراد ہوتے ہیں، دوسرے اس صورت میں قید "وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" محض بے معنی ہو جائے گی، زمین میں توطن تو صالح اور فاسق کو برابر حاصل ہوتا ہے بلکہ فساق کو بوجہ احسن بلکہ آمنوا کی قید بھی بیکار ہی نظر آتی ہے کیونکہ کفار کے توطن میں کیا کمی ہے۔ القصہ ان لغویات سے کلام اللہ کی تغیبر کی جاتی ہے یہ نہیں جانتے کہ لغو کلام کا کلام اللہ میں ہونا منجملہ محالات ہے۔

استخلاف بمعنی تسلط ہے بدلالت فی الارض

اور بعضے علماء شیعہ بہت کوشش کر کے یہ بات نکال کر لائے ہیں کہ "اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحَاتِ" سے حضرت امیر مراد ہیں اور جمع کا صیغہ تعظیم کے لیے ہے یا حضرت امیر اور ان کی اولاد مراد ہیں مگر ہم کہتے ہیں کہ قطع نظر اس بات کے کہ جمع سے واحد مراد لینا بے ضرورت بیجا ہے اور باوجودیکہ جمع کے معنی بن سکیں، واحد کے معنی مراد لینے اہل سخن کے نزدیک بالقطع ممنوع، شیعہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ تمکین دین اور زوال خوف تو کسی کو بھی میسر نہیں آیا اس لیے ضرور ہوا کہ "مِنْکُمْ" کے من کو تبعیضیہ قرار دیجئے اور استخلاف سے تسلط مراد لیجئے مگر چونکہ "اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا" جمع ہے تو کم سے کم تین تو ہونے ضرور ہوئے اور زیادہ ہوں تو فبہا۔

القصہ ابتداء سے اس آیت کے اتنی بات نکلی کہ صحابہ سے خداوند کریم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ تم میں سے کم سے کم ایسے تین شخصوں کو کہ وہ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہوں گے، ضرور ہم خلیفہ بنا کر روئے زمین کو ان کے تسلط میں کر دیں گے اور اس دین کو جو علم الٰہی میں اس سے بہتر کوئی دین نہیں اور خدا نے ازل سے انہیں کے لیے چھانٹ کر رکھا، ان کے واسطے جما دیں گے کہ ان کے جیتے جی اس میں رخنہ نہ پڑے گا اور ان کے خوف و ہراس کو کہ جو کفار سے رکھتے تھے بالکل امن اور اطمینان سے بدل دیں گے، پھر بعد اس کے یا تو وعدہ میں داخل ہے یا فقط بطور اخبار بالغیب کے بیان کرتے ہیں کہ وہ باوجود ان خرخشوں کے جو ایسی خلافتوں کو لازم ہیں ہرگز عبادات میں سستی نہ کریں گے اور پھر وہ عبادت بھی ایسی اخلاص کی ہوگی کہ ہرگز اس میں بوئے شرک اور ملاوٹ ریا کا نہ ہوگا۔

آیت استخلاف کی صحیح تفسیر

اب اس کمترین کی التماس حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ ہے کہ وعدہ الٰہی میں تو تخلف ہو ہی

نہیں سکتا۔ سو جن کے ساتھ اس وعدہ کا ایفا ظہور میں آئے وہی مصداق ان اوصاف مذکورہ کے ہوں گے اور وہ بیشک بشہادت خداوندی ایمان کامل اور اعمال صالح رکھتے ہوں گے بلکہ سب اقران و امثال میں ان دو باتوں میں بڑھے ہوئے ہوں گے کیونکہ جب ایمان اور عمل صالح کے انعام میں یہ نعمتیں ملی ہیں تو انہیں کو ملی ہوں گی جن کا ان دو کمالوں میں نمبر اوّل ہوگا ورنہ (نعوذ باللہ) خدا کے یہاں بھی بڑا اندھیر ہے کہ استحقاق کسی کا ہو اور انعام کسی کو مل جائے۔ سنیوں کے طور پر تو خدا کو اختیار بھی ہے کہ کسی کا حق کسی کو دے دے لیکن اس کی حکمت کی شان یہی ہے کہ جس چیز کو کسی کے لائق دیکھے اسے ہی دے اور یہی معنی ہیں اس کے کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا اور اس آیت کے معنی بھی محققین کے نزدیک یہی ہو سکتے ہیں۔ "اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی" یعنی ہر چیز کو اسی کے مناسب طور پر پیدا کیا، پھر آئندہ مناسب ہی مناسب کاموں کی انہیں سوجھائی لیکن شیعوں کے نزدیک خدا کو اختیار نہیں کہ کسی کا حق کسی کو دے دے، اس لیے کہ ان کے نزدیک خدا پر عدل واجب ہے، اس صورت میں ممکن ہی نہیں کہ جن کو خدا نے خلیفہ بنایا وہ اوروں سے خلافت کے استحقاق میں کم ہوں بلکہ ان کا فائق ہونا استحقاق خلافت میں ضرور پڑا۔

نہ صرف استحقاق خلافت بلکہ ترتیب خلافت کا پتہ بھی اس آیت سے چلا

اور نیز اسی تقریر سے یہ بھی نکل آیا کہ ان میں سے جو ایمان میں اور عمل صالح میں دوسروں سے بڑھ کر ہوگا وہ اس انعام میں مقدم رکھا جائے گا کیونکہ تقسیم انعام کی خوبی یہ ہے کہ اوّل نمبر والے کو اوّل دیں مگر چونکہ یہ انعام خلفائے راشدین پر ہوا اور یہ وعدہ خلفائے اربعہ کے ساتھ بترتیب معلوم وفا میں آیا تو بشہادت خداوندی معلوم ہوا کہ یہ اصحاب اربعہ ایمان اور عمل صالح میں اوروں سے بڑھ کر تھے اور وہ بھی اس قدر کہ ان کے ہوتے قابلیت اس انعام خاص کی ان کے سوا کسی میں نہ تھی اور باہم بترتیب خلافت ایک دوسرے سے ایمان اور عمل صالح میں مقدم تھا۔ اوّل اوّل اور دوئم دوئم اور سوئم سوئم اور چہارم چہارم۔

آیت استخلاف کا مصداق صرف خلفاء اربعہ ہیں

اور بعد اس کے ہر چند حضرت سبط اکبر امام ہمام امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلفاء راشدین میں معدود ہیں مگر ان کو جو خلافت پہنچی تو اس وعدہ کے سبب نہیں پہنچی کیونکہ ان کو قبل نزول اس آیت کے کس دن خوف ہوا تھا وہ زمانہ ان کے لڑکپن کا تھا، دشمنوں سے اندیشہ بڑوں کو ہوتا ہے لڑکوں کو نہیں

ہوتا بلکہ وصول اس نعمت کا ان تلک زائد از قدر وعدہ تھا، اسی لیے ان کی خلافت کے لیے تمکین اور جماؤ لازم نہ ہوا، باقی رہے امیر معاویہ ہر چند ان کو بظاہر تمکین میسر آئی لیکن حقیقت میں وہ تمکین دین نہ تھی تمکین ملک وسلطنت تھی۔ چنانچہ واقفان فن سیر پر پوشیدہ نہیں کہ خلفاء اربعہ کے اطوار اور انداز اور امیر معاویہ کے اطوار اور انداز میں زمین آسمان کا فرق تھا، ان کی گزران فقیرانہ اور زاہدانہ تھی اور امیر معاویہ کا طور ملوک کا سا تھا اس لیے اہل سنت ان کو باوجودیکہ صحابی سمجھتے ہیں خلفاء میں نہیں گنتے، ملوک میں شمار کرتے ہیں لیکن ملوک ملوک میں بھی فرق ہے، ایک نوشیرواں تھا ایک چنگیز خان۔

سو یہ ہر چند ملوک میں سے تھے لیکن اس کے یہ معنی ہیں کہ خلفاء راشدین کے مقابلے میں دُنیا دار معلوم ہوتے تھے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور انبیاء کے مقابلہ میں مالدار معلوم ہوتے ہیں نہ یہ کہ ظلم وستم کے روادار تھے غرباء کے حق میں ستمگار تھے ان کا حلم اور رعایا پروری اور دلجوئی خلائق شہرۂ آفاق ہے۔ مع ہذا یہ ان لوگوں میں سے نہیں کہ جن کو قرار واقعی کفار سے بھی خوف ہوا ہو۔ یہ بات فقط مہاجرین اوّلین کے حق میں صادق آتی ہے نہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات پیش آئی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اور مہاجرین اوّلین میں سے بھی جیسا خوف خلفاء اربعہ کو بترتیب ہوا ہے اور کسی کو پیش نہیں آیا۔ چنانچہ کتب تاریخ سے خوب واضح ہے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ انعام مذکور خاص انہیں کو ملا اور یہ وعدہ انہیں کے ساتھ ظہور میں آیا کیونکہ یہ خوف اصل سے بوجہ ایمان اور عمل صالح تھا، کفار کی دشمنی کی بناء دیکھئے تو انہیں دو باتوں پر تھی پھر جس میں ایمان اور عمل صالح زیادہ ہوگا، دشمنی کفار بھی اسی کے ساتھ زیادہ ہوگی خوف کفار بھی اسی کو زیادہ ہوگا، دوسرے محبت اور اخلاص جو ایمان اور عمل صالح کا خلاصہ ہیں خوف ہی کے وقت معلوم ہوتے ہیں اور خوف ہی سے پرکھے جاتے ہیں تو جس کو اس قسم کا خوف زیادہ ہوگا۔ اسی میں ایمان اور عمل صالح بھی زیادہ ہوگا۔ القصہ خوف کفار مہاجرین اوّلین کو ہوا ہے۔ حضرت امام ہمام امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کفار سے کیا اندیشہ تھا۔ حضرت امام ہمام رضی اللہ عنہ اس زمانہ تک لڑکے تھے امیر معاویہ جب تک مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔

آیت استخلاف کی بنیاد مہاجرین کی قربانیاں ہیں

اس آیت کے مضامین میں غور کیجئے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ باعث اس وعدہ کا فقط یہ ہوا ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصاً مہاجرین اوّلین نے باوجود بے سروسامانی اور ذلت اور خواری کے جو ابتداء اسلام میں تھی ایک جم غفیر اور گروہ اعظم کفار کی مخالفت محض خدا کی رضا

مندی اور دین کی ترویج کے لیے اختیار کر کے اپنی جانیں جلائیں اور ان کو اپنا دشمن بنا کر طرح طرح کی ایذائیں ان کے ہاتھ سے اٹھائیں، سالہا سال خوف و خطر میں گزارے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ نوبت اس کی آئی کہ گھر سے بے گھر ہوئے زن و فرزند سب کو چھوڑ کر جلاوطن ہوئے، پھر اس پر بھی چین نہ ملا نوبت قتل قتال کی پہنچی مدت ہائے دراز تک کفار نگونسار فوج کشی کرتے رہے اور جو چڑھ کر نہیں آئے تو مسلمانوں کے فکر سے تو خالی بھی نہیں رہے۔ اس میں بہت سے مہاجرین میں سے اور نیز ان کی ہمراہی میں بہت سے انصار شہید ہوئے۔ جب خداوند کریم عالم الغیب والشہادت کو ان کا کامل امتحان ہو گیا تو رحمت الٰہی کو ان کی اس جان کاہی اور جان گدازی پر جوش آیا، لازم پڑا کہ ان کی اس جاں نثاری اور جانبازی کی مکافات اس دارِ دُنیا میں بھی کی جائے، اس لیے جس جس قسم کی کلفتیں انہیں پیش آئی تھیں اس کے مقابل کی نعمتیں ان کو ملیں اور اس کے مکافات کی راحتیں ان کو عطا ہوئیں تسلط کفار جو ان کے حق میں باعث تمام آزار اور سبب ہمہ تکلیفات تھا۔ استخلاف سے مبدل ہوا کفار کے تسلط کے باعث جو نماز، روزہ ادا نہیں کر سکتے تھے اور ذکرِ خداوندی سے ممنوع تھے اور اس سبب سے حسرت ہائے گونا گوں دل میں رکھتے تھے بلکہ باعث جلاوطنی کا بھی حقیقت میں یہی تھا اس کے عوض میں تمکین دین ملی اور خوف کے عوض میں امن عطا ہوا۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر چند شرف گونا گوں رکھتے ہیں لیکن فقط اس شرف کو استحقاق خلافت میں دخل نہیں۔ یہ اس جان کاہی اور جاں گدازی کا ثمرہ ہے جس کا مذکور ہوا۔

آیت مذکورہ سے مشیت خلافت قریش کا راز بھی کھل گیا

اور خلافت کے مخصوص ہونے کی وجہ بھی بنسبت قریش کے معلوم ہو گئی۔ یعنی یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ خلافت حق قریش ہے، انصار کو اس میں کچھ دخل نہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ خلافت حقیقت میں انعام اور مکافات میں مہاجرین کی جانفشانیوں کے ملی ہے چونکہ مہاجرین قریش میں سے ہیں اس لیے انہیں میں منحصر رہنی چاہیے ہاں جو کہ انصار اور اعوان خلفاء ہوا کرتے ہیں جیسے قاضی وغیرہ وہ البتہ نصرت کے صلہ میں انصار میں سے ہونے چاہئیں اور یہ بھی مکرر روشن ہو گیا کہ حضرت امام حسن اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کو جو خلافت ملی ہے تو وہ خلافت نہیں جو وعدہ کے سبب ملی ہے اور نیز یہ بھی اہل فہم و انصاف پر صاف روشن ہو گیا کہ ان کے زمانے میں ان کے ہاتھوں سے جو کچھ دین کے مقدمہ میں ظہور میں آیا اور اس نے رواج پایا جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک کا نہ دینا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا متعہ کا منع کرنا

اور تراویح کی تاکید اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جمعہ میں ایک اذان کا بڑھا دینا وہ سب من جملہ دین پسندیدہ اور مصداق مضمون ''اِرْتَضٰی لَهُمْ'' ہے علیٰ ہذا القیاس جس مسئلہ پر ان کے زمانہ میں ان کی وجہ سے اجماع اور اتفاق ہو گیا ولا ریب حق وصواب ہے اس سے جو منحرف ہے وہ دین پسندیدۂ خداوندی سے منحرف ہے اور جو اس کا منکر ہے وہ حق کا منکر ہے۔

آیت مرقومہ حضرت فاروق کی نزاہت کی دلیل ہے

اور نیز قطع نظر اس کے کہ جملہ ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ'' حقیت خلافت خلفاء ثلاثہ پر بوجہ احسن دلالت کرتا ہے اور شیعوں کے اس توہم کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایام مرض وفات میں کاغذ، قلم، دوات منگایا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ آنے دیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے فرمان ہی کے لکھنے کو منگایا تھا بیخ و بنیاد سے اکھاڑتا ہے۔ جملہ ''وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ'' سے بھی اہل فہم کے نزدیک یہ توہم زائل ہو گیا کیونکہ خلافت خلفاء ثلاثہ جب خلافت موعودہ ہوئی تو ان کی خلافت کی تمکین بھی منجملہ تمکین دین پسندیدہ ہوگی۔ ہاں اگر خلافت اُمور دینی میں سے نہ ہوتی تو البتہ اس استدلال کی گنجائش نہ تھی۔ سو شیعہ اس کا انکار نہیں کر سکتے ورنہ حضرت امیر اور ان کی اولاد رضوان اللہ علیہم اجمعین کو طالب دُنیا کہنا پڑے گا۔ (نعوذ باللہ منہا) غرض یہ طعن اور نیز اور بہت سے مطاعن جو شیعی اور خارجی بسبب اپنی تیرہ درونی کے حضرات خلفاء راشدین پر کرتے ہیں مندفع ہو گئے۔ اگرچہ یہ طعن اور سوا اس کے اور مطاعن بنظر غور اہل بصیرت کے نزدیک معترضوں کی تیرہ درونی سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ دربارۂ فدک تو اوراق مابعد سے ان شاء اللہ یہ حال واضح ہو جائے گا۔ تفصیل اس اجمال کی بہ نسبت جملہ مطاعن کے اس جا پر اگر بے موقع اور بے جا نہ ہوتی تو بقدر گنجائش وقت درج اوراق کرتا مگر چونکہ کاغذ، دوات، قلم کے نہ آنے دینے کا طعنہ بھی بزعم شیعہ کلاں ترین مطاعن خلفاء راشدین ہے تو بنظر تسکین خاطر بعض بنی نوع اگرچہ اس بحث میں بے موقع ہے مختصر مختصر عرض کرتا ہوں تا کہ اس بڑے طعن کا اندفاع موجب اندفاع دیگر مطاعن صغیرہ ہو جائے۔

فرمان نبوی کی تعمیل نہ ہو سکنے کے اسباب

حضرت من اوّل تو کسی روایت میں یہ نہیں کہ کاغذ، قلم، دوات کے آنے کے مانع اوّل حضرت عمر ہی تھے۔ البتہ جب سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات نے کاغذ، دوات، قلم منگانے کو

فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ حاضرین مجلس کی رائے اس وقت مختلف ہوئی، کسی نے کہا کہ امتثال امر ہی کیجیے، کوئی بولا کہ اس شدت مرض میں یہ تکلیف نہ دیجیے۔ اس ردّ و کد میں ایک شور برپا ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے میں یہ آیا کہ یہ ارشاد مربیانہ اور مشفقانہ ہے بطور ایجاب نہیں جس کی تکمیل واجب ہو کیونکہ خداوند کریم اس سے پہلے فرما چکا ہے۔

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دینکم وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ"...... "یعنی حجۃ الوداع کے دن خداوند کریم کی طرف سے یہ بشارت آئی کہ آج کے دن میں نے اپنے دین کو تمہارے لیے پورا کر دیا اور تمام کام کر دی میں نے تم پر اپنی نعمت۔"

پھر جب خداوند کریم دین کو کامل کر چکا ہو تو اب یہ امر کسی نئے امر دینی کے لکھوانے کے لیے تو نہیں ہے ہو نہ ہو اسی کی تفصیل ہو گی۔ سو یہ بات چنداں ضروری نہیں جو اس امر کی تعمیل واجب ہو بلکہ بوجہ شفقت کاملہ آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ سو جب باوجود شدت مرض کے آپ نے ہمارے لیے یہ تکلیف گوارا فرمائی تو کیا اس کی مکافات یہی ہے کہ ہم بھی آپ کے لیے اس تکلیف کو گوارا کریں بلکہ مقتضیٰ ادب یہی ہے کہ آپ کے فرمانے کا کچھ خیال نہ کیجیے اور اس قصہ کو جانے دیجیے اور سچ بھی تو ہے اگر کسی کا باپ بھوک کی شدت میں آپ تو نہ کھائے اور بیٹے کو بوجہ شفقت اپنے حصے کے کھانے کو فرمائے تو کیا مناسب ہے کہ فرزند عاقل دیدہ دانستہ پدر مہربان کو بھوکا چھوڑ کر سب نکل گئے بلکہ ایسے وقت میں مقتضیٰ ادب یہی ہے کہ والد مہربان کا کہنا نہ مانے اور اس نافرمانی ہی کو اپنی سعادت جانے، غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوجہ مذکور اور نیز بایں غرض کہ کسی طرح یہ شور موقوف ہو جائے "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" کہا۔ یعنی کافی ہے ہم کو قرآن شریف، پھر اس تکلیف کے دینے کی کیا ضرورت؟ اور اگر کسی کتاب نادر الوجود کی کوئی ایسی روایت جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مانع اوّل ہونے پر اس طرح دلالت کرے کہ اس میں گفت و شنید کی گنجائش باقی نہ رہے، کوئی شیعہ پیش بھی کرے تو قطع نظر اس کے کہ وہ روایت واقعی صحیح ہے۔ کوئی جعلسازی نہیں تب بوجہ مذکور کوئی گرفت کی بات نہیں، بہر حال منشاء اس اعتراض کا قلت فہم و فراست اور نقصان عقل و درایت ہے اور انجام کو دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے ٹھیک تھی۔ آخر جب یہ شور ہوا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تمام مجمع کی نسبت یہ ارشاد فرمایا کہ یہاں سے کھڑے ہو جاؤ، اگر کاغذ، دوات، قلم کے منگانے کا ارشاد پیام خداوندی ہوتا اور ضروری اور واجب ہی ہوتا تو مکرر آپ بتاکید فرماتے اور علیٰ ہذا القیاس اگر یہ شور جیسا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمجھا، موجب آزار خاطر حضرت سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتا تو کھڑے ہو جانے کو نہ فرماتے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کا وزن

بلکہ یوں کہئے کہ جیسے اور بہت مواقع میں باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے خدا کی مرضی کے موافق نکلی ہے اور اسی وجہ سے ان مواقع میں ان کی رائے کے موافق وحی آئی اگر وحی نہ آتی تو بوجہ مخالفت رائے نبوی اہل اسلام کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے برا کوئی نہ تھا یہاں بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے خداوند کریم علیم حکیم کی مرضی کے موافق تھی ورنہ جیسے کفار کی تکذیب کے وقت وحی آسمانی شاہد صدق رسول ربانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتی تھی یہاں یہی وحی آتی اور آپ کی رائے کی تصدیق ہو جاتی، ہاں اتنی کمی رہ گئی کہ بعد اس واقعہ کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصدیق کے لیے وحی نازل نہ ہوئی۔ غالباً پندرہ سولہ واقعہ کی تصدیق کو کافی سمجھ کر ایک اس واقعہ میں بغرض تصدیق عمری وحی نازل نہ فرمائی اور نیز یہ واقعہ بدلالت آیت مذکورہ "اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" چنداں ضروریات دینی میں سے نہ تھا۔ چنانچہ مذکور ہوا اور بایں ہمہ آخر زمانہ حیات نبوی میں جو وقت کمال توجہ الی اللہ اور استغراق تام کا ہے کیا مناسب تھا کہ ایسے اُمور غیر ضروریہ کی طرف اپنے نبی کو مصروف کیا جائے۔ بایں وجہ غالباً اس واقعہ میں وحی ربانی جو مصدق عمر اور شاہد حقیت قول خلیفہ دوئم ہو جائے نہ آئی ورنہ یہ وہمات خود مندفع ہو جاتے۔ بالجملہ یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بولنا تو عقل سلیم کے نزدیک قابل تعریف ہے اور اس پر بھی بوجہ تیرہ درونی اور بغض ذاتی کے اگر کوئی برا کہے جائے تو اس کا جواب بجز اس شعر کے اور کچھ نہیں۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد　　　عیب نماید ہنرش در نظر

کاغذ، قلم، دوات نہ لانے میں سبھی شریک تھے صرف فاروق کیوں؟

اور اگر ارشاد نبوی کو در بارہ طلب کاغذ و قلم و دوات شفقت پر محمول کرنا کسی تعصب کو بحکم "المرء يقيس على نفسه" کے تعصب نظر آئے اور باوجود اس توضیح کے اس ارشاد کو ارشاد وجوب ہی کہے جائے تو یہ اعتراض فقط حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی پر نہ ہوگا بلکہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ تمام اہل بیت اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اس جرم میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شریک نکلے اور وہ قصہ ہو گیا۔ مرگ انبوہ جشنے دارد بلکہ اہل بیت اس تقصیر میں اوّل درجہ کے تقصیر دار ہوئے کیونکہ اوّل تو مریض کی امر و نہی کے مخاطب اس کے گھر والے ہی ہوا کرتے ہیں۔ دوسرے

حضرت عمر تو غیر تھے، عیادت کے لیے ساعت دو ساعت کے لیے آ گئے تھے، اگر ان کی نشست کے وقت کچھ اندیشہ تھا تو جب وہ اُٹھ کھڑے ہوئے پھر کون مانع تھا، آخر اس قصے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کئی روز زندہ رہے بلکہ غور سے دیکھئے تو درصورتیکہ اس ارشاد کو ارشاد ایجابی اور امر وجوبی کہئے جیسے شیعوں کا جی چاہتا ہے تو پھر جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی (نعوذ باللہ) اس جرم کے شریک ہوئے کیونکہ جس قدر ہم پر اطاعت خدا اور رسول واجب ہے، اس سے زیادہ نبی پر تبلیغ احکام واجب ہے۔ چنانچہ آیت:

یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ

"اس پر دلالت کرتی ہے اس لیے کہ حاصل اس آیت مذکور کا یہ ہے کہ اے رسول! پہنچادے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے اور اگر یہ کام نہ کرو گے تو پھر تم نے کوئی پیغام بھی خدا کا نہ پہنچایا۔" اِدھی اور اُدھر سب نے سنا ہوگا کہ "نزدیکاں رابیش بود حیرانی" چنانچہ اشارات کلام اللہ و حدیث بھی اس پر شاہد ہیں تو اب لاجرم یہی کہنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تبلیغ احکام اس سے زیادہ واجب ہے کہ ہم تم پر تعمیل احکام اور ادھر یہ بھی ظاہر ہے کہ تبلیغ جب ہی کہہ سکتے ہیں کہ احکام کا بیان بھی کیا جائے۔ اتنی بات کو کہ کاغذ، دوات، قلم لاؤ، میں تمہیں وہ باتیں لکھ دوں کہ اگر ان پر عمل کرو تو گمراہ نہ ہو، تبلیغ حکم کہنا اسی کا کام ہے جو برائے نام ہی انسان ہے اور عقل سے محروم اور دانش سے ناکام ہے۔ الغرض اس صورت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اگر تقصیر بھی ہوئی تو اتباع نبوی پھر بھی ہاتھ سے نہیں گیا۔ اگر حضرات شیعہ جناب سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات والتسلیمات اور اہل بیت کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نسبت اس تقصیر کو (نعوذ باللہ منہ) تجویز کرسکیں تو ہمیں بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قدر گناہ گاری کا چنداں رنج نہیں، اوّل تو مرگ انبوہ جشنے دارد۔ دوسرے:

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتے   گومشت خاک ماہم برباد رفتہ باشد

شیعوں کو یہ خواب کہاں سے آ گیا کہ منشا نبوی تحریر مسئلہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ تھا

مع ہذا دوات، قلم، کاغذ کے منگانے سے یہ کہاں لازم آ گیا کہ فرمان خلافت حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی تحریر فرماتے۔ ظاہر عبارت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو

تقاضا کرتا ہے کہ دین اسلام کی باتوں کا خلاصہ جو تمام ارکان کی جڑ ہو، تحریر فرماتے یا احکام دین میں سے وہ احکام کہ ان کی تعمیل کو تمام احکام کی تعمیل لازم ہو، لکھواتے۔ چنانچہ آپ کا یہ فرمانا کہ ان پر عمل کرو گے تو گمراہ نہ ہو گے، اس بات پر گواہ ہے، سو کسی ایک کی خلافت معین کرنے میں یہ بات ظاہر ہے کہ حاصل نہیں ہوتی، یوں تاویلیں گھڑنے کو ہر کسی کے منہ میں زبان ہے اور اگر بتکلف اس مضمون کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کو لازم بھی سمجھتے تو پھر کب تک؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد پھر کچھ نہیں حالانکہ روایت کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پھر کبھی گمراہی پیش ہی نہ آئے گی اور یہ بھی نہ سہی، بپاس خاطر شیعہ ہم نے اس پر بھی خاک ڈالی اور اسی کو تسلیم کیا کہ فرمان خلافت کی تحریر ہی مدنظر تھی لیکن پھر بھی یہ کہاں سے نکل آیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی خلافت کی تصریح کے لیے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اضطراب تھا کہ بدلیل نقلی و عقلی فرمان خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرکوز خاطر حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ نقل کی بات پوچھتے تو صحاح اہل سنت میں کچھ ایسا موجود ہے کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ میرے جی میں تھی کہ ابوبکر کے لیے لکھ دوں تا کہ کسی تمنا والے کو پھر تمنا باقی نہ رہے مگر نہ خدا کو سوا ابوبکر کے کسی کی خوشی ہے نہ مؤمنین اُن کے سوا کسی اور کے روادار۔ انتہیٰ

فرمانِ نبی سے خلافت صدیقی کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو عین قرین قیاس ہے

غرض اس روایت کا ماحصل اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اگر لکھنے کا ارادہ تھا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے نہ تھا اور عقل سے پوچھتے ہو تو سنئے کہ دستور کے موافق آپ کو غالباً یہ اندیشہ ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بوجہ قرابت شاید خیال جانشینی ہو اور اُن کے احباب و اقارب اس باب میں ساعی ہوں تو اس صورت میں حق حقدار یعنی ابوبکر کو نہ پہنچے گا اور اس قسم کا خیال بہ نسبت ابوبکر رضی اللہ عنہ اہل عقل کے نزدیک متصور نہیں نہ قرینہ ہے نہ احتمال وراثت ہی ہو تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت ہو۔ بالجملہ اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیچ تاب تھا اور اس قدر اس کی مدافعت میں اضطراب تھا سو بحمد اللہ بزعم شیعہ آپ کا یہ خیال بھی راست ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خواستگار خلافت ہے۔ پھر اُس پر آپ کی پیشین گوئی بھی صحیح ہوئی، خدا تعالیٰ کو اور مؤمنوں کو سوا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور کوئی پسند ہی نہ آیا۔ القصہ اگر لکھنے کا

ارادہ تھا تو حضرت ابوبکر کے لیے تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت کریں تو صدیق کریں شیعیان حضرت علی کو کیا کام؟ مگر وہ نقل ہے کہ بھوکے کو دو اور دو چار روٹیاں ہی سمجھ میں آتی ہیں اور بلی کو خواب میں چھچھڑے ہی نظر پڑتے ہیں، کوئی بات کیوں نہ ہو، حضرات شیعہ کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت اور اماموں کی امامت ہی نظر آتی ہے۔ خیر اس جگہ یہ بات اتفاقی تھی مطلب اصلی یہ تھا کہ جملہ "وَلَیُمَکِّنَنَّ" سے بالاجمال تمام مطاعن خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا جواب نکلتا ہے۔ اب یہاں بس کیجئے کہ خلافت خلفاء ثلاثہ بوجہ احسن اس آیت سے ثابت ہوگئی اور ان کا فضل و کمال اور اُن کی بزرگی "کما ینبغی" اس آیت سے ظاہر ہوگئی۔ اُدھر سنیوں کے مذہب کی حقیت اور اُن کی حقانیت اور شیعوں کے خیال وگمان کا بطلان اور اُن کے طریقہ کی مذمت بخوبی روشن ہوگئی۔

خلفاء نعمت خلافت سے اصالتاً نوازے گئے دوسرے انکے طفیلی تھے

مگر تنبیہ کے لیے اس قدر اور گزارش ہے کہ اس آیت میں اوّل کلمہ "لَھُمْ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں دین پسندیدہ اُنہیں اشخاص کے لیے جمایا جائے گا جو خلیفہ بنائے جائیں گے اور یہ نعمت عظمیٰ اولاً بالذات انہیں کو عطا ہوگی جو خلیفہ ہوں گے۔ مقصود اصلی وہی محبوب ہوں گے اوروں کو وہ دولت اگر ملے گی تو انہیں کے تصدق ملے گی مگر اختلاف اور تبدیل خوف میں ان کا اصل الاصول ہونا عام فہم سمجھ کر الفاظ موجودہ پر اکتفا فرمایا پر دین کا ایک کے لیے اصلی ہونا اور باقیوں کے لیے اُس کا تصدق ہونا چونکہ ایسا عام فہم نہ تھا کہ شیعہ بھی مان جائیں تو "لَیُمَکِّنَنَّ" کے بعد لفظ "لَھُمْ" بھی بڑھایا، غرض اُس عہد میں اور بھی اگر اُس دین پر ہوں گے تو وہ انہیں کی جوتیوں کا صدقہ ہوگا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ تسلط اہل اسلام اور تمکین دین پسندیدہ اور ازالہ خوف اور تبدیل امن جو کچھ تھا سب کا سب اصل میں انہیں چار یار کے لیے تھا لیکن جیسے کسی امیر کی کوئی دعوت کرتا ہے تو اُس امیر کے اقربا اور اُس کے حشم خدم کی دعوت بھی اُس امیر کے طفیل میں کر دیتا ہے، پھر جو امیر مذکور کو کھلاتے پلاتے ہیں اُس کے اقربا اور حشم خدم کو بھی وہی کھلاتے ہیں۔ فرق ہوتا ہے تو اصالت اور تبعیت کا اور اعزاز و اکرام کا ہوتا ہے۔ ایسے ہی یہ نعمت عظمیٰ اور دولت جلیلہ خلافت وغیرہ بھی ہر چند اصل میں انہیں چار یار کے لیے ہیں لیکن ان کے طفیل میں اس نعمت عظمیٰ سے تمام اصحاب بہرہ ور ہوئے جو صحابہ کہ کبھی غرباء عرب اور فقراء صحابہ میں معدود تھے، وہ بھی مناصب حکومت پر مامور ہوتے تھے اور کفار پر تحکم اور حکمرانی تو ہر کسی کو حاصل تھی ادنیٰ ادنیٰ صحابی کا ناز امراء اور اہل کتاب کو اُٹھانا پڑا، القصہ نعمت خلافت ہر چند بالاصالت چار یار ہی کے لیے تھی مگر سب ہی اُس میں شریک

تھے اور ساری نعمتوں سے جو اس آیت میں مندرج ہیں صحابہ اور غیر صحابہ بطفیل خلفاء اربعہ حسب لیاقت بہرہ ور ہوئے۔ اس میں صحابہ کو بمنزلہ اقربا سمجھئے اور اُن میں بھی ان کو جو وقت نزول اس آیت کے مشرف باسلام و ایمان ہوئے تھے زیادہ تر قریب سمجھئے، پھر مہاجرین اوّلین کو سب سے اقرب بلکہ بمنزلہ حقیقی بھائیوں کے مقرر رکھئے اور تابعین کو بجائے اتباع اور خدام کے تصور کیجئے۔ اس صورت میں یہ نعمت کو سب میں مشترک ہوگی لیکن اعزاز و اکرام میں درجہ بدرجہ فرق ہوگا۔

"وَمَنْ کَفَرَ" سے شیعہ کے کفران نعمت کی طرف اشارہ ہے جو اعجازِ قرآنی ہے

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خویش و اقارب اگر بطفیل امیر کے نعمت سے کامیاب ہوتے ہیں تو امیر کچھ ان سے خواستگار شکر گزاری یا طالب خدمت گاری نہیں ہوتا ہاں غلام اور خدام اور زلہ برداروں کی طرف البتہ جو یہ نظر رہتی ہے سو اُن میں سے قدر شناس اور عاقل اور سلیم الطبع ہوتے ہیں وہ خدمت گزاری اور شکر گزاری سے پیش آتے ہیں اور جو بداصل اور ناقدر ہوتے ہیں وہ شکر گزاری تو در کنار اُلٹے اپنے آقائے نعمت اور وسیلہ راحت کی جڑ کاٹنے کے درپے ہوتے ہیں۔

سو اس نعمت عظمیٰ خلافت کا حال بھی یہی ہوا کہ ہر چند خلفاء اربعہ کے صدقہ میں اس زمانہ تک کے اہل اسلام کامیاب ہیں جس قدر دین کو وسعت اور شوکت ہوئی یا اب ہے، حقیقت میں یہ سب انہیں کی خلافت کا پھول پھل ہے لیکن صحابہ کے زمانہ سے لے کر آج تک جیسے اس نعمت کے شکر گزار ہیں ویسے ہی اس زمانہ سے لے کر آج تک کافران نعمت بھی برابر چلے آتے ہیں مگر چونکہ علم الٰہی تو وقائع گزشتہ اور وقائع آئندہ کو برابر محیط ہے تو بطور اخبار بالغیب کے اُن کافران نعمت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضرور پڑا تا کہ خلفاء اربعہ کی بزرگی اور ان کے اعداء کی برائی قرار واقعی ثابت ہو جائے اور اُن کا اور اُن کے اعداء کے مرتبہ کا حال سب کو بخوبی واضح ہو جائے۔ اسی واسطے بعد اتمام وعدہ اور بیان حال خلفاء اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے جو آگے ہونے والا تھا اتنا اور ارشاد فرمایا: "وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذَالِکَ فَاُوْلٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ" یعنی جو کہ طفیلی اور تابع خلفاء کے اس نعمت میں ہوں اور پھر حق نعمت نہ پہنچائیں اور خدمت گزاری اور اطاعت فرمان تو در کنار زبان سے شکر گزار تک نہ ہوں بلکہ اُلٹے بدی سے پیش آئیں تو وہ اصل فاسق ہیں کہ کوئی فاسق ان کے برابر نہیں اور یہ تو خود ظاہر ہے کہ اس آخر آیت کے مصداق بجز شیعہ اور نواصب اور خوارج اور قاتل خلیفہ ثانی اور قاتلان خلیفہ ثالث اور قاتل حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اور کوئی معلوم نہیں ہوتا مگر چونکہ شیعی ان کے دشمن ہیں جو اس نعمت کے حق میں اصل اُصول ہیں تو اس فسق میں جو اس ناشکری کا

ثمرہ ہے سب میں پیشرو ہوں گے، اگر چہ کسی اور وجہ سے وہ دوفرقے اوروں سے بڑھ جائیں۔

اور امیر معاویہ اور بعضے اور صحابہ گو مخالف حضرت امیر رضی اللہ عنہ رہے لیکن ان کا بگڑنا ایسا تھا جیسا بھائیوں کا بگڑنا کیونکہ وہ اور چار یار اس نعمت خلافت میں بمنزلہ امیر اور غریب بھائیوں کے ہیں کہ باوجودیکہ سب اپنے امیر بھائی کے طفیلی ہوتے ہیں، پھر اس سے بگڑتے رہتے ہیں، غرض شکر رنجی برادرانہ کو ہر چند ایک دوسرے کا طفیلی ہو، کفر نعمت نہیں سمجھا جاتا۔ اُس کو عرف میں ناز کہتے ہیں۔ اسی واسطے اگر ایک بھائی کو دُنیا میں ثروت ہو جاتی ہے اور اس کے اور بھائیوں کو اس کے طفیل سے ہم چشموں میں عزت اور گونہ ثروت حاصل ہو جائے تو خوبی اُسی کی سمجھتے ہیں کہ وہ بھائی جس کے سب طفیلی ہوتے ہیں اپنے اور بھائیوں سے بہ منت اور ساجت پیش آیا کرے نہ کہ غرور اور تکبر کیا کرے بلکہ اُس کے بھائی اگر اُلٹے تحکم کریں تو سب سہے اور مدارات سے پیش آئے اور مکافات کے درپے نہ ہو اور نہ ان سے انتقام لے بلکہ اگر کوئی شخص اس کے متوسلوں میں سے ان سے کسی قسم کی پرخاش کرے تو یہ سمجھا دے کہ میرے بھائی ہر چند مجھ سے منحرف ہیں پھر بھائی ہیں اور تم ہر چند دوست ہو پھر غیر ہو۔

القصہ حق شناسوں کا دستور یہی ہے کہ باہم کی شکر رنجیوں کی وجہ سے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ غیر (خاص کر اپنے نوکر غلام) اُن کو ایذا پہنچائیں بلکہ خدا اگر کچھ لیاقت دین یا دُنیا کی دیتا ہے تو اس کی جفا اُٹھاتے ہیں اور زبان پر نہیں لاتے بلکہ اُلٹے احسان کیا کرتے ہیں، ہاں اگر اپنا نوکر یا غلام اُن کی اہانت یا ایذاء کے درپے ہوتا ہے تو اس کو البتہ سزا دیا کرتے ہیں۔

شیعوں کا شیوۂ تبرابازی امیر کی اتباع سے نکال کر ان کا قدم امیر معاویہ کی تقلید پر جماتا ہے

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سنا کہ اصحاب امیر معاویہ ہم پر لعن طعن کرتے ہیں تو آپ نے اپنے لشکریوں کو ان کی لعن کرنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ شیعوں کی معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ افسوس کہ شیعوں نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقلید اختیار کر لی اور تبرا اپنا شیوہ بنایا۔ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتباع نہ کیا کہ کسی کو برا نہ کہیں مگر ان کے کہاں نصیب جو حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اتباع اختیار کریں، اس نعمت کے لائق سنی ہی تھے۔

شہپر زاغ و زغن زیبائے صید و قید نیست　　　ایں کرامت ہمرہ شہباز و شاہین کردہ اند

سبحان اللہ! کیا کلام معجز نظام ہے کہ کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ صحابہ سے وعدہ کیا اور ان کے فضائل، اشارت اور نیز صراحت سے بیان کر کے منکران صحابہ کی جدا خبر لی، پھر وہ بھی کچھ ایسی طرح کہ دشمنانِ صحابہ پر سر سے لے کر پاؤں تک برابر مطابق آئے۔

الفاظ آیت تحفظ فضیلت صحابہ کیلئے سنگین حصار کھینچتے ہیں

ہاں اگر "یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا" نہ ہوتا یا "وَمَنْ کَفَرَ" کے پیچھے لفظ "بَعْدَ ذَالِکَ" نہ ہوتا تو بظاہر تاویل کی گنجائش رہتی کہہ سکتے کہ صحابہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمارے عقیدہ کے موافق مرتد ہو گئے تھے۔ "وَمَنْ کَفَرَ" سے وہی مراد ہیں اور کفر سے کفر حقیقی مقصود ہے کفرانِ نعمت مراد نہیں مگر خدا سے کہیں کوئی بات رہ سکے ہے اہل فہم تو پہلے ہی سمجھتے تھے کہ ایسا ایمان اور عمل صالح جو خداوند کریم کو بھی پسند آئے اور اس کے امتحان میں عمدہ نکلے، یہاں تک کہ اس پر انعام دے مبدل بکفر نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا ایمان اور عمل صالح بجز ان لوگوں کے میسر نہیں آتا جن کے حق میں شیطان تو یوں کہے "اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ" یعنی اے خدا! میں سب کو گمراہ کر دوں گا، سوا تیرے چھٹے ہوئے بندوں کے اور خداوند کریم کا یوں ارشاد ہوا "اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ" یعنی اے ابلیس! میرے جو کامل اور چھٹے بندے ہیں ان پر تیرا قابو نہیں بلکہ کلام اللہ سے تو یوں ثابت ہوتا ہے کہ مخلصین یعنی چھٹے ہوئے مومنوں کا گناہوں سے محفوظ ہونا یا معصوم ہونا لازم ہے کیونکہ آیت "لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ" میں حضرت یوسف علیہ السلام کے گناہوں سے بچا دینے اور بچے رہنے کی وجہ یہی فرمائی کہ وہ مخلصین میں سے تھے، پھر جب خلفاء اربعہ جن کا مخلصین میں سے ہونا ابھی مرقوم ہوا محفوظ یا معصوم ہوئے تو مصداق "وَمَنْ کَفَرَ" کیونکر ہو سکیں گے۔

اس کے بعد جو لوگ کچھ قلیل مایۂ فہم رکھتے ہیں ان کے لیے "وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِیْ ارْتَضٰی لَھُمْ" بڑھایا۔ تا کہ صحابہ کی نسبت اپنی زبان و دل کو آلودہ گستاخی نہ کریں اور اس طرح اپنے دین و ایمان کو برباد نہ کریں اور ان کی لعنت کی سزا میں ہماری لعنت کے مستحق نہ ہوں لیکن اغبیاء اور جہال کے سمجھانے کے لیے بھی کوئی بات ضرور چاہیے تھی۔ اس لیے جملہ "یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا" زیادہ فرمایا تا کہ احتمال ارتداد بھی باقی نہ رہے اور بسبب اپنی تیرہ درونی اور کم فہمی کے اپنی ہجو کو جو "وَمَنْ کَفَرَ" سے شروع ہے صحابہ کے اوپر مطابق نہ کرنے لگیں۔ واقعی "یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا" نے احتمال ارتداد کو جو

بطور فرض محال پیش آتا تھا بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ دیا کیونکہ اس میں ان کے آخر حال تک کی خبر دے دی، سو جو کچھ خداوند کریم نے ارشاد فرمایا وہ سب خلفاء اربعہ میں بوجہ اتم ظہور میں آیا۔ یہاں تک کہ شیعہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خلفاء ثلاثہ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ظاہر شریعت کی پاس داری اور ترویج دین اور زہد و تقویٰ کی رعایت بہت کرتے تھے۔ چنانچہ شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں بلکہ اور علماء نے بھی اس بات کو واضح لکھا ہے اگرچہ اپنی بدی سے باز نہیں آئے اور موافق مثل مشہور المرء یقیس علیٰ نفسه کی وجہ اس کی یہ تراشی ہے کہ یہ سب لوگوں کے دکھانے کو تھا لیکن جملہ ''یَعْبُدُوْنَنِیْ'' اور نیز اس جملہ کا ماقبل جب اُن کے اخلاص پر دلالت کرے تو پھر موافق مثل مشہور الرافضی فوارہ لعنت از دمی خیزد و بر دمی ریزد یہ برائی اور بدگوئی انہیں کے سر رہے گی۔

خلفائے ثلاثہ پر ارتداد کی تہمت خدا تعالیٰ پر دروغ گوئی کی تہمت ہے

مع ہذا لفظ "بَعْدَ ذَالِکَ" نے امامیہ کے منہ کو بالکل سیاہ ہی کر دیا ہے کیونکہ اگر بالفرض بغرض محال خلفاء ثلاثہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتد بھی ہوئے تو (نعوذ باللہ) خدا نے اتنا بھی نہ سمجھا جتنے شیعہ سمجھے، چاہیے تھا "وَمَنْ کَفَرَ" بعد وفات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتا اور کہہ دیا "وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذَالِکَ" جس سے دروغ گوئی کی تہمت اپنے ذمہ لگی اور اگر "وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذَالِکَ" بجائے خود ہے تو شیعوں کے مفید مطلب نہیں بلکہ مضر ہے کیونکہ اگر "وَمَنْ کَفَرَ" سے اصحاب ثلاثہ ہی مثلاً مراد ہیں تو ان کا کفر بعد اتمام نعمت موعودہ ہونا چاہیے تو اس صورت میں انکار امامت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو شیعوں کے نزدیک بجز دوفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ خصوصاً خلفاء ثلاثہ سے ظہور میں آیا کفر لازم نہ آوے، سو اوّل تو یہ شیخ چلی کا گھر بنا بنایا ڈھ جائے گا کہ انکار امامت اور انکار رسالت دونوں سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ دوسرے خلفاء ثلاثہ کے استحقاق خلافت کے انکار سے جو اس آیت سے ثابت ہوتا ہے خود کافر بننا پڑے گا، خیر اس صورت میں ہمیں بھی شکایت نہیں۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتے   گو مشت خاک ماہم برباد رفتہ باشد

وَمَنْ کَفَرَ کے اصلی مصداق

بالجملہ صحیح یہی ہے اور صحیح کیوں نہ ہو، سیاق یہی کہتا ہے کہ مصداق "وَمَنْ کَفَرَ" اعداء خلفاء ہیں، خلفاء نہیں ہو سکتے اور "کَفَرَ" سے کفران نعمت مراد ہے کفر حقیقی نہیں، گو بتکلف بن سکے

کیونکہ اس وقت مطلب یہ ہو جائے گا کہ جو شخص ایسی ایسی امدادیں خدا کی طرف سے بنسبت دین محمدی کے دیکھے اور پھر بھی کفر ہی اختیار کرلے تو وہ اصلی فاسق ہے لیکن نعمت کے مقابلہ میں کفرانِ نعمت ہی ہوا کرتا ہے کفر حقیقی کا موقع نہیں ہوتا۔ غرض صحیح یہی ہے کہ "مَنْ کَفَرَ" کے مصداق اعداء خلفاء ہیں لیکن ہم نے رعایت کی تھی کہ کفرانِ نعمت مراد رکھا، وہ اس کمی سے ناخوش ہیں تو اس گھاٹے کو پورا کرلیں اور اپنے آپ کو کافر حقیقی ہی سمجھیں: ع......رضاء ماہمہ آنست کان رضاء شماست

باب مناقب صحابہ بذیل تفسیرات آیہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہاں پہنچ کر شاید بعضے شیعہ مذہب یوں حجت کریں کہ ہم نے مانا اصحاب ثلاثہ خلیفہ برحق اور اپنے اپنے زمانہ میں افضل الناس تھے لیکن بعد ان کے جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقت آیا تو اس وقت موافق اشارات آیہ "وعد اللّٰہ الخ" کے وہ افضل الناس اور خلیفہ برحق ہوں۔ چنانچہ اس بات کے سنی بھی معتقد ہیں تو اس صورت میں ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کے مخالفین کیوں کر مقبولان بارگاہِ الٰہی ہوں حالانکہ اہلسنّت سب صحابہ کے خواہ انہوں نے حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت کی یا نہ کی معتقد ہیں۔ خصوصاً طلحہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تو مبشر بالجنہ بھی جانتے ہیں اس لیے لازم پڑا کہ کلام اللہ کی شہادت ان بزرگواروں کے لیے ادا کی جائے اور منشاء غلطی حضرات شیعہ کا بیان کیا جائے۔ سورۂ فتح میں خداوند کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے باب میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَا هُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط

"حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول ہیں، ساحر، کاہن نہیں اور ان کے ہمراہی کافروں پر تو بڑے تیز و تند اور ایک دوسرے کے ساتھ نرم اور ایک دوسرے کے دوست، تو انہیں دیکھے تو رکوع میں جھکے ہوئے سجدے میں پڑے ہوئے اللہ کے فضل اور اس کی رضا مندی سے، غرض ہے ان کے چہروں میں علامتیں موجود ہیں سجدہ کے اثر سے۔"

اس اُمت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے اور رسالت کے بعد بغض فی اللہ کا

یہاں تک کہ آیت کے معنوں کا بیان تھا اب اس ہیچمدان کی سنئے کہ اوّل جناب باری تعالیٰ

نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف فرمائی۔ بعد میں اصحاب کی، تو قرینہ عقلیہ سے معلوم ہوا کہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اُمت میں اصحاب کا رُتبہ ہے علیٰ ہذا القیاس جو وصف کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہوگا اس کے بعد اس وصف کا رُتبہ ہوگا جو صحابہ کی مدح میں بیان ہوا ہوگا مگر ہم نے جو دیکھا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ ہے اور اصحاب کی مدح میں "اشداء علی الکفار رحماء بینھُمْ" تو اس لف ونشر سے معلوم ہوا کہ بعد رسالت کے رُتبہ بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کا ہے کیونکہ بغض فی اللہ یعنی خدا کے سبب کسی سے عداوت کرنی یہ بعینہ وہی شدت علی الکفار ہے اور حب فی اللہ بعینہ "رحماء بینھم" کا ترجمہ ہے۔ اس اشارہ سے زیادہ تر تصدیق اس حدیث کی ہوگئی جو سنیوں کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اور اُس کا ماحصل یہ ہے کہ جس شخص نے خدا واسطے دیا اور خدا واسطے کسی سے ہاتھ کو کھینچ لیا اور خدا واسطے کسی سے محبت اور خدا واسطے کسی سے بغض رکھا تو بیشک اُس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔ واقعی سنیوں کی حدیثیں سب کلام اللہ پر مطابق آتی ہیں، پر شیعوں کی حدیثوں کا حال یہ ہے کہ کلام اللہ کچھ کہتا ہے اور ان کی حدیثیں کچھ ایک دو حدیثیں جو بیان کی گئیں ان کا حال ناظرین رسالہ ہذا پر پوشیدہ نہ رہے گا۔

صحابہ کی منقبت میں اشداء علی الکفار کو باقی اوصاف پر مقدم کرنے کی حکمت

پر یہاں ایک لطیفہ قابل بیان ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں جہاں کہیں حب فی اللہ بغض فی اللہ کا بیان آیا ہے تو حب فی اللہ کو مقدم کیا ہے اور کلام اللہ میں بغض فی اللہ پر جو لفظ دلالت کرتا ہے یعنی اشداء علی الکفار اسے مقدم بیان کیا حکمت اس میں کیا ہے؟ اس کم فہم کے فہم میں یوں آتا ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ دونوں آثار کمال محبت خداوندی میں سے ہیں یعنی جب کسی کو خداوند کریم سے محبت کمال درجہ کی ہوگی تو وہ محبت چاروں طرف کو پھیلے گی جہاں جہاں خدا کے ساتھ کسی چیز کو کچھ خصوصیت ہوگی تو اس خصوصیت ہی کے موافق اس چیز سے بھی محبت ہوگی۔

محبوب کے متعلقین کی محبت محبوب ہی کی محبت ہے

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنی آدم میں سے خدا کے ساتھ زیادہ علاقہ اور اختصاص ہے تو جس شخص کو خدا کے ساتھ محبت کامل ہوگی اور اس علاقہ کو سن لے گا تو بیشک اس کو بعد خدا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے محبت ہوگی علیٰ ہذا القیاس، جس کو بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدا سے زیادہ اختصاص ہوگا تو محبِّ خداوندی کو بھی اس

سے اسی قدر محبت ہوگی علیٰ ہذا القیاس، مکانات میں مثلاً خانہ کعبہ کو زیادہ تر اختصاص ہے تو محبت خداوندی کو بیشک سب مکانات سے زیادہ خانہ کعبہ سے محبت ہوگی۔ پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد کا رُتبہ ہے اس کے بعد بیت المقدس کا تو اس شخص کو بھی علیٰ حسب المراتب محبت ہوگی۔ اسی طرح اعمال اور اخلاق اور عادات میں خیال کرلو، القصہ جتنا کسی چیز کو جناب باری سے قرب ہوگا اتنا ہی محبانِ خداوندی کو اس چیز سے علاقہ ہوگا۔

متعلقین محبوب کی محبت محبوب کی محبت کا جزو ہے

مثلاً ظاہر کی محبت میں ظاہر ہے جب کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے اقربا اور خیر خواہوں بلکہ کوچہ کے رہنے والوں کے ساتھ بھی محبت ہو جاتی ہے۔ سو جیسے روشندانوں میں گو دھوپ بمقدار روشندان کے آتی ہے ایسے ہی محبت بھی بمقدار علاقہ محبوب متعلقان محبوب سے پیدا ہو جاتی ہے مگر جیسے جو دھوپ باہر ہوتی ہے اسی کا ٹکڑا اندر ہوتا ہے اور جو نور خارج از دیوار ہے اسی نور کا شعبہ اندر ہے ایسے ہی متعلقوں کی محبت بھی محبوب ہی کی محبت کا شعبہ ہوتا ہے اور اسی کا ٹکڑا اس کو سمجھنا چاہیے۔

بدخواہان محبوب کی دشمنی محبت کا جزو نہیں اس کا لازم ہے

بخلاف بدخواہان محبوب کی عداوت کے کہ وہ محبوب کی محبت کو لازم ہوتی ہے اس کا ٹکڑا اور اُس کا شعبہ نہیں ہوتی یعنی جو لوگ کہ محبوب کے بدخواہ ہوتے ہیں ان سے بتقاضاء محبت محبوب عداوت ہونی لازم ہے مگر یہ عداوت محبوب کی محبت کا ٹکڑا اور اس کا شعبہ بلکہ ہم جنس تک نہیں ہاں اس کو لازم ہے جیسے دھوپ کو بشرطیکہ دیوار وغیرہ کوئی شے نور کے روکنے والی حائل ہو۔ سایہ لازم ہے حالانکہ اس کے ہم جنس تک نہیں۔ اس قیاس پر جو لوگ اعداء خدا ہوں گے محبان خداوندی کو ان سے عداوت لازم ہوگی لیکن بہرحال یہ عداوت غیر محبت ہے۔ اگرچہ اس کو لازم ہے ہاں اولیاء خدا اور مقربان الٰہی کی محبت وہ حقیقت میں خدا ہی کی محبت کا ٹکڑا ہے کوئی غیر شے نہیں اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی مدح اور ثناء بیان فرمائی وہاں تو مقدم کو مقدم رکھا مؤخر کو مؤخر اور خداوند کریم حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی تعریف نہیں فرماتے بلکہ اُن لوگوں کی تعریف کرتے ہیں جن میں یہ وصف پائے جاتے ہیں۔

کسی کی مدح میں پہلے ہلکی پھر بڑھیا پھر اور بڑھیا خوبی بیان کرنا صحیح ترتیب ہے

اور دستور یوں ہے کہ کسی صاحب کمال یا موصوف باوصاف مختلفہ کی اگر تعریف کیا کرتے

ہیں تو اس کے کمالات میں سے کمتر کو پہلے لیا کرتے ہیں، بعد میں اس سے زیادہ کو، پھر بعد میں اس سے زیادہ کو، تاہر وصف کی قدر اور عزت ہو ورنہ اگر ترتیب کو بالعکس کر دیجئے تو بعد عمدہ اوصاف کے سن لینے کے کمتر اوصاف کی کیا قدر رہ جائے گی جو کل تعریف میں بیان کیا جائے۔ غرض یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اوصاف کی خوبی اور برائی تو اصلی ہے اور اوصاف والوں کی بھلائی برائی اوصاف کے سبب سے ہے درصورتیکہ اوصاف کی بھلائی برائی بیان کی جائے تو اوّل کو اوّل بیان کیا جائے اور دوم کو دوم اور درصورتیکہ اوصاف والے کی بھلائی برائی مدنظر ہو اور اس شخص کے اوصاف بترتیب ذکر کیے جائیں تو ترتیب مذکور کو منعکس کر دینا چاہیے ہاں جہاں دو چیز کا فرق مراتب باعتبار مجموعۂ اوصاف کے دریافت کیا جائے یعنی کس میں زیادہ اوصاف ہیں اور کس میں کم اور کس میں عمدہ تر ہیں اور کس میں نہیں؟ تو یہ حقیقت میں اوصاف ہی کی تعریف ہے، اس لیے اس کی ترتیب وہی ہوگی جو اوصاف کی ترتیب ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اوّل ذکر کیا، بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا مذکور شروع کیا، القصہ صحابہ کی تعریف میں ادنیٰ وصف جو بیان کیا گیا ہے تو اشداء علی الکفار ہے۔ یعنی وہ کافروں پر بڑے ہی تیز و تند ہیں۔

محبت کرنا آسان ہے اور دشمنی دُشوار خصوصاً اقربا سے

اور چونکہ محبت کرنا آسان ہے کیونکہ طبعی بات انسان کی یہ ہے کہ جب کوئی اس سے محبت کرے تو یہ بھی اس کی طرف مائل ہو تو اس صورت میں خدا واسطے کی محبت سے ایمان خوب نہیں پرکھا جاتا۔ ہاں عداوت کرنی البتہ دُشوار ہے کہ عداوت کے ثمرہ میں دوسرا بھی عداوت ہی سے پیش آئے گا محبت تو کجا، معلوم ہوا اگر کسی کو خدا واسطے کسی سے بغض ہو تو یہ نشان کمال ایمان سمجھا جائے گا خاص کر خدا واسطے کی عداوت بھی اقربا سے کہ یہ دُشوار در دُشوار ہے۔ سو در صورت یہ کہ مطلق عداوت نشان کمال ہو تو اقربا کی عداوت تو نشان اکملیت سمجھنا چاہیے۔

اور ہم جو قرینہ مقام کو لحاظ کرتے ہیں تو محل اقربا ہی کی عداوت کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ماسبق کی آیت یعنی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تسلی اور تسکین خاطر کے لیے نازل ہوئی ہے سو جس غم کے سبب تسلی کی جاتی ہے وہ غم یہی تھا کہ غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار مکہ معظمہ سے صلح کر کے مراجعت فرمائی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی آرزوئیں خاص کر مہاجرین کی جو عداوت جہاد کفار سینوں میں لبریز تھیں دلوں کی دلوں میں رہ گئیں اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ابتداء میں اس سفر کے یہ خواب دیکھا تھا کہ ہم

بجمیع جماعت امن چین سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور اس خواب کے باعث بایں خیال کہ اسی سال میں ہم مکہ میں داخل ہوں گے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں سرور بھرے ہوئے تھے کہ کچھ کہا نہیں جاتا وہ سب کا سب حسرت وغم سے بدل گیا۔

اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ ہوتی تو آب تیغ صحابہ کفار مکہ کو غرقاب فنا کر دیتی، پاس قرابت کس کا اور شفقت نسبی کجا، وہی مہاجرین جو مکہ والوں میں سے کسی کے بھتیجے تھے، فقط جوش محبت خداوندی اور نیازمندی رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں انہیں اپنے اقربا کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے اور آیت ماسبق اور آیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ سب باہم چسپیدگی میں دست وگریباں ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کو یوں تو ہر کافر دشمن خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غیظ وغضب آتا تھا لیکن اس آیت میں زیادہ تر اسی غیظ وغضب کی طرف اشارہ ہے جو ان کو کفار مکہ پر اس قصہ میں پیش آیا سو اُن میں سے مہاجرین انہیں کفار کے اقربا میں سے تھے تو ان کے حق میں لفظ اشداء علی الکفار نشان اکملیت ایمان کا سمجھنا چاہیے اور درصورت یہ کہ ادنیٰ وصف اُن کا اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ ان کا ایمان کامل تو کیا اکمل ہے تو اعلیٰ اوصاف تو اعلیٰ ہیں اور چونکہ مؤمنان کامل الایمان گنے چنے ہوئے ہوتے ہیں کچھ ایسی سہل بات نہیں کہ دخل در معقولات کی طرح ہر کوئی کمال ایمان حاصل کر لے۔

صحابہ بشہادت کتاب اللہ نفس وشیطان پر بھی اشد تھے لہٰذا اُن کی گمراہی کا خیال بھی گمراہی ہے

مع ہذا قرینہ اس بات کا کہ اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر فرمایا، پھر صحابہ کا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس اُمت میں اوّل نمبر ہے اور صحابہ کا دوم تو ہم بالیقین سمجھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اوّل قسم کے مخلصین میں سے تھے کہ شیطان بھی اُن کے اغواء سے کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا بلکہ بایں نظر کہ شیطان راس ورئیس کفار ہے اور صحابہ اشداء علی الکفار ہیں تو شیطان پر اور بھی اشد ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس نفس اعدائے دین میں سے بلکہ سب میں بڑھ کر ہے۔ شیطان بھی اُسی کے سہارے اپنا کام کرے ہے وہ اگر نہ مانے تو شیطان کیا کرے۔ بہرحال نفس وشیطان سے اُن کی عداوت اور بھی زیادہ ہوگی اور ان دونوں پر وہ اور بھی اشد ہوں گے کیونکہ بغض فی اللہ یعنی خدا کے دشمنوں سے عداوت بقدر دشمنی ہوتی ہے جتنی

دشمنوں کی دشمنی زیادہ اتنا ہی بغض فی اللہ زیادہ ہو اور مخلصین پر شیطان کا فقط بس نہ چلتا تھا مگر کچھ اندیشہ بھی نہ تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کی کور بھی دبتی تھی۔ عجب نہیں کہ اُن سے بھاگتا پھرتا ہو۔
سو یہی وجہ ہوگی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سایہ سے بھی شیطان بھاگتا تھا کیوں کہ وہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم میں کافروں کے باب میں زہر قاتل تھے۔ ان کے حق میں اشداء علی الکفار ہونا سب میں زیادہ صادق آتا تھا۔ بھلا شیطان جن سے خود بھاگے انہیں کیا گمراہ کرے گا، شیطان کو ایسی جگہ اپنی ہی پڑجاتی ہے اور نفس جن سے دبے وہ کس سے دبیں گے آدمی...... اوروں سے جو دبتا ہے تو اس نفس ہی کے پتے دیتا ہے۔ اسی واسطے یہ لازم پڑا کہ ایسے لوگوں کی عبادات میں کچھ فرق نہ پڑے اور ان میں کسی قسم کا رلا و ریاء وغیرہ کا نہ ہو کیونکہ ان سب بیماریوں کی جڑ یہی دو آسیب تھے جب یہی قابو میں آ گئے پھر کیا کسر باقی رہ گئی۔

نفس وشیطان کی آمیزش بغیر غلط فہمی سے کوئی غلطی ہوتو اُمید ثواب ہے

ایسے وقت اگر برا کام ہوتا ہے تو فقط بسبب غلط فہمی کے ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی ثواب ملنا چاہیے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے جو سر کے بال غصے میں پکڑ کر کھینچے حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی کچھ تقصیر نہ تھی ہرگز عقل سلیم کے نزدیک داخل جرائم نہیں، یہ نہیں کہ اس پر کسی قسم کا مواخذہ ہو بلکہ اُمید ثواب ہے کیونکہ باعث اس کا فقط خدا کی محبت اور بغض فی اللہ ہوا اور چونکہ یہ دونوں اوصاف محمودہ میں سے ہیں بلکہ اعلیٰ اقسام میں سے اور ادھر اعمال کا مدار فقط صورت پر نہیں ورنہ سب کی نمازوں کا برابر ہی ثواب ہوتا تو ہم کو یقین کامل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس پر ثواب ملے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بعد اطلاع غلطی کی بوجہ غلطی ندامت ہونی ضرور ہے سو اس ندامت سے یہ نہیں لازم کہ وہ کام ایسا برا ہو کہ ان کو اس پر عذاب ہو بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ کام تو حقیقت میں برا ہوتا ہے پر نیت کے غلبہ سے اچھا ہو جاتا ہے جیسے دھول دھپہ اصل سے برا ہوتا ہے لیکن یاران غمگسار کا دھول دھپہ بھی بسبب اس کے کہ از راہ محبت ہوتا ہے موجب نشاط خاطر محزون ہوتا ہے۔

مشاجرات صحابہ کا باعث نفس وشیطان نہیں بلکہ بغض فی اللہ تھا

الغرض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سامنے جب نفس وشیطان مغلوب ہوئے تو اس وقت اگر کوئی کار بے موقع ان سے صادر ہوا ہو تو بوجہ غلط فہمی صادر ہوا ہوگا، اس صورت میں گو وہ کام برا تھا لیکن چونکہ بری طرح سے نہیں ہوا اور شیطان و نفس کو جو برے کاموں کی اصل اور بنیاد باندھنے والے ہیں،

اس میں دخل نہیں ملا بلکہ قوت ایمانی ہی باعث اس کا ہوئی ہے تو اب بوجہ غلبہ نیت اور قوت ایمانی ان کاموں کی برائی ایسی مغلوب ہوگئی ہے جیسے ماشہ دو ماشہ برابر میٹھے یا نمک کا اثر کنویں یا دریا میں۔

سو جیسے حضرت موسیٰ کو حضرت ہارون علیہم السلام پر غصہ ہونے اور ان کے بال پکڑ کر کھینچنے کا باعث فقط بغض فی اللہ تھا ایسے ہی مشاجرات صحابہ بھی بغض فی اللہ پر مبنی ہوں لیکن جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ غلطی ہوئی کہ اُس بغض فی اللہ کو بے موقع صرف کر دیا ایسے ہی صحابہ سے بھی یہ غلطی ہوئی ہو کہ جوش بغض فی اللہ میں مثلاً چوک گئے اور بگاڑ بیٹھے اور حقیقت الامر کو نہ سمجھے تو اس صورت میں ان پر مواخذہ نہ ہوگا بلکہ ماجور ہوں گے۔ ہاں اگر بغض فی اللہ یا کوئی اور صنف محمود باعث اس فعل کا نہیں ہوا کہ بلکہ کوئی ایسا امر ہے کہ اس پر ثواب نہیں ہو سکتا۔ فقط اس قسم کے افعال مباح ہوتے ہیں تو البتہ ثواب تو مترتب نہ ہوگا لیکن بسبب غلط فہمی کے ماخوذ بھی نہ ہوں گے۔

نفس دب سکتا ہے لیکن اس کا مزاج نہیں بدل سکتا

اور احتمال یہ بھی ہے کہ گہہ و بیگاہ اقل قلیل بہ مقتضائے بشریت کوئی حرکت ناسزا صادر ہووے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چند شیطان کو مخلصین پر قابو نہیں رہتا اور نفس بھی مغلوب اور مقہور ہو کر ان کا اس طرح مطیع فرمان ہو لیتا ہے جیسے ہاتھی باوجود اس عداوت کے کہ اس کو آدمیوں سے ہے مغلوب اور مقہور ہو کر آدمیوں کی ہر طرح سے اطاعت کرتا ہے لیکن جیسے ہاتھی پھر ہاتھی ہے آدمیوں کے غلبہ سے آدمی نہیں بن گیا، کبھی نہ کبھی اپنی عادات اصلی پر آ جاتا ہے ایسے ہی نفس گو غلبہ ایمان اور صولت محبت الٰہی کے باعث مقہور اور مغلوب ہو گیا ہے لیکن پھر نفس ہے وہ طبع زاد برائی اور گناہوں کی رغبت کہاں جائے۔

نیکی کی اصل روح اور بدی کی اصل نفس ہے

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے بدن میں چاروں قسم کی کیفیات یعنی حرارت برودت یبوست رطوبت کے پائے جانے سے یہ دریافت ہوا ہے کہ بیشک بدن ان چاروں کیفیات کی اصلوں سے یعنی آگ ہوا پانی خاک سے مرکب ہے ایسے ہی بلحاظ اس بات کے کہ آدمی کے دل میں کبھی نیکی کی طرف رغبت ہوتی ہے کبھی بدی کی جانب، یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقت ان دونوں کی اصلوں سے مرکب ہے لیکن جیسے اربع عناصر میں سے ہر ایک میں ایک کیفیت خاص ہے کہ اس کے مخالف اس میں نہیں پائی جاتی اور اگر پائی بھی جائے تو عارضی ہوتی ہے جیسے پانی کا گرم ہو جانا ایسے ہی نیکی اور بدی کی اصل میں بھی ان دونوں میں سے ایک ایک ہونی چاہیے اور دوسری آ جائے تو وہ عارضی

ہے جب یہ بات مسلّم ہو چکی تو ہم کہتے ہیں کہ نیکی کی اصل کا نام ہم روح کہتے ہیں اور بدی کی اصل کا نام نفس اور روح میں کیفیت اصلی نیکی ہوگی مغلوب ہو کر اگر بدی اُس سے صادر ہو تو وہ عارضی ہے اور نفس کی اصلی خاصیت بدی ہوگی اور مغلوب ہو کر نیکی کرنے لگے تو وہ عارضی سمجھی جائے گی۔

روح عالم ملائکہ کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین میں سے ہے

اس جگہ سے ہم یوں قیاس کرتے ہیں کہ جیسے حرارت غریزی کے وسیلے سے ہم یوں دریافت کرتے ہیں کہ آدمی کے بدن میں ایک جزء ناری بھی ہے اور پھر اس کو یوں کہتے ہیں کہ اس کی اصل کرہ ناری ہے، خدا نے اپنے زور قدرت سے اسے یہاں لا کر قید کر دیا ہے ایسے ہی نیکی کے ارادہ کے وسیلے سے اوّل تو ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ آدمی میں کوئی چیز ایسی بھی ہے کہ اس کی اصلی خاصیت نیکی ہے اور دوبارہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل طبقہ ملائکہ ہے جن کی شان میں خداوند کریم یوں ارشاد فرماتا ہے: "لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ" یعنی خدا کی نافرمانی کرتے ہی نہیں جو حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں۔ سو اس کا ماحصل یہی ہے کہ ان کی اصلی خاصیت نیکی ہے، ایسے ہی انسان کے دل میں بدی کے ارادہ اور خواہش کے وسیلے سے اوّل تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی جز ایسا ہے کہ اس کی اصلی خاصیت بدی ہے اور پھر یوں خیال میں آتا ہے کہ اس کی اصل طبقہ شیاطین ہے جن کے حق میں جناب باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں "وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا" حاصل یہ کہ شیاطین اپنے رب کے قدیمی نافرمان ہیں۔ سو اس کا ماحصل یہی ہے کہ ان کی اصلی خاصیت بدی اور نافرمانی ہے۔ القصہ روح عالم الملکوت کی ایک چیز ہے اور نفس طبقہ شیاطین سے ہے۔ خداوند کریم نے اپنے زورِ قدرت سے ان کو ایک جگہ ایسا جمع کر دیا ہے۔ جیسا طوطی اور زاغ کو ایک قفس میں بند کر دیں۔

انسان میں نیکی و بدی کے مختلف دور ملائکہ اور شیاطین کی تقویت و تاثیر سے ہوتے ہیں

پھر جیسے بدن کے اربع عناصر میں ہر ایک کو اس کے ہم جنس سے تقویت ہوتی ہے ایسے ہی روح اور نفس کو بھی اپنے اپنے ہم جنس سے یعنی ملائکہ اور شیاطین سے تقویت ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض احادیث بھی اس پر شاہد ہیں اور بزورِ عقل بھی ہم یوں ہی یقین کرتے ہیں کہ اوقات مختلفہ میں یہ نیکی اور بدی کے خیال کا غلبہ بوجہ ملائکہ یا بوجہ شیاطین ہو تو ہو ورنہ جو اندازِ طبع زاد تھا وہی رہتا۔ غرض طبعی کیفیت

اگر جاتی ہے تو کسی خارجی شے کے غلبہ سے جاتی ہے سو نیکی کے خیال کا غلبہ بظاہر سامان بجز اعانت ملائکہ متصور نہیں ہے۔علیٰ ھذا القیاس بدی کی جانب توجہ کی زیادتی بجز تاثیر شیاطین معقول نہیں۔

نفس دب جائے تو اشداء علی الکفار کا مقام ہاتھ آتا ہے

سو اگر کسی وقت نیکی کا خیال غالب ہو اور اس وجہ سے اعمال صالحہ صادر ہوں اور اس ترکیب سے روح کی تاثیر نفس پر ایسی طرح عارض ہو جائے جیسے برتن کے نیچے آگ جلانے کی ترکیب سے آگ کی تاثیر پانی پر عارض ہو جاتی ہے اور اس کی تاثیر اصلی کو جو ٹھنڈک ہے دبا لیتی ہے تو اس صورت میں نفس بھی روح کے کام ایسے ہی دینے لگے گا جیسے بہت گرم پانی آگ کا کام دے یعنی بدن کو جلا دے۔علیٰ ہذا القیاس اگر نفس روح پر غالب آ جائے گا تو روح نفس کی تبعیت میں نفس کے کام دینے لگے گی کیونکہ ترکیب میں یہی ہوتا ہے کہ یا یہ غالب ہو یا نہ ہو چنانچہ اجسام میں یہی حال رہتا ہے کبھی کسی خلط کا غلبہ کبھی کسی خلط کا غلبہ بہر حال اگر روح غالب ہو گی تو ایسے وقت میں روح کو بنسبت نفس کے اشداء علی الکفار میں سے سمجھنا چاہیے اور اس وقت میں شیطان کا بالکل اختیار اُٹھ جاتا ہے اور وہ تسلط اور حکومت جو پہلے تھی باقی نہیں رہتی۔

نفس دب جائے تو بھی قابل اعتبار نہیں

لیکن جیسے کسی شخص پر ہمیں ایسا اختیار تو نہ ہو جیسے نوکر یا غلام پر ہوتا ہے مگر تاہم اپنی طرف سے اپنے جی کی بات سوجھایا کرتے ہیں وہ مانے یا نہ مانے ایسے شیطان بھی اپنی حسب مرضی کہنے سے یعنی وسوسہ ڈالنے سے باز نہیں آتا۔ بہر حال جن کا نفس مقہور اور مغلوب ہو جاتا ہے وہ روح کی تبعیت میں اچھے کام کرنے لگتا ہے لیکن پھر نفس نفس ہی ہے جیسے پانی کتنا ہی گرم کیوں نہ ہو آخر پھر پانی ہے۔اوّل تو آگ کے بجھانے میں ویسا ہی ہے جیسا ٹھنڈا پانی، دوسرے یہ حرارت عارضی ہے اور عارضی چیز کا کیا اعتبار، ابھی آگ جلانی چھوڑ دو یا چولہے پر سے اُتار کر ذرا رکھ دو، پھر وہی ٹھنڈا کا ٹھنڈا ہے، اسی طرح جہاں نفس کی خبرداری سے ذرا غفلت ہوئی۔ پھر وہی اپنیوں پر آ جاتا ہے۔

انسان ہمیشہ ایک ہی حال میں نہیں رہ سکتا

اور ہر وقت ایک سا حال رہنا محالات عادی میں سے ہے خصوصاً انسان سے جس کی شان میں جناب باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں ”وَلَمْ نَجِدْلَهٗ عَزْمًا“ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں یوں ارشاد ہے کہ آدم بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی کیونکہ جو جو اوصاف

حضرت آدم علیہ السلام میں تھے۔ تھوڑے بہت سب بنی آدم میں ہونے چاہئیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ توالد اور تناسل میں نوعیت باقی رہتی ہے۔ اسی واسطے آدمی کے آدمی اور گھوڑی کے گھوڑا اور گدھی کے گدھا پیدا ہوتا ہے اور جب نوعیت باقی رہے تو جو وجہ نوعیت کے باقی رہنے میں نظر آتی ہے یعنی توالد تناسل وہی بعینہ اور اوصاف کے حق میں بھی سمجھنی چاہیے۔ بالجملہ سب اوصاف آدم علیہ السلام نسلاً بعد نسلاً کم و بیش سب آدمیوں میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ مشہور بھی ہے "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ" اور جب بے ثباتی بھی سب آدمیوں میں ہوئی تو پھر ایک حال پر رہنا کجا اس صورت میں لازم پڑا کہ ہمیشہ نفس کی محافظت یکساں نہ ہو بلکہ کبھی کبھی اس کی نگاہ داشت میں فرق پڑے اور نفس اپنی خاصیت کی طرف مائل ہو اور کوئی نہ کوئی قصور سرزد ہو، باقی رہی یہ بات کہ کوئی نفس کی حقیقت کو بدل کر روح بنالے، یہ خود محالات میں سے ہے۔ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے: "لَا تَبْدِیْلَ لخلق اللّٰهِ" یعنی خدا کے پیدا کیے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

غلبہ نفس اور مغلوبیت نفس سے سرزد ہونے والی خطاؤں میں بے حد فرق ہے

الغرض کوئی صورت ایسی نہیں کہ انسان خطا اور قصور سے بے اندیشہ ہو جائے لیکن اس حال کا قصور اس قصور کے برابر نہیں کہ نفس اپنی خاصیت اصلی پر ہو اور اس پر روح کا ذرّہ برابر اثر نہ ہو بلکہ اُلٹا اس کا روح پر اثر ہو کیونکہ پہلی صورت میں آدمی کا کچھ قصور نہیں، اس کا کام اتنا ہے کہ روح کو غالب کردے اور نفس کو مغلوب، روح کی خاصیت نفس کی خاصیت کو دبا بیٹھے، یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ نفس کو بدل کر روح بنادے، یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ مدام یکساں حال رہے۔ پھر جب اس کے اختیار میں یہ دونوں باتیں نہ ہوئیں اور جس قدر اس کا اختیار تھا اس قدر کر گزرا تو پھر لائق اس کے ہے کہ معاف کیا جائے۔ چنانچہ خداوند کریم خود فرماتا ہے: "لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" یعنی اللہ کسی کو اس کی طاقت اور وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اس لیے ہمیں یقین کامل ہے کہ اس وقت کی خطائیں ہرچند خطائیں ہیں لیکن بسبب عموم رحمت اور وعدہ مذکور کے معاف کی جائیں۔

اب سنئے کہ انبیاء سے جو لغزشیں ہوئی ہیں تو شاید اس قسم کی ہوں جن پر عتاب ہوا ہے اور احتمال ہے کہ بسبب ان کے علو رتبہ کے موافق مثل مشہور، نیکان را بیش بود حیرانی، ان کی زلات سب از قسم غلط فہمی ہوں اور اوروں کو گو اس پر ثواب ملے پر ان کو اس پر عتاب ہو لیکن صحیح اوّل ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال ہر چہ باداباد انبیاء کے اسرار کو خدا جانے یا انبیاء؟

اشداء علی الکفار سے خطاء ممکن ہے لیکن شیطان کا تسلط ممکن نہیں

پر یہاں تو فقط اتنی بات سے غرض ہے کہ یہ وصف کہ جو "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کا خدا نے معرض تعریف میں بیان کیا اور پھر تعریف بھی ایسے وصف کے ساتھ کہ بعد رسالت اسی کا رتبہ ٹھہرا، یہ وصف ایسا نہیں کہ صدور گناہ یا صدور خطا اس کے ساتھ محال ہو۔ محال البتہ جب ہوتا کہ اس وصف والوں کو حقیقت نفسی کے تبدیل کا اختیار ہوتا۔ سو یہ تو معلوم، یہ بھی اس وصف والوں کو میسر نہیں آ سکتا کہ ایک حال پر برقرار رہیں اور کیونکر رہ سکیں، دو چیزیں مخالف ایک دوسرے کی دشمن سے ان کو پالا پڑا، ایک شے ہو تو ایک حال پر رہے۔ ان کے واسطے یہی بہت ہے کہ شیطان کا ان پر تسلط نہیں ہو سکتا، خداوند کریم ان سے برائیوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف سے برائی اور فحش کے ہٹانے کی وجہ یہی بیان فرمائی ہے کہ وہ چنے ہوؤں میں سے ہیں، فرمایا ہے:

"کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ، وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ"

"یعنی یوں ہی ہوا، اس واسطے کہ ہٹا دیں، اس سے برائی اور بے حیائی البتہ وہ ہے ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے۔"

القصہ یہ لازم نہیں کہ جو "اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ" ہوا کریں ان سے لغزش کا ہونا محالات میں سے ہو۔

"اَشِدَّاءُ اور رُحِمَاءُ" کیلئے اخلاص لازم اور ریا ناممکن ہے

ہاں البتہ یہ لازم ہے کہ عبادات میں فتور نہ ہو، ان کے کام میں ریا کو دخل نہ ہو۔ طالب اگر ہوں تو رضاء خداوندی کے ہوں نظر ہو تو اس کے ایک افضال پر ہو، سو اسی لیے بعد ان دونوں وصفوں کے بطور علامات کے اور دلائل کے یوں بیان فرمایا: "تراھم رکعا الخ"

غلط فہمی کے سبب بڑوں بڑوں سے خطا ہو جاتی ہے

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب ہماری عرض علماء شیعہ کی خدمت میں یہ ہے کہ اوّل تو بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کسی غلطی کے سبب سے بھلی بات کو بری سمجھ جاتے ہیں، خضر کی کشتی توڑنے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی اوالعزم نے برا سمجھا اور خلاف شریعت سمجھ کر یوں فرمایا "لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا" حاصل یہ ہے کہ تو نے برا کام کیا حالانکہ انہوں نے کچھ برا نہیں کیا تھا بلکہ بھلا کیا تھا، اگر نہ توڑتے تو وہ کشتی پکڑی جاتی۔ سو اسی طرح حضرات شیعہ بلکہ حضرات آئمہ

بعض اصحاب کے افعال کو مثلاً فدک کے نہ دینے کو اور سوا اس کے اور افعال کو سر دست اگر برا سمجھ گئے ہوں اور حقیقت میں وہ برے نہ ہوں تو شیعہ حضرات ہی کی نقل کی رو سے فرمائیں کیا محال ہے۔

اور یہ بھی نہ سہی شاید کسی کو یہ گمان ہو کہ حضرت خضر اہل مکاشفہ میں سے تھے۔ ان کی بات اگر سمجھ میں نہ آئی تو بجا ہے، ابوبکر کو ہم اہل مکاشفہ میں سے نہیں سمجھتے۔ اس لیے یہ التماس ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی باہم جو شکر رنجی ہو گئی اور منشاء اس کا یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حقیقت الامر کو نہ سمجھے اور اس سبب سے دست و گریباں ہو گئے اور ایسے ہی حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا حقیقت الامر کو سر دست نہ سمجھی ہوں تو کیا حرج ہے حالانکہ یہاں کوئی مکاشفہ کی بات بھی نہ تھی، اس لیے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے تو کچھ خطا کی ہی نہ تھی۔ اگر معصوم ہونے کی وجہ سے اس بات کو مستبعد سمجھتے ہو تو حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو فقط شیعوں ہی کے نزدیک معصوم تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو بالاتفاق معصوم ہیں۔

اور "سَلَّمْنَا" یہ بھی نہیں تو یہ نا کارہ ابھی عرض کر کے آیا ہے کہ اولیاء اور مخلصین سے چوک ہو ہی جاتی ہے اور خطا کا ہونا کچھ ان سے محال نہیں جو اس وجہ سے ان کی بزرگی کے منکر ہو جائے، بزرگی اور چیز اور صدور گناہ اور چیز، وہ گناہ جو مخالف ولایت ہے وہ یہ ہے کہ نفس اپنی خاصیت اصلی پر باقی ہو اور روح اس کے مغلوب ہو جائے، نہ یہ کہ بمقتضاء بشریت بھی نہ ہو ورنہ ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں جو یہ آیا ہے "وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی" یا حضرت یونس علیہ السلام کی طرف تعریض ہے۔ "لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ" یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ" ان سب کے کیا معنی ہوں گے۔ حالانکہ یہ سب وقائع کلام اللہ میں مذکور ہیں، گنجائش انکار بھی نہیں اور صحابہ کے زلات اگر زلات بھی ہوں اور از قبیل غلط فہمی نہ ہوں تب وہ کچھ کلام اللہ میں مذکور نہیں۔ کسی حدیث متواتر میں نہیں ممکن ہے کہ غلط ہوں اور نہ سہی ہم کہتے ہیں کہ غلط نہیں لیکن جو تم جواب انبیاء کی طرف سے دو گے وہی صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے سمجھ لو بلکہ ان کی طرف سے یہی عذر بہت ہے کہ وہ معصوم نہیں نبی نہیں، اگر خطاء ہو گئی تو بلا سے، جب با ایں ہمہ خدا نے ان کی تعریف کر دی تو پھر کیا حاجت جواب اور کیا عذر کی ضرورت۔

مصرع: ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر ست

امکان خطاء کے باوجود اتنی تعریف دلیل غفران و رضا ہے

القصہ اس قسم کے قصور قابل گرفت نہیں اور عقل سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرتی کہ ان پر محاسبہ اور مواخذہ

ہو بلکہ ان اوصاف کے بیان ہی میں اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا۔ اس لیے کہ "اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" ہونا کچھ اس بات کو نہیں چاہتا کہ ان سے، کوئی خطا نہ ہوئی ہو اور جب اس بات کا التزام نہ ہو اور خداوند کریم نے باوجود امکان صدور خطا ان کی تعریف فرمائی تو یہ معنی ہوئے کہ یہ وصف ایسے نہیں کہ ان کے سامنے اس قسم کی باتوں کا حساب کیا جائے بلکہ یہ خوبی فقط اس قدر ہی ہے کہ سب کو محو کیے دیتی ہے تو گویا ضمناً اشارہ ان کی مغفرت کی طرف ہوا اور جواب بھی وہ معذب ہو سکیں، تو پھر کیا تعریف جہنمی سے تو سور بلکہ پاخانہ پیشاب بھی اچھے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے۔

القصہ نظر انصاف چاہیے خدا کی تعریف کے بعد پھر کہیں ہو سکتا ہے کہ صحابہ جہنم میں جائیں، پھر اس صورت میں ایک کیا لاکھ گناہ ان کے ذمہ لگا دو جو کرے گا وہ اپنی عاقبت خراب کرے گا اور سمجھنے والے اسی کو تعریف سمجھیں گے۔

امکان خطاء کے باوجود اتنی تعریف اعدائے صحابہ کے منہ پر طمانچہ ہے

اور حق بھی تو ہے جب کوئی بادشاہ دانش مند جسے انتظام مملکت کا خیال ہو اور وہ ملازموں کے حال کا نگراں ہو اپنے چند ملازموں کو باوجود خطاؤں کے کچھ نہ کہے تو ظاہر میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کوئی بہت ہی پیارے ہیں کہ اس حال پر بھی ان سے مواخذہ نہیں اور جو اُلٹی تعریف کرے اور ان کے غمازوں اور دشمنوں سے جو ان سے کینہ رکھتے ہوں، بری طرح پیش آئے اور ان کے ان کمالات کو جو اپنے نزدیک اور ان کے دشمنوں کے نزدیک ان کی خوبی مسلم الثبوت ہو ان کے دشمنوں کو سنا سنا کر کہے کہ ان میں سے جس میں یہ اوصاف پائے جائیں۔ ہم نے اس کی سب خطائیں معاف کیں بلکہ اس کے لیے اور انعام قرار واقعی تیار کیا ہے تو اس صورت میں بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں ہو سکتا کہ بادشاہ کو ان ملازموں سے محبت ہے اور اس کو ان کی پچ ہے جو ان کا دشمن ہے وہ اس کا دشمن جو ان کا دوست وہ اس کا دوست ہے۔

تعریف صحابہ کا ایک مقصد آنے والے دشمنوں کا چڑانا اور جلانا بھی ہے

سو بفضلہ تعالیٰ یہ سارا قصہ بعینہ ان آیات کے ملاحظہ سے سمجھ میں آتا ہے کیونکہ اول تو صحابہ کی تعریف ایسی بڑھ کر کرے کہ اس سے زیادہ کوئی تعریف کی صورت اُمتیوں کے حق میں سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر بعد ازاں فرمایا: "لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ" یعنی یہ جو کچھ صحابہ کے حق میں کہا گیا تو کفار یعنی ان کے دشمنوں کے جلانے اور چڑانے کے لیے کہا گیا ہے۔ سبحان اللہ! کیا علم محیط خداوندی ہے کہ بعد

کے تمام احوال کی طرف اشارہ فرما دیا۔ خدا کو تو پہلے ہی معلوم تھا کہ شیعہ اور نواصب اور خوارج صحابہ کے حق میں غمازیاں کریں گے اور ان کی قدر و منزلت کا جو خدا کی درگاہ میں ہے کچھ خیال نہ کریں گے۔

باقی رہی یہ بات کہ "لیغیظ بھم" کے ساتھ تو "اعداء ھم" کا لفظ ہونا چاہیے تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کو ہی ان سے دشمنی ہو تو ہو مسلمانوں کا کام تو یہ نہیں کہ خدا ان کی تعریف کرے اور ان کی سب خطائیں معاف کرے اور پھر بھی ان سے حسد ہی کیے جائیں، جن کی خدا تعریف کرے اور خدا کی بات بات سے ان کی محبت ٹپکے پھر کمبختی ہے یا نہیں کہ ان کی بدی کرے اور برائیاں گائے اور خدا کو اپنا دشمن بنائے۔

صحابہ کرام شیعوں کے بھی محسن ہیں

یا یوں کہیے کہ منکران صحابہ کو جو نوبت کلمہ گوئی کی آئی اور بزعم خود مسلمان ہوئے تو یہ صحابہ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے نہ وہ جہاد کرتے نہ اس طرح اسلام پھیلتا اور نہ یہ کلام اللہ کا رواج ہوتا کہ شیعہ تک باوجودیکہ کلام اللہ کو ان سے کیا نسبت، کلام اللہ کی تلاوت سے مستفید ہوتے ہیں۔ پھر بایں ہمہ اگر ان کے شکرگزار نہ ہوں تو پھر کس کے ہوں گے اور ان کے حق میں گستاخی کریں گے تو پھر کس کا ادب کریں گے، ان سے زیادہ بڑھ کر اور کون کافر نعمت ہوگا، اس لیے جناب باری تعالیٰ نے دشمنان صحابہ کو کافر فرمایا۔

صحابہ کی تعریف قرآن کی پیشین گوئی ہے کہ آئندہ صحابہ کے دشمن پیدا ہونگے

پھر چونکہ علم غیبی میں صحابہ کی نسبت بدگوئی اور گستاخی کا ہونا متحقق تھا تو جیسے مثال مذکور میں غمازوں کے لیے بیان کیا گیا تھا ایسے ہی غمازانِ صحابہ کو بھی سنا سنا کر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْراً عَظِيْمًا" یعنی حاصل اس کا اس صورت میں یہ ہوا کہ اے منکران صحابہ یہ جماعت صحابہ جن کی ہم تو تعریف کرتے ہیں اور تم پھر بھی ان کی بدگوئی سے باز نہیں آتے اور تس پر بھی نہیں سمجھتے۔ اگر بالفرض ایسے ہی ہیں جیسے تم کہتے ہو اور واقعی ان سے یہ خطائیں ہوئی ہیں جن کو تم گاتے پھرتے ہو، تب کیا ہوگا؟ ہم نے تو یہ وعدہ کر لیا ہے کہ ان میں سے جو ایمان رکھتا ہوگا اور اس نے اچھے اچھے عمل کیے ہوں گے ہم اس کی خطائیں بھی معاف کر دیں گے اور ان کو اجر عظیم بھی دیں گے، پھر جب وہ سب کے سب کافروں کے ساتھ تیز و تند ہوں اور آپس میں محبت رکھتے ہوں نماز میں ہمیشہ مشغول رہیں، سوائے خدا کی رضامندی اور اس کے افضال کے اور کہیں طلبگار نہ ہوں تو

ہم ان کے گناہ کیونکر معاف نہ کریں اور انہیں کسی عذر سے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کا اجر کیوں نہ دیں، اس سے زیادہ ایمان اور اعمال صالحہ کی اور کیا ضرورت ہے۔

صحابہ سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ غیر مشروط ہے

اگر یہ شرط ہوتی کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ گناہ بھی کسی قسم کا نہ کریں تب بھی ایک بات تھی۔ اس وعدہ میں تو یہ شرط نہ تھی اہل فہم اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ "منھم" جو بعد "عملوا الصلحت" کے بڑھایا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ وعدہ حقیقت میں منکروں کے جواب کے لیے بیان کیا گیا ہے اور اس کی یہ صورت ہے جیسے مرقوم ہوئی ورنہ یہ معنی اگر ہوں کہ کوئی ان میں سے ایمان لایا اور عمل صالح کیے اور کوئی کافر ہی رہا (نعوذ باللہ) تو اس کو ہم جانتے ہیں، شیعہ بھی باور نہ کریں گے۔ اس لیے کہ خدا کے اتنے تو یہ بھی معتقد ہیں کہ خدا جسے مؤمن بتلا دے وہ مؤمن ہی ہے کافر نہیں۔ سو خدا نے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی پہلے ہی گواہی دے دی بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ میں سے بھی اوّل قسم کے ایمان اور اوّل قسم کے اعمال صالحہ کی گواہی دی کیونکہ ایمان میں تو اس سے بڑھ کر کوئی ایمان نہیں کہ خدا سے محبت اس درجہ کو پہنچے کہ اس کے دشمنوں سے کیسے باشد اپنا ہو یا بیگانہ عداوت ہو جائے اور اس کے دوستوں سے کیسے باشد محبت ہو جائے کیونکہ سب کے نزدیک بالاتفاق اعلیٰ مقامات ایمان میں سے ہے اور پھر وہ بھی اس قدر۔

ایمان کے معنی اور مراتب یقین

اور وجہ اس کی ظاہر ہے اس لیے کہ ایمان کہتے ہیں کسی چیز کے یقین کر کے تسلیم کر لینے کو۔ سو اصطلاح شرع میں خاص خدا کے کمالات پر یقین کر لینا اور پھر ان کو تسلیم کر لینا یعنی مثلاً خدا احکم الحاکمین ہے تو اس کے ایمان کے یہ معنی ہوئے کہ اوّل تو خدا میں اس وصف کو یقینی سمجھے پھر تسلیم بھی کر لے، سو حاکم کی حکومت کے تسلیم کرنے کے یہی معنی ہیں کہ اس سے منحرف نہ ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس سب کمالات کو سمجھو۔

علم الیقین

مگر یقین کے چند مرتبے ہیں۔ ایک تو علم الیقین یہ تو ادنیٰ مرتبہ ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی معتبر آدمی سے ہم سنیں کہ فلانی جگہ فلانی چیز ہے۔ ایسا یقین تو ہر ادنیٰ مسلمان کو حاصل ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بالاتفاق سچے ہیں، ان کی خبر سے معلوم ہوا کہ خدا میں سب کمالات ہیں، اگر اتنا یقین بھی نہ ہو تو ایمان ہی نہیں۔

عین الیقین

دوسرا رتبہ عین الیقین یعنی جو کانوں سے سنا تھا وہ آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سو اس مرتبہ میں یقین پہلی مرتبہ سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ سن کر گو کسی چیز کا یقین ہو جائے لیکن وہ بات نہیں ہوتی جو آنکھوں سے دیکھنے میں ہوتی ہے اسی واسطے خوبصورتوں کے قصے اکثر کانوں سے سنتے ہیں اور محبت نہیں ہوتی اور آنکھوں سے دیکھنے میں جو کچھ ہوتا ہے سب جانتے ہیں۔ لیلیٰ اور شیریں اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کے مرنے کے بعد کسی کو محبت نہ ہوئی حالانکہ شہرہ ان کے حسن و جمال کا جتنا اب ہے جب نہ ہوگا بلکہ اس سے صاف یوں معلوم ہو گیا کہ سننے سے کسی کو محبت ہوتی ہی نہیں ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کسی کو تو محبت ہوتی اپنے زمانہ کے خوبصورتوں سے تو محبت ہو جائے اور ان سے نہ ہو، وجہ اس کی اور کچھ نہیں کہ سننے سے بوجہ صورت محبت پیدا نہیں ہوتی ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام تو حضرت یوسف علیہ السلام ہی تھے۔

اور جو کہیں سننے سے ہو بھی تو وہ بھی دیکھنے ہی کا طفیل ہے یعنی آنکھوں سے جو خوبصورت نظر آتے ہیں اور ان کے دیکھنے سے ایک کیفیت ہوتی ہے تو پھر اگر سنتے ہیں کہ فلانا خوبصورت ہے تو اسے اپنے تجربہ سابق پر قیاس کر لیتے ہیں اور اس وجہ سے گونہ اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے ورنہ فقط سننے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے مادر زاد اندھے کو جسے شکل وصورت کا تصور ہی نہیں ہوتا اور خوبصورت اور بدصورت کو ہرگز نہیں سمجھتا اس کو بوجہ صورت کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں بالجملہ عین الیقین کے درجہ میں اگر کوئی چیز جمیل اور مجموعۂ کمال ہوتی ہے تو اس سے بشرط مناسبت طبیعت محبت ہو جاتی ہے۔

حق الیقین

پھر ایک مرتبہ یقین کا حق الیقین ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کو آنکھوں سے دیکھا ہے اس کے استعمال اور برتنے کا بھی اتفاق ہو جیسے پانی کا ایک تو دیکھنا پھر دیکھ کر اسے پی بھی لینا، اب پینے کے بعد یہ احتمال ہے کہ شاید سراب ہو یا دیکھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہو باقی نہیں رہتا۔ غرض یہ مرتبہ یقین ہونے میں عین الیقین سے بڑھ کر ہے، اس مرتبہ میں وہ محبت جو دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

محبت حق الیقین کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے

بلکہ حقیقت میں دیکھنے تو محبت اسی درجہ میں پیدا ہوتی ہے، اس لیے کہ پانی سے جو محبت ہے تو اسی

وجہ سے ہے کہ وہ پیاس کو بجھاتا ہے۔ سو یہ بات تو پینے ہی سے معلوم ہوئی۔ اگر کوئی شخص ایسا فرض کرو کہ اس نے نہ کبھی پانی دیکھا ہو نہ سنا ہو نہ اس کی تاثیر معلوم ہو اور نہ اسے کبھی پانی کی ضرورت ہوئی ہو۔ پھر اسے ایک دفعہ ہی پیاس لگے۔ اس وقت اس کے سامنے اگر پانی آ جائے تو وہ کیا جانے کہ اس میں یہ تاثیر ہے اور اس سے میری پیاس بجھ جائے گی۔ بجز اس کے کہ یا تو خدا اس کے جی میں ڈال دے کہ اسے استعمال کیجئے یا کوئی اسے بتلا دے، اسے ہرگز پانی کی طرف یہ گمان نہ ہوگا۔ لیکن خوبصورتوں کو دیکھنا اس وجہ سے برتنا ہی ہے کہ جیسے گلزار کے دیکھنے سے جی کو راحت ہوتی ہے ویسے ہی ان کے دیکھنے سے جان و دل کو آرام ہوتا ہے۔ بالجملہ عقل سلیم یوں کہتی ہے کہ محبت حق الیقین کے مرتبہ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ واضح ہو گیا۔ اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا تو ان شاءاللہ تعالیٰ اس بحث کو پورا بیان کرتا مگر ناچار ہوں فرصت کم، پھر اپنا حرج اوقات، ادھر جواب خط کی جلدی۔ لہٰذا ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

صحابہ حق الیقین کے مراتب پر فائز تھے اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ میں بھی راسخ تھے

بالجملہ محبت مرتبہ حق الیقین میں پیدا ہوتی ہے اور یہ اعلیٰ قسم یقین کی ہے اور پھر محبت میں اعلیٰ قسم یہ ہے کہ محبوب کے لواحق و توابع تک محبت پہنچ جائے اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کے دشمنوں سے عداوت ہو جائے، سو جب جناب باری تعالیٰ نے سب صحابہ کے حق میں اس بات پر گواہی دی کہ ان کے دل میں ہمارے دشمنوں کی دشمنی اور ہمارے دوستوں کی دوستی ہے تو صاف واضح ہو گیا کہ ان کے دل میں خدا کی محبت پہلے ہے۔

باقی کوئی یوں کہے کہ مسلمانوں سے محبت ہونے کو کیا لازم ہے کہ خدا ہی کے سبب سے ہو، محبت کے بہت اسباب ہیں، نسب کی وجہ سے ہوتی ہے احسان اور سلوک اور دوستی کے سبب سے ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے اور بہت صورتیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس دشمنی کی بہت وجوہ ہیں، جب تک یہ متحقق نہ ہو کہ وہ محبت اور دشمنی خدا کے سبب ہے، تب تک مطلب ثابت نہیں ہوتا۔

جواب اس کا اوّل تو یہ ہے کہ جب کسی وصف کے ساتھ محبت اور دشمنی کو متعلق کرتے ہیں تو عرف میں وہ محبت اور دشمنی اس وصف ہی کی وجہ سے سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ مجھے خوبصورتوں سے محبت ہے یا عالموں سے محبت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی یوں کہے کہ مجھے متکبروں سے عداوت ہے یا کافروں سے عداوت ہے تو کوئی ناانصاف بھی اس کے سمجھنے میں تامل نہیں کرتا

کہ یہ محبت اور یہ عداوت ان اوصاف ہی کی وجہ سے ہے اور یوں کسی کو احتمال بھی نہیں ہوتا کہ شاید کسی اور وجہ سے ہو۔ سو خدا نے بھی "اشداء علی الکفار" کہا ہے یعنی کافروں پر بڑے تیز و تند ہیں اور کافر کے یہی معنی ہیں کہ خدا کا دشمن ہو تو معلوم ہوا کہ ان کی عداوت بوجہ کفر ہے۔ کسی اور وجہ سے نہیں اور جب بوجہ کفر ہوئی تو خدا ہی کی محبت کے سبب ہوئی، ایسے ہی "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" کو سمجھئے، یعنی ایک دوسرے کو جو آپس میں محبت ہے تو فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور آپ کے زمرہ میں داخل ہو جانے کے باعث ہے اور اس کا حاصل بھی وہی ہے کہ خدا کے حلقوں میں سے ہیں اور جب یہ سمجھ کر ہوئی تو وہی خدا واسطے کی محبت ہوئی۔

صحابہ کا مقصود صرف رضائے الٰہی تھا

مع ہذا "يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا" نے اس بات کو خوب ثابت کر دیا کہ ان کے ہر کام میں خدا کی رضا مندی مد نظر ہے، سو کفار سے سختی کی باتیں اور آپس کی عنایاتیں سب خدا کی رضا مندی کے لیے کرتے ہیں اور خدا کی رضا مندی کی طلبگاری عین نشان محبت ہے۔ سوائے محبت کے اور کوئی وجہ رضا کی طلب گاری کی ممکن ہی نہیں اور بہشت کی تمنا میں جو لوگ خدا کی مرضی کے کام کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں مرضی کی طلب نہیں ہوتی، جنت کی طلب ہوتی ہے جیسے فقیر روٹی کی وجہ سے مال داروں کی خوشامد کرتے ہیں تو وہ حقیقت میں ان کی رضا کے طالب نہیں۔ مقصود اصلی ان کا روٹی ہی ہوتا ہے، بالجملہ رضا جوئی محب ہی کا کام ہے۔ الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو کفار سے عداوت اور اپنے لوگوں سے محبت تھی تو وہ فقط خدا ہی کی محبت کا ثمرہ تھا۔

صحابہ کی محبت اور تسلیم سے اوپر کسی محبت و تسلیم کا درجہ ہی نہیں ہے

اور چونکہ محبت مرتبہ حق الیقین میں ہوتی ہے اور وہ اعلیٰ درجہ یقین کا ہے تو لازم آیا کہ سب صحابہ کو خدا کی عظمت اور جاہ و جلال اور کمال اور جمال کا اتنا یقین تھا کہ اس سے اوپر کوئی یقین کا مرتبہ ہی نہیں۔ ادھر تسلیم اس درجہ کو تھی کہ اس کے آثار خود موجود تھے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے خود اس کی خبر دی اور کہا "تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا الخ" اگر تسلیم نہ ہوتی تو یہ اعمال کیوں کرتے اور یہی الفاظ بمعیت جملہ "يَبْتَغُوْنَ الخ" ان کے اعمال صالحہ کی بھی خبر دیتے ہیں تو اب بوجہ اکمل ان کا ایمان کامل اور اعمال صالحہ جن پر وعدہ مغفرت اور اجر عظیم تھا ثابت ہو گیا تو پھر یہ احتمال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہیوں میں سے کوئی مسلمان تھا اور کوئی نہ تھا اور اس وجہ سے "مِنْهُمْ" فرمایا تو یہ شیعوں ہی سے ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک اگر

بدیہیات کا انکار اور محال کی تسلیم ممنوع ہوتی تو سنیوں کے مذہب سے روگرداں ہوکر مذہب شیعہ پر کیوں مستقیم ہوتے، اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا تو اس دعوے کی دو چار دلیلیں بیان کرتا مگر سمجھنے والے اسی رسالہ میں سے اس مطلب کو سمجھ جائیں گے ان کے لیے یہی دلیل بہت ہے۔

حق الیقین کے مراتب میں تفاوت ہے

باقی کوئی یوں کہے کہ صحابہ کو اگر مرتبہ حق الیقین تھا اور وہ اعلیٰ مراتب یقین ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انہوں نے کوئی مرتبہ ہی نہ چھوڑا۔ صحابہ کیوں کہتے ہو رسول کہو تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الیقین میں سو آدمیوں سے اگر ایک خبر سنیں اور اس پر یقین ہو جائے تو وہ بھی علم الیقین ہے اور ہزار سے سنیں تب بھی علم الیقین ہے لیکن بایں ہمہ دوسرا یقین قوی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کوس بھر سے ایک شے دیکھئے وہ بھی عین الیقین ہے اور ایک ہاتھ کے فاصلے سے دیکھئے وہ بھی عین الیقین ہے لیکن دوسری صورت میں جو وضاحت ہے وہ پہلی صورت میں نہیں، اسی طرح ایک دفعہ پانی پیجئے یا تھوڑا سا پیجئے، وہ بھی حق الیقین ہے اور کئی بار پیجئے یا بہت سا پیجئے وہ بھی حق الیقین ہے۔ مع ہذا دوسری صورت میں جو بات ہے وہ پہلی صورت میں نہیں ایک دفعہ میں بسا اوقات چنداں حال معلوم نہیں ہوتا ہاں کئی بار میں البتہ خوب معلوم ہو جاتا ہے۔

الغرض حق الیقین میں شریک ہونے سے مساوات لازم نہیں آئی۔ بایں ہمہ مدار افضلیت کا محبت پر ہے معلوم ہونے پر نہیں، بسا اوقات ایک خوبصورت کو دو آدمی برابر دیکھتے ہیں، ایک کو محبت ہوتی ہے، ایک کو نہیں اور جو ہوتی بھی ہے تو برابر نہیں ہوتی سو صحابہ کو خدا تعالیٰ سے اتنی محبت نہ تھی جتنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے تھی۔

باہمی مناقشات "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کے منافی نہیں ہیں

اب ایک بات قابل بیان کے اور باقی ہے وہ یہ ہے کہ شاید حضرات شیعہ کو موافق مثل مشہور۔ خوئے بدرا بہانہ ہا بسیار۔ صحابہ کی بزرگی کے تسلیم کرنے میں یہ حیلہ اور باقی ہو کہ صحابہ میں باہم اکثر مناقشات ہوئے اور ان کے باہم اکثر رنج رہے اور نزاع ظہور میں آئے۔ چنانچہ طرفین کی کتابوں میں موجود ہے۔ پھر ان کو "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کیونکر ہم کہیں اور جب یہ نہیں تو پھر کس وجہ سے یوں کہا جائے کہ وہ کامل الایمان تھے بلکہ یوں احتمال ہوتا ہے کہ جن سے حضرت امیر کو رنج پہنچایا، وہ ان سے لڑے نہ وہ "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کے مصداق تھے نہ ان پر "آمنوا وعملوا

الصٰلحٰت" صادق آتا تھا اور لفظ "مِنْهُمْ" جو بعد "عملوا الصٰلحٰت" بڑھایا ہے تو انہی کے اخراج کے لیے بڑھایا ہے، اس شبہ کا جواب ہر چند فقط ہمارے ہی ذمہ نہیں کیونکہ بعینہ یہی احتمال خوارج اور نواصب بھی پیش کر سکتے ہیں، شیعوں کو بھی اس اعتراض کا فکر جواب لازم ہے۔

صحابہ کی رنجش کی بناء بھی محبت تھی

مگر بغرض تسکین خاطر شیعہ وسنی یہ معروض ہے کہ رنج دو وجہ سے ہوتا ہے ایک بوجہ عداوت، ایک بوجہ محبت، بوجہ عداوت کی تو صورت اظہر ہے، دشمنوں کو جو دشمنوں سے رنج ہوتے ہیں وہ اسی قسم کے ہیں، باقی بوجہ محبت کے یہ صورت ہے کہ کسی کا دوست اس کے خلاف مرضی اور خلاف توقع کرے تو یہ رنج بوجہ محبت ہے اس لیے کہ اگر اجنبی ایسی باتیں کرتے ہیں تو ان سے کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اس سے خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنج فقط محبت کا ثمرہ ہے، اگر محبت نہ ہوتی تو یہ رنج نہ ہوتا۔ ایسے ہی اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی سمجھ لو تو بہت ہوگا تو یہی ہوگا کہ خدا کے کلام کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ سو (نعوذ باللہ) مثل زرارہ بن اعین اور احول طلق وغیرہ مقتدایان شیعہ جو بشہادت آئمہ اور کتب جھوٹے اور کذاب ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ مذکور ہوگا۔ کچھ خداوند کریم تو جھوٹا اور کذاب نہیں؟ جو اتنا دشوار معلوم ہو مگر جن کو جھوٹی باتوں کے تسلیم کرنے کی خو ہو وہ سچے کلام کو اگرچہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو کیونکر تسلیم کر لیں۔

جن روایات پر تشیع کی بنیاد ہے ان کے راویوں کی ثقاہت کا حال

مع ہذا ہم یوں پوچھتے ہیں کہ سنی تو حسب اعتقاد شیعہ اس قابل ہی نہیں کہ ان کی کتابوں کی روایات کو تسلیم کیا جائے۔ باقی رہی شیعوں کی روایتیں ان کا حال یہ ہے کہ جن راویوں سے شیعہ اپنے دین ایمان کی باتیں لیتے ہیں اور مابین شیعہ اور حضرات آئمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ واسطے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ہشام بن سالم اور میثمی اور صاحب طلق یعنی احول طلق وغیرہم جو ان کے مقتداء اور پیشوا اور احادیث معمول بہا کے راوی ہیں ان کی جو کچھ خوبیاں اور بزرگیاں ہیں اور حضرات آئمہ نے ان کے فضائل بیان کیے ہیں وہ سب تو اس رسالہ میں نہیں آ سکتے، پر بطور نمونہ کچھ معروض ہے کلینی جو اصح الکتب شیعہ ہے اس میں یہ حدیث ہے:

عن ابراهيم محمد بن الخزاز و محمد بن الحسنين قالا دَخَلْنَا عَلٰى اَبى الحسين الرضا عليه السلام فَقُلنا انّ هشام بن سالم والميثمى وصاحب الطلق

يَقُوْلُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَجْوَفُ الى السُّرةِ وَالْبَاقِىْ صَمَدٌ فَخَرَّ لِلّٰهِ سَاجِدًا ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَکَ مَا عَرَفُوْکَ وَلَا وَحَّدوک فَمِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ وَصَفُوْکَ.

''حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ابراہیم بن محمد خزار اور محمد بن حسین بیان کرتے ہیں کہ ہم امام ابوالحسن رضا علیہ السلام کے پاس گئے ہم نے کہا کہ ہشام بن سالم اور میثمی اور صاحب الطلق یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ناف تک تو کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس ہے، آپ سنتے ہی سجدے میں جاپڑے اور یہ فرمایا کہ الٰہی تو پاک ہے، ان عیوب سے نہ ان لوگوں نے تجھے پہچانا اور نہ انہوں نے تجھے وحدہ لاشریک لہ جانا، اس سبب سے جو کچھ ان کے منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔''

دوسری روایت بھی کلینی ہی کی ہے:

عن علی بن حمزہ قَالَ قُلْتُ لابی عبداللّٰہ علیہ السلام سَمِعْت ھشام بن الحکم یَرْوِیْ عنکم انَّ اللّٰہ جِسْمٌ صَمَدِیٌّ نوریٌّ معرفَةٌ ضَرُوْرِیٌّ یَمُنُّ بِھَا عَلٰی مَنْ یَشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ فَقَالَ سُبْحَانَ مَنْ لَا یَعْلَمُ اَحَدٌ کَیْفَ ھُوَ اِلَّا ھُوَ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْر لَا یُحَدُّوَ لَا یُحَسُّ وَلَا یُحِیْطُ بِہٖ شَیْءٌ وَلَا جِسْمٌ وَلَا صُوْرَةٌ وَلَا تَحْدِیْد.

''حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ابن حمزہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا کہ ہشام بن حکم تم سے روایت کرے ہے کہ خدا جسم ہے ٹھوس، سو اس کے جواب میں حضرت امام ہمام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچھ ویسا ہی فرمایا جیسا امام ابوالحسن رضا نے فرمایا تھا، مطلب قریب قریب ہے۔''

اب ان روایتوں کو دیکھئے کہ مقتدایان امامیہ نے کیا کیا معرفتیں تراشی ہیں، پھر تس پر اماموں کا حوالہ دیتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعضے ان کے مقتداء اور پیشواء خدا کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا ازل میں جاہل تھا، جیسے زرارہ بن اعین اور بکر بن اعین اور سلیمان جعفری اور محمد بن مسلم وغیرہم اور کہاں تک بیان کروں۔ ایسے ایسے بزرگواروں سے دین کی باتیں روایت کرتے ہیں اور پھر ان روایتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور ان کا نام صحاح رکھتے ہیں اور یہ افسانے انہی کی معتبر کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں۔ یقین ہے کہ علماء سب تسلیم کریں گے۔

اور اگر موافق عادت بزرگان (دروغ پسندگی) سنیوں کے سامنے جھوٹ بول جائیں اور انکار کر جائیں تو اپنے دل میں تو ضرور ہی منفعل ہوں گے۔ سبحان اللہ! اس بات کی رعایت تو سنیوں میں ہے کہ جن کتابوں کا صحاح نام رکھتے اور انہیں معتبر سمجھتے ہیں ان میں بجز پارساؤں اور متقیوں اور دین داروں کے اور کسی سے

روایت نہیں لاتے اور جو لاتے بھی ہیں تو اس غرض سے کہ کوئی اس روایت کی وجہ سے دھوکا نہ کھا جائے۔ اسی لیے بتلا جاتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا موضوع یعنی بنائی ہوئی جھوٹی روایت ہے۔

الغرض شیعوں کے دین کی روایتوں کا جب یہ حال ہے تو کتب تواریخ تو نور علیٰ نور ہی ہوں گی اور سنیوں کی روایت خود قابل اعتبار نہیں تو اس صورت میں جو روایتیں کہ نزاع صحابہ اور باہم کی چپقلش پر دلالت کرتی ہیں۔ کلام اللہ کے مقابلہ میں کیونکر قابل اعتبار ہوں گی۔ بہر حال کلام اللہ متواتر تو ہے۔ جس صورت میں کلام اللہ میں "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" ہو اور اس کے تمہارے نزدیک یہی معنی ہوں کہ ان میں ہرگز کبھی رنج ہوتا ہی نہیں تو موافق قاعدہ اُصول کے ان روایات کا اعتبار نہ ہوگا جو کلام اللہ کے مخالف ہیں، اب بفضلہٖ تعالیٰ جمیع اُمور متعلقہ آیت مرقومۂ بالا سے فراغت پائی لازم یوں ہے کہ ایسی آیت بھی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی بزرگی پر ایسے دلالت کرے کہ اظہر من الشمس ہو اور بسہولت فہم میں آ جائے اور اس روایت سے ان کا حسن خاتمہ بھی معلوم ہو جائے بیان کی جائے، شاید کوئی راہ پر آ جائے۔ لہٰذا آیت ششم معروض خدمت ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتبعوھُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ وَاَعَدَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ○

"حاصل اس کے معنوں کا یہ ہے کہ جو لوگ قدیم ہیں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیچھے آئے نیکی سے، اللہ راضی ان سے اور وہ راضی اس سے اور تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے لیے باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، رہا کریں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ، یہی ہے بڑی مراد۔"

اس آیت کے بعد ہم جانتے ہیں کہ اگر حق پرستی مدنظر ہوگی تو مولوی عمار علی صاحب تو کس گنتی میں ہیں، شیعہ صد سالہ بھی جس کی رگ و پے میں تشیع سما گیا ہو حق بول اُٹھے اور کیونکر حق نہ بولے، جناب باری تعالیٰ نے اس آیت میں منکران اکابر صحابہ کے لیے حیلہ و حجت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

آیت ہجرت میں رضائے الٰہی کا مدار صرف ہجرت پر ہے

لہٰذا ارتداد کا الزام بھی مفید مقصد نہ ہوگا!

اگر ایمان کا ذکر ہوتا یا اعمال صالحہ کا ذکر ہوتا تو شیعہ اور خوارج اور نواصب آنکھیں بند کر کے یوں بھی

کہہ سکتے کہ صاحب اس میں مؤمنوں اور اچھے عمل والوں کے لیے خدا کا وعدہ ہے۔ سو ہم کہتے ہیں کہ وہ دائرہ ایمان ہی سے خارج تھے سبقت ہجرت خلفاء ثلاثہ اور حضرت زبیر اور حضرت طلحہ وغیرہم مہاجرین اوّلین کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں جو انکار کر سکیں اور کہہ دیں کہ صاحب کسی نے تہمت لگادی ہوگی۔ خصوصاً خلیفہ اوّل کی ہجرت کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہجرت سے بھی سابق ہے اور مہاجرین اوّلین تو انہیں لوگوں کی نسبت اوّل گنے جائیں گے جو بعد جنگ بدر کے آئے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو مہاجرین اوّلین میں سے بھی مہاجر اوّل نکلے۔ اس صورت میں تو اسی آیت سے ان کی افضلیت نکل آئی کیونکہ درصورت یہ کہ اس آیت میں جتنے وعدے ہیں وہ سب سبقت ہجرت پر (مثلاً) موقوف ہوئے تو جو کوئی سبقت میں بھی سابق ہوگا وہ استحقاق وفاء وعدہ میں بھی اوّل نمبر ہوگا اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو البتہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اتنے پہلے گھر چھوڑ کر آئے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تک پہنچے، باقی سب ان سے پیچھے ہی نکلے۔

ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ منورہ کے درمیان عجیب وغریب فرق

اور ہجرت حبشہ اگرچہ ہجرت مدینہ منورہ سے سابق ہے لیکن اس کی وجہ سے سابق ہونا چنداں موجب افضلیت نہیں۔ اس ہجرت کی اباحت کا باعث تھا تو فقط قلت صبر تھا۔ مکہ معظمہ میں رہ کر پکا رہنا اور احکام خداوندی کا بجالانا بہت دُشوار تھا، ثبات ایمان اور حفظ جان کے لیے ضعفا کو رُخصت ہوگئی تھی اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہجرت حبشہ نہ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حکم نہ ہونے کی اگر کوئی وجہ بتکلف نکال بھی لیجئے تو اس کا کچھ جواب ہی نہیں کہ جس نے حبشہ کی جانب ہجرت نہ کی اس پر کچھ عتاب نہ ہوا اور مدینہ منورہ کی ہجرت بغرض امداد دین تھی، اس کو رُخصت نہیں کہہ سکتے۔ عزیمت ہی کہئے تو اوّل درجہ کی عزیمت کہئے۔ اسی لیے اس کے تارکین مورد عتاب رہے۔ ہر چند ہجرت حبشہ کا رُخصت ہونا اور ہجرت مدینہ منورہ کا عزیمت ہونا قطع نظر ظاہر ہونے کے اس تقریر سے اور بھی واضح ہوگیا مگر مزید توضیح کے لیے اس قدر اور بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ہجرت مدینہ میں جان پر کھیلنا تھا اور ہجرت حبشہ میں جان کا بچانا، اس میں دین کا بڑھانا تھا۔ اس میں اپنی نماز روزہ کا بجالانا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد ونصرت تھی، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تنہا چھوڑ جانا۔ اس میں مارنا مرنا، اقرباء سے رؤساسے جہاد کرنا، اس میں اعداء کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سلامت گزرنا: ''ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا'' غرض ہجرت حبشہ کوئی فضیلت قابل تعریف نہیں، خصوصاً تعریف خداوندی۔

آیت السابقون میں ہجرت سے مراد صرف ہجرت مدینہ منورہ ہے

اسی لیے فریقین میں سے کسی نے اس ہجرت کو مصداق آیات تاکید ہجرت یا آیات فضائل ہجرت نہیں سمجھا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ آیت اور نیز آیات ہجرت مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں اور پھر اس آیت میں اور نیز اور آیات میں مہاجرین کے فضائل میں انصار کو پھر ذکر فرمایا اور سورۂ حشر میں مہاجرین کے حال میں لفظ "یَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ" بڑھایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ فضیلت ہی ہجرت کے لیے ہے جو انصار کی نصرت کے ہمدوش اوران کے کام سے ہم آغوش ہے، سو ایسی ہجرت اگر ہے تو مدینہ منورہ کی ہجرت ہے۔ حبشہ کی ہجرت میں نہ انصار تھے نہ نصرت تھی، بہر حال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیر ہم کی سبقت ہجرت میں کچھ کلام نہیں۔

آیت ہجرت سے صرف رضائے الٰہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا ایمان اور اعلیٰ درجہ کے اعمال صالحہ بھی ثابت ہوتے ہیں

پھر اس سبقت ہجرت ہی کے سبب خداوند کریم یوں فرماتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا، سو اوّل تو یہی کفایت کرتا تھا کیونکہ رضا سے آگے کوئی مقام ارفع نہیں۔ جب خدا ان سے راضی ہوا تو ان میں کمال ایمان بھی اس درجہ کو ہوگا کہ کہا نہیں جاتا اور اعمال صالحہ بھی ان کے قرار واقعی صالح ہوں گے۔ سو اوّل تو موافق آیت "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا" مرقومہ بالا کے ان کی مغفرت میں کلام کی گنجائش نہ رہی کیونکہ بزرگان مذکور سب کے سب غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

دوام جنت کی خوشخبری سے بڑھ کر حسن خاتمہ کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے

مع ہذا پھر یوں بھی ارشاد فرمایا کہ ان کے لیے جنتیں تیار کر رکھی ہیں، پھر وہ بھی ہمیشہ کے لیے، اس پر بھی کوئی ان کی بزرگی میں شک کرے تو بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ بزرگی کے معنی اس کے نزدیک یہ ہوں کہ خدا اس سے ناخوش ہو اور اس کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہو، سو حضرات شیعہ جو ان بزرگواروں کی بزرگی میں کلام کرتے ہیں اور ان کے دشمنوں کو اکثر بزرگ سمجھتے ہیں تو شاید اسی اصطلاح کے موافق سمجھتے ہیں لیکن اس صورت میں لازم آئے گا کہ حضرت امیر سے بھی دست

بردار ہوں کیونکہ وہ بھی بشارت میں داخل ہیں۔ بہر حال ان اولیاء اللہ کے برا کہنے والے ان کو کیا کہتے ہیں، خدا کو جھٹلاتے ہیں، سو ان کا کافر یا فاسق کہنا، اپنا کافر یا فاسق کہنا ہے۔ آفتاب کو کوئی بے نور بتلائے تو وہ آفتاب کو کیا اپنی آنکھوں کو بے نور بتلاتا ہے۔

آیات فضائل صحابہ میں جو شبہات شیعہ پیش کریں گے، وہی بعینہ خارجی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پیش کر سکتے ہیں

اس کے بعد اتنی اور گزارش ہے کہ بعضے ہٹ دھرم شاید یوں تکرار کریں کہ خدا پہلے راضی ہو گیا ہو، اور پھر جب حضرت امیر سے مخالفت کی ہو تو ناراض ہو گیا ہو اور ان کے لیے جو جنتیں تیار کر رکھی ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو عذاب نہیں ہونے کا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اوّل عذاب ہو لے اور پھر وہ جنتوں میں چلے جائیں تو اس کا جواب ہر چند قابل جواب نہیں۔ خصوصاً شیعہ کے مقابلے میں کیونکہ خوارج بھی بنسبت حضرت امیر کے اس قسم کی آیات میں بعینہ یہ احتمال پیدا کر سکتے ہیں یہاں تک کہ جن آیات میں مغفرت کا ذکر آیا ہے اسے بھی یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ مغفرت ہے جو بعد عذاب کے ہوگی لیکن نقل مشہور ہے کہ "حیلہ جو را تا پدروازہ باید رسانید"

صحابہ کیلئے قیامت میں رُسوائی نہیں اور کفار اور فساق کیلئے رضائے الٰہی نہیں

اس لیے کہا جاتا ہے کہ اوّل تو سورۂ تحریم میں یوں ارشاد ہے "يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ"، یعنی "جس روز کہ نہ رسوا کرے گا اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں" سو ان کے ایمان میں تو شیعہ بھی کلام نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کلام اللہ موجود ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ" یعنی اللہ راضی نہیں ہوتا کافروں سے بلکہ یوں بھی آیا ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ" یعنی اللہ راضی نہیں ہوتا فاسقوں سے سو جب خدا ان سے راضی ہوا تو ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانے میں تو کچھ شک نہ ہوا بلکہ اس بات میں بھی تردد نہ رہا کہ وہ ایک زمانہ میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زمان حیات میں سے) صالحین میں سے تھے، فاسق تک نہ تھے تو بیشک موافق وعدہ الٰہی کے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیامت کو معزز اور محترم رہیں گے۔ پھر عذاب آخرت کے کہ اس سے بڑھ کر کوئی رسوائی نہیں کیا معنی۔ مگر شاید ان اُلٹوں سمجھ کے ماروں کے نزدیک یہی معنی عذاب کے ہوں۔ دوسرے یہ کہ سورۂ انبیاء میں یوں ارشاد پاک ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَھُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی اُولٰٓئِکَ عَنْھَا مُبْعَدُوْنَ ۝ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَھَا. وَھُمْ فِیْ مَا اشْتَھَتْ اَنْفُسُھُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ط ھٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

"حاصل اس کا یہ ہے جس کے لیے ہمارے یہاں عمدہ مرتبہ مقرر ہوا ہے وہ اس دوزخ سے دور رہیں گے نہیں سنتے کے اس کی آہٹ تک اور وہ اپنی جی چاہتی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے، نہ غم ہوگا ان کو اس بڑی گھبراہٹ میں اور لینے آویں گے ان کو فرشتے یوں کہتے ہوئے یہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ تھا۔"

اب خیال کیجئے کہ جن سے خداوند کریم وعدہ "فوز عظیم" فرمائے اور تسلی آمیز کلام سے ان کو اطمینان دلائے، ایسوں کو مستحق عذاب جاننا نااہلوں کا کام ہے اور وعدہ کا پہلے سے مقرر ہونا آپ ظاہر ہے کہ ابھی سے وعدہ ہولیا اور وہیں وعدہ کے موافق تسلیاں ہولیں، پھر ان کے لیے عذاب کا ہونا بجا اس کے نہیں ہوسکتا کہ (نعوذ باللہ) خدا اپنے وعدے سے ہٹ جائے؟ سو خدا تعالیٰ شیعان علی کی طرح سے تو ہے ہی نہیں۔ (نعوذ باللہ منہا) کہ آج تقیہ کر کے سب کچھ کہہ لیا پھر وقت پر آنکھیں بدل لیں۔

صحابہ کے مشاجرات نہ کفر تھے نہ فسق کیونکہ دونوں رضاء کے منافی ہیں

اس تقریر سے یہ واضح ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محاربہ یا شکر رنجی نہ موجب کفر ہے جیسے اکثر شیعہ کہتے ہیں نہ موجب فسق نہیں تو خدا لوگوں سے کیوں راضی ہوتا، اس لیے کہ وہ خود فرماتا ہے "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عن القوم الْکٰفِرِیْنَ. اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ" بلکہ انکار امامت حضرت امیر بھی موجب کفر و فسق نہیں کیونکہ تمام جماعت مہاجرین و انصار سوا دو چار آدمیوں کے سب ان کی امامت کے شیعوں کے نزدیک منکر تھے اور اسی کی مؤید نہج البلاغت میں جو اصح الکتب شیعہ ہے حضرت امیر سے دوبارہ محاربہ امیر معاویہ یوں مروی ہے "اَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ اِخْوَانَنَا فِی الْاِسْلَامِ عَلٰی مَا دَخَلَ فِیْهِ مِنَ الزَّیْغِ وَالْاِعْوِجَاجِ" یعنی "ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے اس سبب سے لڑتے ہیں کہ اسلام میں کچھ کجی کی باتیں داخل ہوگئی ہیں۔" اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ منکر امامت حضرت امیر اور ان سے لڑنے والے کافر نہیں اور امیر معاویہ باوجود اس مخالفت اور انکار امامت کے چنانچہ سب کو معلوم ہے حضرت امیر کے نزدیک مسلمان ہی تھے۔ اب اگر شیعہ مذہب کو تھامنا چاہیں تو ان روایات کی تغلیط اور تکذیب کریں جن سے محاربات صحابہ اور مشاجرات ان کے حضرت امیر کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں۔ نہیں تو یہی کریں کہ کلام اللہ میں سے ان آیات کو بن پڑے تو اڑا دیں۔ آخر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے حضرت امیر کے استحقاق امامت کے مخفی کرنے کے لیے گیارہ ہزار آیتوں کے قریب اُڑا دیں حالانکہ واجبات کا مخفی کرنا سخت گناہ ہے۔ شیعہ تو بزعم خود نیک ہی کام کریں گے اور جب حضرت امیر سے لڑنا اور ان کی امامت کا انکار تک موجب کفر و فسق نہ ہوا حالانکہ امامیہ کے نزدیک مثل شہادتیں اقرار امامت حضرت امیر بھی جزء ثالث ایمان ہے تو اور گناہ جو اس سے کمتر ہیں وہ کاہے کو موجب کفر و فسق ہوں گے۔ اس صورت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے اصحاب بھی اس طعن سے شیعوں کے عقائد کے موافق بری ہونے چاہئیں۔

بہرحال آیت السابقون نے شیعوں کو جواب دندان شکن سنایا نہ بن پڑے ہے کہ اصحاب ثلاثہ وغیرہم مذکورین کی نسبت یوں کہیں کہ وہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مسلمان ہوئے کیونکہ یہ آیت سورۂ توبہ میں ہے اور سورۂ توبہ کل ایک دو برس پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نازل ہوئی ہے۔ یہ سب صاحبان مکہ میں مسلمان ہو لئے تھے نہ اس کی گنجائش کہ لفظ باحسان ہی کو (ملے یا نہ ملے) دھینگا دھینگی سے مہاجرین اور انصار کے ساتھ ملا کر کچھ باب گفتگو کشادہ کریں کیونکہ "اتبعواھم" کے متعلق ہے اور پھر وہ جملہ ہے اور جملہ بھی موصولہ ماقبل تک کیونکر لے جائیں؟

عقیدۂ تفضیل آئمہ پر آیت "اعظم درجۃ" کی ضرب کاری

مع ہذا طرفہ تماشا یہ ہوگیا کہ اس آیت اور دو تین دوسری آیتوں کے وسیلے سے جو اس آیت کے ذیل مذکور ہوئیں سنی اصحاب ثلاثہ کیا بلکہ تمام مہاجرین اور انصار کا ایمان ثابت کر کے امامیہ کے ایک اور عقیدہ کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔ وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرات آئمہ سب کے سب اُمتیوں سے تو کیا انبیاء سے افضل ہیں اور وجہ اس عقیدہ کی پامالی کی یہ ہے کہ سورۂ توبہ ہی میں (ان صحابہ کے حق میں جو ایمان بھی لائے اور ہجرت بھی کی اور جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد بھی کیا) یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کا مرتبہ اور اُمتیوں سے اعلیٰ ہے۔ پھر اس میں کچھ تخصیص امام اور غیر امام کی نہیں تو معلوم ہوا کہ سوائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور آئمہ اطہار اس رُتبہ کو بھی نہ پہنچے تھے جو ان صحابہ کا ہے۔ نبی کا رُتبہ تو درکنار۔ تسکین خاطر کے لیے وہ آیت مرقوم ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَاللّٰهِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○

"یعنی جو لوگ کہ ایمان لائے اور انہوں نے وطن چھوڑ دیا اور خدا کی راہ میں مال و جان سے

جہاد کیا وہ سب میں بڑے درجہ والے ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں، بشارت دیتا ہے ان کو رب ان کا، اپنی رحمت اور اپنی رضامندی اور باغوں کی جن میں ان کے لیے دوام کی نعمت ہے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے کیوں نہ ہو اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔"

باب عقیدۂ بدا کی تفصیل میں!

بدا کی پرخارداری اور علمائے شیعہ کا اضطراب

اب حضرات شیعہ سے بجز اس کے کچھ نہیں بن پڑتی کہ یا تو حق بول اُٹھیں یا یہ موافق مثل مشہور "الضرورة تُبِیحُ المحظورات" بحکم ضرورت پھر مذہب قدیم کی طرف رجوع کریں اور یوں کہیں کہ ہمیں کلام اللہ سے وہی ثابت ہوتا ہے جو سنیوں کا مطلب ہے لیکن خدا کا کیا اعتبار؟ جیسے اور بہت سے اُمور میں۔ (ہمارے عقیدہ کے موافق آج کوئی مانے یا نہ مانے) خدا کو بدا واقع ہوا ہے۔ صحابہ کی شان میں اور سنیوں کے حق میں اور کلام اللہ کی حفاظت میں بھی بدا واقع ہوا۔ پہلے یوں ہی ارادہ ہو جیسا کلام اللہ میں فرمایا، بعد میں رائے بدل گئی ہو اور یہی معنی بدا کے ہیں۔

بدا کے ایک معنی

چنانچہ نظام الدین جیلانی نے جن کو آج کل کے شیعہ شاید منافق بتلاتے ہیں، رسالہ علم الہدا ے فی تحقیق البداء میں لکھا ہے "یُقَالُ بَدَا لَهٗ اِذَا ظَهَرَ لَهٗ رَاْیٌ مُخَالِفٌ لِلرَّاْیِ الْاَوَّلِ" یعنی کہا کرتے ہیں کہ فلانے کو بدا واقع ہوا جب اس کو پہلی رائے کے مخالف کوئی دوسری رائے سوجھے، ملا نظام الدین جیلانی مذکور اسی رسالہ میں لکھتا ہے کہ شیخ ابوجعفر طوسی اور شیخ ابوالفتح کراجکی کا بھی بدا کے معنوں میں یہی مذہب ہے۔ اس لیے کہ شیخ طوسی نے عدۃ میں اور شیخ کراجی نے کنز الفوائد میں یہی تحقیق کی ہے۔

بدا کے دوسرے معنی

مگر شریف مرتضی نے ذریعہ میں جو کچھ تحقیق کر کے لکھا ہے (اور طبرسی کے کلام میں سے بھی کچھ اس کی بُو آتی ہے) وہ اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ لکھتے ہیں معنی "قولنا بداله تعالٰی انّه ظَهَرَ لَهٗ مِنَ الْاَمْرِ مَالَمْ یَکُنْ ظَاهِرًا" یعنی "ہم جو کہتے ہیں کہ خدا کو بدا ہوا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کو کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جو پہلے نہ تھی۔" پھر اس کے بعد ملا نظام الدین لکھتے لکھتے یوں لکھتا ہے کہ حاصل یہ ہے کہ خدا کو اشیاء نو پیدا کا علم ان کے وجود کے بعد حاصل ہوتا ہے اور پھر

اس کے بعد اپنی تحقیق لکھتا ہے اور وہ تحقیق دوسرے معنوں پر منطبق آتی ہے وہ یہ ہے کہ خبر میں بھی بدا ہوتا ہے یعنی یوں بھی کبھی ہوتا ہے کہ آئندہ بات کی خبر دی کہ یوں ہوگی اور وہ اس طرح نہ ہو۔

بدا کے تیسرے معنی

اب سنئے کہ متاخرین امامیہ کو کچھ بدا کے باب میں بھی ہوش آئی ہے اور سنیوں کے اعتراضوں کو سن سنا کر کچھ فکر آبرو ہوا ہے۔ اس لیے بات بدل کر اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ یہ بات فقط خاص اس علم میں ہوتی ہے جس کی کسی کو خبر نہیں کرتے اور جو علوم کہ انبیاء کو بھیجے جاتے ہیں، اس میں خدا جھوٹ نہیں بولتا، سو اگر اس بات پر امامیہ جم جائیں تو سنیوں کی طرف سے ان کو مرحبا اور آفرین اس صورت میں کلام اللہ کی بات تو باون تولے پاؤرتی کی ہوگی۔ پھر ہمیں کیا ضرورت کہ بداء کے عذر کی وجہ سے کسی اور طرح سے اثبات مدعا کریں۔

مگر مانتے ہیں ملا نظام الدین کو کہ سنیوں کے طعن اُٹھانے اور مذہب کے بٹا لگ جانے سے گھبرائے مذہب کو سنبھالا اور متاخرین کی نہ مانی۔ اس تخصیص میں جو متاخرین بنسبت علم مخصوص کے کرتے تھے ان کی تکذیب کی اور بہت سی روایات احادیث مذہب شیعہ نقل کر کے متاخرین کی بات کو خاک میں رُلا دیا اور کیوں نہ رُلاتے آخر شیعوں میں بڑے محقق ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ اس باب خاص میں رسالہ لکھا۔ مع ہذا اس کا کہنا بھی سچ ہے، جھوٹ بولنا تو جب ہو جب خدا جان بوجھ کر کچھ کا کچھ کہہ دے اور جب (نعوذ باللہ) خدا ہی کو غلط معلوم ہو تو پھر خدا کا کیا قصور؟ جو متاخرین کہتے ہیں کہ خدا اپنے دوستوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔

بدا کی تین قسمیں

بالجملہ ان سب روایات سے جو محقق مذکور نے اثبات مدعا کے لیے نقل کیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بدا کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو بدا فی العلم یعنی خدا نے پہلے سے کچھ جان رکھا تھا مگر بعد میں حقیقت الامر کچھ اور معلوم ہوئی۔ دوسرے بدا فی الارادہ یعنی پہلے کچھ ارادہ تھا، پھر یوں معلوم ہوا کہ یہ ارادہ ٹھیک نہیں، تیسرے بدا فی الامر یعنی پہلے کچھ حکم دیا۔ پھر بعد ازاں یوں معلوم ہوا کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی، اس حکم کو بدل کر دوسرا ایسا حکم جس میں وہ نقصان نہ ہو بلکہ مصلحت وقت معلوم ہوتی ہو، صادر فرمائیں۔

بدا اور نسخ میں ایک اشتباہ کا ازالہ

یہ معنی آخر خوب ذہن نشین رکھنے چاہئیں، ایسا نہ ہو کہ نسخ سے مشتبہ ہو جائیں کیونکہ نسخ حقیقت

میں اسے کہتے ہیں کہ ایک حکم کا زمانہ آخر ہو جائے اور دوسرے حکم کا زمانہ آ جائے۔ مثلاً رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم ہے۔ جب عید ہوئی وہ زمانہ آخر ہوا اور افطار کا زمانہ آ گیا۔ اسے یوں نہیں کہتے کہ پہلے حکم میں کچھ غلطی تھی اس لیے موقوف کیا گیا بلکہ وہ حکم اسی زمانہ تک تھا، اس کے بعد دوسرے حکم کا زمانہ آ گیا۔ اتنا فرق ہے کہ کہیں پہلے سے زمانہ کی مقدار کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ جیسے مثال مذکور میں اطلاع ہے اور کہیں نہیں ہوتی وقت ہی پر ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تھی۔ یہ بات سوائے خداوند کریم کے کوئی نہیں جانتا تھا اور جو کوئی جانتا بھی تھا تو یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زمانہ کس وقت آئے گا۔ القصہ بدا فی الامر جسے شیعہ بدا فی التکلیف کہتے ہیں اور ہے اور نسخ اور ہے بدا کی یہ صورت ہے کہ رمضان کے مثلاً روزے رکھنے کا حکم دیا اور جب تک کوئی نقصان اس میں معلوم نہ ہوتا تھا اور اسی لیے جب تک یوں نہ ٹھہرایا تھا کہ یہ حکم فلاں وقت تک رہے گا۔ پھر یکایک یہ سوجھی کہ مصلحت وقت اس کے خلاف میں ہے، اس لیے اس کو بدل دیا۔

بدا کی تینوں قسمیں ایک دوسرے کو لازم ہیں

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اس ہیچمدان کی گزارش بھی سنئے کہ درصورت بدا فی التکلیف کے واقع ہونے کے بدا فی الارادہ بھی جسے بدا فی التکوین بھی کہتے ہیں لازم ہوگا کیونکہ بدا فی الارادہ تو اسے ہی کہتے ہیں کہ بسبب کسی مصلحت تازہ کے پہلے ارادہ سے پلٹ جائیں تو جب مصلحت ہی کے لحاظ سے حکم بدلا گیا تو پہلا ارادہ جو اس حکم کی ہمیشگی کا تھا وہ آپ بدلا گیا اور اسی طرح بدا فی الارادہ کو بدا فی العلم جسے بدا فی الاخبار بھی کہتے ہیں لازم ہے اس لیے کہ ارادہ تو نئی مصلحت کے معلوم ہونے پر بدلتا ہے، پھر جب مصلحت تازہ معلوم ہوئی تو لاجرم یہ بات صحیح ہوئی کہ جو علم اب حاصل ہوا وہ پہلے نہ تھا اور جو پہلے تھا وہ اب غلط معلوم ہوا۔ اسی کو بدا فی العلم کہتے ہیں۔

سو اگر شیعوں میں سے کوئی بدا فی الامر اور بدا فی الارادہ کا تو قائل ہو اور سنیوں کے سامنے بدا فی الاخبار سے مکر جائے تو یہ مکر جانا پیش نہ جائے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شیعوں کے نزدیک مسئلہ بدا مجمع علیہا ہے۔ اگر وہ آیات مذکورہ کے دباؤ سے سنیوں سے دامن چھڑانے کو یوں کہنے لگیں کہ اگر تم اپنے پیشواؤں کی بزرگی کلام اللہ سے ثابت کرتے ہو تو ہم نے مانا کلام اللہ میں ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو لیکن کلام اللہ کا (نعوذ باللہ) کیا اعتبار؟ خدا کی رائے گھڑی گھڑی بدلتی رہتی ہے اور (نعوذ باللہ) غلط صحیح رطب یابس سب اس کے کلام میں ہوتا ہے، ہمارے آئمہ کو البتہ علم "ما کان ما یکون" تھا ان کے اقوال سے اگر ان کی بزرگی ثابت ہو تو بیشک ہم تسلیم کر لیں۔

عقیدۂ بدا کے نتائج (۱) چاردہ معصوم کی مغفرت مشکوک

اس صورت میں ہمیں بھی یوں لازم ہے کہ شیعوں کی اس حجت کو بھی ختم کردیں۔ اس لیے سامعہ خراش اہل انصاف ہوں کہ اگر یہی بدا ہے تو اوّل تو ہمیں چاردہ معصوم کی مغفرت میں کلام ہے۔ (نعوذ باللہ) اور شیعوں کا تو کیا ذکر؟ جیسے اصحاب کرام سے وعدہ ہائے مغفرت کر کے بعذر بدا پھر گئے، اگر حضرات آئمہ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی ہو تو فرمایئے اماموں کا خدا پر کیا دباؤ ہے؟ خاص کر یہ بہانہ بھی موجود ہو کہ ان کے تقیہ اور نامردہ پن نے تمام دین کا ستیاناس کر دیا۔

امام آخرالزماں کی طویل روپوشی اندیشناک ہے

پھر اس پر امام آخرالزماں نے تو (نعوذ باللہ) یہ ستم ڈھائے ہیں کہ باوجودیکہ دوست دشمن کی خبر ہے یہ بالیقین معلوم ہے کہ تمام ملک ایران میں مخلصانِ شیعہ سالہا سال سے منتظر زیارت اور مشتاقِ ملازمت بیٹھے ہیں۔ جان و مال فدا کرنے کو تیار ہیں، ادھر ہندوستان میں روز بروز ترقی تشیع ہے، امام کے انتظار میں مرے جاتے ہیں، اگر حسب حال ان کے یہ شعر کہا جائے تو بجا ہے:

اے اشتیاق رویت دلہا کباب کردہ سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

مع ہذا اپنی موت اپنے اختیار میں ہے اور اس پر یہ معلوم کہ میں فلانے وقت سے پہلے نہ مروں گا، باوجود اس فراہمی اسباب اور انتظار احباب کے خدا جانے کیا نامردانہ پن ہے کہ روز بروز زیادہ ہی چھپتے جاتے ہیں اور باہر نہیں آتے۔ اگر خدانخواستہ کچھ اندیشہ ہوتا تو کیا ہوتا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کل تین سو تیرہ ہی آدمی مجتمع ہونے پائے تھے جو جہاد شروع کر دیا، پھر وہ بھی بزعم شیعہ اکثر منافق اور منافق بھی نہیں تو ایسے مخلص بھی نہ تھے جیسے امامیہ زمانہ امام زماں سے اخلاص و محبت رکھتے ہیں اور مخلص نہ تھے جبھی تو شہادت امامت حضرت اس پر چھپالی بلکہ خلافت اور سوا اس کے اور حقوق اہل بیت دبا بیٹھے، بہر حال جائے حیرت ہے کہ بایں ہمہ سامان وامن و اطمینان غیبت امام کا انتہا ہی نہیں، کہیں اماموں کا بنسبت "ما کان ما یکون" کے عالم ہونا غلط ہے؟ یا شیعوں کی دوستی غلط؟ اور ہم جانتے ہیں کہ یہی صحیح ہے ایک دوستی کی آڑ میں ہزار عیب اماموں کے ذمے لگاتے ہیں، چنانچہ کچھ کچھ تو اس رسالہ کے دیکھنے والوں کو بھی واضح ہو جائے گا۔

پسر امام کو امام بنانے میں بھی شاید خدا سے بدا واقع ہو گیا ہو

الحاصل امام زماں بایں ہمہ انتظار احباب اور فراہمی اسباب ادھر، پھر ہر طرح سے بے اندیشہ غار

سر من رائے سے باہر تشریف نہیں لاتے اور دین محمدی اور اُمت احمدی کی خبر نہیں لیتے کہ کس گمراہی میں پھنسی ہوئی ہے دین ابوبکر بجائے دین محمدی اور بیاض عثمانی بجائے کلام ربانی دوازدہ امام کے بدلے ابوحنیفہ شافعی اور اس گمراہی سے زیادہ اور کیا گمراہی ہوگی جس کا انتظار ہوگا۔ الغرض اماموں کو تو یہی عذر تھا کہ ہم بے بس و بے کس ہیں، امام زماں جو باہر تشریف نہیں لاتے تو ان کو کیا عذر ہے در صورت یہ کہ بدا کو ہم تسلیم کرلیں تو توجیہ اس بے انتظامی دین کی امامیہ کے عقائد کے موافق بجز اس کے سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا سے دوازدہ امام کے مقرر کرنے میں بڑی چوک ہوئی۔ ابوبکر، عثمان کو مقرر کرنا تھا جو دین کو رونق دیتے اور بے انتظامی نہ ہونے دیتے۔ القصہ امامیہ سے بجز اس کے اور کچھ توجیہ بن نہیں پڑتی۔ ہاں اگر اس کے قائل ہو جائیں کہ خدا کے ذمہ یہ واجب نہیں کہ جو بندہ کے حق میں اصلح ہو وہ ہی کیا کرے تو البتہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں "لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ" یعنی خدا سے کوئی یوں نہیں پوچھ سکتا کہ یوں کیوں کیا اور خدا سب سے پوچھ سکے ہے کہ تم نے یوں کیوں کیا؟

امام زماں کو شاید بدا کی وجہ سے خدا معزول کر چکا ہو

بہر حال عجب نہیں جو بدا واقع ہوا ہو اور امام زماں کی معزولی کا حکم صادر ہو چکا ہو اور شاید یہی وجہ ہے کہ تخمین سے زیادہ امام کو غیبت میں گزری اور یہ جو امامیہ کے ذہن نشین ہے کہ ابوبکر، عمر وغیرہم آخر زمانہ میں پیدا کیے جائیں گے یہ بالکل غلط نہ ہو بلکہ امام زماں کو معزول کر کے شاید ان کو پھر نئے سرے سے پیدا کر کے مامور کریں۔ پر امامیہ نے باتباع خداوندی اس بات میں غلطی کھائی ہو کہ وہ سزا دینے کے لیے پیدا کیے جائیں گے۔ خیر یہ بات تو شاید شیعوں کو ناگوار ہو۔

عقیدۂ بدا کا استیصال قرآن مجید سے

سو ہاں خاطر شیعہ اس بات سے اعراض کر کے یوں ملتمس ہوں کہ اگر خدا سے چوک ہوتی ہے تو انبیاء سے تو نہ ہوتی ہوگی اور اتنا ہم جانتے ہیں کہ شیعہ بھی نہ کہیں گے کہ خدا اخبار گزشتہ میں بھی غلطی کھاتا ہے کیونکہ یہ تو صاف جھوٹ ہے۔ جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ خداوند کریم سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں جو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بہت پہلا قصہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ فرعون کے سوال کے جواب میں یوں نقل فرماتا ہے: "لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسٰى" یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرا رب نہ چوکے ہے نہ بھولے ہے، اس آیت کو غور کیجیے کیا ارشاد کرتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو ہم جانتے ہیں،

بجامہ بھی یوں ہر گز ہیں کہ وہ چوک جاتے تھے، یہ برائی تو اس فرقہ کے پیشواؤں نے خدا ہی کے لیے رکھ چھوڑی ہے ورنہ لازم آوے گا کہ معصوم بھی خطا کرے، پھر یہ طعن جو سنیوں پر کرتے ہیں کہ ان کے امام اور خلیفہ معصوم نہ تھے حالانکہ امام اور خلیفہ کو چاہیے کہ معصوم ہو، خطا نہ کرے ورنہ حق اور باطل کی تمیز محال ہو جائے گی اور جو غرض کہ ان کے مقرر کرنے سے ہوتی ہے یعنی احکام شریعت معلوم ہونا اور ان کا عمل درآمد ہونا وہ حاصل نہ ہوگی، سواب یہ طعن کس منہ سے کریں گے۔

قواعد عقائد شیعہ کی رو سے خدا سے خطاء ممکن معصوم سے ناممکن

الغرض قواعد عقائد شیعہ سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ خدا سے کو خطا ہو جائے، پر معصوم سے خطا نہ ہو سو حضرت موسیٰ علیہ السلام جو بالاتفاق معصوم تھے، انہوں نے جو یہ فرمایا کہ میرا رب نہ بھٹکتا اور چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے تو اس میں تو ہرگز احتمال غلط نہیں اور خدا نے جو یہ قصہ نقل فرمایا تو ایک قصہ گزشتہ ہے کچھ آئندہ کی بات نہیں جو بداء فی الاخبار کی گنجائش ہو، پھر کیا معنی کہ خدا بہک جائے کچھ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ عقل و حواس میں اختلال آ گیا، ابوبکر و عمر ہر چند صاحب رعب اور مرد با ہیبت تھے مگر نہ اتنے کہ خداوند کریم کے بھی عقل و حواس میں فرق آ جائے یا سوا اس کے اور کچھ سبب ہے (نعوذ باللہ من ھذہ الخرافات تعالیٰ اللہ عن ذالک علوا کبیرا) ایک سنیوں کے الزام کے لیے خدا کی عظمت بھی تو ہاتھ سے دے بیٹھے۔ فدک چھیننا تھا تو ابوبکر نے چھینا تھا اور قرطاس دوات کو نہ لانے دیا تو عمر نے نہ لانے دیا، ان پر تبرا کیا تو کیا خداوند کریم کو جو ان برائیوں سے سالم لیا تو کیا اسی سبب سے کہ باوجودیکہ نصر المظلوم حق (یعنی مظلوم کی مددگاری حق) ہے اور پھر مظلوموں کی مددگاری نہ کی۔ خیر خداوند کریم ان بیباکوں کا منہ سیاہ کرے کہ سخت بے ادب ہیں اور جس لائق یہ ہیں اس تک جہاں ہی پہنچائے۔ بالجملہ کلام اللہ میں بدا کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا ہے۔

بدا کا عقیدہ رکھنے والوں کے لیے حضرت جعفر کی بددعا

اور اگر شیعہ خدا کا اتنا بھی اعتبار نہ کریں اور اخبار گزشتہ میں بھی غلطی فہم کے احتمال سے (نعوذ باللہ) اس بات کے طالب ہوں کہ ہم کلام اللہ کی گواہی پر بدا سے انکار نہیں کرتے جب تک کہ کلینی کی کوئی حدیث اس باب میں نہ ہو تو کلینی کی حدیث بھی لیجیے۔

فی الکافی عن منصور بن حازم عن ابی عبداللہ قال منصور سألتُہ ھَلْ یَکُوْنُ شیءٌ لَم یَکُنْ فِیْ عِلْمِ اللّٰہِ قَالَ لَا مَنْ قَالَ ھذا فاخزاہُ اللّٰہ قُلْتُ اَرَءَیْتَ ما کَانَ

وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَيْسَ فِي عِلْمِ اللّٰهِ قَالَ بَلٰى قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ

''یعنی کافی میں منصور بن حازم سے روایت کرتا ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کوئی چیز ایسی بھی ہوئی کہ کل خدا کو معلوم نہ تھی اور آج ہوگئی ہو؟ آپ نے فرمایا کہ کوئی نہیں ، جو یہ کہے خدا اسے رسوا کرے، پھر میں نے پوچھا کہ یہ تو بتائیے جو ہولیا اور جو ہونے والا ہے قیامت تک، کیا خدا کو معلوم نہ تھا؟ انہوں نے فرمایا کیوں نہیں خلق کے پیدا کرنے سے پہلے معلوم تھا۔''

اس روایت سے دو فائدے حاصل ہوئے، ایک تو یہ کہ بدا ایک عقیدہ غلط ہے کیوں کہ بدا کی آفتوں میں جو تحقیق گزر چکی اس سے صاف ثابت ہے کہ بدا بے اس کے ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی نیا علم پیدا ہو، دوسرا یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بدا کے قائلوں کے لیے بددعا فرمائی، سو حضرات شیعہ کو ہماری طرف سے بھی مبارک باد۔ یہ ساری خرابیاں کلام اللہ کے نہ سمجھنے کی ہیں اور ان کا بھی کیا قصور؟ اپنی روایتوں کے معنوں کو نہیں سمجھتے، اگر سمجھ ہوتی تو پہلے انہیں ہی سمجھتے، کلام اللہ تو سنیوں کا ہے۔

حق واضح ہونے کے بعد ماننا ضروری ہے پھر کسی اور بات کا انتظار حماقت ہے

اس وقت لازم یوں ہے کہ منشا اس غلطی کا بیان کیا جائے تا کہ مزید اطمینان ہو جائے اور ناظرین کو یہ خلجان باقی نہ رہے کہ ''تمہاری پیش قاضی آئی راضی'' محرر رسالہ کے طمطراق کی باتیں فقط سن کر ہم یوں کیونکر بدا سے دستبردار ہوں، ہمارے علماء شیعہ بھی تو آخر کسی وجہ ہی سے کہتے ہوں گے جب تک ان کی نہ سن لیں، تسلی نہیں ہوتی۔ ہر چند یہ عذر اس قبیل کا ہے کہ مشہور ہے ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کیونکہ جب کسی آدمی کو کسی وجہ سے حق واضح ہو جائے تو پھر اسے اس کا کیا انتظار کہ دوسروں کی بھی سن لوں، اگر کوئی شخص قریب شام کے دَر و دیوار پر دھوپ دیکھے یا خود آفتاب کو بچشم خود دیکھے اور دوسرا پردہ میں بیٹھا ہوا، گھڑی گھنٹے کے وسیلے سے یوں کہے کہ دن چھپ گیا تو آفتاب کا یا دھوپ کا دیکھنے والا کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو اور گھڑی سے وقت کا بتلانے والا کتنا ہی علامۂ روزگار اور حساب میں پرکار کیوں نہ ہو لیکن اس پر بھی آفتاب یا دھوپ کے دیکھنے والے کو دن کے یقین ہونے میں اس کا انتظار نہ ہوگا کہ میں اس کی تو سن لوں کہ جو گھڑی کے وسیلے سے رات بتلاتا ہے۔

اسی طرح جب یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ بروئے کلام اور نیز بروئے احادیث شیعہ بدا غلط ہے، پھر اس کا کیا انتظار ہے کہ بدا کے قائلوں کی بات بھی سن لینی چاہیے بلکہ ایسے وقت میں مناسب یوں ہے کہ جیسے آفتاب کا بچشم خود دیکھنے والا باوجود جاہل ہونے کے بے تامل یوں سمجھ جاتا ہے کہ گھڑی والا ہر چند محاسب اور بڑا ہوشیار ہے، اس کے علم میں کچھ شک نہیں لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس کی

گھڑی بگڑی ہوئی ہے یا اس وقت اتفاق سے بمقتضاء بشریت کچھ غلطی ہوگئی ہے ایسے ہی بدا کی غلطی کا سمجھنے والا بھی بے تامل مان اُٹھے کہ ہر چند قائلین بدا بڑے بڑے عالم اور فاضل تھے لیکن تاہم آدمی تھے، غلطی کھا گئے نہ اس آیت پر انہیں دھیان ہوا "كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا" یعنی اللہ ہمیشہ سے علیم ہے اس کا علم کچھ اب پیدا نہیں ہوتا اور نہ آیت مذکورہ "لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسٰى" ان کے خیال میں گزری اور نہ حدیث کلینی کا کچھ خیال کیا بلکہ ادب کی بات تو یوں ہے کہ یہ کہیے ان لوگوں کو کلام اللہ تو یاد نہ تھا کیونکہ یہ تو سنیوں کا کلام ہے۔ کلینی بعد میں تصنیف ہوئی۔ مع ہذا ان کا کیا قصور؟ سب جانتے ہیں "دروغ گورا حافظہ نباشد" القصہ یہ عذر کہ شیعوں کی دلیلیں معلوم ہونی چاہئیں (یہ عذر بعد کلام اللہ اور حدیث مذکور کے جن کے معنوں میں کچھ تاویل نہیں ہوسکتی اور خدا کے علم کے قدیمی ہونے پر مثل آفتاب روشن کے گواہی دیتی ہیں) عقلا کے نزدیک قابل سماعت نہیں۔

بدا جیسے واہی عقیدے کی غلط بنیادیں

مگر بایں ہمہ بپاس خاطر مولوی عمار علی صاحب یہ معروض ہے کہ منشاء غلطی شیعہ اس قسم کی آیتیں ہیں "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" حاصل یہ کہ خدا نے موت حیات کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ تمہیں آزمائے کہ کون سا تم میں اچھے عمل والا ہے سو اس آیت سے اور ایسی ہی مضمون کی اور آیتوں سے علماء شیعہ کو یوں دھوکہ پڑا کہ امتحان اور آزمائش تو وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت امر پہلے سے معلوم نہیں ہوتی، پھر اس پر یہ تماشا ہوا کہ ایک جگہ خداوند کریم یوں بھی ارشاد فرماتے ہیں: "يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ" یعنی اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، اس آیت کے مضمون کو جو پہلی آیت کے مضمون سے ملا کر دیکھا تو علماء شیعہ کو بجائے خود اس بات کا یقین ہوگیا کہ خدا کو پہلے سے تو حقیقت الامر خوب معلوم تھی ہی نہیں یونہی اٹکل اور رائے سے ایک بات مقرر کر رکھی تھی، سو اس میں جہاں کہیں کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے اسے بدل دیتے ہیں اور یہی معنی بدا کے ہیں۔ الحاصل اس وجہ سے شیعوں کے نزدیک عقیدہ بدا مستحکم ہوگیا اور یہ غلطی جو اوّل کسی کو بوجہ کوتاہی عقل کے پڑی تھی خوب مضبوط ہوگئی اور کیوں نہ ہو۔

بے اُستاد کی ٹھوکریں

بے اُستاد ہمیشہ خراب رہتا ہے، اگر ماہران کلام اللہ کی کفش برداری اختیار کرتے تو اس آیت کے معنوں میں ایسے کیوں بھٹکتے مگر یہ فرقہ تو ایسا کم نصیب ہے کہ کلام اللہ کے جاننے والوں کے دلی

دشمن ہیں۔ جناب من ''ہرکارے ہر مردے'' صحابہ کرام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تھے۔ کلام وہ سمجھتے تھے، پھر جو ان سے مستفید ہوگا وہ کلام اللہ کو سمجھے گا یا شیعہ سمجھیں گے؟

ابتلا وامتحان سے مقصود خداوندی قطع محبت ہے نہ کہ تحصیل علم

اگر آیت "لِيَبْلُوَكُمْ" سے یہ بات نکالی ہے کہ خدا کو پہلے کسی چیز کے پیدا ہونے کے علم اس کا نہیں ہوتا ہے تو اس میں تو کچھ شک نہیں کہ اس وقت تو ضرور ہی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اوّل تو شیعہ اس کے قائل ہی ہیں۔ مع ہذا کلام اللہ میں بیسیوں جگہ "إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ" موجود ہے۔ یعنی خداوند کریم جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے، پہلے پیدا ہونے سے تو ہم نے مانا، نہیں دیکھتا تھا لیکن یہ تو فرمایئے کہ بعد پیدا ہونے کے بھی کیا کچھ اس میں تامل باقی ہے؟ نور آفتاب خدا کا محتاج نہیں، شمع چراغ کی اس کو ضرورت نہیں آگے پیچھے ہونا اس کے نزدیک سب یکساں ہے کیوں کہ وہ فرماتا ہے "إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ" یعنی اللہ ہر چیز کو محیط ہے۔ القصہ بعد وجود اشیاء کے ان کے پیش نظر ہونے میں کچھ شک نہیں اور پھر بایں ہمہ بھول جانے کا اندیشہ نہیں کیونکہ سورۂ طٰہٰ میں "لَا يَنْسٰى" موجود ہے یعنی خدا بھولتا نہیں، پھر کیا ضرورت ہوئی کہ کراماً کاتبین مقرر کیے گئے؟ اور حساب کتاب قیامت کو ہونا ضرور پڑا اور نامۂ اعمال اور صحیفہ ہائے کردار بنی آدم لکھے گئے جو علماء شیعہ اس کا جواب دیں گے وہی ہماری طرف سے نوازش فرما کر قبول فرمالیں۔

اگر یوں جواب دیں کہ ہر چند خداوند عالم الغیب کو ہر لکھی چھپی بڑی چھوٹی چیز کی خبر ہے لیکن شوکت اور عظمت اور حکمت خداوندی کے مناسب یہی ہے کہ یہ سارا کارخانہ برپا ہو تو ہمیں تسلیم، پر یہی جواب ہمارا ہے اور اگر شیعوں کو بنسبت نامہائے اعمال اور حساب کتاب اور ہاتھ پاؤں کی گواہی کے جو قیامت میں ہوگی، یہ عذر ہے کہ یہ سب تعلیم بنی آدم کے لیے ہے تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ امتحان خداوندی بھی تعلیم بنی آدم کے لیے ہے۔

باقی کسی کو ہاتھ پاؤں کی گواہی اور حساب کتاب اور وزن اعمال میں شک ہو تو یہ کلام اللہ کی آیتیں موجود ہیں۔ آیت "يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" جس کا یہ حاصل ہے کہ فلانے لوگوں کو اس روز عذاب ہوگا جس روز ان کی زبان، ہاتھ پاؤں ان پر گواہی دیں گے اور آیت "قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ" یعنی قیامت کو جب کفار کے کان، آنکھیں، کھالیں ان کے کرتوت کی گواہی دیں گے تو وہ ان کو ملامت کریں گے سو اس کا بیان ہے کہ کہیں گے کفار اپنی کھالوں کو کہ تم نے کیوں ہمارے حق میں بری

گواہی دی؟ تو وہ کہیں گے کہ جس خدا نے سب کو بلایا تھا اور بولنا سکھایا تھا اسی نے ہمیں بھی بلا دیا۔

اور سوا اس کے اور بہت سی آیتیں وزن اعمال پر اسی طرح دلالت کرتی ہیں۔ "وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ" یعنی تول اس دن ٹھیک ہے "وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ" حاصل اس کا یہ ہے کہ رکھیں گے ہم ترازوئیں انصاف کی قیامت کے دن "فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِیْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ" حاصل یہ ہے کہ جس کے اعمال تول میں بھاری ہوں گے ان کی اچھی گزران ہوگی، ایسی ہی حساب کے مقدمہ میں کثرت سے آیتیں وارد ہیں۔ منجملہ ایک دو لکھے دیتا ہوں "اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ" خواہ ظاہر کرو جو کچھ تمہارے جی میں ہے یا چھپاؤ، خدا حساب ضرور لے گا۔ "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ" یعنی جو کوئی منکر ہوگا اللہ کے حکموں سے تو اللہ حساب شتاب لینے والا ہے۔ الغرض ان باتوں سے انکار نہیں ہوسکتا اور ہمیں کسی سے کیا کام، امامیہ اور اثنا عشریہ سے غرض ہے سو وہ منکر ہی نہیں اہل سنت اور وہ دونوں باتوں کے ایمان میں متفق ہیں، زیدیہ یا اسماعیلیہ ہوتے تو یوں بھی سہی۔

الحاصل جو کچھ شیعہ تجویز فرمائیں ہمیں کچھ دریغ نہیں اگر وہ یوں کہیں کہ بنی آدم کی حجت ختم کرنے کے لیے حساب کتاب وغیرہ ہے ورنہ کچھ حاجت نہ تھی تو ہماری طرف سے بھی یہی جواب معروض خدمت سہی بلکہ اس کے ساتھ میں اُلٹا شکرانہ ہم سے لیں کہ ہمیں ان آیات کے معنی کی تحقیق میں تخفیف ہاتھ آئی۔ غرض بہر حال "چشم ما روشن دِل ماشاد" صلاح ما ہمہ ان ست کان صلاح شما است۔

امتحان بغرض قطع حجت کی ایک قرآنی مثال

اور کسی مثال سے سمجھنا مد نظر ہے تو ایسی مثال لیجئے جسے مولوی عمار علی صاحب بھی مان جائیں، الم کا پہلا سیپارہ تو شیعوں کو غالباً یاد ہو؟ نہیں تو قریب یاد کے ہوگا کیونکہ اکثر دستمال اطفال رہتا ہے۔ چہ جائیکہ بڑے بوڑھے عالم فاضل، سو پہلے سیپارہ میں رکوع "وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ" میں کچھ یہ بیان ہے کہ جناب باری تعالیٰ نے فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کے زمین میں خلیفہ بنانے کی خبر دی تو فرشتوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ آدم اور آدم کی اولاد کو زمین میں خلیفہ بناتے ہیں جو زمین میں فساد کریں اور خونریزیاں مچائیں حالانکہ ہم اس بات کا استحقاق رکھتے ہیں۔ آپ کی تسبیح ہم کرتے ہیں، آپ کی تقدیس میں ہم مشغول رہتے ہیں تو اس کے جواب میں سردست تو جناب باری تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے مگر ان کی حجت قطع کرنے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام یا حقیقت تعلیم فرما کر پھر فرشتوں سے ان

چیزوں کے نام یا حقیقت دریافت کیے اور فرمایا کہ اگر تم دعوائے استحقاق میں سچے ہو تو ہمارے سوال کا جواب دو چونکہ فرشتوں کو معلوم نہ تھے تو انہیں بجز یوں کہے نہ بن پڑی کہ "سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ" حاصل اس کا یہ کہ الٰہی تو پاک ہے ہمیں تو جتنا تو نے بتلا دیا اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں تو ہی اسرار کا جاننے والا اور حکمتوں والا ہے۔

جب ان سے نہ بتلایا گیا تو حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تو انہیں ان چیزوں کے نام بتلا دے، جب حضرت آدم علیہ السلام نے ان کے نام بتلا دیئے تو خداوند کریم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمان زمین کی سب لکھی چھپی باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرو اور جو چھپاتے ہو وہ سب مجھے معلوم ہیں۔ برائے خدا علماء شیعہ اس قصہ میں غور فرمائیں۔ یہ امتحان فرشتوں اور حضرت آدم علیہ السلام کا جو لیا تو کیا اس لیے لیا تھا کہ اپنے آپ کو حقیقت الامر معلوم ہو جائے یا فرشتوں ہی کی حجت قطع کرنے کے لیے؟ درصورت یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے سے اپنے سوال کا جواب بتلا چکے ہوں اور فرشتوں کو نہ بتلایا ہو تو کسی نادان کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جناب باری تعالیٰ کو یہ معلوم نہ تھا کہ کون استحقاق رکھتا ہے کون نہیں، سو جیسے یہ امتحان فقط فرشتوں کی حجت قطع کرنے کے لیے اور ان کے اعتراض کو اپنے ذمہ سے اُٹھا دینے کے لیے تھا ایسے ہی یہ امتحان جو "لِیَبْلُوَکُمْ" یا اور اسی مضمون کی آیتوں سے ثابت ہوتا ہے تو فقط اسی لیے ہے کہ بنی آدم بوجہ حسد ایک دوسرے کے درجہ بڑھانے پر خدا کے ذمہ ناانصافی کی تہمت نہ لگانے لگیں اور ان کو گنجائش گفت وشنود اور جائے اعتراض وانکار جو ان کی جبلت میں رکھی ہوئی ہے، باقی نہ رہے۔

بعثت انبیاء اور تکالیف شرعیہ کی وجہ بھی قطع حجت بنی آدم ہے

اور واقعی اس حکم احکام کے قصہ اور رسولوں اور انبیاؤں کے بھیجنے کے سلسلہ کی وجہ اور حکمت یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جب ملائکہ باایں ہمہ عصمت اور فرمانبرداری کے جو آیت "لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ" سے (جس کا حاصل یہ ہے کہ فرشتے خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ انہیں حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں) ثابت ہوتی ہے خدا کی بات میں دخل دے بیٹھے اور بوجہ حسد بنی آدم اعتراض کر گزرے۔ بنی آدم تو بنی آدم ہیں، پھر باوجودیکہ گناہوں سے ان کا خمیر ہے، ان کی شان میں یہ تعریف بھی آئی ہے۔ "وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا" یعنی انسان سب میں زیادہ جھگڑالو ہے، پھر اگر خداوند کریم موافق اپنے علم ازلی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جنت میں اور ابوجہل اور فرعون کو دوزخ میں داخل کر دیتا تو ابوجہل

اور فرعون کا ہے کو ٹھنڈے چولہے بیٹھتے اعتراض پر اعتراض کیے جاتے اور اپنے استحقاق جنت کے دعوے میں کیا کیا کچھ نہ کرتے، اسی لیے خداوند کریم علیم حکیم نے کلام اللہ میں اکثر مواقع میں وجہ اس سلسلہ ہدایت کی بھی بیان فرمائی ہے۔ تسکین خاطر ناظرین کے لیے ایک آیت گزارش کرتا ہوں۔

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ o اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ o اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ o اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ o بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ o

حاصل اس کا یہ ہے کہ ”چلو بہتر بات پر جو تم پر نازل کی گئی تمہارے رب کی طرف سے، پہلے اس سے کہ پہنچے تم پر عذاب اچانک اور تم کو خبر نہ ہو کہیں کہنے لگے کوئی جان ہائے افسوس میں نے قصور کیا اللہ کے مقدمہ میں اور میں ہنستا ہی رہا، کوئی کہنے لگے اگر اللہ مجھ کو بتاتا تو میں متقی ہوتا یا کوئی کہنے لگے جب دیکھے عذاب کسی طرح مجھ کو پھر جانا ملے تو میں نیکی والوں میں سے ہو جاؤں، کیوں نہیں، پہنچ چکے تھے تجھ کو میرے حکم، پھر تو نے ان کو جھٹلایا اور غرور کیا اور تو کافروں میں سے تھا۔“

دوزخی اور جنتی پہلے ہی سے طے ہیں

یہاں تک ترجمہ تھا اب اس آیت کے مطالعہ کرنے والے فرمائیں کہ یہ جو حکم ہوا کہ خدا نے جو تمہاری طرف عمدہ بات نازل کی ہے اس کا اتباع کرو اور اس پر چلو خدا نے اس کی کیا وجہ فرمائی ہے، بجز اس کے اور بھی کچھ ہے کہ یہ اندیشہ تھا کوئی یوں نہ کہنے لگے کہ خدا اگر مجھے راہ بتلاتا تو میں متقی، پرہیزگار ہوتا اور یہ اندیشہ جب ہو سکتا ہے کہ اپنی طرف سے پہلے تجویز کر رکھا ہو کہ اس کو دوزخ میں پہنچائیں گے اس کو جنت میں، سو اسی تجویز کے موافق اگر کاربند ہوتے اور جس کو برا بھلا جیسا سمجھ رکھا تھا، اس کے مناسب اسے جگہ دیتے تو بیشک دوزخی بھی اپنا استحقاق جتاتے اور دعویٰ اپنی بھلائی کا کر کے کہتے کہ ہمارا امتحان کیوں نہ لیا، ہم کو راہ دکھائی ہوتی، ہم بے شک متقی اور پرہیزگار نکلتے۔ مع ہذا ”كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ“ فرمایا اور ”كَفَرْتَ“ نہ فرمایا عربیت میں جو مہارت ”كَمَا يَنْبَغِيْ“ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر ”كَفَرْتَ“ فرماتے تو یہ معنی ہوتے کہ جب آیات آئیں اور ان کا انکار کیا تب کافر ہو گیا۔ پہلے سے نہ تھا اور اب یہ معنی ہیں کہ ازل سے تیرا چہرہ کافروں میں اور نمک حراموں میں لکھا ہوا تھا، سو تو موافق اس لکھے ہوئے ہی کے نکلا باوجودیکہ ہماری آیات تیرے پاس آئیں، پھر تو نے انہیں نہ مانا اور الٹا غرور کیا۔

ایسے ہی سورۂ اعراف میں ہے "اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ" یعنی عہدِ الست جو لیا گیا تو فقط اسی لیے کہ تم عذاب کے وقت یوں نہ کہنے لگو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔ القصہ چونکہ صورت حال بنی آدم سے چنانچہ مذکور ہوا، اعتراض اور جھگڑا ٹپکتا تھا، جناب باری تعالیٰ نے یہ امتحانِ اعمال مقرر کر دیا تاکہ ان کی حجت منقطع ہو جائے اور کل کو غل نہ مچائیں اور ناانصافی کی تہمت نہ لگائیں۔ اسی لیے ان کے سنانے کو فرماتے ہیں: "لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاھِدِیْنَ مِنْکُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ وَنَبْلُوَ اَخْبَارَکُمْ" حاصل یہ نکلا کہ اگر تم کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اور یوں سمجھتے ہو کہ خدا کو کیا معلوم کون اچھا ہے کون برا ہے آزما کے دیکھا تو ہوتا جو اچھے برے کا فرق معلوم ہوتا ورنہ فقط اٹکل سے کسی کو برا بھلا سمجھ لینا اور پھر اس کے موافق دوزخ و جنت میں داخل کر دینا کارِ انصاف نہیں تو اب ہم بھی امتحان ہی لیں گے تاکہ معلوم تو ہو کون بھلا ہے کون برا ہے، کون مجاہد ہے، کون صابر ہے۔ غرض یہ امتحان قطع حجت بنی آدم کے لیے ہے، خداوند علیم کو تحصیل علم مدنظر نہیں۔

اَخْبَارَکُمْ کے تفسیری فوائد

چنانچہ دوسری آیت میں جو لفظ "اَخْبَارَکُمْ" ہے وہ بھی بآواز بلند، اس بات پر شاہد ہے کہ خداوند علیم پہلے سے بے خبر نہیں، اچھے برے نیک و بد سب کے حال سے خبردار ہے کیونکہ اس صورت میں حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ ہم کو جو تمہاری حقیقتوں کی خبر ہے اور تم کو اس میں شک ہے ہم بھی اسے جانچیں گے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ خدا کو پہلے سے ہر چیز کی خبر ہے، بھلے اور برے کو جانتا ہے ایسا نہیں جیسا امامیہ کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز پیدا ہوتی ہے، خدا کو جب ہی خبر ہوتی ہے۔ چنانچہ ملا نظام الدین جیلانی کے حوالے سے اوپر گزر چکا لیکن بنی آدم کی حجت قطع کرنے کے لیے یہ سارا بکھیڑا کیا جیسے فرشتوں کے ساکت کرنے کے لیے سوال جواب مذکور کی نوبت پہنچائی ورنہ جیسے خداوند کریم پہلے سے جانتا تھا کہ حضرت آدم خلافت کے لائق ہیں اور فرشتوں میں وہ بات نہیں جو حضرت آدم علیہ السلام میں ہے ایسے ہی ازل سے جنتیوں کا جنت کے لائق ہونا اور دوزخیوں کا دوزخ کے لائق ہونا خداوند کریم اس طرح جانتا تھا جس طرح ہم تم لکڑیوں کا چولہے کے لائق ہونا اور روٹی کا کھانے کے قابل ہونا سمجھتے ہیں۔ سو اگر خداوند کریم علم ازلی کے موافق جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں پہنچا دیتا تو کچھ ظلم نہ تھا۔ لیکن بنی آدم کا جھگڑا پلے بندھنا تھا فرشتوں نے تو کیا تکرار کیا تھا جو یہ کرتے؟ اس لیے یہ سارے کارخانے اور امتحان مقرر کیے۔

جیسے بعض جگہ بالاتفاق ماضی سے مجازاً مستقبل مراد ہے اسی طرح بعض جگہ مستقبل سے بھی ماضی مراد ہے

اب بفضلہٖ تعالیٰ وہ دھوکہ جو بوجہ آیات امتحان علماء شیعہ کو واقع ہوا تھا مرتفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ کلام اللہ یوں سمجھا کرتے ہیں نہ یہ کہ ایک آیت کو پہنچ گئے اور جو کچھ فی الفور سمجھ میں آ گیا اس پر جم گئے اور یہ نہ دیکھا کہ اور آیات سے مل کر اس آیت کے کیا معنی ہوتے ہیں، اگر یہی تفسیر دانی ہے تو ہم جانتے ہیں کہ علماء شیعہ کل کو "وَنَادٰی اَصْحَابُ الْجَنَّةِ اَصْحَابَ النَّارِ اور وَنَادٰی اَصْحَابُ الْاَعْرَافِ" اور "وَنَادٰی اَصْحَابُ النَّارِ" وغیرہا۔ اس قسم کی آیات کے معنوں میں فرمانے لگیں گے کہ یہ سب قصے ہو چکے ہیں۔ اس لیے کہ قطع نظر ان آیات اور احادیث کے جن سے قیامت کا آئندہ کو ہونا ثابت ہوتا ہے سر دست ان آیات کے یہی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ یہ باتیں سب ایام گزشتہ کے افسانے ہیں کیونکہ "نَادٰی" ماضی کا صیغہ ہے جب تلک یوں نہ کہیں کہ جو چیز ہونے والی ہے اور اس کے ہونے میں کچھ شک نہیں ہوتا اسے عرف میں یوں ہی کہا کرتے ہیں کہ ہو ہی چکی۔ چنانچہ جو شخص لب مرگ ہوتا ہے اسے کہا کرتے ہیں اس میں کیا رہا ہے مر ہی چکا۔

جب تلک ان آیات کے معنی اور آیات کے موافق نہ ہوں گے ادنیٰ سے ادنیٰ عربی خوان بھی یوں جانتا ہے کہ باعتبار لغت کے "وَنَادٰی اَصْحَابُ الْجَنَّةِ اَصْحَابَ النَّارِ" کے یہ معنی ہیں کہ ندا کی جنتیوں نے دوزخیوں کو اب تلک دوزخ اور جنت میں گیا ہی کون ہے جو یہ سوال اور جواب ہونے لگے۔ البتہ یہ سب سرگزشتیں بروز قیامت ظہور میں آئیں گی۔ چنانچہ سیاق اور سباق سے ظاہر ہے اور نیز امامیہ اور اثنا عشریہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ سو جیسے ان الفاظ کو بقرینہ دیگر آیات اپنے معنی حقیقی یعنی زمانہ ماضی سے پھیر کر معنی مجازی یعنی زمانہ مستقبل مراد لیتے ہیں ایسے ہی اگر "لَنَبْلُوَنَّكُمْ" وغیرہ کلمات کو جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتے ہیں، ان آیات کے قرینے سے جن سے خداوند علیم کے علم کا قدیم ہونا ثابت ہوتا ہے اپنے معنی اصلی یعنی زمانہ مستقبل سے پھیر کر زمانہ ماضی مراد لیں تو کیا گناہ ہے؟

حوادثِ آئندہ یقینیہ کو ماضی اور وقائع ماضیہ مخفیہ کو مجازاً مستقبل سے تعبیر کرنا صحیح ہے اس کی مثال

اور تصحیح مجاز کی وجہ درکار ہو تو سنئے جیسے اُمور آئندہ میں سے ان امور کو جن کا آئندہ کو واقع ہونا یقینی

ہوتا ہے بایں وجہ کہ ان کا تحقق ضروری اور یقینی ہے الفاظ ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں ایسے ہی اُمور گزشتہ میں سے ان امور کو جن کا تحقق اور وقوع اوران کا وجود ایک نوع سے مخفی ہو اور بایں ہمہ ان کا اثر بھی ہنوز ظاہر نہ ہوا ہو تو بایں لحاظ کہ ایسے اُمور کا ہونا نہ ہونا اکثر اثر کے ہونے نہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے الفاظ مستقبل سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں مثال کی ضرورت ہو تو سنئے کہ اگر کوئی بیمار بوجہ امتداد مرض اور شدت بیماری صاحب فراش ہو جائے یعنی چار پائی کا سوار بن جائے اور پھر شافی مطلق اس بیمار کو ایک دفعہ ہی شفا عطا فرمائے تو ظاہر ہے کہ وہ طاقت رفتہ مرض کے جاتے ہی نہ آ جائے گی بلکہ آئے گی تو رفتہ رفتہ آئے گی، سو اگر بمجر دزوال مرض عطار وغیرہ قرض خواہ اگر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں تو وہ مرد ضعیف ونقیہ اگر مفلس ہوتا ہے تو باوجود اطلاع اس امر کے کہ میرا مرض زائل ہو گیا اور میں اچھا ہو گیا، اکثر یہی جواب دیتا ہے کہ میں اچھا ہو جاؤں تو کہیں سے فکر کر کے آپ کا حق پہنچاؤں۔

یا فرض کرو بیمار کو تو زوال مرض کی اطلاع نہ ہو۔ چنانچہ اکثر ہوتا ہے پر طبیب کامل آثار و دلائل سے اس کی صحت سے مطلع ہو کر خواستگارِ انعام ہو اور بیمار بسبب بقائے آثارِ مرض مثل نقاہت وغیرہ کے اعطائے انعام میں متردد ہو تو طبیب اکثر کہا کرتے ہیں کہ اچھا جب تم اچھے ہو جاؤ گے جبھی دینا، سو جیسے طبیب یا مریض مذکور بایں لحاظ کہ اب تک ظہور اثر صحت کچھ نہیں ہوا یعنی طاقت نہیں آئی، صحت کو جو واقع ہو چکی بمنزلہ غیر واقع سمجھ کر صیغہ استقبال سے تعبیر کرتا ہے۔

ایسے ہی جناب باری بھی اپنے اس علم قدیم کو (کہ صحابہ مجاہد و صابر ہیں اور اعداء صحابہ فاسق و فاجر، اصحاب کرام بوجہ سعادت ازلی اور شرافت لم یزلی اور خوبی ذاتی اور کمال صفاتی اس لائق ہیں کہ ان سے اچھے کام لیے جائیں اور اس کے ثمرہ میں کمالات کسبی دیئے جائیں اور اعداء صحابہ بسبب شقاوت ازلی اور ذات لم یزلی اور زبونی ذاتی اور نقصان صفاتی اس قابل ہیں کہ ان سے برے کام لیے جائیں اور اس کی پاداش میں ان کے قلوب سیاہ کیے جائیں، بایں نظر کہ قبل تکلیف اعمال اس علم پر کوئی ثمرہ متفرع نہیں ہوا اور اس کا اثر یعنی اچھے برے کاموں کا ان سے لینا ہنوز ظاہر نہیں ہوا۔ یا بایں خیال کہ بہت سے نابکاروں کو خدا کے اس علم کے صحیح ہونے میں ایسا تردد ہے جیسا بیمار مذکور کو قول طبیب میں، اگر بصیغہ استقبال بیان فرمائے تو شیعوں کو اس قدر حیرت کیوں ہے؟

ازلی سعادت وشقاوت کی عام فہم مثال

رہی یہ بات کہ یہ فرق نیک وبد ازلی اور خلقی ہے کسبی اور عارضی نہیں، سو یہ ہر چند ایک امر دقیق ہے لیکن اہل فہم کے نزدیک یہ فرق بعینہ ایسا ہے جیسا ذکی وغبی اور حلیم وخونخوار اور بخیل وسخی اور شجاع

و نامرد، عالم و جاہل کا فرق ہے جیسے بادشاہانِ عاقل عالم سے کارِ علم اور جاہل سے کار جہل لیتے ہیں، ایسے ہی جناب باری بھی ہر کسی سے اُسی کے لائق کام لیتا ہے۔

تینوں زمانے مجتمعۃً موجود ہیں فنا نہیں ہوئے

بلکہ تحقیق تو یوں ہے کہ زمانہ بتمامہ ازل سے لے کر ابد تک ایک شے موجود ہے نہ زمانہ ماضی فنا ہوا اور نہ زمانہ آئندہ معدوم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی یوں کہے "اِنَّ زَیدًا قَائِمٌ" یعنی زید قائم ہے تو بمجرد اس کلام کے سننے کے ہر کوئی یہ سمجھ جاتا ہے کہ زید موجود ہے اور اس کا یہ حال ہے اور ظاہر بھی تو ہے کہ کوئی حال تو جب ہو کہ جب وہ خود پہلے ہو لے، جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو گزارش یہ ہے کہ قیامت کے باب میں جو وقائع آئندہ میں سے ہے خداوند کریم یوں فرماتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ خدا سچا ہے "اِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ" یعنی بیشک قیامت آنے والی ہے یا دوسری جگہ یوں فرماتا ہے "اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ" یعنی بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے، سو موافق قاعدہ مذکورہ کے ہم بھی یونہی سمجھتے ہیں کہ قیامت بالفعل موجود ہے اور اس کا یہ حال ہے کہ ہماری طرف آنے والی ہے اور وہ بہت بڑی چیز ہے اور ہم اس پر بے تکرار ایمان لاتے ہیں اور چون و چرا نہیں کرتے، اور اگر کوئی نیم ملا یوں چون و چرا بھی کرے کہ بہت اوصاف ایسے ہیں کہ ان سے اس چیز کا وجود معلوم نہیں ہوتا جس کا وہ وصف ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ فلانا مر گیا یا فلانا معدوم ہو گیا تو ہر چند یہ شبہ قابل جواب نہیں اور اس کا جواب بھی یہ ہے کہ یہ باتیں اوصاف نہیں بلکہ اوصاف کا نہ ہونا ہے لیکن "سلّمنا" یوں کہنا کہ فلانی چیز آنے والی ہے یا فلانی چیز بڑی ہے یہ تو ایسی نہیں جن سے ہونا معلوم نہ ہو بلکہ یہ باتیں تو کو دنوں کے نزدیک بھی وجود ہی پر دلالت کرتی ہیں۔

سو درصورت یہ کہ یہ اوصاف وجود پر دلالت کرتے ہوں ہم قیامت کے بجائے خود موجود ہونے میں کیوں تامل کریں اور یوں جب مقرر ہو چکا تو ہم ایک اور بھی التماس کرتے ہیں کہ جیسے قیامت آنے والی ٹھہری اور وہ اس وصف کے قرینے سے موجود معلوم ہوئی تو زمانہ گزشتہ بشہادت تمام عالم گزرنے والا ہے۔ اسی واسطے اس کا نام گزشتہ رکھا گیا۔ مع ہذا جب قیامت وغیرہ اجزائے زمانہ متحرک ٹھہرے تو ایک روز ہم تک پہنچ کر گزر بھی جائے گی اور یوں کہنا کہ فلانا شخص جاتا ہے وجود پر دلالت کرنے میں کچھ اس سے کم نہیں کہ یوں کہئے کہ فلانا شخص آتا ہے اور جب دونوں طرفیں زمانے کی گزشتہ اور آئندہ برابر بجائے خود موجود نکلیں۔

سب زمانے احاطۂ خداندی میں ہیں

تو موافق فرمودۂ باری تعالیٰ اعنی آیت "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ" سارا زمانہ اوّل سے لے کر آخر تک احاطۂ خداوندی میں داخل ہوا، سو احاطہ خداوندی کے جو کچھ کوئی معنی لے ہمیں کچھ انکار نہیں کم سے کم یہ معنی تو ضرور ہوں گے کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت بعینہٖ اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے "اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا" یعنی اللہ کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس صورت میں کیفیت سارے زمانہ کے وجود کی باجود اس روانگی کے کہ ایک جز آتا ہے اور ایک جاتا ہے ایسی ہوگی جیسے اجزاء آب رواں کہ سب کے سب بجائے خود موجود ہیں لیکن جب اگلے اجزاء گزر جاتے ہیں تب پچھلے آتے ہیں۔

اور خدا کے پیش نظر اور معلوم ہونے کے ایسی مثال سمجھئے جیسے کوئی لب دریا جا کر کھڑا ہو تو ادھر سے اُدھر تک تمام دریا کا پانی اور جو جو اس پانی کے اندر ہوتا ہے حباب یا خس وخاشاک اس کے پیش نظر ہوتا ہے اور اس کو سب ایک شے واحد نظر آتا ہے، گو اجزاء آب اور جو کچھ ان میں ہے باہم مقدم اور مؤخر ہیں۔

ماضی و مستقبل بھی خدا کیلئے حال کا حکم رکھتے ہیں مگر باہم مقدم مؤخر ہیں

الغرض اجزاء زمانہ اور جو کچھ زمانے میں واقع ہوتا ہے سب کا سب بتمامہا خداوند کریم کے پیش نظر ہے اور سارا مجموعہ اس کو بمنزلہ شے واحد معلوم ہوتا ہے اور معاً سب کے سب اس کو یکساں نظر آتے ہیں، اس کے حساب سے سب زمانہ حال کا حکم رکھتے ہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کی نسبت مقدم اور مؤخر گنے جاتے ہیں اور فرق حال اور استقبال اور ماضی کا بہ نسبت ایک دوسرے کے ہے سو جیسے کوئی کسی مکان میں ہوتا ہے تو اس کے سوا جو مکان کہ جو اس کے سامنے ہوتا ہے اس کو آگا کہتے ہیں اور جو اس کے پیچھے ہوتا ہے اسے پیچھا کہتے ہیں، ایسے ہی جس زمانہ میں کوئی چیز ہوتی ہے اس کے پہلے زمانہ کو بہ نسبت اس کے ماضی کہتے ہیں اور اس کے اگلے زمانہ کو بہ نسبت اس کے مستقبل اور خاص اس زمانہ کو جس میں وہ چیز ہوتی ہے اس کی نسبت زمانہ حال کہتے ہیں۔ سو ہر چند خداوند کریم کے پیش نظر ہونے میں اور اس کے سامنے موجود ہونے میں سب یکساں ہیں لیکن باہم مقدم اور مؤخر ہیں اور ایک دوسرے کی نسبت ماضی اور مستقبل اور حال ہے۔

کلام الٰہی میں ماضی وحال واستقبال کے استعمال کی ترتیب

سو خداوند کریم کبھی تو موقع دیکھ کر بلحاظ اپنے معلوم ہونے اور اپنے پیش نظر ہونے کے کلام کرتا

ہے اور کبھی مناسب وقت ان وقائع کے تقدم اور تاخر کا لحاظ ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں تو ہمیشہ ماضی کا صیغہ یا حال کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے اور دوسری صورت میں ماضی کے موقع میں ماضی اور حال کے موقع میں حال اور استقبال کی جگہ استقبال اور باوجود سب کے یکساں پیش نظر ہونے کے ماضی کا صیغہ جو استعمال کرتے ہیں اور حال کا لفظ نہیں بولتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کسی فعل کے صدور اور حدوث سے خبر دینی مدنظر ہوتی ہے اور کبھی اس فعل کے استمرار وجود کی خبر۔ سو جن افعال کی خبر دیتے ہیں وقت خبر جو وہ حاضر ہوتے ہیں تو باعتبار استمرار وجود کے حاضر اور پیش نظر متکلم ہوتے ہیں ورنہ باعتبار صدور اور حدوث کے وقت خبر حاضر نہیں رہتے بلکہ غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ صدور اور حدوث آنی ہے زمانی نہیں اور قبل وجود کسی فعل کے جو اس فعل کی خبر دی جاتی ہے تو وہ لاجرم بصیغہ استقبال ہونی چاہیے۔ غرض حدوث کے لیے صیغہ حال ممکن نہیں یا لفظ ماضی ہوگا یا لفظ استقبال، اگر قبل حدوث کسی وجہ سے مطلع ہو کر خبر دیں گے تو بصیغہ استقبال خبر دیں گے اور بعد حدوث معائنہ کر کے خبر دیں گے تو بصیغہ ماضی خبر دیں گے، حال جب ہو سکتا تھا کہ حدوث بھی مثل استمرار یعنی حاصل مصدر زمانی ہوتا، آنی نہ ہوتا، بہرحال بنسبت علم خداوندی کے سب بمنزلہ حال کے ہے۔ سو جہاں کہیں وقائع آئندہ کو ماضی کے الفاظ سے بیان کیا ہے جیسا "وَنَادىٰ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ" یا اور سوا اس کے تو وہاں رعایت اس کی ہے کہ خدا کو سب مستحضر اور پیش نظر ہے اور جہاں اُمور گزشتہ میں صیغہ استقبال کا مذکور ہے۔ جیسا "حتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ" یا "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ" وغیرہ تو وہاں یہ مدنظر ہے کہ بنسبت اپنے ماقبل کے مستقبل ہے۔

وقائع عالم قدیم نہیں ہو سکتے کیونکہ مستمر نہیں

اس بحث کو اہل انصاف سے ملاحظہ فرمائیں اور پھر فرمائیں کہ یہ ہیچمداں ہر چند دیوانہ ہے لیکن کس قدر ٹھکانے کی بات کہتا ہے مگر برائے خدا ذرا سوچ سمجھ کر دیکھیں مبادا اپنی جلدی میں میرے ذمے یہ تہمت نہ لگا دیں کہ فلانے رسالے والا وقائع عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہے۔ تنبیہ کے لیے میں ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ کسی واقعہ کے قدیم ہونے کے لیے یہ ضرور ہے کہ اس کا استمرار وجود اعنے حاصل بالمصدر بقدر تمام زمانہ من اولہ الیٰ آخرہ ہو، یعنی ازل سے لے کر ابد تک اس کا استمرار وجود موجود ہو۔ اس سے قدم ثابت نہیں ہوتا کہ ایک زمانہ محدود الطرفین پر منطبق ہو، اگرچہ وہ زمانہ قطع نظر حرکت لازمہ کے بذات خود ایک شے مستقر ہو، یعنی مثل حرکات ایسا نہ ہو کہ ایک جز حادث ہوا تو ایک فانی ہو گیا۔ "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الهادی لا هادی الا انت"

حصول علم کے دوطریقے بالواسطہ و بلا واسطہ

اور اگر کوئی عقل کا پورا اس تقریر میں کچھ اُلجھنے لگے اور اس طریق سے مطلب تک پہنچنا اس کو دُشوار معلوم ہو تو ایک دوسرا طریق جس سے یہ وضاحت خدا کے علم کا قدیم ہونا اور ان آیات کا بھی بلا تکلف اس پر مطابق آ جانا ثابت ہو جائے جو درج اوراق ہیں پر توجہ خاطر ناظرین ضروری ہے۔ اپنے علوم کے تجسس کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو علم اشیاء دو طریق سے حاصل ہوتا ہے ایک تو بے واسطہ دوسرا بواسطہ لوازم یا بواسطہ ملزومات، مثلاً آفتاب کا یا دھوپ کا علم کبھی تو بے واسطہ ہوتا ہے آنکھ سے دیکھا معلوم ہو گیا اور کبھی بواسطہ ہوتا ہے آفتاب کا علم دھوپ کے وسیلہ سے یا دھوپ کا علم آفتاب کے وسیلہ سے۔ اگر آدمی گھر میں ایسی جگہ بیٹھا ہو جہاں سے آفتاب نظر نہ آتا ہو پر دھوپ نظر آتی ہو تو دھوپ کے وسیلہ سے معلوم ہو جائے گا کہ آفتاب آسمان پر نکلا ہوا ہے۔ سو یہ علم جو آفتاب کا حاصل ہوا تو بواسطہ لازم حاصل ہوا اور اگر آفتاب کو صحن میں بیٹھے ہوئے دیکھیں اور یوں سمجھیں کہ چھت پر دھوپ ہو گی تو یہ دھوپ کا علم بواسطہ ملزوم حاصل ہوا۔ علیٰ ہذا القیاس آگ اور دھوئیں کے علم کو سمجھئے کہ کبھی بے واسطہ حاصل ہوتے ہیں جیسے آگ کو یا دھوئیں کو خود آنکھ سے دیکھ لیا کبھی بواسطہ یک دیگر ہوتا ہے مثلاً دھوئیں کو دیوار کے پیچھے سے دیکھ کر آگ کو سمجھ جانا، یا دور سے جہاں چراغ کا دھواں نظر نہ آتا ہو چراغ کے شعلہ کو دیکھ کر دھوئیں کو جان لینا۔

اکثر ایک چیز کا علم بواسطہ اور بے واسطہ دونوں ساتھ آتے ہیں

لیکن ایک شے کے علم بے واسطہ کو اس کا علم بواسطہ بھی بیشتر لازم ہوتا ہے اور دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور کسی طرح کا تقدم اور تاخر نہیں ہوتا۔ مثلاً آگ کو قریب سے دیکھئے تو دھواں بھی اس کے ساتھ ہی نظر آئے گا۔ سو اس صورت میں آگ کا علم دو طرح حاصل ہو سکتا ہے ایک تو بے واسطہ کیونکہ آنکھ سے خود نظر آتی ہے دوسرا دھوئیں کے واسطے سے کیونکہ اگر آگ نظر نہ آتی اور دھواں ہی نظر آتا تو بیشک آگ کا علم حاصل ہوتا۔ سو درصورتیکہ آگ بھی نظر آئی تو بطریق اولیٰ آگ کا علم دھوئیں کے واسطے سے ہونا چاہیے اور ظاہر بھی تو ہے اب دھوئیں میں کیا کمی آ گئی ہے جو دلالت نہ کرے۔

کبھی علم بواسطہ علم بے واسطہ میں محو ہو جاتا ہے کہ اس کا خیال بھی نہیں رہتا

بلکہ غور سے دیکھئے تو تلازم جس سے علم بالواسطہ حاصل ہوتا ہے اسی صورت سے معلوم ہوتا ہے

مگر آگ کا علم جو بواسطہ دھوئیں کے اس صورت میں حاصل ہوتا ہے ہر چند علم بے واسطہ ہی کے ساتھ حاصل ہوتا ہے لیکن علم بے واسطہ میں ایسا مضمحل اور محو ہے کہ اس کی خبر بھی نہیں ہوتی اور کسی کو اس طرف دھیان بھی نہیں گزرتا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ دن کو ستاروں کا نور بھی ہوتا ہے مگر آفتاب کے نور میں ایسا محو ہے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا۔

کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ یا ایک کا بواسطہ دوسری کا بے واسطہ بھی اکٹھے ہی حاصل ہو جاتے ہیں

جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی کہ ایک شے کا علم بے واسطہ اور بواسطہ بسا اوقات دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں ایسا ہی یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ کبھی دو چیزوں کا علم بے واسطہ بھی ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً آگ کو اور دھوئیں کو ایک ساتھ دیکھئے علیٰ ہذا القیاس، ایک شے کا علم بے واسطہ اور دوسری شے کا علم بواسطہ پہلی شے کے واسطے سے بھی اکٹھے ساتھ ہی حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً دھوئیں کا علم بے واسطہ اور آگ کا علم بواسطہ دھوئیں کے واسطے سے اور ایسے ہی آگ کا علم بے واسطہ اور دھوئیں کا علم بواسطہ آگ کے واسطہ سے دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور اکثر کچھ تفاوت نہیں ہوتا جو ایک کو یوں کہیں کہ یہ علم تو فلانی ساعت میں حاصل ہوا اور یہ علم اس سے پہلی ساعت یا اس کے بعد کی ساعت میں حاصل ہوا۔

بے واسطہ اور بواسطہ حاصل ہونے والے علم الٰہی میں کوئی تقدم تاخر نہیں

لیکن تاہم عقل کے نزدیک ایک ترتیب ہے کہ اس کی رو سے مقدم مؤخر کہہ سکتے ہیں یعنی ایک شئے کے علم بے واسطہ کو دوسری شے کے علم بالواسطہ سے جو بواسطہ پہلی شے کے حاصل ہوتا ہے عقل ایک طرح سے مقدم سمجھتی ہے یعنی ہر کوئی یوں سمجھتا ہے کہ دوسری شے کا علم اس صورت میں پہلی شے کے علم پر موقوف ہے۔ سو جیسا ہاتھ میں کسی چیز کو لے کر ہلائیے تو گو وہ چیز ہاتھ کے ساتھ ہی ہلتی ہے لیکن پھر یوں کہتے ہیں کہ ہاتھ اوّل ہلتا ہے ایسا ہی اس صورت میں گو دونوں چیزوں کا علم برابر ہی حاصل ہوتا ہے لیکن جس کا علم بے واسطہ ہے بہ نسبت اس علم کے جس کا علم اسی کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے مقدم گنا جاتا ہے اور جیسا یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہاتھ کو اس لیے ہلایا تاکہ وہ چیز ہلے جو ہاتھ میں ہے۔ ایسا ہی یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دھوپ کو اس لیے دیکھا تاکہ آفتاب بھی معلوم ہو جائے۔

کلام الٰہی میں ماضی و حال علم بے واسطہ سے تعبیر ہے اور استقبال علم بالواسطہ سے

جب یہ تمام مقدمات ذہن نشین ہو چکے تو اب التماس یہ ہے کہ خداوند کریم کے علم کو اگر قدیم کہئے تو "حتّٰی نعلم" وغیرہ کے استقبال میں کچھ فرق نہیں آتا اور "حتّٰی نعلم" وغیرہ کے استقبال سے اس کے علم کے قدیم ہونے میں کچھ تفاوت نہیں پڑتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خداوند علیم کو ہر چیز کا علم دو طرح سے حاصل ہے بے واسطہ اور بواسطہ یک دیگر، کیونکہ تمام موجودات کے ساتھ لوازم لگے ہوئے ہیں۔ سو جیسا لوازم اور ملزومات دونوں کا علم بے واسطہ اسے حاصل ہے ایسا ہی لوازم کا علم ملزومات کے واسطہ سے، ملزومات کا علم لوازم کے واسطہ سے بھی اسے حاصل ہے اور دونوں ازل سے برابر ساتھ ہیں۔ گو علم بالواسطہ کسی چیز کا اس کے علم بے واسطہ میں محو اور مضمحل ہو اور ایسا ہی کسی چیز کا علم دوسری چیز کے علم کے واسطے سے اور اس دوسری چیز کا علم برابر ساتھ ہی ازل سے خداوند لم یزل کو حاصل ہیں اور دونوں قدیم ہیں مگر کسی چیز کے علم بالواسطہ کو بہ نسبت اس چیز کے علم کے جس کے واسطہ سے یہ علم حاصل ہوا ہے، مؤخر گنیں گے اور یہ علم بہ نسبت اس علم کے مقدم سمجھا جائے گا۔ سو جہاں کہیں علم خداوندی کے ذکر میں صیغہ استقبال کا یا معنی استقبال کے پائے جاتے ہیں وہ باعتبار علم بالواسطہ کے ہے ورنہ باعتبار زمانہ کے کچھ تفاوت نہیں اور جہاں کہیں ماضی یا حال مستعمل ہے وہاں علم بے واسطہ مراد ہے۔

بنی آدم کے علوم چونکہ بواسطہ ہیں اس لیے بصیغہ استقبال (بواسطہ) تکلم فرمایا

اور باعتبار علم بالواسطہ کے کلام کرنے کی وجہ یہ پیش آئی ہے کہ کلام اللہ کے مخاطب آدمی ہیں اور تمام آدمی بلکہ تمام ذوی العقول کو اکثر چیزوں کا علم بالواسطہ ہی ہے بے واسطہ نہیں۔ روح بنی آدم یا بنی آدم کے کمالات نفسانی جیسے سخاوت، شجاعت، خلق، مروت، اگر ہیں تو دل میں ہیں آنکھوں سے یا کانوں سے یا سوا اس کے اور حواس خمسہ سے معلوم نہیں ہوتے، ان کو اگر کوئی دوسرا معلوم کرتا ہے تو ان کے آثار اور لوازم سے معلوم کرتا ہے۔ سخاوت دینے دلانے سے جو ہاتھ کا کام ہے، شجاعت مارنے مرنے سے جو ہاتھ پاؤں سے تعلق رکھتا ہے، خلق شیریں زبانی سے جو زبان سے متعلق ہے معلوم ہوتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس روح کا ہونا نہ ہونا دوسروں کو حرکات سکنات سے جو بدن سے متعلق ہیں معلوم ہوتا ہے۔

اگر علوم بے واسطہ سے تکلم فرماتے تو وہ بنی آدم پر حجت نہ ہوتے کیونکہ ان کے بس میں نہیں

اور جہاں کہیں جناب باری تعالیٰ نے اپنے علم میں صیغہ استقبال استعمال کیا ہے وہ ایسے ہی اُمور ہیں جو بنی آدم کو بے واسطہ معلوم نہیں ہو سکتے۔ سو ان سے باعتبار علم بے واسطہ کے اگر کلام کرتے تو ان پر کچھ حجت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ان کو الزام دے سکتے تھے۔ اس لیے الزام دینے کے موقع میں باعتبار علم بالواسطہ کے کلام کی ہے اور جہاں یہ غرض نہیں وہاں باعتبار علم بے واسطہ کے کلام کی ہے اور وہاں صیغہ ماضی کا یا حال کا مستعمل ہے مگر بنی آدم کو چونکہ ان اشیاء کا علم بے واسطہ ہو ہی نہیں سکتا اور اس پر ان واسطوں کا علم قبل ان کے وجود کے بنی آدم کے حق میں ممکن ہی نہیں اور اس وجہ سے ان کے تمام علوم برابر حاصل نہیں ہوتے تو وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کر کے صیغہ استقبال سے حدوث سمجھ جاتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ کلام اللہ میں ایک جا تو یوں مذکور ہے کہ خداوند علیم کو تمام اشیاء کے علوم ازل سے حاصل ہیں۔ جیسا کہ "کَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا" اور ایک سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعضے علوم حادث ہیں جیسے الفاظ "حَتّٰی نَعْلَمَ" وغیرہ مگر جو لوگ فہمیدہ ہیں اور نکتہ مذکورہ سے متنبہ ہو گئے ہیں دونوں کو مطابق یک دیگر سمجھتے ہیں۔

محو واثبات کی بحث اور علم الٰہی کے دو دفتر

اب مناسب یوں ہے "يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ" کے معنی بھی بیان کیے جائیں کہ منصفان علماء شیعہ کو شاید انتظار ہو مخدوم من اوّل ساری آیت گوش گزار ہے، بعد اس کے اپنا مافی الضمیر بھی معروض خدمت ہوگا۔ ساری آیت یوں ہے: "وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَاب يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَاب" حاصل اس کا یہ ہے کہ "کسی رسول سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی معجزہ جو اس کی نبوت کی نشانی ہو خدا کی بے اجازت لے آئے اللہ کے یہاں ہر مدت کی ایک جدا کتاب ہے اس میں سے جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اس کے پاس ایک اور بڑی کتاب ہے جو سب کی اصل ہے۔" یہ تو اس آیت کا حاصل ہوا۔ اب اہل فہم سے یہ اُمید ہے کہ بعد ملاحظہ ان دونوں لفظوں کے ایک تو "لِكُلِّ اَجَلٍ كتاب" اور دوسرا "وعندهٗ أم الكتاب" اور نیز بعد لحاظ اس امر کے کہ جملہ "يمحوا الله الخ" اوّل کے بعد واقع ہے بے تنبیہ کے آپ سمجھ جائیں گے کہ خداوند کریم

کے یہاں دو دفتر ہیں ایک بڑا جس کی طرف اُم الکتاب کا لفظ اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا چھوٹا دفتر جس کی طرف جملہ لکل اجل کتاب ہدایت کرتا ہے اور محو اور اثبات یعنی مٹانا نہ مٹانا یہ چھوٹے دفتر میں ہوتا ہے، بڑے میں نہیں ہوتا۔ سو بعینہٖ یہی اہل سنت کا مذہب ہے، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ بڑا دفتر جو علم خداوندی کے موافق ہے یا خود علم خداوندی ہے اس میں گھٹاؤ بڑھاؤ نہیں ہوتا۔

عقیدۂ بدا قرآن سے اس طرح ثابت ہے جیسے "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃ" سے نماز کی ممانعت

پھر شیعہ کس خوبی پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بدا کلام اللہ سے ثابت ہوتا ہے، اگر اسی آیت کے بھروسہ کودتے ہیں تو یہ بعینہٖ ایسا ہی استدلال ہے جیسا کسی بانوا نے کہا تھا کہ کلام اللہ میں خدا نے نماز سے منع فرمایا ہے اس لیے ہم نہیں پڑھتے۔ کسی نے پوچھا کہ صاحب ہمیں بھی بتلاؤ ہم نے تو آج تک یہ بات نہیں سنی اگر یہ حکم ہے تو کلام اللہ کے قربان جایئے بڑے آرام کی بات نکل آئی، بانوا نے کہا صاحب سورۂ نساء میں نہیں؟ کہ "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃ" یعنی نماز کے پاس نہ پھٹکو اس نے کہا، صاحب اس کے بعد "وَاَنْتُمْ سُکَارٰی" بھی تو ہے یعنی نشے کی حالت میں نماز مت پڑھو۔ ساری آیت کے معنی پر عمل کرنا چاہیے، بانوا نے کہا بابا سارے کلام پر کس سے عمل ہوا ہے؟ یہ بھی غنیمت ہے، جو اتنا بھی عمل ہو جائے تو شاید علماء شیعہ نے بھی اسی قاعدہ پر عمل کیا ہے۔

اور میرے نزدیک ایک اور عذر شیعوں کے لیے اس موقع میں خفت اُتارنے کے لیے بہت عمدہ ہے وہ یہ ہے کہ سارے کلام اللہ کے یاد نہ ہونے میں تو شیعہ معذور ہی ہیں۔ اتفاق سے "لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ" تک فقط ان کو یاد ہو گیا تھا بسبب کمال عبودیت اور سراپا بندہ ہونے کے اسی پر اعتقاد جما بیٹھے۔ سو یہ بات تو قابل تعریف ہے اگر "وعندہٗ اُم الکتاب" بھی ان کو معلوم ہوتا اور پھر سنیوں کے موافق ان کا اعتقاد نہ ہوتا۔ تب البتہ جائے گرفت تھی۔ سبحان اللہ اس تفسیر دانی اور کلام اللہ کے محفوظ ہونے پر سنیوں سے مقابلے کا دعویٰ مگر "موشے بخواب اندر بیرون زشہر شد" جناب من شیعوں کے اکثر استدلال تو بانوا مذکور کے سے استدلال ہیں اور کلام اللہ کی یادداشت ایسی ہے جیسے مرزا نوشہ شاعر بتقاضائے تاثیر مذہب اپنی سرگزشت لکھتے ہیں:

لاتقربوا الصلوٰۃ زہمہ بخاطر است   وز رام یاد ماند کلوا واشربوا امرا

علم الٰہی قدیم غیر متغیر محیط ہے

حق یوں ہے کہ علم الٰہی میں کچھ تغیر نہیں آتا اور کیونکر تغیر ہو سکے۔ خداوند کریم جابجا ایسے ہی توہمات کے دفعیہ کے لیے فرماتا ہے:

کَانَ اللّٰہ عَلیمًا حکیمًا کَانَ اللّٰہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلیمًا وَکُنَّا بِکُلِّ شَیْءٍ عَالِمِیْنَ، اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ علمًا کَانَ اللّٰہ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا

"حاصل سب کا یہ ہے کہ خداوند کریم ازل سے ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کی حقیقت پہچانتا ہے اور ہر چیز ازل سے اس کے احاطہ علمی اور احاطہ وجود میں ہے۔"

چنانچہ تصویر اس مضمون کی کچھ مذکور بھی ہوئی، پھر جب ازل سے ہر چیز کو محیط ہے تو بعد اس کے غلطی کا باعث اگر ہو سکے ہے تو یہ ہو سکے ہے کہ کوئی چیز بیچ میں خدا کے اور خدا کے معلومات کے حائل ہو جائے۔ سو اگر یہ احتمال ہے تو اس کا جواب تو کلام اللہ ہی میں بہت جگہ موجود ہے۔ "نحن اقرب" یعنی ہم سب سے زیادہ نزدیک ہیں یا شیعہ یوں تجویز فرمائیں کہ (نعوذ باللہ) خداوند کریم کے حواس میں فتور ہے سو اتنی جرأت شیعوں ہی کو ہے۔ مع ہذا "لَا یَخْفٰی علی اللّٰہ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ" یعنی اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی زمین میں نہ آسمان میں، یہ بھی کلام اللہ ہی میں ہے کسی پنڈت کی پوتھی کی آیت نہیں۔

عقیدہ بدا خدا کیلئے جہل مرکب تجویز کرتا ہے

اس پر طرفہ یہ ہے کہ اکثر علماء شیعہ معقولات میں دخل در معقولات رکھتے ہیں مگر اس پر اتنا نہیں سمجھتے کہ علم غلط حقیقت میں علم نہیں وہ اقسام جہل میں سے ہے، اسی واسطے اس کو جہل مرکب کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کو منطق کے چھوٹے رسالہ پڑھنے والے تو درکنار ان پڑھے بھی سمجھتے ہیں بلکہ زبان زد عام وخاص ہے کہ جہل مرکب سے تو جہل بسیط ہی بھلا، بایں ہمہ جو یہ حضرات ذات والاصفات جناب کبریائی کو جہل مرکب کا بٹہ لگاتے ہیں تو اوّل تو ان آیات مرقومہ پر خط نسخ کھینچنا پڑا۔ سبحان اللہ! خدا کے کلام کو بندے نسخ کریں اور وہ بھی اعتقادات میں کہ باتفاق شیعہ وسنی بلکہ باتفاق عالم قابل نسخ ہی نہیں دوسرے خدا کجا جہل مرکب کجا نعوذ باللہ من ہذا الخرافات۔

عقیدہ بدا تمام موجودات کو ایک طرح خدا پر فضیلت دیتا ہے

تیسرے جمادات وغیرہ جن کو بالکل علم نہیں بلکہ تمام موجودات ایک وجہ سے خدا سے افضل

ٹھہرے کیونکہ کوئی ہو سوائے خدا کے سب میں کچھ نہ کچھ جہل بسیط ہے اور خدا میں جہل بسیط نہیں کیونکہ کلام اللہ کی آیات سے خود واضح ہو چکا کہ خدا کو سب چیز کی خبر ہے۔ سو وہ خبر اور وہ علم اگر غلط ہووے تو جہل مرکب ہوگا اور جہل مرکب سے جہل بسیط آخر افضل ہی ہے تو سب مخلوقات ایک وجہ سے خدا سے افضل نکلی۔ واہ سبحان اللہ کیا خدا کی قدر شناسی ہے۔

تمام عالم علم الٰہی کے محو و اثبات کا دفتر ہے

باقی کوئی ہم سے یوں پوچھے کہ وہ دفتر کون سا ہے، جس میں محو اور اثبات ہوتا ہے تو گو ہمیں بعد اس کے کہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دفتر علم الٰہی کے علاوہ ہے کچھ اس کے جواب کی حاجت نہیں لیکن تسکین خاطر کر دینی بھی اچھی ہوتی ہے، اس لیے معروض خدمت ہے کہ ان امور کی حقیقت تو خدا ہی جانے، یا جن کو وہ اطلاع کر دے مگر بطور امکان و احتمال اس مقام میں ہمیں بیان کرنا لازم پڑا، اس کم فہم کے فہم نارسا میں جو بمعونت تقاریر بعض بزرگان آتا ہے تو یہ ہے کہ تمام عالم دفتر خداوندی ہے مگر اس میں سے بعض اشیاء کو بمنزلہ اوراق کے اور بعض کو بمنزلہ نقوش اور حروف کے سمجھئے۔

محو و اثبات کی ایک تفہیمی تمثیل

تفہیم کے لیے اوّل ایک مثال گوش گزار ہے موم یا گارے یا کسی اور نرم چیز کو ہم کئی کئی شکل میں لا سکتے ہیں چاہیں اس کو گول بنالیں چاہیں چپٹا مگر اس موم پر ان اشکال میں سے ایک وقت میں ایک ہی شکل آ سکتی ہے دو مجتمع نہیں ہو سکتیں۔ جب دوسری شکل آئے گی پہلی مٹ جائے گی لیکن چونکہ اشکال تو ایک قسم کے نقش و نگار ہیں تو ان کو تو بمنزلہ حروف اور نقوش سمجھئے اور اس موم کو بمنزلہ اوراق سمجھئے۔ جب یہ مثال ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ تمام اجسام میں تبدل اشکال اور کیفیات نظر آتا ہے، زمین سے جو کھیتی نکلتی ہے تو وہی اجزائے خاکی ہوتے ہیں، پر خدا کی نیرنگی سے ان کی شکل اوّل بدل جاتی ہے، پھر اس کھیتی کی شکل کیا سے کیا ہو جاتی ہے، آخر رفتہ رفتہ وہی غذا جو حقیقت میں اجزاء خاکی ہیں، شکل بدل کر غذا بن گئے ہیں۔ معدہ میں جا کر کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں اور پھر نطفہ بن کے کچھ اور رنگ روپ پیدا کر لیتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور اجسام میں دیکھ لیجئے گرمی سردی وغیرہ جتنے تغیرات ہیں وہ سب اسی قسم کے ہیں۔

ایسے ہی ارواح میں طرح طرح کی کیفیات کا تبدل رہتا ہے رنج خوشی خوف و امن وغیرہ سو جو چیزیں کہ بدلتی رہتی ہیں، ان کو تو اس دفتر خداوندی کے حروف اور نقوش سمجھئے اور اجسام

اور ارواح وغیرہ کو جو ان سب احوال میں بمنزلہ موم بجائے خود موجود رہتے ہیں اس دفتر کے اوراق سمجھئے، بعد اس کے یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ جو جو اشکال معدوم ہو گئے وہ تو محو ہو گئے اور جو ان کی جگہ قائم کیے گئے وہ اثبات اور ثبت ہو گئے۔ چنانچہ محاورہ دان فارسی اور عربی جانتے ہیں کہ اثبات اور ثبت لکھنے کے موقع میں بولا کرتے ہیں۔

"لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَاب" کی عجیب تفسیر

مگر چونکہ ہر شکل کے لیے کچھ نہ کچھ زمانہ چاہیے اور اس کی بقاء کے لیے زمانہ میں سے کچھ مقدار معین ہوتی ہے تو خداوند کریم نے ارشاد فرمایا "لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابَ" یعنی ہر زمانہ کے لیے جدا جدا نقوش ہیں جب ایک زمانہ ہو لیتا ہے اور دوسرے نقوش اور گلہائے اشکال اور کیفیات کی بہار آتی ہے اور ان کے زمانہ کی آمد ہوتی ہے تب پہلے نقوش کو مٹا دیتے ہیں اور دوسرے زمانے کے مناسب نقوش ان اوراق میں لکھے جاتے ہیں مگر یہ وہ اوراق نہیں کہ پہلے نقوش کے مٹانے سے بگڑ جائیں یا آلودہ ہو جائیں بلکہ جیسے دفتر میں یا سلیٹ کی تختی یا لکڑی کی تختی پر جو چاہا لکھ دیا۔ پھر جب چاہا مٹا دیا اور اس کی جگہ اور لکھ دیا، ایسے ہی ان اوراق میں بھی جو چاہا لکھ دیا اور جب چاہا مٹا دیا۔

اُم الکتاب کی توضیحی مثال

لیکن پہلے پچھلے سب نقوش کی نقل بلکہ اصل ایک بڑے دفتر اور بڑی کتاب میں ہے جیسے تحریر پڑھنے والے جس شکل کو پڑھتے جاتے ہیں سلیٹ پر کھینچ کھینچ سمجھتے جاتے ہیں اور جب سمجھ لیتے ہیں اور دوسری شکل کے سمجھنے کی نوبت آتی ہے، پہلی کو مٹا دیتے ہیں اور دوسری کھینچ لیتے ہیں اور بایں ہمہ ان سب کی نقل بلکہ اصل تحریر اقلیدس میں موجود ہے۔ باقی ربط اس آیت کا اپنے ماقبل سے اس صورت میں یہ ہوگا کہ کسی نبی سے کیونکر ہو سکے کہ اپنے آپ کوئی آیت لے آئے، ہمارے یہاں تو ہر زمانے کے لیے نقوش مقرر ہیں گنے چنے ہوئے رکھے ہیں، اس میں کمی بیشی کب ہو سکتی ہے جو کوئی اپنی طرف سے اس میں اپنی خواہش کے موافق اس آیت کا نقش بھی رلا دے؟

محو واثبات علم الٰہی میں نہیں لہٰذا بدا کی گنجائش بھی نہیں

اب اس تقریر کو اہل انصاف غور فرمائیں کہ کیسی برجستہ ہے اور پھر بایں ہمہ اس میں کہیں اس کی گنجائش نہیں کہ قائلین بدا انگشت رکھ سکیں یا تمسک کر سکیں، پھر کوئی کیونکر کہہ دے کہ آیت میں محو اثبات کا ذکر ہے تو علم الٰہی میں محو اثبات ہونا ہوگا مگر جو بات اپنے ذہن میں جمی ہوئی ہوتی ہے اسی

کی طرف ذہن دوڑا کرتا ہے، بھوکے کے نزدیک دو اور دو چار روٹیاں ہی ہوتی ہیں اور اگر اس تقریر کو سن کر کسی کے یوں کان کھڑے ہوں کہ مشہور تو یوں سنا تھا کہ "لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَاب" سے جو لکھا لکھتا ہے تو یہی لکھتا ہے جسے عرف میں لکھنا کہتے ہیں۔ سو وہ تو کسی کلام اور الفاظ کے مقابلہ میں جو حروف اور نقوش ہوتے ہیں ان کے لیے ہوتا ہے تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ حق بات چاہے مشہور ہو کہ نہ ہو ہاں اگر یہ معنی چسپاں نہ ہوں تو جب ہی کہو۔

اُم الکتاب اور محو و اثبات کی ایک اور مثال

مع ہذا جیسے اور صاحبوں کی مرضی ہم بھی اسی راہ چلتے ہیں، دُکانداروں کے یہاں اکثروں نے دیکھا ہوگا کہ روزمرہ کی برداشت کو تختی پر لکھتے جاتے ہیں، بعدازاں بہی میں نقل کر کے تختی کو دھو لیتے ہیں اور پھر دوسرے دن کی برداشت اسی تختی پر لکھنی شروع کر دیتے ہیں، سو روز یہ لکھنا اور مٹانا رہتا ہے اور اس پر ایک بہی وہ ایسی ہے کہ اس میں تمام ایام کی برداشت کی تفصیل تاریخ وار درج ہے کہ اس میں بجز لکھنے کے مٹانے کا اتفاق نہیں ہوتا، سو ایسا ہی جناب باری تعالیٰ کے کارخانہ قدرت میں سمجھ لیجیے جیسے یہاں روزمرہ کی برداشت تختی پر لکھتے ہیں وہاں قرن وار کسی لوح پر ایک تحریر ہوتی ہو اور پھر اس کو اس لوح سے مٹا کر بڑی کتاب میں کہ اس کو اُم الکتاب کہتے ہوں درج کر دیتے ہوں۔ بعدازاں پھر دوسرے قرن کا حساب کتاب لکھنا شروع کر دیتے ہوں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن کا حساب کتاب ایک لوح پر لکھ کر اس کو کسی بڑی لوح میں نقل کر دیا ہو، پھر اس لوح سے اس تحریر کو مٹا کر صحابہ کے قرن کا حساب کتاب لکھ کر اسی طرح لوح کلاں میں درج کر دیا ہو، اسی طرح یہ محو و اثبات ہمیشہ ہوتا ہو مگر سب جانتے ہیں کہ یہ محو و اثبات بوجہ غلطی تحریر نہیں کہ جس سے بدا ثابت ہو جائے۔

محو و اثبات بالفرض احکام میں بھی ہو تو حذاقت ہے بدا نہیں

اور سلمنا کہ یہ بھی نہ سہی بلکہ حکم احکام کے تبدیل و تغیر کے باعث یہ محو و اثبات ہوتا ہو تب بھی تو مقتدایان شیعہ کا دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا، تصویر اگر مطلوب ہے تو اس کی یہ صورت ہے کہ بیمار اگر طبیب کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کے لیے موافق قواعد طب کے مثلاً منضج تجویز کرتا ہے۔ جب اس کی میعاد پوری ہو لیتی ہے تو انہی دواؤں میں سے بعض دواؤں کو کاٹ دیتا ہے اور سنا وغیرہ بڑھاتا ہے اور بعد اس کے تبرید کا نسخہ لکھتا ہے اور پھر مقویات تجویز کرتا ہے تو اس صورت میں جو کچھ طبیب تجویز کرتا ہے وہ سب کتب طب کے موافق ہوتا ہے اور منضج اور مسہل اور تبرید اور مقویات کی جو

تبدیلی کرتا ہے تو وہ تبدیلی اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ پہلی تجویز میں کچھ غلطی ہوئی تھی بلکہ عین فہم وخوبی طبابت یہی ہے کہ اپنے اپنے وقت پر منضج اور مسہل اور تبرید کا استعمال ہوا کرے۔

سو جیسے یہ قصہ ہے ایسا ہی کارخانہ قدرت کا کارخانہ سمجھئے۔ جناب باری تعالیٰ کو جو حکیم مطلق ہے بجائے طبیب حاذق خیال فرمائیے اور اُم الکتاب کو بجائے کتب طب قرار دیجئے اور اس کتاب کو جو "لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَاب" میں ہے یعنی ہر ہر مدت کی جدا جدا کتاب کو بمنزلہ نسخہ منضج اور مسہل رکھئے اور فرشتوں کو تیماردار اور مجموعہ عالم کو جو اصطلاح محققین میں مسمی بہ شخص اکبر ہے بیمار، فرض کیجئے اور محو و اثبات کو ایسا سمجھئے جیسا منضج کی جگہ مسہل بدلتے ہیں اور مسہل کی جگہ تبرید ہو۔ اس تبدیلی کو بدا مصطلح شیعہ سمجھنا کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ ہاں اگر یہ تبدیلی اس قسم کی ہوتی جیسے تشخیص کی غلطی سے اوّل کچھ تجویز کیا تھا، پھر کچھ سمجھ میں اور آیا، البتہ ایک موقع تھا لیکن "لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَاب" اس بات کو چاہتا ہے کہ مدت وار جدا جدا تحریریں ہوتی ہیں اور وہ تبدیلی بوجہ تبدیلی مدت ہے بوجہ غلطی تجویز نہیں۔

القصہ یہ تینوں تقریریں جو مذکور ہوئیں ایک سے ایک چڑھتی ہوئی ہے اور بعد ملاحظہ ان تقریرات کے مدعیان بدا کا حوصلہ معلوم نہیں ہوتا کہ پھر اس آیت کی طرف منہ کر کے بھی سوویں یا اس آیت سے تمسک کا نام بھی لیں مگر جس کے دل میں انصاف نہ ہو اس کے آگے حق بات کا بیان کرنا بھی لاحاصل خیر کوئی سمجھے یا نہ سمجھے جو اس پر بھی نہ سمجھے اسے خدا سمجھے۔

عقیدۂ بداء پر تیسرا استدلال

اور بعض علماء شیعہ کو بدا کی حقیقت پر ایک اور نئی دلیل سوجھی ہے۔ آیت "وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ الخ" سے بدا کی حقیقت پر استدلال لاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی سنئے، ہم سناتے ہیں۔ حاصل اس آیت کریمہ کا اوّل معروض ہے، وہ یہ ہے کہ "وعدہ ٹھہرایا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ہم نے اس مدت کو ایک عشرہ اور بڑھا کر، سو پورا ہو گیا وقت اس کے رب کا چالیس راتیں انتہیٰ"

اب تقریر استدلال سنئے اوّل تو جناب باری نے تیس شب کی محنت پر توریت کا وعدہ کیا، پھر تیس رات کے مجاہدہ پر توریت عطاء نہ ہوئی بلکہ فرماتے ہیں کہ تیس رات کے بعد دس روز اور بڑھا دیئے۔ سبب اس زیادتی کا بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیس رات کی خلوت پر توریت کا عطا ہونا خلاف مصلحت معلوم ہوا یہ کثیر اُجرت اس قلیل مدت پر نازیبا نظر آئی، تعظیم اُجرت کے لیے مدت اور بڑھائی۔ سو اگر خدا ہی کو یہ بات پہلے سے سوجھی نہ تھی تب تو بدا کا ثبوت موافق

اصطلاح متقدمین ظاہر ہے ورنہ اس سے تو کم بھی نہیں کہ خداوند علیم تو جانتا تھا پر حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو کچھ کا کچھ بتلا دیا۔ سو اس بات میں اور اس بات میں گو زمین و آسمان کا تفاوت ہے پر ہمارے حق میں جیسا بدا حسب اصطلاح متقدمین ویسا ہی توریہ رب العالمین، نہ اُس صورت میں خدا کے کلام پر اعتماد نہ اس صورت میں کلام ربانی قابل استناد، پھر اگر فضائل صحابہ وغیرہ معتقدات اہل سنت پر کلام ربانی شاہد بھی ہو تو کیا ہوا، ایک زبانی بات ہے قابل التفات نہیں۔

جواب: مگر کوئی سمجھ دار ہو تو ہم بھی اپنے جی میں اس کا جواب لیے بیٹھے ہیں۔ غلطی یا غلط گوئی متکلم اور ہے اور غلط فہمی مخاطب اور، حضرات شیعہ اپنی غلط فہمی سے اپنی غلط فہمی کو غلطی یا غلط گوئی خدا وندی سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ غلط فہمی اپنی سمجھ کا قصور ہے، خداوند علیم کا اس میں کیا قصور؟ یہ سب جانتے ہیں کہ جناب باری نے اس قصہ کو مختصر بیان فرمایا ہے، روزوں کا اس میں ذکر نہیں، مسواک کا اس جگہ مذکور نہیں، سو جیسا روزوں کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ حدیث و تفسیر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فقط تیس دن رات مقصود نہ تھے بلکہ اتنے دنوں صائم رہنا مطلوب تھا۔ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ بعض اور شرائط بھی ہوں کہ ان کا ذکر نہیں فرمایا۔ من جملہ ان کے مسواک کا کرنا بھی ہو اور اگر فرض کیجئے روایات سے ثابت ہو جائے کہ توریت کی اُجرت میں فقط تیس دن کے روزے ہی ٹھہرے تھے اور سوا اس کے اور کوئی بات مشروط نہ ہوئی تھی تو قطع نظر اس کے کہ اس امر کا ثبوت غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ فقط عدم ثبوت نکلے تو نکلے ثبوت عدم محال نظر آتا ہے۔

جواب کی ایک توضیحی مثال

ہم کہتے ہیں کہ بہت سے ایسے شرائط ہوتے ہیں کہ وقت تقرر اُجرت ان کا مذکور نہیں آتا، ان کا معروف ہونا کافی ہو جاتا ہے۔ کچہری یا فوج کے ملازموں کو دیکھئے کہ لباس خاص اور اکرام حکام اور تقدیم تسلیم کا وقت تقرر ان سے کوئی مذکور نہیں کرتا۔ بایں ہمہ ان اُمور کے ترک پر ان سے مواخذہ کیا جاتا ہے، جرمانہ لیا جاتا ہے، تاوان لیتے ہیں، سزا دیتے ہیں اور اگر ملازمان بادشاہی کی بات بایں وجہ قابل قیاس نہ ہو کہ ان سے تو اصل کار اور اُجرت کی مقدار کا بھی ذکر نہیں آتا۔ ایک بات معین ہوتی ہے جس سے ہر عام و خاص جانتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور امور بالائی مثل لباس وغیرہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ سو اس حساب سے ان کا حال مثل اصل امر رہا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تو ہمارے اور بھی مفید مطلب ہے کیوں کہ جب شہرت کے سامنے تمام اُمور کے ذکر کی حاجت نہیں تو بعض اُمور کے مذکور ہونے کی تو بشرط شہرت لاجرم حاجت نہ ہوگی۔

دوسری توضیحی مثال

مع ہذا یہ مثال ناپسند ہے تو اور مثال لیجئے، گھوڑے کو کہیں جانے کے لیے کرایہ کرتے ہیں تو چار جامہ پوری لگام رکاب وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ بایں ہمہ اگر گھوڑے والا گھوڑے کے ساتھ یہ چیزیں حوالہ نہیں کرتا تو کرایہ لے جانے والا کیسا کچھ لڑتا جھگڑتا ہے اور بن پڑتا ہے تو کرایہ میں سے بھی کچھ نہ کچھ کتر لیتا ہے۔ ایسے ہی اگر مابین بندگان خاص خداوندی خصوصاً انبیاء اور جناب باری کچھ قوانین ادب مقرر ہوں اور بندگانِ خاص کے نزدیک مشہور معروف ہوں اور اس کے ترک پر اگر چہ ذکر نہ آئے مواخذہ ہو تو عین حق اور عین صواب ہے مگر اس کو بدا نہیں کہہ سکتے۔ بدا کہنا جب مناسب ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو ہرگز اس کی اطلاع نہ ہو اور در صورت یہ کہ اس کی اطلاع ہو اور فقط بمقتضاء بشریت ان سے خطاء ہو جائے تو پھر بدا کجا۔

دوسرا جواب

اور یہ بھی نہ سہی کلام اللہ سے فقط اتنا اثبات ہوتا ہے کہ تیس دن کے مجاہدہ پر توریت کا عطا ہونا ٹھہرا تھا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک ماہ کا کسی کا کچھ مشاہرہ مقرر کردیں۔ سو جیسے ایک ماہ کی تنخواہ کے یہ معنی ہیں کہ ایک مہینے کی یہ مزدوری ہوئی۔ خواہ تیسویں دن ملے، خواہ دس دن بعد ایسے ہی تیس رات دن کے مجاہدہ پر توریت کے عطاء ہونے کے یہ معنی ہیں کہ تیس دن کے مجاہدہ کا یہ ثمرہ اور یہ پھل ہے خواہ تیسویں دن ملی ہو یا دس دن بعد، باقی رہی دس روز زیادہ کی محنت کی وجہ، اس کا بیان ہمارے ذمہ ضرور نہیں۔

دفع توہم

اور اگر کوئی نادان لفظ اتممنا سے دس رات کا بہ نسبت تیس رات کے تتمہ ہونا سمجھ کر اُلجھنے کو تیار ہو تو اس کا جواب بھی لیجئے سنن ونوافل کا بہ نسبت فرائض کے متمم ہونا اور علی ہذا القیاس صدقۃ الفطر کا بہ نسبت صیام رمضان کے متمم ہونا احادیث صحیحہ سے ظاہر و باہر ہے مگر کسی کے نزدیک اس کے یہ معنی نہیں کہ فرائض پنجگانہ کی مقدار بہ نسبت زمانہ سابق کے زیادہ کی گئی بلکہ یہ معنی ہیں کہ بمقتضاء بشریت ہر عمل میں کچھ نہ کچھ قصور رہ ہی جاتا ہے، کتنا ہی اہتمام کیوں نہ کرو، اس صورت میں مقدار اصلی خدا کے نزدیک بھی اور بندوں کے علم میں بھی وہی رہی اور یہ سب اوپر کا بکھیڑا از قبیل قضاء مافات اور جبر نقصان اور مکافات تقصیرات ہے سو ایسے ہی ان دس دن کو سمجھئے بلکہ لفظ "اتممنا" ہی خود اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دس دن کی محنت از قبیل جبر نقصان ہے ورنہ میعاد اصلی وہی تیس دن

تے اگر ان تیس رات کا مجاہدہ بہمہ وجوہ قابل پسند ہوتا اور بمقتضائے بشریت جس سے سب ناچار ہیں کچھ ہو یا ولی ہو۔ چنانچہ واقف کار واقف ہیں کوئی قصور فتور عارض حال موسوی نہ ہوتا تو جناب باری تعالیٰ کی طرف سے اور دس دن کا مطالبہ نہ ہوتا۔

لفظ میقات کی تفسیر

باقی رہا لفظ "میقات ربہ" کا اس بات پر دلالت کرنا کہ میعاد اصلی چالیس راتیں تھیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ بازار خداوندی میں ہر عمل کی ایک اُجرت ہے اور ہر اُجرت کے لیے ایک محنت معین ہے کلام اللہ حدیث اس کے گواہ ہیں فضائل عظیمہ مثل حصول توریت وغیرہ کا نرخ چالیس رات کی محنت اصل سے مقرر ہو مگر کمال جود اور عموم رحمت کے باعث حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دس دن یعنی تہائی محنت کی تخفیف کی گئی ہو جیسے اس اُمت کے عوام کے لیے نو حصے محنت کی تخفیف کی گئی ہے باور نہ ہو تو اس آیت کو دیکھیے "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" یعنی جو ایک نیکی لائے گا دس گنا ثواب پائے گا۔ سو دس گنا تو جب ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک نیکی کے عوض دس نیکیوں کا ثواب ملے، پھر جب ایک ہی نیکی پر دس نیکیوں کا ثواب ملا تو نو حصے محنت کی تخفیف آپ نکل آئی، آیات اور احادیث میں اس مضمون کے اور بھی بہت شواہد ہیں، پھر بعضی آیات و احادیث تو ایسی ہیں جن سے اس سے زیادتی تخفیف بھی بعض بعض افراد کے لیے ثابت ہوتی ہے۔ باندیشہ تطویل تفصیل سے معذور ہوں۔

غرض یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بحکم عنایت قدیمانہ دس دن کی تخفیف ہوئی ہو پر بمقتضائے بشریت حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام سے یہ عمل ایسا کامل نہ بن پڑا جیسا توریت کے معاوضہ کے لیے بکار تھا بلکہ کچھ نقصان نکلا جس کی مکافات اور تلافی دس دن کی خلوت و مجاہدہ سے ہو سکی، اس لیے بنظر رحمت خاصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تیس دن کی محنت کو ردّ تو نہ کیا۔ اگرچہ ردّ کرنے کا موقع تھا، ہاں دس دن کی اور ہدایت فرمائی تاکہ کامیاب جائیں اور غیروں کے سامنے ندامت نہ اُٹھائیں۔ جب اس طریقہ سے وہی چالیس دن آ پڑے تو جناب باری نے بھی یہ ارشاد فرمایا: "فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِينَ لَيْلَةً" یعنی پس تمام ہوگئی وہ ہی چالیس راتیں جو اس کے رب کا میقات تھا، یعنی وہ وقت جو ایسی نعمتوں کے لیے اس نے مقرر کر رکھا تھا، سو انجام کار وہی پورا ہوا۔

تیسرا جواب

یا یوں کہیے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بذات خود قابل اہتمام اور شایان تاکید ملک علام

ہیں ہوتیں، پر کسی بندۂ خاص سے جو ایک وقت خاص اور ساعت اخلاص میں بضرورت کسی امر عارضی کے ظاہر ہوتی ہیں تو جناب باری بروئے کمال بندہ پروری اور غلام نوازی اس عمل کو ایسا قبول کرتا ہے کہ اس کو داخل عبادات خاصہ کر دیتا ہے اور پھر ہر خاص وعام سے اس کے کرنے نہ کرنے کا حساب لیتا ہے تا کہ خدا کی قدر شناسی اور اس بندہ کی رفعت وقدر معلوم ہو جائے۔ مثال اس کی اگر مطلوب ہے تو حضرت ہاجرہ کا صفا مروہ کے بیچ دوڑنا اور اس سبب سے اس سعی کا داخل سنن یا واجبات حج ہو جانا حالانکہ عقل سلیم کو اس فعل میں کوئی مضمون تعبد کا نظر نہیں آتا سب کا سنا ہوا قصہ ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر چالیس رات کی مقدار اوّل سے خداوند علیم کے نزدیک قابل اہتمام نہ ہو بلکہ اس وقت تک وہی تیس رات کی مقدار مہتم بالشان ہو مگر چونکہ بندۂ خاص سراپا اختصاص حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام سے ایک وقت خاص میں جس کا مذکور ہے چالیس رات کا مجاہدہ بضرورت معلوم ظہور میں آیا تو بوجہ کمال اخلاص حضرت موسیٰ علیہ السلام جناب باری نے اس عمل کو ایسا قبول فرمایا کہ آئندہ سے فضائل جلیلہ کی تحصیل کے لیے عدد اربعین ہی مقرر ہو گیا اور جب اس وجہ سے یہ عدد مہتم بالشان ٹھہرا تو جناب باری عز اسمہ کے اس قول کے "فتمّ میقات ربّہ اربعین لیلۃ" یہ معنی ہوئے کہ ہر چند ایسی نعمتوں کے لیے اصل میں وہی تیس راتیں تھیں لیکن چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بضرورت معلوم حالت اخلاص میں چالیس رات کا مجاہدہ ظہور میں آیا تو خداوند کریم نے اس عمل کو ان کے اخلاص کے باعث ایسا قبول فرمایا کہ اب سے تقرب بارگاہ خداوندی کے لیے پوری چالیس شب وروز کی خلوت مقرر ہو گئی چونکہ پہلی تقریر اور اس تقریر میں فرق ظاہر ہے ان دونوں کے بیان فرق سے معذور ہوں۔

بدا کیلئے کذب لازم ہے

ہاں نتیجہ اس طول بیانی کا عرض کرنا پڑا، اس لیے سامع خراش اہل انصاف ہوں کہ بدا کا ثبوت اس آیت سے جب ہو سکتا ہے کہ یا تو جناب علام الغیوب ہی نے پہلے سے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ بعد مرور تیس شب کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا کریں گے اور جب تک ہرگز چالیس رات کی تاخیر کا دھیان نہ تھا، اتفاق سے کسی مصلحت تازہ کے باعث ارادہ سابق سے پلٹ گئے اور تیس رات کے بدلے چالیس رات کے بعد عطا فرمائی یا جناب باری عالم الغیب والشہادۃ کے علم و ارادہ میں تو یہی تھا کہ بعد انقضاء مدت چہل شب عطاء توریت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مشرف ہوں مگر عمداً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیس شب کے بعد توریت کے عطاء ہونے کی خبر دی۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام باعتماد صدق خبر خداوندی یہی سمجھتے رہے کہ لاجرم بعد مرور تیس شب کے توریت عطا ہوگی مگر چونکہ مدنظر خداوندی کچھ اور تھا توریت کی بات چالیس رات پر جا پڑی۔

اس صورت میں گو صفت علم خداوندی اور صفت ارادہ عیب ونقصان سے منزہ رہے، پر کلام خداوندی میں دروغ کا بٹہ لگا، یہ اس واسطے جتلایا کہ بعض محققان شیعہ بپاس عصمت صفت علم وارادہ بدا کی تقریر کچھ ایسی ہی کرتے ہیں جس سے نقصان وعیب جو کچھ ہو، اخبار تک رہے، علم وارادہ تک نہ پہنچے، پر جو لوگ خدا کی عظمت وجلال کو کسی قدر سمجھتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ خداوند عظیم الشان کی کوئی صفت کیوں نہ ہو، عیب ونقصان سے مبرا ہے۔ محقق مذکور نے بزعم خود اچھی روش اختیار کی تھی اور صفت علم وارادہ کو نقصان سے بچا کر یوں خوش تھے کہ اہل سنت سے دامن چھڑالیا، پر یہ نہ سمجھے کہ یہ صفتیں اگر منزہ رہیں تو کیا ہوا، ایک اور صفت میں نقصان لازم آیا۔ آرے دروغ گورا حافظہ نباشد

مخاطب کی غلط فہمی سے علم خداوندی میں بدا ثابت نہیں ہوسکتا

بہر حال یہ دو صورتیں بدا کے ثبوت کی تھیں اور درصورت یہ کہ یہ دونوں صورتیں نہ ہوں بلکہ شکل عقد اجارہ اور تعلیق شرط وجزاء ہو تو اگر بوجہ عدم وقوع شرط جزاء ظہور میں نہ آئی اور بہ سبب ناپسندی عمل اُجرت نہ ملی تو اس میں خدا کی جانب کون سا قصور عائد ہوتا ہے جو بدا کے ثبوت کی گنجائش ملے، ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام غلطی فہم کے باعث جس سے انبیاء معصومین بھی معصوم نہیں، اگر کچھ کا کچھ سمجھ جائیں تو ہم تو نہیں کہہ سکتے یہ ان کا قصور ہے مگر اس کو بدا سے کیا علاقہ، ایسے بدا کے تو خود اہل سنت جو بدا کے بحایت منکر ہیں بکثرت قائل ہیں، اختلاف آئمہ جو لاجرم ایک نہ ایک کی غلط فہمی کو مستلزم ہے ان کے نزدیک رحمت عظمیٰ ہے۔ بالجملہ بدا کی حقیقت یہ ہے کہ متکلم یعنی جناب باری خود غلط سمجھے جیسے حقدمین شیعہ کی رائے معلوم ہوتی ہے یا عمداً غلط کہہ دی جیسے بعض محققین زمانہ تاویل کرتے ہیں، نہ یہ کہ مخاطب یعنی انبیاء یا علماء وغیرہم اپنے قصور فہم سے کچھ کا کچھ سمجھ جائیں، اس کو غلطی اجتہاد اور غلط فہمی اور قصور فہم کہتے ہیں، بدا کو اس سے کچھ علاقہ نہیں، ہاں کوئی قاصر الفہم اگر اس کو بدا سمجھ جائے تو تادم وضوح حق گو نہ معذور ہے۔ گو ایسی باتوں میں عذر جہل مقبول نہیں اور بعد وضوح حق اور اتمام حجت پھر یہ قصور اعلیٰ درجہ کا قصور ہے "نعوذ باللہ من سوء الفهم"

مگر ناظرین تقریر ہذا کو اس قدر یاد رہے کہ غلطی اجتہاد کی گنجائش اگر ہے تو ماسواء محکم اور عبارت النص میں ہے، عبارت النص اور محکم میں اہل فہم نہیں بہکتے جو اس میں بھی خطا کرے وہ

جاہل ہے عالم نہیں سو تلاوت کرنے والے کلام اللہ کے خود جانتے ہیں کہ آیات فضائل صحابہ در باب فضیلت صحابہ محکم اور عبارت النص ہیں کہ نہیں؟

آیہ میقات کی دو دیگر تفسیریں اور بدا کا استیصال

اگر کوئی اب بھی نہ سمجھے تو اس کو خدا سمجھے، پر نقل مشہور ہے جیسے کو تیسا، ایسے نادانوں کا یہ علاج ہے کہ یوں کہا جائے ثلثین لیلۃ یا مفعول بہ ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے یا مفعول فیہ، اگر مفعول بہ ہے تو قدر موعود تو وہی تیس راتیں تھیں اور مطلب یہ تھا کہ تم طور پر آنا، اپنا ایک خاص کام یعنی تیس رات کی عبادت جو اہل عقل کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں تم سے لیں گے، سو اس وعدہ کو پورا فرمایا اور پھر بمقتضائے کرم خداوندی دس دن کا اور اضافہ فرمایا۔ سو یہ از قبیل "لَدَيْنَا مَزِيْد" ہے اور اس نعمت اوّل کی اس کو روکن سمجھنا چاہیے۔ جب عوام اُمت محمدی کو نوگنی اصل سے روکن ملتی ہو، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک تہائی روکن مل گئی تو شیعوں کو اتنا برا کیوں معلوم ہوتا ہے اس صورت میں توریت کو اس وعدہ سے کچھ علاقہ نہیں، یا تو وہ از قسم وعدہ وعید ہی نہ ہو بلکہ از قبیل "لَدَيْنَا مَزِيْد" ہو یا موعود تو ہو پر بالاستقلال موعود ہو تیس رات کی محنت کا بطور تعلیق و شرط موعود نہ ہو۔

بالجملہ آیت سے اس صورت میں اگر ثابت ہوگا تو تیس رات کی عبادت کا موعود ہونا ثابت ہوگا تورات کا موعود ہونا جس پر مدار کار اثبات بدا تھا، ہرگز ثابت نہ ہوگا اور اگر مفعول فیہ ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ تیس راتوں تک وعدہ ہوتا رہا۔ باقی رہا موعود کیا ہے اس کے بیان سے یہ آیت ساکت ہے، اگر امر موعود عطاء توریت تھا تب کچھ نقصان نہیں اور اگر امر دیگر تھا تب کچھ خلجان نہیں، اوّل تیس رات تک یہ بشارت آتی رہی، جب بایں لحاظ کہ ایک مہینے کی مقدار عرف بنی آدم میں ایک مقدار کثیر ہے اسی سبب اکثر معاملات اُجرت اس پر منعقد ہوتے ہیں۔ اس قدر بشارت سے تسلی ہوگئی تب مزید اطمینان کے لیے چلہ پورا کیا اور اسی واسطے ایک بار ہی "**وواعدنا موسٰی اربعین لیلۃ**" کہہ کر خاتمہ نہ کر دیا بلکہ "**ثلثین لیلۃ**" کہہ کر "**واتممناھا بعشر**" فرمایا۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں یہ نہیں کہ کسی امر کے لیے اوّل کچھ ایک مدت مقرر فرمائی۔ پھر وقت پر اور مدت کام میں آئی جو بدا کے لیے دست آویز اور مذہب حق سے جائے گریز ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے مگر دیکھنے والوں کو یہ معلوم رہے کہ یہ تقریر اخیر موافق مثل مشہور جواب ترکی بہ ترکی اہل جدل کے مقابلہ میں بطور مجادلہ لکھی گئی ہے ورنہ طالبان حق کے لیے یہی حق و باطل خود ظاہر ہے۔

خاتمہ مباحث بدا

اب اس قدر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ شیعہ بدا کے وقوع کے مدعی تھے اور یہ آیت بزعم خود انہوں نے دلیل دعویٰ سمجھ رکھی تھی اور یہ سب اہل فہم جانتے ہیں کہ مدعی کے لیے دلیل ایسی چاہیے جس میں خلاف دعویٰ اور کوئی احتمال نہ ہو اور جو کوئی احتمال خلاف دعویٰ اُس دلیل سے سمجھ میں آتا ہو اور پھر وہ احتمال بھی ایسا کہ بہ نسبت دعویٰ مدعی کے زیادہ چسپاں بلکہ عین مفہوم مطابقی ہو اور بایں ہمہ اور دلائل اس کے مثبت ہوں اور دعویٰ مدعی کو رد کرتے ہوں تو اہل عقل پھر ہرگز اُس دعوے کو قبول نہ کریں گے اور حق نہ سمجھیں گے بلکہ حق اس دوسرے ہی احتمال کو سمجھیں گے، سو یہاں بعینہ یہی صورت ہے۔ چنانچہ اہل فہم پر پوشیدہ نہ رہے گی۔

جب بدا کے ابطال سے بفضلہٖ تعالیٰ فراغت پائی تو ہم اپنی طرف سے اُن لوگوں کے عذر کا جواب دے چکے جو خلفاء ثلثہ اور باقی مہاجرین اور انصار کی بزرگی کے باوجود یہ کہ کلام اللہ میں ان کی بزرگیاں مذکور ہیں اور ان کے لیے بڑے بڑے وعدہ کیے ہیں اس عذر سے قائل نہیں ہوتے تھے کہ شاید خدا کو بدا واقع ہوا ہو اور یہ سارے وعدے اور سب ان کی تعریفیں غلطی سے اوّل ظہور میں آئی ہوں اور پھر بعد میں حقیقت الامر صحابہ کی جناب باری تعالیٰ کو معلوم ہو گئی ہو اور بروئے انصاف اب ہمارے ذمے یہ واجب نہیں کہ آئمہ کے اقوال سے ان کو تسلی کر دیں۔

بدا کے ضمن میں آئمہ کے علم غیب پر بحث

اور اگر ہم اس پر بھی خاک ڈالیں تو یہ بات کیونکر سنی جائے کہ آئمہ کو "ما کان وما یکون" کا علم تھا اس لیے اگر ان کے اقوال سے خلفاء یا اصحاب کی بزرگی ثابت ہو جائے تو پھر کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ سبحان اللہ! خدا کے کہے سے تو تسلی نہ ہو اور اماموں کے فرمانے پر قرار آ جائے۔ اوّل تو صدہا آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سواء جناب باری تعالیٰ کسی کو علم غیب نہیں برائے تسکین دو تین آیتیں لکھنی ضرور پڑیں۔ "مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا" یعنی نہیں جانتا کوئی کہ کل کو کیا کرے گا۔ اس آیت میں کسی کا استثناء نہیں سب کو امام ہو یا غیر امام برابر فرماتے ہیں کہ کل کی خبر نہیں رکھتے۔ "قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ" کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ نہیں جانتے زمین و آسمان والے غیب کو مگر اللہ جانتا ہے۔

"ما کان ویکون" تسلیم کرنے میں مساوات لازم ہے

دوسرے اس صورت میں خدا کے علم میں اور آئمہ کے علم میں مساوات لازم آئے گی حالانکہ

جناب باری تعالیٰ سورۂ یوسف میں یوں ارشاد فرماتے ہیں: "وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ" یعنی ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے اور اگر کوئی یوں کہے کہ اگر اس آیت سے استدلال کرتے ہو تو اس آیت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا سے بھی زیادہ کوئی علم والا ہے کیوں کہ اس آیت میں کلیتہً فرما دیا ہے کہ خدا اور غیر خدا کی تخصیص نہیں کی تو یہ بات اوّل تو اہل فہم کے نزدیک قابل جواب نہیں اور جواب کے قابل بھی ہے تو اس جواب کے کہ یوں کہا جائے: ع

بریں فہم و دانش بباید گریست

کون نہیں جانتا کہ ایسے مقامات میں جناب باری تعالیٰ باستثناء عقلی مستثنیٰ ہوا کرتا ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر" سے کسی نادان کو بھی آج تک یہ شبہ نہیں پڑا کہ جب اللہ ہر چیز پر قادر ہوا تو اپنے معدوم کر دینے یا اپنے شریک کے پیدا کر دینے پر بھی قادر ہوگا۔ اتنا ہر کوئی سمجھ لیتا ہے کہ انبیاء اور اماموں کے پیدا کرنے اور معدوم کر دینے پر دونوں پر قادر ہے۔ ایسے ہی "فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْم" سے جاہل سا جاہل بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ خدا سے بھی زیادہ کوئی عالم ہوگا۔ پھر اگر کوئی اس قسم کی گفتگو کرے تو بجز تعصب اور ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں کہا جاتا۔

ایک عجیب تفسیری لطیفہ

مع ہذا ذی علم کے لفظ میں ایک اشارہ لطیف اس بات کے جواب کی طرف بھی ہے جیسے "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر" میں جو لفظ شے ہے اس میں ایک اشارہ لطیف خدشہ مذکور کے جواب کی طرف ہے، بیان اس کا یہ ہے کہ ذی علم اور علیم ہر چند بظاہر دونوں لفظ ہم معنی ہیں لیکن ذی علم میں ایک گونہ اتنی بات نکلتی ہے کہ غیر ذات ہے کیونکہ اضافت بالاتفاق تغایر پر دلالت کرتی ہے بخلاف علیم کے کہ اُس میں یہ بات نہیں۔ سو چونکہ خدا کا علم غیر ذات نہیں بالاجماع خصوصاً شیعہ کے نزدیک تو اس کو ذی علم کہنا مناسب نہیں بلکہ علیم کہنا چاہیے جیسے کہ شے اسے کہنا چاہیے جو مشیت کے تلے داخل ہو اور ذات خداوندی مشیت کے تلے داخل نہیں بلکہ معاملہ بالعکس ہے۔ القصہ جیسے خداوند کریم مشیت کے تلے داخل ہی نہیں جو اشیاء میں معدود ہو اور قدرت کے تصرفات اس پر چل سکیں، ایسے ہی خداوند کریم ذی علم میں داخل ہی نہیں جو اُس سے اوپر کوئی علیم ہوگا۔

الحاصل علم میں کوئی خدا کے ہم پلہ نہیں جیسے وہ ذات میں یکتا ہے ویسے ہی صفات میں یکتا ہے، نہ انبیاء اس کے علم میں برابر ہیں نہ امام نہ ملک نہ جن نہ خواص نہ عوام، اس عقیدہ میں شیعوں کا بعینہ ایسا غلو ہے جیسا نصاریٰ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بزرگی میں قدم حد سے بڑھ گیا ہے اور وہ تشبیہ

جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دی ہے اور یوں فرمایا ہے کہ تیری مثال ایسی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال کہ ایک فرقہ ان کی محبت میں ہلاک ہوا اور ایک ان کے بغض میں۔ وہ تشبیہ اور تمثیل سب بجا اور درست نکلی کہ خوارج نے جو بغض لیا تو روافض نے وہ محبت لی کہ جس سے حضرت امیر کو انبیاء سے تو بڑھایا ہی تھا خدا تک پہنچا دیا بلکہ انہوں نے "لَدَیْنَا مَزِیْد" کا کام کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو فقط حضرت امیر ہی کی نسبت یہ فرمایا تھا۔ حضرات شیعہ نے آپ کے فرمانے کی ایسی تصدیق کی کہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر دکھلا دیا، خوارج سے تصدیق نبوی میں وہ کارگزاری نہیں بن پڑی تھی جو شیعہ سے بن پڑی۔ القصہ خوارج سے حضرات آئمہ کے باب میں وہ تفریط نہ ہوئی جو شیعوں سے افراط ہوئی اور کسی نے سچ کہا ہے دشمن دانا بہتر از نادان دوست۔

بالفرض اگر علوم غیب آئمہ کیلئے ثابت بھی ہوں تو بدا کا خدشہ دور نہیں ہوا

اور اگر "مسلّمنا" آئمہ کو علم ما کان اور علم ما یکون تھا بھی، تب جو خدشہ کہ بوجہ بدا خدا کے فرمودہ میں تھا وہ بجائے خود رہے گا کیونکہ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو افضل الائمہ اور اعلم الائمہ ہیں وہ یوں فرماتے ہیں "فِی حدیث الکافی وَاَمَالِی الصَّدُوْقِ عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ لَوْلَا آیَۃٌ فِی کِتَابِ اللّٰہِ لَاَخْبَرْتُکُمْ بِمَا یَکُوْنُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ یُرِیْدُ بِالْاٰیَۃِ قَوْلَہٗ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ" حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ کافی جو کلینی کی تصنیف ہے اور امالی جو شیخ صدوق کی کتاب ہے ان دونوں میں حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جس کا یہ ٹکڑا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر ایک آیت یعنی "یمحوا اللہ ما یشآء" نہ ہوتی تو میں تمہیں جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے سب کی خبر دے دیتا۔ یہاں تک حاصل روایت ہوا اب غور فرمایئے کہ جو دلیل ان کے عالم ما یکون اور عالم ما کان ہونے کی تھی وہی دلیل اس بات کی بھی ہے کہ ان کا علم خدا کے علم سے بڑھ کر نہیں، پھر بایں ہمہ جس وجہ سے خدا کا علم قابل اعتماد نہ تھا۔ اُسی وجہ سے آئمہ کے علوم بھی قابل اطمینان نہیں، خدا کے بدا سے وہ بھی تنگ تھے اور اپنے کسی علم پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔ اس خیال سے شاید شیعوں کو تو یہ رنج ہو کہ ہمارا دین ہی ہاتھ سے چلا، جب آئمہ کو اپنے علم پر اعتماد نہ ہو تو یہ دین جو انہیں کے علوم کا پرتو ہے کیا قابل اعتماد رہا؟

پر ہمیں یہ خوشی ہے کہ اصحاب ثلاثہ اور سوائے ان کے اور مہاجرین وانصار کی برائیاں جو شیعہ حضرات آئمہ سے روایت کرتے تھے قطع نظر اس کے کہ ان روایات کے راوی کذاب اور مفتری

تھے۔(چنانچہ کچھ کچھ اس کا بیان ہو چکا) یونہی قابل اطمینان نہ رہے اور ماسوا اس کے اور جو کچھ ان کی کتابوں میں خلاف مذہب اہل سنت حضرات آئمہ سے مروی ہے سب ساقط الاعتبار ہو گیا۔

باقی رہی یہ بات کہ بدا اگر ہوا بھی ہوگا تو کہیں قدر قلیل ہوا ہوگا تو جواب اس کا یہ ہے کہ اعتبار کے اُٹھ جانے کو اتنا بھی بہت ہے، انجیل اور توریت کون سی ساری کی ساری اوّل سے آخر تک بدل گئی تھیں؟ دس پانچ جگہ کی تحریف نے سب کا اعتبار کھو دیا۔

مناقب خلفاء وصحابہ بزبان امیر رضی اللہ عنہ ودیگر آئمہ

اور اگر کوئی یہ فرق نکالے کہ کلام اللہ میں جو کچھ اصحاب کے فضائل نازل ہوئے ہیں یا خلفاء ثلثہ کی بزرگیوں کی طرف اشارہ ہے وہ سب قبل وفات...... اکثر اصحاب نازل ہولیا تھا اور وفات سے پہلے پہلے آدمی کا کچھ اعتبار نہیں، ہاں خاتمہ کا اعتبار ہے۔ سو خدا کی تشخیص میں غلطی کا احتمال ہے پر امیر المؤمنین یا اور آئمہ نے جو کچھ فرمایا ہوگا وہ سب بعد وفات کا قصہ ہے اس میں غلطی کا احتمال نہیں، اگر ان کے کلام سے ان کی بزرگی خاص کر اصحاب ثلاثہ میں سے کسی کی ثابت ہو جائے تو پھر گنجائش انکار نہیں، اس لیے آئمہ کی روایات پیش نظر کرتا ہوں، نہج البلاغہ تصنیف علامہ رضی میں جس کی مرویات شیعوں کے نزدیک متواترات میں سے ہیں، یوں منقول ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو لوگوں نے ان اصحاب کا حال پوچھا جن کا انتقال ہو چکا تھا تو آپ نے ان کے وہ اوصاف فرمائے جو بجز اولیاء کے ہو ہی نہیں سکتے۔وہ عبارت بلاغت آمیز بعینہ منقول ہے "كَانُوا اِذَا ذَكَرُوا اللّٰه هَمَلَت اَعْيُنُهُمْ حتّى تبلّ جباهُهُمْ ما دوا كَمَا يَمِيْدُ الشَّجَرُ يوم الريح الْعَاصِفِ خَوْفًا مِنِ الْعِقَاب وَرَجاءً لِلثّوَاب" اور پھر دوسری دفعہ ان کے حق میں فرمایا: "كَانَ احبُ اللّقَاءِ اِليهم لِقَاء اللّٰهِ وَاَنَّهُمْ يَتَقَلَّبُوْن علٰى مثل الجمر مِنْ ذِكْرِ مَعَادِهِمْ" "حاصل ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ جب خدا کا ذکر کرتے تھے "بَہ نکلتی تھیں ان کی آنکھیں یہاں تک کہ ان کے چہرے تر ہو جاتے تھے اور خدا کے ڈر اور اُمید ثواب میں ایسے لرزتے اور جھومتے تھے جیسے درخت تیز ہوا سے اور سب میں زیادہ محبت ان کو خدا کے ملنے کی تھی اور آخرت کو یاد کر کے ایسے بے چین ہو کر کروٹیں لیا کرتے تھے، جانو انگاروں پر لوٹتے ہیں۔" اور حضرت امام سجاد سے صحیفہ کاملہ میں بڑی طول طویل دُعا جس میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ان کے لیے دُعا خیر مندرج ہے منقول ہے۔سو ساری دُعا کی نقل کی گنجائش نہیں۔فقط دو چار لفظ لکھے دیتا ہوں۔اس

دعا میں "اَللّٰهُمَّ وَاَصْحَابِ مُحَمَّدٍ خَاصَّةَ الَّذِیْنَ حَسَنُوا الصَّحَابَةَ" کہہ کے آگے کہتے ہیں "فَارَقُوا الْاَزْوَاجَ وَالْاَوْلَادَ فِیْ اِظْهَارِ کَلِمَتِهٖ وَقَاتَلُوا الْآبَاءَ وَالْاَبْنَاءَ فِیْ تَثْبِیْتِ نُبُوَّتِهٖ" اس کے بعد میں فرماتے ہیں: "فَلَا تَنْسیٰ لَهُمْ اَللّٰهُمَّ مَا تَرَکُوْا لَکَ وَفِیْکَ وَاَرْضِهِمْ مِنْ رِضْوَانِکَ الخ" پھر اس کے بعد تابعین تک نوبت پہنچائی اور ان کے حق میں بھی اسی قسم کی دُعائیں فرمائیں۔ حاصل ان الفاظ کا یہ ہے "یا اللہ اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جنھوں نے خوب یاری کا حق ادا کیا، بیبیوں اور اولاد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بول بالا کرنے کے لیے چھوڑ دیا اور باپوں اور بیٹوں سے ان کی نبوت کے جمانے کے لیے لڑے، سومت بھولیو ان کے حق میں یا اللہ جو جو انہوں نے تیرے لیے اور تیرے سبب سے چھوڑ دیا اور راضی کردے ان کو تو اپنی رضامندی سے" یہاں تک الفاظ مذکورہ کا مضمون ہے ان روایات سے تو مطلقاً صحابہ کی تعریف اور بزرگی ثابت ہوتی ہے۔

مناقب صدیق رضی اللہ عنہ

اب وہ بھی سنئے کہ جس سے خاص ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ثابت ہووے۔ رضی کی نہج البلاغۃ میں جو شیعوں کے نزدیک مثل وحی آسمانی ہے، روایت کیا ہے

"عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِنَّهٗ قَالَ لِلّٰهِ بِلَادُ اَبِیْ بَکْرٍ فَلَقَدْ قَوَّمَ الْاَوَدَ وَدَاوَی الْعَمَدَ وَاَقَامَ السُّنَّةَ وَخَلَّفَ الْبِدْعَةَ ذَهَبَ نَقِیَّ الثَّوْبِ قَلِیْلَ الْعَیْبِ اَصَابَ خَیْرَهَا وَسَبَقَ شَرَّهَا اَدّٰی اِلَی اللّٰهِ طَاعَتَهٗ وَاتَّقَاهُ بِحَقِّهٖ رَحَلَ وَتَرَکَهُمْ فِیْ طُرُقٍ مُتَشَعِّبَةٍ لَا یَهْتَدِیْ فِیْهَا الضَّالُّ وَلَا یَسْتَیْقِنُ الْمُهْتَدِیْ"

حاصل اس کا یہ ہے کہ "حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں خدا ہی کے واسطے ہیں شہر (یعنی چونکہ ابوبکر کے شہر خدا ہی کے تھے تو خدا ہی کے رُتبے کا ظہور ہوا اور ظاہر ہے کہ جس کا خدا حرتی ہو وہ شخص لاجرم بڑا ہی صاحب کمال ہوگا) ابوبکر کے یعنی ابوبکر میں خداداد خوبیاں ہیں۔ پس قسم ہے کہ انہوں نے سیدھا کردیا کجی کو اور اصلاح کردیا ستون کو اور قائم کردیا سنت کو پس پشت ڈالا انہوں نے بدعت کو، دُنیا سے پاک دامن بے عیب گئے، خوبی خلافت کی ان کو نصیب ہوئی، اور آگے چل دیے خلافت کے فسادوں سے، ادا کی انہوں نے خداوند کریم کی طاعت، پرہیزگار رہے، حق پرہیزگاری کا چل دیے اور لوگ مختلف رستوں میں حیران ہیں کہ نہ گمراہوں کو راہ ملی ہے اور نہ ہدایت والوں کو اپنی ہدایت کا یقین ہے۔" یہاں تک حاصل معنی خطبہ مرقومہ ہوا۔

علامہ رضی کی خیانت جو مفید مطلب نہ ہو سکی

اب گوش گزار ناظرین رسالہ یہ ہے کہ علامہ رضی نے بپاس داریٔ مذہب ابوبکر کے لفظ کی جگہ لفظ فلاں بدل دیا ہے تا کہ سنیوں کو گنجائش استدلال نہ رہے اوران علامہ رضی کی کچھ عادت ہی یہ ہے مگر اتنا نہ سمجھے کہ نام کے چھپانے سے کیا فائدہ؟ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے کل تین خلیفہ تھے سو جس کی تعریف ہوگی سنیوں کا مطلب کہیں نہیں گیا۔ لہٰذا وہ اوصاف ایسے ہیں کہ خود ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑا دیں، خاص کر پہلا وصف اور دوسرا وصف کہ یہ دو وصف سواء ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کوئی بتلائے تو اور کس پر منطبق ہوتے ہیں؟ اور کس کی خلافت میں دین میں کجی آ گئی تھی؟ اور کس رُکن یعنی ستون میں ارکان اسلام میں سے نقصان آ گیا تھا کہ اس نے اس کی درستی کی؟

ہاں ان کی خلافت میں البتہ بسبب وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار طرف سے شور ارتداد اُٹھا، بہت لوگ ادائے زکوٰۃ سے جو رُکن اسلام ہے مانع آئے، سو نہ ابوبکر صدیق ہوں نہ یہ فتنے دبیں، ان کی برکات اور حسن انتظام اور خوبیٔ خلافت کے باعث جو حضرت امیر کے آنکھوں میں کھبے ہوئے تھے اور شیعہ بھی جی میں تو مانتے ہی ہوں گے زبان سے کہیں یا نہ کہیں، حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے زمانے کے فساد اور فتنوں کو دیکھ دیکھ انہیں یاد کرتے ہیں اور تاسف کرتے ہیں کہ ایسے زمانے میں ایسا شخص ہونا چاہیے تھا۔

صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شجاعت اور استقامت

اور کیوں نہ ہو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ تھے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جب چار طرف مرتدین کا زور ہوا تو اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم گھبرا گئے، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جری اور ذی ہوش اور صاحب رائے کے ہوش بھی ٹھکانے نہ رہے، یہ انہیں کی ہمت بندھانے کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تھا "اَجَبَّارٌ فِی الْجَاهِلِيَّةِ وَخَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ" یعنی اے عمر! کیا کفر کے زمانے میں یہ شورا شوری تھی اور اسلام میں یوں بول گئے۔ القصہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ رائے تھی کہ ایسے میں اگر لشکر اُسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ بھیجا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے مبادا مدینہ منورہ لشکر مجاہدین سے خالی ہو جائے اور دشمن تاخت کر بیٹھیں لیکن آفرین ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شجاعت اور استقامت پر کہ

باوجود ان ہنگاموں کے ہرگز نہ گھبرائے اور یہ فرمایا کہ جس لشکر کی تیاری خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کر گئے ہوں یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کو روانہ نہ کروں اور ایسے ہی مرتدین کے قتال میں جو لشکر کے بھیجنے کا ارادہ فرمایا اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے اس باب میں ان کی رائے کے مخالف ہوئی تو ایسا کچھ فرمایا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں تن تنہا جا کر لڑوں گا اور اسی طرح زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کے قتال کے باب میں جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ شبہ کیا کہ وہ کلمہ گو ہیں تو یہ ارشاد فرمایا کہ جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا نماز کو فرض کہے گا اور اسے فرض نہ سمجھے گا میں اس سے بے تامل لڑوں گا، واللہ! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بکری کا بچہ لوگ زکوٰۃ میں دیتے ہوں گے اور اب نہ دیں گے تو میں ان سے جہاد میں دریغ نہ کروں گا۔ الحاصل یہ انہیں کی شجاعت اور فہم و فراست تھی جو یہ رائے صائب سوجھی اور دین کو تھاما ورنہ دین میں وہ فتور پڑے تھے کہ خدا ہی حافظ تھا۔

سو جناب امیر المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے زمانے کے فسادوں اور بدعتوں کو جو لوگوں نے برپا کر رکھے تھے دیکھ دیکھ کر ان کو یاد کرتے تھے۔ چنانچہ الفاظ خطبہ مذکورہ خود گواہی دیتے ہیں اسی واسطے اکثر شارحین نہج البلاغۃ کی یہی رائے ہے اور کیونکر ممکن ہو کہ اور کسی پر ان اوصاف کو منطبق کردیں، بہت کرتے تو یہ کرتے کہ کسی ایسے شخص کا احتمال پیدا کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مر گیا ہوتا۔ جیسے بعضے ناانصافوں نے کیا ہے۔ سو شارحین کے ذمہ معنی کا درست کرنا بھی تو ہوتا ہے، ان اوصاف کو اس پر کیونکر منطبق کردیتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو کچھ خوبی ظہور میں آئی وہ سب آپ کا طفیل تھا اور کسی کا اس میں کیا اجارہ؟ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک زبان پر اس لیے نہیں لا سکتے کہ سنیوں سے اس کا کیا عذر کریں گے کہ حضرت امیر نے "ما حسبنی" لفظ فلاں کہا۔ کس قدر گستاخی کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس طرح سے ذکر کیا۔

مقام تعریف مقام تصریح ہوتا ہے نہ کہ مقام اخفاء

اور پھر کیا باعث ہوا کہ محل تعریف میں جو مقام تصریح و اعلام ہوتا ہے یہ اخفاء اور ابہام، بلکہ اسی نظر سے کہ یہ محل تعریف ہے یوں خیال میں آتا ہے کہ یہ تعریف ابوبکر ہی کی تعریف ہے اور یہ کنایہ لاجرم اعدائے صحابہ کی تحریف ہے ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں تو کچھ اندیشہ ہی نہ تھا جو کسی نے یوں چھپایا اور نام نہ بتایا۔ ہاں ابوبکر کی ضد میں بایں غرض کہ یہ مدح ابوبکر صدیق رضی

اللہ عنہ کی مدح نہ ہو جائے، گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی کی تہمت بھی اپنے ذمہ لازم آئے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت (گو بہ جبر) باعث اخفاء نام ہو سکے، گوارا کریں اور اس طرح سے اس مدح کو مدح نبوی قرار دیں تو ممکن ہے مگر اوصاف مذکورہ اس توجیہ کو کرنے بھی دیں، آپ کے زمانے میں اوّل تو اقامت سنت اور تخلیف بدعت کے کیا معنی؟ جس سے چاہو پوچھ دیکھو اقامت سنت کے لفظ سے کیا متبادر ہوتا ہے؟ ہر کوئی اتنا جانتا ہے کہ اقامت کے لیے سنت کا وجود اور اس کی پستی ہونی چاہیے، نہیں تو پھر اقامت کس کی ہوگی، سو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام فرماتے تھے یا خود کوئی عمل کرتے تھے تو وہ اقامت سنت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کو خود سنت سمجھنا چاہیے۔ مع ہذا بعد مقرر ہونے احکام سنت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کون سا ان میں فتور پڑ گیا؟ اور پڑ بھی گیا تھا تو آپ نے اس کی کیا اصلاح فرمائی؟

بہر حال کچھ کیجئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی طرف یہ اوصاف ڈھلتے ہیں، سو یہ کرامت حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے کہ ہر چند علامہ رضی نے ان کے کلام کو خراب کرنا چاہا مگر معنی وہی رہے اور بدنامی اپنے ذمہ لگائی، بھلا اتنا بھی خیال نہ کیا کہ تعریف کے محل میں ایسے کنایات سے کون باتیں کیا کرتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے اور بعضے شارحین کی رائے یہ ہے کہ اس خطبہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف ہے۔ سو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیں کون سے برے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جو وہ اس تعریف کو منطبق کرتے ہیں تو اس وجہ سے کہ وہ یوں لکھتے ہیں کہ مجھے مصنف کے ہاتھ کا یعنی علامہ رضی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہج البلاغتہ کا نسخہ مل گیا تھا۔ سو اس میں لفظ فلانے کے نیچے عمر کا نام لکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ مجھ سے فخار بن معد مولوی ادیب شاعر نے ایسا ہی بیان کیا اور میں نے ابو جعفر یحیٰی بن زید علوی سے جو پوچھا کہ اس لفظ سے کون مراد ہے تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہیں، میں نے کہا کیا امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قدر ان کی تعریف کی، انہوں نے کہا ہاں۔

الغرض اس وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ بعضے خطبوں میں جو حضرت عمر کے نام سے تعریف ہے تو اس کے الفاظ ان الفاظ سے بہت ملتے ہیں۔ بعضے شارحین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ڈھلے ہیں، پر اظہر یہی ہے کہ مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں لیکن جب شیعوں نے دیکھا کہ آخر یہ تعریف ہے تو کسی کی اصحاب ثلثہ میں سے ہے تو انہوں نے کہا کہ آؤ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی بتلاؤ، حضرت عمر آخر حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے داماد تو ہیں۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تو بہر حال کچھ ان کا پاس لحاظ زیادہ ہی چاہیے لیکن ہمارا ادھر

بھی لیکھا ہے اسی واسطے جو روایت کہ خاص ان کی تعریف میں ہے اس کو بھی زیب رقم کرتا ہوں۔

مناقب عمر رضی اللہ عنہ بزبان امیر رضی اللہ عنہ

لاسمان کتاب الموافقت میں زفر بن حکیم سے روایت کرتا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے کہا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چلنا چاہیے اور ان کی سنیں وہ کیا کہتے ہیں، سو میں جوان کی محفل میں آیا تو بہت لوگ ان کے منتظر بیٹھے تھے سو کچھ یونہی دیر ہوئی ہوگی جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے۔ اوّل تو سر مبارک جھکایا، پھر اوپر اُٹھا کر یہ فرمایا:

لِلّٰہِ دَرُّ بَاکِیَۃِ عُمَر وَا عُمَراہ قَوَّم الْاَوْدَوَا اَبَدَ الْعَمَدَمَاتَ نقی الثَّوْبِ قَلِیْلُ الْعَیْبِ وَاُعُمَراہ ذَھَبَ بِالسُّنَّۃِ وَاتقی الْفِتْنَۃَ اَصَابَ وَاللّٰہ ابْنُ الْخَطَّاب خَیْرَھَا وَنَجی مِنْ شَرِّھَا وَلَقَدْ نَظَرَ لَہٗ صَاحِبَۃٗ فَصَار عَلَی الطَّرِیْقَۃِ مااسْتَقَامَتْ ثُمَّ قَالَ فَقَالَ وَرَحِلَ اَلْمَرْکَبُ فَتَشَعَّبَھُمْ الطَّرِیْقُ لَا یَدْرِی الضَّالّ وَلَا یَسْتَیْقِنُ الْمُھْتَدِیْ۔

اس عبارت کے معنی بھی قریب قریب پہلی ہی روایت کے ہیں اس لیے بعض شراح جن کا ذکر ہو چکا، روایت مقدم کو بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی پر محمول کرتے ہیں لیکن اوصاف کو دیکھیے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی پر پھبتے ہیں۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا باقی اس روایت کے الفاظ اور اس روایت کے الفاظ کے تطابق سے کچھ یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں ایک ہی آدمی کی تعریف میں ہوں۔ اگر دونوں روایتوں کو جدا جدا شخص کے لیے سمجھیے تب بھی تو کچھ محال نہیں۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بھی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی خلافت کا تتمہ تھا۔ بنیاد ساری باتوں کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی باندھ گئے تھے، ملک شام اور ایران پر جو جہاد ہوا تو پرداز اس کا خلیفہ اوّل ہی ڈال گئے تھے اور جو جو لوازم خلافت تھے سب کی جڑ وہی درست کر گئے تھے۔ چنانچہ ماہران تواریخ پر پوشیدہ نہیں، وہ موجد قوانین انتظام تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس کے برتنے والے۔ غرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رستہ ڈال گئے ہیں کہ حضرت عمر اسی رستہ چلتے گئے اگر اس وجہ سے کہ ابوبکر صدیق کے کاموں کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پورا کیا، ان کو بھی موصوف باوصاف مندرجہ روایات اوّل سمجھیں تو چنداں بعید نہیں۔

باب عقیدۂ تقیہ

عقیدہ تقیہ اور اس کے عقلی ونقلی مباحث

بہر حال اگر شیعوں کو یہی مرکوز خاطر ہو کہ ہم بجز اماموں کے فرمانے کے اصحاب ثلاثہ اور اصحاب کے قیامت تک معتقد نہ ہوں گے تو یہ عذر بھی ہم نے ان کا باقی نہ رکھا۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا جو مرقوم ہوا مگر ہم جانتے ہیں کہ ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' شیعہ اپنی ناانصافی سے باز نہ آئیں اور بسبب عداوت صحابہ کے جو اہل بیت کی محبت سے پہلے ان کی رگ و پے میں رچ گئی ہے عجب نہیں کہ خلاف اُمیدیوں بھی کہہ اُٹھیں کہ حضرات آئمہ کی بات کا بھی کیا اعتبار؟ ساری عمر انہوں نے تقیہ میں گزاری اور حق کو ناحق اور ناحق کو حق کہتے کہتے چل دیئے۔ جب امام الائمہ حضرت امیر المؤمنین بایں ہمہ شہرۂ شجاعت اور ظہور کرامت کہ شیر خدا اور علی ولی اللہ ان کا لقب ہے، خلفائے ثلاثہ سے اتنا کچھ ڈرتے تھے کہ ان کے زمانے میں تو کیا اپنے زمانے میں بھی اظہار مذہب حق نہ کر سکے ہوں تو اوروں کا تو کیا ذکر؟ ہم جب تک ہرگز نہ مانیں کہ یا تو تقیہ کو کوئی باطل کر دکھلائے یا کسی ایسے کی سند بتلائے کہ وہ تقیہ نہ کرتے ہوں۔

اس لیے ناچار تقیہ کی اصل حقیقت بھی کھول کر کچھ کچھ دکھلانی پڑی، ناانصافوں سے پلہ پڑا ہے، دیکھئے کتنی چک پھیریاں کھائیں اور ہم ان کی دم کے ساتھ لگے ہوئے کہاں کہاں تک جائیں۔ مخدوم من آفرین ہے ان لوگوں کی ہوشیاری پر کہ جن کا یہ دین ساختہ پرداختہ ہے۔ ایسی نامعقول باتوں کا بجز بدا اور تقیہ کے رواج ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر سنیوں نے کلام اللہ کا حوالہ دیا تو بدا کا عذر کیا، اماموں کا قول پیش کیا تو تقیہ سے الزام دیا اب بیچارے سنی اپنا سامنہ لے کر رہ نہ جائیں تو اور کیا کریں؟ غرض جس نے اس مذہب کو تراشا واقعی نہایت ہوشیار تھا، پر کم فہم بھی ہوں تو اتنے ہوں جتنے حضرات شیعہ کہ دام ودانہ کہ ان کو کچھ تمیز نہیں، ہائے افسوس کیسے کیسے لوگ اس دام میں پھنس گئے یہ نہ سمجھا کہ دین خداوندی کو ایسی باتوں سے کیا علاقہ، یہ فقط یاروں کی گھڑی ہوئی باتیں

ہیں، نہ عبداللہ بن سبا یہودی منافق اور اس کے شاگرد پیشہ ہوتے نہ یہ قواعد تشیع تصنیف ہوتے۔
خیر بہر حال اس حیلہ اخیر کا جواب بھی دے لیجئے، شاید خداوند کریم کسی کو ہدایت نصیب فرمائے۔

تقیہ شیعہ کی اپنی روایات کے آئینے میں

مخدوم من اوّل تو یہ عذر روایات مذکورہ میں بنظر غور پیش نہیں جاتا، خاص کر پہلی دو روایات میں حضرت امام سجاد زین العباد رضی اللہ عنہ "وعن آبائه الكرام" نے جو کچھ اصحاب کرام کی تعریف فرمائی تو عین مناجات خداوندی اور دُعا کے وقت فرمائی ہے خدا سے کیا تقیہ پڑا تھا؟ اگر کسی بنی آدم سے کلام گفتگو ہوتی تو یہ بھی احتمال ہوتا کہ شاید طرفدارانِ صحابہ میں سے ہو اور اگر خدا پر بھی صحابہ کی طرف داری کی تہمت تھی تو سنیوں کے زہے نصیب کہ ان پیشواؤں کی خدا بھی طرف داری کرتا تھا لیکن شیعوں کو اپنا فکر چاہیے۔ مع ہذا حق مذہب سوا اس کے اور کسے کہتے ہیں کہ خدا ان کی پشتی پر ہو سارا کلام اللہ "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ" اور اسی قسم کی آیات سے بھرا ہوا ہے، باقی خدا کی طرف یہ احتمال تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا بھی اصحاب ثلاثہ سے ڈرے تھا۔ (نعوذ باللہ منہا)

ہاں اگر شیعہ کہہ دیں تو کچھ نہیں کیوں کہ ان کے عقائد کے موافق تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تقیہ بھی کچھ اس سے کم نہیں، شیر خدا جدا تھے۔

موت پر اختیار، غیب کا علم، بے انتہا شجاعت، پھر تقیہ کیوں؟

بایں ہمہ اپنی موت اپنے اختیار میں، چنانچہ کلینی نے اس بات کو ثابت ہی کیا ہے کہ اماموں کی موت ان کے اختیار میں ہے اور کلینی کیا سارے امامیہ اس پر متفق ہیں کہ علم "ما كان ما يكون" جدا تھا اتنا یقیناً جانتے تھے کہ فلانے وقت فلانے کے ہاتھ سے شہید ہوں گا، اس سے پہلے نہ اس سے پیچھے اور تمام عمر میں اس اس طرح آسائش گزاروں گا کہ باوجود کثرت انبوہ دشمنان میرا کوئی مزاحم حال یا درپے جان و مال نہ ہوگا اور اگر ہوگا بھی تو میرا کچھ نقصان نہ ہوگا، پھر ان سب اختیارات اور علوم کے بعد شجاعت تو ایسی کہ ہزار رستم بھی ہوں تو مان جائیں، ابوبکر و عمر تو کس گنتی میں ہیں اور کرامت اس قدر کہ در خیبر کو اُٹھا کر پھینک دیں۔ خانہ ابوبکر و عمر کی کیا حقیقت۔

پھر بایں ہمہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے ڈرے، کوئی انصاف کر کے بتلائے کہ یہ تقیہ خدا کے تقیہ سے کس بات میں کم ہے؟ علاوہ بریں وقت تعریف مذکور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا بجز نام و کام نام و نشان باقی نہ رہا تھا اور ظاہر ہے کہ مرے ہوئے سے تو گیدڑ بھی نہیں ڈرتے۔ شیر خدا علی مرتضٰی پھر روباہ مری

ہوئی سے دبے تو قیامت آ گئی، خیر کہاں تک کہئے مطلب اتنا ہے کہ دُعا کے وقت کہ جو وقت مناجات عالم السر والخفیات ہے۔ اس وقت تقیہ کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کہ منافقین کا نماز پڑھنا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، منافق بندوں کو دھوکا دیتے تھے اور دَر صورت تقیہ (نعوذ باللہ) حضرت امام سجاد خدا کو کیونکہ یہ تو ہم یقیناً جانتے ہیں اور شیعہ بھی کتنے ہی نادان کیوں نہ ہوں اس کے خلاف نہ کہیں گے کہ حضرت امام کی عبادت روی دریاء تھی، سو کسی سنی یا معتقد خلفاء کے استرضاء کا تو ان کی عبادت میں احتمال ہی نہیں۔ بجز اس کے کہ بخیال جانب داری خلفاء جو خدا سے ظہور میں آئی یہ خیال دل میں ہو کہ ایسا نہ ہو کہ خداوند کریم بہ سبب خلفاء اور بے اعتقادی صحابہ سے اگر چہ حق ہی ہو ناراض نہ ہو جائے۔ **"نعوذ باللّٰه من هذه الخرافات"** جناب من ایسی محفل میں تقیہ کا احتمال کرنا جس پہلو سے پلٹ کر دیکھو دین کو برہم درہم کیے دیتا ہے یا خداوند کریم کی طرف برائی عائد ہوگی۔ **"تعالی اللّٰه عَنْ ذالک علوا کبیرا ط"** یا آئمہ کی طرف...... **"نعوذ باللّٰه منه کثیرا"** بہر حال تقیہ کے پردہ میں یہ دشمنانِ اہلبیت آئمہ کو کیا کیا کچھ نہیں کہہ لیتے واقعی بہت خوبصورتی سے ہجو کرتے ہیں۔

حضرت امیر نے بعد وفات صدیق کے مناقب حلفاً بیان کیے اس وقت خوف بھی نہ تھا

بھلا امام سجاد تو ستم دیدہ اور ظلم کشیدہ دشمنانِ سفاک تھے۔ اس پر نہ وہ شجاعت تھی جو حضرت امیر میں تھی نہ وہ کرامت تھی جو حضرت امیر میں تھی۔ اگر ان کے حق میں کوئی تقیہ کا دعویٰ کرے تو شاید کوئی بیوقوف فی الجملہ مان بھی جائے لیکن ستم تو یہ ہے کہ حضرت امیر کی نسبت بایں ہمہ زور و شجاعت و باوجود یکتائے علم و کرامت و استمرار صحت وسلامت کہ زمان خلفاء ثلثہ سے لے کر اپنی خلافت تک بے اندیشہ گزاری اپنی نیند سوئے اپنی بھوک کھایا یہ احتمال کیا جائے کہ انہوں نے ایسے دس جھوٹ پر قسم کھائی کہ ان کی بدولت آسمان گر جائے تو عجب نہیں اور زمین پھٹ جائے تو دور نہیں، کجا یہ اوصاف جمیلہ اور محامد علیہ کہ لگ بھگ انبیاء کے اوصاف اور لوازم کے ہیں کجا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ بزعم شیعہ ابلیس سے بڑھ کر کہ اس کا برا کہنا مستحب بھی نہ ہوا اور ان کا تبرا فرض بلکہ اس سے بڑھ کر کہا جائے تو عجب نہیں کیونکہ موافق **"مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا"** کے ایسے ویسے لوگوں کے فرضوں کا ثواب دس گنا ہو تو ہو اس لیے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کو دہ چند ثواب ملے گا۔

اور لعن شیخین اس قدر مقبول ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ بات مرقوم ہے کہ ابو بکر صدیق اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر ہر صبح لعنت کرنی ستر نیکیوں کے برابر ہے اور پھر طرفہ یہ ہے کہ ابلیس اور نمرود اور شداد اور فرعون اور ابو جہل اور اُمیہ بن خلف اور ابولہب وغیرہم دشمنانِ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعن اور تبرا ماشہ بھر نیکی کے برابر نہیں، کسی نے ایسوں ہی کی تعریف میں کہا ہے۔ ''بریں عقل و دانش باید گریست'' بالجملہ ایسے لوگوں کی تعریف جو ابلیس اور نمرود اور فرعون اور ابو جہل وغیرہم سے بھی بڑھ کر ہوں اور پھر تعریف بھی اس قدر کہ دس بڑے بڑے کمالات بقسم بیان کیے جائیں، ایسے کاملوں سے جن کا نام حضرت علی شیر خدا جن کے اوصاف اوپر مذکور ہو چکے جب ہی ہو سکتی ہے کہ کافر ہونے کے یہ معنی ہوں کہ خدا کا بڑا ہی مطیع و فرمانبردار ہو، سو اگر کفر کے یہی معنی ہیں تو کون مردود برا مانتا ہے، ایسی گالیاں تو جتنی چاہیں شیعہ دے لیں، بجز تسلیم اس طرف سے ان شاء اللہ جواب ہی نہ ہو گا۔

بیت: بدم گفتی و خور سندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

سبحان اللہ! کس کس پیچ سے حضرات آئمہ کی معصومیت بلکہ بزرگی کو بٹہ لگاتے ہیں۔ خوارج سے شیعہ (ہم جانیں) کچھ دو انگشت زیادہ ہی ہوں گے پر اتنا ہی کہ شیعہ سنوار کر چھان پھوڑ کر عیب لگاتے ہیں اور خوارج اناڑیوں کی طرح بے سوچے سمجھے گنوار کا سا لٹھ مار بیٹھتے ہیں۔

حکایات تقیہ کی روایات کتب شیعہ، پُر زور تکذیب کرتی ہیں

القصہ یہ عذر پوچ عاقلوں کے سامنے کہ آئمہ معصومین اصحاب ثلاثہ یا اور مہاجرین اور انصار کی تعریف بوجہ تقیہ کیا کرتے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ عقل کے نزدیک یہ عذر لاطائل گوز شتر کے نرخ بکتا ہے، یوں بھی تو قابل تمسک نہیں کہ جن بزرگواروں کی طرف تقیہ کی تہمت کرتے ہیں ان ہی بزرگواروں کے افسانے جو ان کی معتبر کتابوں میں منقول ہیں بآواز بلند تقیہ کی تکذیب کرتی ہیں۔ ہر چند سب کا اس رسالہ میں درج کرنا ممکن نہیں لیکن ''مشتے نمونہ خروارے'' دو تین روایتیں جو امام الائمہ حضرت امیر کے اظہار حق اور صدق حال پر دلالت کریں درج کی جاتی ہیں تاکہ بحکم متابعت بزرگان اوروں کی بزرگی اور خوبی بھی کذب اور ریا سے پاک وصاف ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ جب شمس الائمہ کا حال یہ ہے کہ تقیہ میں جو بقول شیعہ ان پر منجملہ فرائض ہی تھا اس قدر تقصیروار تھے اور احکام تو کیا ذکر؟ تو اور آئمہ کا کیا حال ہو گا؟

امیر کا حکم کہ سچائی اختیار کرو خواہ کچھ بھی ہو

نہج البلاغت میں جو شیعوں کے نزدیک اصح الکتب اور متواتر ہے۔ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کا یہ قول تقیہ کے ابطال میں دلیل قوی اور برہانِ کامل ہے "عَلَامَةُ الْإِيْمَانِ إِيْثَارُكَ الصِّدْقَ حَيْثُ يَضُرُّكَ عَلَى الْكِذْبِ حَيْثُ يَنْفَعُكَ" یعنی ایمان کی نشانی یہ ہے کہ جہاں سچ بولنا ضرر کرتا ہو ایسی جگہ سچ بولنے کو پسند رکھے۔ جھوٹ بولنے پر جو نفع دیتا ہو، اس روایت سے صاف نکلتا ہے کہ جو تقیہ کرے اس میں ایمان نہیں کیونکہ علامت ایمان کی یہ ہے کہ جان و مال کا ضرر گو ہو جائے پر جھوٹی بات زبان پر نہ لائے۔

امام کی شجاعت اور اشتیاق جنت

دوسری روایت بھی نہج البلاغت ہی کی لیجئے: قَالَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنِّيْ وَاللّٰهِ لَوْ لَقِيْتُهُمْ وَاحِداً وَهُمْ طِلَاعُ الْاَرْضِ كُلِّهَا مَا بَالَيْتُ وَلَا اسْتَوْحَشْتُ وَاِنِّيْ مِنْ ضَلَالَتِهِمُ الَّتِيْ هُمْ فِيْهَا وَالْهُدَى الَّذِيْ اَنَا عَلَيْهِ لَعَلٰى بَصِيْرَةٍ مِنْ نَفْسِيْ وَيَقِيْنٍ مِنْ رَّبِّيْ وَاِنِّيْ اِلٰى لِقَاءِ اللّٰهِ وَلِحُسْنِ ثَوَابِهِ لَمُنْتَظِرٌ رَاجٍ.

مطلب یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں بیشک قسم اللہ کی اگر ان سے تن تنہا مقابل ہوں اور وہ تمام زمین کو گھیرے ہوئے ہوں تو میں ہرگز کچھ پرواز نہ کروں اور نہ گھبراؤں اور مجھے ان کی گمراہی اور اپنی ہدایت کا حال عیاں ہے اور اس بات کا خداداد یقین ہے اور میں خدا کے ملنے یعنی مرنے اور اس کے ثواب کے انتظار اور اُمید میں ہوں۔ اب غور فرمایئے جو شخص تن تنہا اتنے دشمنوں سے بھی نہ ڈرے جو تمام روئے زمین کو ڈھک لیں اور ڈرنا تو درکنار پروا اور گھبراہٹ تک نہ ہو بلکہ مرنے اور جنت کا مشتاق ہو، ایسے لوگوں سے تقیہ کے ہونے کے کیا معنی؟ ایسے لوگ بھی اگر ڈرنے لگے تو قیامت آ گئی۔ مع ہذا تقیہ بغیر خوف کے تو ہوتا ہی نہیں اگر مر جانے کا خوف ہے تو وہ اماموں کو ہوتا ہی نہیں کیونکہ اوّل تو ان کی موت ان کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ کلینی نے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے اور تمام امامیہ کا اس پر اتفاق ہے پھر وہ کسی سے کیا ڈریں اور کیوں ڈریں؟ دوسرے علم وقائع گزشتہ اور نیز وقائع آئندہ سب ان کو متحضر، خود اپنے مرنے کا حال اور کیفیت بتفصیل و تشریح معلوم ہوتی ہے، اس وقت سے پہلے ڈر ہو ہی نہیں سکتا۔

انبیاء اور آئمہ کا منصب صبر و تحمل اور حق گوئی ہے

اور اگر خوف مال یا آبرو یا بدگوئی خلائق کا اندیشہ یا کسی قسم کی تکلیف کا خوف ہے تو انبیاء اور آئمہ کا کام یہی ہے کہ تکلیفیں اُٹھایا کریں اور تحمل کیا کریں اور دشمنوں کی قوت و شوکت اور اپنی بے

کسی اور بے زری کا لحاظ نہ کریں اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود سے نہ چھپے اور آگ میں گرنا قبول کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے نہ ڈرے اور آخر نوبت جلاوطن ہونے کی پہنچی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے نوسو برس تک کیا کیا، مصیبتیں اُٹھائیں، شیعوں نے بھی سنی ہوں گی۔ حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام کا مقتول ہونا شہرۂ آفاق ہے۔ حضرات شیعہ ہی انصاف کر کے فرمائیں کہ ان کے مقتول ہونے کا باعث سواء کلمۃ الحق اور حق گوئی کے اور کیا تھا۔ عزت چھوڑ یہاں تو جان پر کھیل گئے۔ حضرت امیر جو انبیاء سے افضل نہیں تو مساوات میں تو شیعوں کے نزدیک کلام ہی نہیں آبرو تک کا خدا سے دریغ کریں۔

تقیہ اگر فرض تھا تو امام حسین کی شہادت معصیت ہوگی

اور خود خلف رشید حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سید الشہداء شہید کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ جان نازنین کو نثار راہ خدا کر گئے۔ اگر تقیہ سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ بلکہ فرض خداوندی تھا تو اس سے زیادہ اور کونسا موقع تقیہ کا ہوگا کہ تیس ہزار فوج جرار برسرِ کارزار، زن و فرزند ہمراہ، ننگ وناموس کا اندیشہ، نہ کھانا نہ دانا، نہ پانی کا سامان نہ آڑ کے لیے کوئی مکان اور اس طرف سے فقط اتنی طلبگاری کہ بیعت یزید قبول کر لو پھر جہاں جی چاہے چل دو، بڑے حیف کی بات ہے جان و مال سب برباد گئے، زن و فرزند پر جو کچھ گزری سب جانتے ہیں، پھر تس پر خاتمہ ہوا تو یوں ہوا کہ فرض مفترض معمول بہ اہل بیت پر عمل نہ کیا، بے گناہوں کو مفت کے مظلمہ میں گرفتار کیا، ان کا وبال (نعوذ باللہ) اپنی گردن پر لیا (نعوذ باللہ) اگر یہی تقیہ ہے تو ہم جانتے ہیں کہ یہ دوست بدتر از ہزار دشمن، بہ نسبت حضرت امام الشہداء نعوذ باللہ عقیدہ "خسر الدنیا والآخرہ" رکھتے ہیں، واللہ کہ ان الفاظ کے کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے مگر خداوند عالم الغیب والشہادۃ خوب جانتا ہے میں تقیہ سے نہیں کہتا کہ یہ سب رڈ و کد بدولت حضرات مدعیان دروغ فرقہ مسمی بشیعہ کے ہے ورنہ یہ خاکپائے غلامان اہل بیت ان حضرات کو اکابر اولیاء اللہ اور عمدۂ صدیقین اور افسر مخلصین اور خلاصہ محسنین اور زبدہ متقین اور سر حلقہ محبوبین سمجھتا ہے، حاشا وکلا جو بطور شیعہ دعویٰ دروغ ہو۔

امام کا اپنی کرامت سے حضرت عمر کو مرعوب کر دینا

تیسری روایت راوندی کی کہ مقتداء شیعہ اور شارح نہج البلاغت ہے۔ کتاب جرائح الجوائح میں سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتا ہے۔

اِنَّ عَلِیًّا بَلَغَهٗ عَنْ عُمَرَ اَنَّهٗ ذَکَرَ شِیْعَتَهٗ فاستقبلهٗ فِیْ بَعْضِ طُرُقَاتِ الْبَسَاتِیْنِ الْمَدِیْنَةِ وَفِیْ یَدِ عَلِیٍّ قَوْسٌ فَقَالَ یَا عُمَر بَلَغَنِی عَنْکَ ذِکْرُکَ لِشِیْعَتِیْ فَقَالَ اِرْبَعْ عَلٰی ضَلْعَتِکَ فَقَالَ عَلِیٌّ اِنَّکَ لَهٰهُنَا ثُمَّ رَمٰی بِالْقَوْسِ عَلَی الْاَرْضِ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانَ کَالْبَعِیْرِ فَاغِراً فَاه وَقَدْ اَقْبَلَ نَحْوَ عُمَرَ لِتَبْلُعَهٗ فَقَالَ عُمَرَ اللّٰه اللّٰه یَا اَبَا الْحَسَنَ لَاُعُدْتُ بعْدَهَا فِیْ شَیْءٍ وَجَعَلَ یَتَضَرَّعُ اِلَیْهِ فَضرِبَ یَدَهٗ اِلَی الثُّعْبَانِ فَعَادَتِ الْقَوْسُ کَمَا کَانَتْ فَمَضٰی عُمَرُ اِلٰی بَیْتِهٖ. الخ

یہ روایت بہت بڑی ہے کہاں تک نقل کروں اتنے الفاظ بھی بہت ہیں، پر حاصل معنی۔ اس کا بیان کیے دیتا ہوں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یوں خبر پہنچی تھی کہ عمر کچھ شیعہ علی کو برا کہتے ہیں، سو اتفاقات سے بعضے مدینہ کے باغوں کی راہ میں ان کے سامنے آ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے عمر! مجھے یوں خبر پہنچی ہے کہ تو میرے شیعہ کو برا کہتا ہے۔ عمر نے کہا اے میاں اپنی خیر مناؤ۔ حضرت علی نے فرمایا تم اتنے ہو گئے، پھر کمان کو جو زمین پر ڈالا تو ایک اژدھا تھا اونٹ کے برابر منہ کھولے ہوئے حضرت عمر کی طرف نگلنے کے ارادہ سے دوڑا۔ عمر نے کہا خدا کے واسطے خدا کے واسطے، اے ابوالحسن پھر اس کے بعد ایسی بات کبھی نہ کہوں گا، اور لگے گڑگڑانے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اژدھا کی طرف جو ہاتھ لپکایا، پھر وہی کمان کی کمان ہو گئی، خیر عمر اپنے گھر چلے گئے۔'' اس روایت کو دیکھئے تو تقیہ کی تو گردن ہی توڑ دی۔ خلیفوں اور اصحاب میں بڑی دھوم دھام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی تھی اور سنی بھی انہیں کی شوکت اور دبدبہ کو بہت زبان پر لایا کرتے ہیں، سو جب ان کا یہ حال ہو کہ ایک کرشمے سے ان کو ڈرا دیا اور بیچارے تو فقط اشارہ کے تھے۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت امیر کا سکوت جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے افعال اور حرکات پر تھا۔ یہاں تک کہ غصب فدک دیکھا کیے، اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا اور ان سے بیعت کر لی اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے، یہ سب بوجہ حقانیت تھا، نہ بوجہ تقیہ ورنہ اس زور اور قدرت اور اس کرامت کا آدمی اور کون تھا جو ان سے اندیشہ یا ہراس رکھتا اور اگر بالفرض یہ زور اور بل اور یہ قدرت خداداد کسی میں ہوتی بھی تب غصب دختر طاہرہ مطہرہ تو ہرگز گوارا نہ ہوتا۔ اہل ہند جو تمام ولایتوں کے لوگوں کے نامردہ پن میں امام ہیں ان میں بھنگی اور چمار بھی اس سہولت سے بیٹی نہیں دیتا جس طرح حضرت امیر نے اپنی دختر مطہرہ کو حضرت عمر کے

حوالے کردیا۔ آپ بھی دیکھتے رہے اور صاحبزادی بھی، پھر صاحبزادوں میں بھی ایک وہ تھے کہ جنھوں نے تیس ہزار فوج جرار کا مقابلہ کیا حالانکہ وہ زمانہ ضعیفی اور تحمل کا تھا اور بہن کے نکاح کے وقت عین شباب تھا اور تس پر تماشا یہ ہے کہ ہنگامہ کربلا میں جو دشمنان سفاک نے حرم محترم اور زنان اہلبیت کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو کیا کچھ غضب اور جوش آیا، شیعوں کو تو شہادت نامہ کربلا از بر ہی ہوگا۔ لکھنے کی کیا حاجت۔

تقیہ از روئے عقل و نقل و عرف

بالجملہ روایات شیعہ خود تقیہ کی جڑ اکھاڑتی ہیں، فقط سنیوں ہی کا قصور نہیں اور اب آگے اور لکھنا ہمیں ضرور نہیں کہ بحمد اللہ عاقلان منصف کے لیے یہ بھی بہت ہے مگر بنظر اتمام حجت اور مزید توضیح یوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور نقل اور عرف سے بھی اس بات میں استفتاء کیجئے تا کہ شیعوں کی آنکھیں تو کھلیں کہ ہم کس خواب خرگوش میں مدہوش ہیں۔ جناب من عقل کی رو سے دیکھئے تو پیغمبروں اور اماموں کا تقیہ ایسا ہے جیسے کسی معلم کو لڑکوں کے پڑھانے اور تادیب کے لیے نوکر رکھا جائے اور وہ معلم تعلیم اور تادیب تو درکنار اُلٹا لڑکوں کے ہم رنگ ہو کر گیند بلا یا گلی ڈنڈا کھیلنے لگے تو پیغمبروں اور اماموں کے لیے خدا کی طرف سے تقیہ کا فرض ہونا ایسا ہی ہے جیسے معلم اور مؤدب کو اہل مکتب یہ حکم دے کہ پڑھائیے، پر چاہیے تمہارے اور لڑکوں کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلے۔ خبردار! ایسا نہ کرنا اور ان کی تادیب میں تقصیر نہ ہو لیکن جس طرح سے لڑکے چاہیں سر مو اس میں تفاوت نہ ہو نہ ان کو ڈرائیو، نہ ماریو نہ اپنی طرف سے کچھ کہیو بلکہ وہ کھیلیں تو ان کے ساتھ تم بھی کھیلنے لگیو۔

اب اہل انصاف فرمائیں کہ یہ بات کچھ عقل کی ہے اور اس میں اور پیغمبروں اور اماموں کے تقیہ میں کیا فرق ہے؟ اور پھر تقیہ بھی اتنا کچھ کہ دین برباد ہو گیا تمام اُمت محمدی گمراہ ہو گئی، تس پر اپنا ننگ و ناموس جاتا رہا، پر چاہیے زبان سے کلمۃ الحق نکلے، اس کی نوبت نہ آئی۔ کھل کھیلنا تو کجا اور پھر بایں ہمہ حضرات شیعہ معتقد اس بات کے کہ دین شیعہ عین مطابق عقل ہے اور کیونکر نہ کہیں خداوند کریم تو ان کے اعتقاد کے موافق بایں ہمہ خداوندی اور احکم الحاکمین ہونے کے محکوم عقل ہے اور عقل کی اطاعت اس کے ذمہ فرض ہے۔ واہ سبحان اللہ کیا خدا کی قدردانی ہے۔ جب خدا کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو کسی کو کیا شکایت، اوّل تو خدا کو محکوم بنایا اور اس کے احکم الحاکمین ہونے سے جو کلام اللہ میں بعینہ انہیں الفاظ سے مذکور ہے ہاتھ اُٹھایا، دوسرے ایسا خلاف عقل حکم اس کے نام لگایا کہ جس سے بزعم خود (نعوذ باللہ) خدا کو گنہگار اور تارک فرض ٹھہرایا۔ "تعالی اللہ عن ھذہ العیوب علوا کبیرا"

تقیہ از روئے کلام اللہ

اور از روئے نقل تقیہ کا حال پوچھیے تو سینکڑوں آیتیں ایسے تقیہ کی برائی پر (جیسے حضرات شیعہ آپ کرتے ہیں اور اماموں کے ذمہ لگاتے ہیں) دلالت کرتی ہیں بلکہ اُلٹے تقیہ نہ کرنے کی خوبیاں کلام اللہ سے جتنی چاہو نکال لو۔ یہاں تک کہ جان کے جانے کے وقت بھی تقیہ کے نہ کرنے ہی کی بہبودگی کلام اللہ سے ثابت ہوتی ہے۔ کلام اللہ کوئی عنقا چیز نہیں جو نہ ملے۔ اگر شیعوں کو بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے میری طرف جعل احتمال ہو تو مطابق کر دیکھیں کہ کلام اللہ میں سورہ بقرہ میں دوسرے سیپارہ میں نصف سے کچھ بعد یہ آیت ہے کہ نہیں؟

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ٥

”یعنی کیا تم کو اے مسلمانو! یہ گمان ہوگا کہ تم جنت میں یونہی چلے جاؤ اور تم پر وہ حالت نہ گزری ہو جو پہلوں پر گزری کہ ان کو شدت کا خوف اور تکلیفیں پیش آئیں اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان دار تھے، گھبرا کر یوں کہنے لگے کہ خدا کی مدد کب ہوگی، سو خبردار رہو اللہ کی مدد قریب ہی لگی ہوئی ہے۔“

اور اس آیت کو بھی دیکھ لیں۔ سورۂ آل عمران میں چوتھے سیپارہ میں مابین ربع اور نصف کے یہ آیت ہے: **وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ٥**

”یعنی بہت سے نبی ہوئے ہیں جس کے ساتھ میں ہو کر بہت سے اللہ والے دشمنوں سے لڑے ہیں، سو جہادوں میں جو تکلیفیں ان کو پیش آئیں تو ان تکلیفوں کے سبب وہ کچھ ڈھیلے ہوئے نہ سست ہوئے نہ کفار سے کچھ دب نکلے اور اللہ صابروں سے محبت رکھے ہے۔“

تقیہ جنت سے محرومی کا سبب ہے

ان دونوں آیتوں کو خدارا بنظر غور اور بچشم انصاف دیکھئے اور بے روی و ریا فرمائیے کہ مرضی جناب باری کس طرف ہے۔ درصورت یہ کہ عوام مؤمنین کے حق میں یوں کہا جاتا ہے تو امام اور پیغمبر تو امام اور پیغمبر ہیں وہ تو دین کی باتوں میں عوام سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ پہلی آیت کی رو سے تو

تقیہ کی صورت میں جنت سے اُمید ہی منقطع ہے۔ پھر اس سے زیادہ اور تقیہ کو کیونکر وضع کریں گے باقی سنیوں کی بے بسی اور بے کسی کا عذر ہو تو جناب باری تعالیٰ نے پہلے اس کا دفعیہ فرما دیا ہے "الا اِنَّ نصر اللّٰہ قریب" یعنی گھبراؤ مت ہماری مدد پاس ہی لگی ہوئی ہے۔

خوف کفار سے سست ہونا ممنوع ہوا تقیہ تو دور کی بات ہے

اور دوسری آیت میں تقیہ تو تقیہ کفار کے خوف سے سست ہو جانے اور ضعیف ہو جانے پر تنبیہ کرتے ہیں کیونکہ تقیہ کی برائی کی طرف تو اشارہ "وَمَا اسْتَکَانُوْا" میں آ گیا تھا اس لیے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ اُن لوگوں نے کفار کے آگے باوجود تکلیفات کے پھر ظاہر کی چاپلوسی نہ کی اور یہی تقیہ ہے اور کیا تقیہ کے سر سینگ ہیں، پھر جو دو باتیں اور فرمائیں کہ نہ سست ہوئے نہ ضعیف ہوئے تقیہ سے دو نمبر اور اُدھر کو کھینچا ہے تا کہ اس سے دور رہیں اور اس میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ سبحان اللہ خدا بھی کیا منتظم اور مدبر ہے، یہ وہی قصہ ہے "بمرگش گیر تا بہ تپ راضی شود" لیکن آفرین ہے شیعوں کی بھی ہٹ دھرمی پر کہ تپ پر بھی راضی نہیں ہوتے۔ موت تو درکنار اور کیوں راضی ہوں جہاد کو کیوں سر دھریں اور جہاد تو جب ہوگا جب ہوگا۔ سنیوں کے گھروں کے پلاؤ اور قورمے کیوں ہاتھ سے کھوئے اور کیوں ان کے تیر ملامت کا نشانہ ہو کر اپنے نصیبوں کو رویئے جنت گئی بلا سے گئی۔

نقد را بنسیہ گذاشتن کار خرد منداں نیست

اور میں نے جو یہ عرض کیا کہ اس آیت میں تقیہ وغیرہ سے روکتے ہیں۔ ہرچند اہل فہم کے نزدیک محتاج بیان نہیں لیکن باندیشہ خوش فہمی شیعہ گزارش ہی لازم ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے جسے تامل ہو دیکھ لو کہ جناب باری تعالیٰ اس اُمت کے لوگوں کو خاص کر صحابہ کو پہلی اُمتوں کے حال سنا سنا کر سست ہونے اور ضعیف ہونے اور تقیہ کرنے سے روکتے ہیں، اب اہل انصاف سے التماس ہے کہ باوجود ان تنبیہات کے اگر کوئی نہ مانے اس کو کیا کہیے وہ ناکارہ لوگوں میں سے ہوگا یا عمدہ اور عمدہ بھی اس قدر کہ مستحق ثواب ہو، جیسا اہل تقیہ فرماتے ہیں۔

تقیہ سبب عتاب ہے نہ کہ موجب ثواب

حق تو یوں ہے کہ تقیہ والے مورد عتاب ہیں۔ چنانچہ ان آیات سے ظاہر و باہر ہے ثواب کجا اور تقیہ کر کے منصب پیغمبری اور مرتبہ امامت پر مامور رہنا تو درکنار ویسے بھی خیر نہیں، خاص کر ایسے تقیہ کے ساتھ کہ بزعم شیعہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات آئمہ کرتے تھے۔ صحابہ معلومین

کے ساتھ کہ جو ان کے عقیدے کے موافق (نعوذ باللہ) ابلیس سے بھی بڑھ کر تھے۔ چنانچہ اس کی طرف اشارہ ہو چکا، ہمیشہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہے اور ہمیشہ ان کی رضا جوئی میں عمر عزیز کو بسر کیا، خدا وند کریم تو ارشاد فرمائے "وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَ هُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ" یعنی "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر تو بعد حق و ناحق کے معلوم کرنے کے ان کی خواہشوں کے موافق کچھ بھی کرے گا تو تیرا کہیں ٹھکانا نہیں، نہ تیرا کوئی دوست تجھے چھڑا سکے گا نہ کوئی تیری مدد کرنے والا ہے جو خدا سے بچالے گا" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بایں ہمہ ممانعت و تہدید پھر بھی ان کی دلجوئی سے باز نہ آئے۔ خدا کی خواہش پر ان کی خواہش کو مقدم رکھا۔

انبیاء خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے

القصہ خداوند کریم تو عوام تک کو تقیہ کے کرنے سے روکے اور شیعہ خواص کو بھی تقیہ کرنے والا اور وہ بھی دائم التقیہ سمجھیں حالانکہ خاص امانت رسالت کے پہنچانے والوں کو (جو شیعوں کے نزدیک بھی پیغمبر اور امام ہیں) جناب باری علامت ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سے ڈرتے اور اللہ کے پیام کے پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ سورۂ احزاب کے پانچویں رکوع میں یہ آیت موجود ہے انبیاء کے حق میں فرماتے ہیں: "اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ" یعنی انبیاء کے اوصاف یہ ہیں پہنچاتے ہیں اللہ کے پیام اور اسی سے ڈرتے ہیں اور سوا اللہ کے اور کسی سے نہیں ڈرتے اس آیت کو دیکھئے کہ فقط انبیاء کا نہ ڈرنا ہی اس میں نہیں جو کوئی شیعہ یوں کہنے لگے کہ تقیہ دین کے چھپانے کو کہتے ہیں کیا ضرور ہے کہ ڈر ہی کے سبب چھپاتے ہوں بلکہ کچھ اور مصلحت ہو۔ سو یہ احتمال اوّل تو ان کا جی جانتا ہے کہ کیسا نامعقول ہے پھر بایں ہمہ شاید کوئی اس بات میں کچھ زبان زوری بھی کرتا لیکن جناب باری تعالیٰ تو علام الغیوب ہے، شیعوں کی ہٹ دھرمی تو پہلے ہی سے جانتا تھا، اسی لیے پہلے ہی یہ پخ لگا دی۔ "الذین یبلغون رسالات اللّٰہ"

خاتم الانبیاء کو تبلیغ کا تاکیدی امر

پھر انبیاء میں سے بھی خاص کر جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو نرا خاص کر حکم جداگانہ سنایا تاکہ مزید تاکید ہو اور کوئی کسی قسم کی سستی اور مداہنت ظہور میں نہ آجائے۔ چنانچہ سورہ حجر میں فرماتے ہیں "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" یعنی "سنا دے کھول کر دین کی بات اور مشرکین کا کچھ دھیان نہ کر" اور پھر اس کے آگے برابر تاکید پر تاکید اسی بات کی چلی جاتی

ہے کہ کہنے میں قصور نہ کرے جسے شک ہو دیکھ لے اور پھر بایں ہمہ سورۂ احزاب ہی میں یوں فرماتے ہیں: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ" حاصل یہ ہے "تمہارے حق میں رسول اللہ ہی کا اقتدا، انہیں کی چال ڈھال اور راہ روش پر رہنا اچھا ہے جسے اللہ کی اور پچھلے دن کی اُمید ہے۔" اس آیت نے ساری اُمت کے ذمہ یہ بات واجب کر دی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق بات کے کہنے اور اظہار دین میں دریغ نہیں کرتے تھے تم بھی نہ کرو، پھر خاص کر آئمہ تو آئمہ ہیں وہ تو تبلیغ دین اور اظہار حق ہی کے لیے بھیجے گئے ہیں بلکہ شیعوں کے نزدیک رسولوں سے زیادہ نہیں تو برابری میں تو حرف ہی نہیں اور برابری نہ سہی جب ایک کام پر مامور ہوئے تو اس میں اوروں سے تو زیادہ ہی کنج وکاؤ چاہیے۔

انبیاء اور ان کے نائب، سب کا مقصد انذار و تبشیر ہے

مع ہذا خداوند کریم فرماتے ہیں "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ" یعنی "ہم نہیں بھیجتے مرسلین کو مگر فقط بشارت دینے اور ڈرانے کے لیے" اور مرسلین کلام اللہ کی اصطلاح کے موافق فقط پیغمبر ہی کو نہیں کہتے بلکہ جو خدا کے احکام پہنچائے پیغمبر ہو یا نائب پیغمبر، چنانچہ سورۂ یٰسین میں جو "اِنَّا اِلَيْكُمْ مُرسلون" ہے اس لیے نائبان حضرت عیسیٰ مراد ہیں حالانکہ وہ نبی نہ تھے نائب نبی تھے اور امام کے تو خود یہی معنی ہیں۔ شیعوں کے نزدیک کہ نائب نبی ہو، باقی کوئی یوں کہے کہ حضرت کے یاروں کو جو رسول کہا تو بایں معنی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے تھے اور آیت "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ" میں وہ مراد ہیں جو خدا کے بھیجے ہوئے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نائبوں کے بھیجنے کو بھی خداوند کریم نے اپنی طرف نسبت کیا اور یوں فرمایا ہے "اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ" یعنی ہم نے بھیجا اور یوں نہیں فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بھیجا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نائبوں کو خداوند کریم اپنا بھیجا ہوا مرسل کہے تو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب تو اس کے بھیجے ہوئے کیوں نہ ہوں گے؟ اور جب اس کے بھیجے ہوئے اور مرسل ہوئے تو موافق آیت مذکورہ "وما نرسل المرسلین" ان کا کام بھی یہی ہے بشارت اور ڈرانا۔ پھر اب فرمائیے کہ تقیہ کہاں سے آ گیا؟ ہم سے تو نہیں ہو سکتا کہ منہ اُلال کر جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہ اطہار کی نسبت یوں گمان بھی کریں کہ وہ فرمودہ الٰہی میں سر مو بھی تفاوت کرتے ہوں، ہمہ تن اظہار دین میں مشغول تھے اور کیوں نہ ہوں اوّل تو آیت مذکورہ سے خود مترشح ہے کہ پیغمبر تبلیغ رسالت میں قصور نہیں کرتے، پھر نائب کیونکر اخفا کریں گے، نہیں تو پھر نائب ہی کیا ہوئے اور مخالف ہوئے (جیسے لکھے کے مٹانے والے)۔

ہی ہوتا ہے، اگر وہ اظہار حق نہ کرے اور بالکل چپکا بیٹھ رہے تو فرض تبلیغ احکام اس کے ذمہ رہ جائے اور فرضیت تبلیغ احکام کی انبیاء اور درویشوں اور علماء کے ذمہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور کسی اور پر نہ ہو، ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ احکام کی فرضیت اس آیت سے واشگاف ہے۔

یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ.

"یعنی اے رسول پہنچادے جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے تیرے رب کی طرف سے اور اگر یہ نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام" اسی طرح اور لوگوں کو فرماتے ہیں:

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ

"یعنی اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت، بلاتی نیک کام کی طرف اور حکم کرتی اچھی بات کا اور منع کرتی ناپسند کو۔"

سو یہ حکم ظاہر ہے کہ معروف اور منکر کے جاننے والوں کو ہے۔ سو اسی کا نام عالم اور درویش ہے جتنا کوئی زیادہ جانے اتنی ہی اس کے ذمہ فرضیت زیادہ ہوگی۔ سو اماموں سے زیادہ اس باب میں اور کون ہوگا؟ بالجملہ اگر انبیاء مہر سکوت منہ پر لگا کر بیٹھ رہیں اور سرے سے منہ کھولیں ہی نہیں تب تو انبیاء کا گنہگار ہونا لازم آئے گا اور اگر احکام الٰہی پہنچائیں تو ظاہر ہے کہ احکام الٰہی تو نفس کے خلاف ہی ہوں گے۔ اسی واسطے مطیع و فرمانبردار کوئی کوئی ہوتا ہے ورنہ پھر بد بخت کوئی کوئی ہوتا اور جب نفس کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو لاکھ میں سے ایک تو مثل ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بے کھٹکے مانتا ہے ورنہ سو سو حجتیں نکالتے ہیں بلکہ اُلٹے دشمن ہو جاتے ہیں۔

پھر اس وقت اگر آدمی لوگوں کی بدگوئی اور ایذاء رسانی سے ہٹ رہے تو اس میں اور دُنیا داروں میں کیا فرق رہا؟ ہر کوئی اُس کو مطلب کا یار سمجھ کر دونی تکذیب پر کمر باندھے گا اور جو ساتھ ہو گئے تھے وہ ہٹ رہیں گے، سو دین کی خیریت ہوئی اور نبوت بھی ختم ہوئی اور اگر ایسے وقت میں پکار رہا اور لوگوں کی بدگوئی اور نقصان جان و مال سے نہ ڈرا تو آگے پھر آسانی کا وقت ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ بعد شدت اور کلفت کے نصرت بھیجتا ہے۔ چنانچہ آیت "اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ الخ" کے آخر میں جو "اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ" ہے اپنے ماقبل سے مل کر یہی کہتا ہے اور جب آسانی ہوئی اور خدا کی مدد آ پہنچی تو پھر تقیہ کس مرض کی دوا ہے؟ الغرض انبیاء کے حق میں کوئی صورت تقیہ کے روا ہونے کی معلوم نہیں ہوتی اور چونکہ آئمہ ہدیٰ بھی نائبان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور نائب کا وہی کام ہوتا ہے جس کام کے لیے منیب ہوا کرتا ہے تو بیشک تبلیغ احکام ان کے

ذمہ میں فرض ہوگئی اور ان کی کیا تخصیص ہے سب ہی پر فرض ہے۔ چنانچہ ابھی مرقوم ہوا لیکن یہ خاص اسی کام کے لیے ہوتے ہیں اور پھر آئمہ ہدیٰ معصوم بھی ہیں صدور گناہ کا احتمال نہیں تو ان سے بھی تقیہ کا ہونا ممکن نہیں جیسے کہ انبیاء سے ممکن نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی تقیہ کا استیصال ہے

سو بفضلہٖ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کے احوال کے مطابق کرنے سے یونہی معلوم ہوتا ہے کہ حق گوئی میں انہوں نے ذرّہ برابر دریغ نہیں کیا بلکہ اس سبب سے جان و مال، عزت و آبرو سب کو برباد کیا ہے اور اپنی بات سے نہیں ہٹے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تو ظاہر ہے سب اہل اسلام نے سنا ہوگا، آپ کی ایذاؤں کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ سالہا سال تک کفار نے ذات برادری سے نکالے رکھا مکہ سے باہر پڑے رہے یہ عہد کرلیا تھا کہ ان سے نہ کوئی بیع وشرا کرے نہ ان کا کوئی کام مزدوری غیر مزدوری سے کردے اور زبانی طعن و تشنیع اور دشنام اور دست درازیاں تو جدا رہیں۔

آخر یہ ہوا کہ قتل کا ارادہ ہوا اور آپ چھپ کر مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے۔ اگر تقیہ فرض کیا درست بھی ہوتا تو آپ کیوں اتنے مصائب اُٹھاتے؟ اور کیوں بیت اللہ جیسی اشرف چیز کو چھوڑ کر آتے؟ ابولہب اور ابوجہل کیوں دشمن ہوتے؟ برائے خدا کوئی بتلائے تو سہی کہ ان ملعونوں کو سوائے حق گوئی کے آپ نے اور کیا ستایا تھا زمین ملک ان کے نہیں دبا لیے تھے، ملک و دولت ان کے نہیں چھین لیے تھے، علیٰ ہذا القیاس حضرت ابراہیم علیہ السلام جو آگ میں ڈالے گئے اور ہجرت کر کے وطن سے چلے آئے تو آپ نے سوا حق گوئی اور اظہار حق کے اور کیا گناہ کیا تھا؟ بالجملہ مثل آفتاب روشن ہوگیا کہ انبیاء نے نہ تقیہ کیا اور نہ ان سے تقیہ ہو سکے۔

علیٰ ہذا القیاس جو ان کے نائب ہیں نہ انہوں نے تقیہ کیا نہ ان سے ہو سکے۔ چنانچہ حضرت امام حسین سید الشہداء کی جانِ نازنین پر جو کچھ گزرا وہ سب جانتے ہیں باعث اس کا فقط حق گوئی تھا ورنہ یزید کا کلمہ کہہ دیتے تو جان کی جان بچتی اور اُلٹی مال و دولت اور اعزاز و اکرام ہوتا اور حضرت امام الائمہ حضرت امیر کا امیر معاویہ سے لڑنا سب پر روشن ہے سوائے ان کے اور اماموں کا حال بھی سنا ہوگا کہ سلاطین سفاک کے ہاتھ سے کیا کیا ایذائیں ان کے نصیب ہوئیں قید خانوں میں محبوس رہے، اگر تقیہ کر لیتے تو کیوں یہ ذلت اور خواری اور کیوں یہ محنت و دُشواری اُٹھاتے؟ ہاں عوام مؤمنین کی نسبت اگر کوئی کہے تو فرضیت تو درکنار؟ البتہ جواز معلوم ہوتا ہے اگر عذر قرار واقعی ہو، مثلاً لڑکے اور عورتیں اور اندھے اور لنگڑے اور اپاہج اور قیدی اور سوا اس کے جو کوئی ایسا ہی ناچار ہو تو اس کو بقدر ضرورت کفار

سے موافقت جائز ہے، بشرطیکہ جان کا یا کسی عضو کا اندیشہ ہو (اپنی یا اپنی اولاد، یا ماں باپ وغیرہ کا) اور اگر کچھ یونہی تکلیف کا اندیشہ ہو جسے تحمل کر سکے تو پھر کفار سے موافقت کرنی ہرگز جائز نہیں۔

صبر کے فضائل اور ترغیب جس سے تقیہ کی حقیقت کھلتی ہے

اور بایں ہمہ پھر ثواب اس میں ہے کہ تقیہ نہ کرے کیونکہ صبر کی جو جا بجا تعریفیں کتاب اللہ میں آئی ہیں تو ایسوں ہی کے واسطے ہیں، نہیں تو تقیہ میں کیا ایذا تھی جو صبر کی ضرورت ہوتی؟ اس میں تو اور پلاؤ اور تنجن میسر آتے ہیں اور حضرت اور قبلہ بن جاتے ہیں، اسی لیے کلام اللہ میں جتنی صبر کی تاکید ہے اتنی کسی اور چیز کی نہیں۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

''یعنی سب انسان ٹوٹے میں ہیں مگر جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق گوئی اور حق پر قائم رہنے اور صبر کی نصیحت کی۔''

شیعوں کے مذہب میں حق گوئی تو کہاں، حق کے دبا لینے کی تاکید ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو ایک فدک کے دبا لینے میں اس قدر برا کہتے ہیں یہ جو تمام حق خداوندی یعنی دین حق کے دبا لینے کی فرضیت کے قائل ہیں ان پر کتنے ہزار لعنت چاہیے؟ اور سوا اس کے ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ وَاصْبِرُوْا'' وغیرہ آیات صبر سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے، اگر تقیہ فرض ہوتا صبر کوڑی کے کام کا بھی نہ تھا۔ مع ہذا کہیں ایک جگہ گو اس کا حکم آیا بالجملہ اگر تقیہ کہیں ہے بھی؟ تو عوام کے واسطے ہے اور ان میں بھی معذوروں کے لیے نہ ہر کسی کے لیے اور اُن کے واسطے بھی جان کے خوف میں اور وہ بھی جائز ہے واجب نہیں بلکہ ثواب کی بات یہی ہے کہ نہ کرے اور کرے بھی تو واجب ہے کہ بقدر ضرورت کرے۔

جہاں اظہارِ حق نہ ہو سکے ہجرت واجب ہے

اور عین حالت تقیہ ہجرت کی فکر میں رہے اور جب قدرت پائے آنکھ بچا کر کہیں ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں اظہار حق سے کوئی مانع نہ ہو کیونکہ کلام اللہ میں ہجرت کی برابر تاکیدیں بھری ہوئی ہیں۔ ''اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ'' یعنی ''میری زمین واسعہ ہے گھر کی کیا تخصیص ہے جہاں بن پڑے وہاں ہی چلے جاؤ اور میری ہی عبادت کرو۔'' دوسرے

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا

''یعنی جولوگ ملائکہ ان کی جانیں قبض کرتے ہیں اور وہ ہجرت کے مقدمہ میں تقصیر وار تھے تو فرشتے ان سے کہتے ہیں تم کس کام میں تھے؟ اور کہتے ہیں کہ ہم ضعیف تھے بے بس ایک زمین میں پڑے تھے، فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین واسع نہ تھی جو تم ہجرت کر لیتے سو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے انجام کی۔''

اور سوا ان آیات کے اور بہت آیات میں ہجرت کا حکم ہے سو ہجرت کا حکم اسی اندیشہ سے ہوتا ہے کہ احکام دینی ظاہر نہیں ہو سکا کرتے، بالجملہ عوام کو بہ بشرائط مذکورہ جائز ہے واجب نہیں، ورنہ ایسے ہی ہٹے کٹوں کو جو زمین میں لات ماریں تو پانی نکل آئے ہرگز اخفاءً حق جائز نہیں، ان کو یہ لازم ہے کہ اگر وطن میں یا جہاں کہیں وہ ہوں اظہارِ حق نہ کر سکیں تو وطن چھوڑ کر چلے جائیں۔

اکراہ میں بھی اظہارِ حق افضل ہے

چنانچہ آیت: ''لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَی اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ط'' فقط اتنی ہی اجازت پر دلالت کرتی ہے کہ اپنا بچاؤ کر لو، پر کفار سے موافقت اور دوستی مت کرو، سو بچاؤ تو یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی اس جگہ سے چل دے، تسکین خاطر کے لیے، معنی ساری آیت کے لکھے دیتا ہوں حاصل یہ ہے'' کہ مؤمن کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور ان سے موافقت اور صلح نہ رکھیں، مؤمنوں کو سوائے خدا کے اور کسی کی موافقت اور دوستی نہیں چاہیے اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے حساب سے کسی شمار میں نہیں مگر ہاں یہ تمہیں اختیار ہے کہ کچھ اپنا بچاؤ کر لو اور پھر یہ ہے کہ اللہ اپنے آپ سے ڈرائے ہے اور پھر اللہ کی طرف سب کا ٹھکانا ہے۔''

یعنی مجھ سے ڈرنا چاہیے کہ میری طرف آنا ہے کافروں سے کیا ڈرتے ہو، ان سے موافقت تو جب کرتے جب ان کی طرف تمہیں جانا ہوتا۔ فقط ہاں اگر آدمی ان کے پنجوں میں پھنس جائے، محبوس ہو یا مثل محبوسوں کے جیسے اندھے، اپاہج، لنگڑے، لولے، لڑکے، بچے، عورتیں، بیمار اور پھر اس پر کفار زبردستی بھی کریں اور وہ زبردستی بھی ایسی ہو کہ عادت کے موافق اس کو اٹھا نہیں سکتا جیسے قید و قتل، تو خیر اختیار ہے اگرچہ ثواب اس میں ہے کہ کھل کھیلے کیونکہ ''اِلَّا مَنْ اُکْرِهَ وَقَلْبُهٗ

مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ" سے فقط اجازت ہی معلوم ہوتی ہے کہ اکراہ کی صورت میں فقط بظاہر موافقت کرلے۔ سو اکراہ اسے ہی کہتے ہیں جو مذکور ہوا لیکن ان آیات سے جو خدا کی راہ میں مارے جانے کے فضائل ان میں بیان ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ثواب اظہار ہی میں ہے۔

سیدنا ابراہیم کے کسی واقعہ سے اخفاء دین ثابت نہیں

باقی حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا کوئی زبان پر لائے تو کمال بے حیائی کی بات ہے، انہوں نے بظاہر جھوٹ بولا، حقیقت میں جھوٹ نہیں بولا، قصہ ان کا معروض ہے، معلوم ہو جائے گا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھانا شروع کیا اور بت پرستی سے منع کیا اور بتوں کی ہجو کرنی شروع کردی تو حضرت کے باپ ہی اوّل تو مخالف ہو گئے اور ان کا کہنا ماننا تو درکنار، ان کو دھمکانا شروع کیا، یہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح ان کے بتوں کو توڑ یئے، اتفاقاً کفار کی عید کا دن آ گیا، لوگ ان کے پاس بھی آئے کہ چلو، انہوں نے ستاروں کی طرف دیکھ کر یا کتاب (نجوم کی) دیکھ کے یوں فرمایا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں، کفار نے سمجھا کہ جیسے ہم نجوم کا اعتبار کرتے ہیں یہ بھی نجوم کو مانتے ہیں سوانہیں نجوم کی راہ سے کچھ یوں معلوم ہوا ہے کہ میں جاؤں گا تو بیمار ہو جاؤں گا اور یہاں حقیقت میں ستاروں کو یا کتاب کو برائے نام ہی دیکھا تھا اور یہ جو کہا تھا کہ میں بیمار ہو جاؤں گا یا تو کچھ آثار بیماری کے ہوں گے یا آدمی بیمار ہوا ہی کرتے ہیں اور یہ ان سے کہا ہی نہ تھا کہ مجھے ستاروں کے حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ میں بیمار ہو جاؤں گا جو جھوٹ ہوتا؟ ہاں وہ یہ ہی سمجھ گئے کہ انہیں نجوم سے یہ بات معلوم ہوئی جب وہ اپنی عید میں چلے گئے تو انہوں نے ان کے سب بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا، پر ایک بڑے بت کو کچھ نہ کہا۔

آخر جب کفار ہٹ کر آئے تو انہیں خبر ہوئی، انہیں ہی اپنے بتوں کا دشمن سمجھتے تھے، سو انہیں ہی پکڑا ان سے جو پوچھا تو انہوں نے استہزاء کے طور پر کہا کہ صاحب اس بڑے بت نے یہ کام کیا ہے سو یہ دوسرا جھوٹ ہے کہ جسے کوئی دیوانہ بھی یوں نہ کہے کہ یہ ایسا جھوٹ ہے جسے ہم جھوٹ سمجھتے ہیں بلکہ ایسی بات ہمارے محاورہ میں بڑا سچ گنا جاتا ہے، ان دونوں قصوں کو غور کیجئے اور پھر فرمایئے کہ یہ اخفاء حق ہے یا اظہار حق ہے اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اسی کام کی بدولت آگ میں ڈالے گئے۔ خاص کر یوں کہنا کہ بڑے نے کیا ہے یہ جھوٹ کیا، سچ سے بھی زیادہ اصلی مطلب پر دلالت کرتا ہے سب جانتے ہیں کہ یہ جواب کیا تھا، ایک چڑانا تھا، ایسے میں تو ان کو غصہ نہ آتا تب آتا اور حقیقت میں چھپاتے تو دین کو اس وقت چھپاتے، سو چھپانا تو درکنار حضرت نے اوّل تو ان کو

چڑایا اور پھر کیا کیا سوال جواب کیے کہ رستم کا حوصلہ نہیں جو ایسے وقت میں ایسی بات کہے اور اوّل دفعہ جو ان کو نجوم کی طرف دیکھ کر دھوکا دیا تو کچھ جان کا بچاؤ، آپ کو مدنظر نہ تھا، مال کا بچاؤ آپ کو مدنظر نہ تھا، آبرو کا پاس آپ کو نہ تھا بلکہ اپنی جان کے کھونے کا شوق لگا تھا، فقط مطلب اتنا تھا کہ یہ جائیں تو تنہائی میں ان کے بت ٹکڑے کیے جائیں۔ سو یہ کام کرنا جان پر کھیلنا تھا ہاں اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ رسوم کفار اور ان کی عبادت اور اشعار سے بھی یکسو رہیں۔ بہرحال یہ جانبازی کا سامان تھا اور جانبازی کو تقیہ کہنا ایسوں ہی کا کام ہے کہ جن کو دُم کی اور ناک کی تمیز نہ ہو۔

اخفائے علاقۂ زوجیت اخفائے دین نہیں ہے

بارے رہا تیسرا جھوٹ، وہ یہ ہے کہ حضرت اپنی بیوی سارہ کو لیے ہوئے ہجرت کیے ہوئے جاتے تھے، ایک بستی میں جا کر پہنچے جہاں کا حاکم بڑا ظالم اور نہایت زانی تھا، اس کے شیطانی لشکر میں سے کسی نے حضرت سارہ کے حسن و جمال کی خبر کردی، اس مردود نے ان کو بلوا بھیجا، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بایں خیال کہ اگر اس مردود کو حضرت سارہ کا کچھ زیادہ خیال ہوا تو یوں سمجھ کر کہ خاوند کو سب سے زیادہ غیرت ہوتی ہے ایسا نہ ہو، پیچھا کریں مجھ کو مروا نہ ڈالے۔ جب حضرت سارہ کے لے جانے کو اس کے پیادہ آ گئے تو یوں فرمایا کہ اے سارہ! اگر وہ ظالم تجھ سے پوچھے تو یوں کہنا کہ میں ابراہیم کی بہن ہوں کیوں کہ میں تو دونوں دینی بہن بھائی ہیں۔ مع ہذا حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی بھی تھیں تو یہ بھی حقیقت میں جھوٹ نہ تھا اور اگر بالفرض والتقدیر یہ کہنا جھوٹ ہی تھا، تب دین کا اخفاء تو نہ تھا اگر اخفاء تھا تو علاقہ زوجیت کا اخفاء تھا اور وہ بھی بایں غرض کہ یہ جان جو حق گوئی میں جانے کے لائق ہے ایسا نہ ہو کہ ایسے قصہ میں جائے اور خدا کی راہ میں جاں نثاری کا ارمان دل کا دل میں رہ جائے۔ غرض اس جگہ جان کا بچانا بھی اسی لیے تھا کہ کل کو اظہارِ حق کروں اور خدا کے کام میں جان دوں، ایسے قصے میں نہ مروں۔ بالجملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملات سے تقیہ کا ثابت کرنا کمال دانش مندی اور خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کر جانا اور غارِ ثور میں چھپنا یہ سب کا سب اظہارِ حق کے باعث تھا ورنہ ابوجہل اور کفار مکہ کی موافقت میں تو کچھ زیاں ہی نہ تھا۔ اس کو تقیہ کہنا اس سے بھی بڑھ کر ہے ایسا تقیہ یہ بھی ہے کہ آدمی دشمن کے وار کو ڈھال سے روکتا ہے، اگر بچاؤ کر لینے کے معنی تقیہ ہے تو یہ تو عین اظہارِ حق ہے کیونکہ بچاؤ کی تو جب ہی ضرورت پڑتی ہے کہ دوسرا کوئی درپے ایذاء ہو۔

بچاؤ اور تقیہ میں فرق عظیم ہے

اس مقام پر ہر کسی نے غالباً تقیہ شیعہ اور بچاؤ میں فرق سمجھ لیا ہوگا پر مزید توضیح کے لیے میں بھی کچھ عرض کیے دیتا ہوں، تقیہ مصطلح شیعہ میں دشمن کے دل سے خیال ایذاء ہی نکل جائے ہے کیونکہ تقیہ میں تو اپنے مذہب کا فقط بدل لینا اور اپنے آپ کو ہم مذہب دشمن بنالینا ہوتا ہے۔ سو چونکہ اختلاف مذہب میں دشمنی دینی کے باعث تقیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو درصورت تبدیل مذہب دشمنی ہی نہ رہے گی بلکہ برعکس دوستی بن جائے گی اور بچاؤ کی صورت میں دشمنی اور بڑھ جاتی ہے اور خیال ایذاء رسانی دوبالا ہو جاتا ہے کیونکہ آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب تک دشمن اپنے قابو میں رہتا ہے اور ایسا موقع ہوتا ہے کہ اس کو ایذاء دے سکیں تو اس کا اوّل تو کچھ چنداں رشک نہیں ہوتا، دوسرے یوں بے فکری ہوتی ہے کہ جب چاہیں گے اسے ذلیل وخوار کردیں گے، تیسرے جب وہ کچھ اپنا بچاؤ کرلیتا ہے تو پھر اپنا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا اب یہ ہم پر وار نہ کرے تو ان وجوہ سے اعداء کو خیال ایذاء رسانی تامقدور زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے میں جو کچھ ان سے بن پڑا کرتا ہے دریغ نہیں کیا کرتے تو اس صورت میں مقربان الٰہی کو سخت مصیبت پیش آیا کرتی ہے۔ بالجملہ یہ فرق لطیف یاد رکھنا چاہیے کہ بہت کارآمد ہے۔

حضرت امیر (بزعم شیعہ) سنت احمدی وابراہیمی وموسوی پر عمل پیرا نہ ہوسکے

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب اہل انصاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کو جو ہنگام قیام مکہ معظمہ اور اثنائے ہجرت میں پیش آئے۔ حضرت امیر کے احوال سے جو بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش آئے ملا کر دیکھیں، اگر اصحاب کرام مرتد ہو گئے تھے تو بیشک حضرت امیر بھی بحکم متابعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ویسے ہی پیش آتے جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ابو جہل اور اُمیہ بن خلف وغیرہم سے پیش آئے اور آپ پر بھی وہ سانحے گزرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرے۔ آخر کو ایک نہ ایک دن تو نوبت ہجرت پہنچتی اور سنت احمدی اور سنت ابراہیمی اور سنت موسوی کی تکمیل ہو جاتی۔

لیکن شکایت تو یہ ہے کہ حضرت امیر نے کبھی منہ کھول کر ایک دفعہ بھی یوں نہ فرمایا کہ میں دین حق پر ہوں اور تم دین باطل پر، اور اگر آپ نے اظہار حق کیا تو دو حال سے خالی نہیں کہ یا اصحاب نے انکار فرمانا تسلیم کرلیا تب تو تقیہ کی کیا ضرورت اور ان پر کیا اعتراض ہے؟ بلکہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ عین موافق مرضی مرتضوی ہوا، اور نہ مانا تو کیا سبب کہ ایسے دشمن کو کسی قسم کی ایذاء نہ دی؟ اور

اگر یوں کہئے کہ بسبب شجاعت مرتضوی یا امداد خداوندی کے وہ کچھ ایذا نہ پہنچا سکے تو اوّل تو یہ خلاف معقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے حضرت امیر سے کم تھے جو آپ پر یہ آفتیں آئیں، حاشا وکلا جو حضرت امیر نے کبھی تقیہ کیا ہو، اگر تقیہ کرتے تو مکہ معظمہ ہی میں کرتے اور کبھی کیا ہوتا تو امیر معاویہ کے ساتھ ضرور کر لیتے، بہت ہوتا تو یہ ہوتا کہ قاتلان عثمان مارے جاتے وہ کون سے آپ کو ایسے عزیز تھے کہ جن کے پاس ولحاظ میں اتنے کچھ شر وفساد کے دین میں روادار ہوئے۔

حضرت سید الشہداء نے تو بے گناہوں اور وہ بے گناہ بھی کیسے کہ اپنے قوت بازو اور اپنے لخت جگر کو اس دین ہی کی بابت قتل کروایا اور اپنے آپ بھی جاں بحق ہوئے اور زن وفرزند ننگ وناموس کا بھی کچھ لحاظ نہ فرمایا حالانکہ یہ سب کشت وخون بظاہر لا حاصل تھا، تیس ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں اتنے آدمیوں اور اس بے سروسامانی پر کیا اُمید کامیابی تھی بخلاف حضرت امیر کے کہ وہ اگر قاتلان عثمان غنی کو امیر معاویہ کے حوالے کر دیتے تو خلافت کی خلافت بنی رہتی، ایک باغی جو مفسد دین تھا اپنا مطیع ومنقاد ہو جاتا، دین کی ترقی ہوتی اور پھر یاں ہمہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ آخر قاتلان حضرت عثمان ظالم تھے مظلوم نہ تھے اور نہ کہیں ہمراہیاں امام الشہداء کے برابر تو بے گناہ بھی نہ تھے۔ حق یوں ہے کہ یہ سب تہمت اخفاء حق اور عیب نامردہ پن ان حضرات شیعہ کا لگایا ہوا ہے۔ **"سبحانک هذا بهتان عظیم"**

دورانِ خلافت میں بھی امیر پر تقیہ واجب تھا

اور طرفہ تر شیعوں کا گوز شتر اور سنئے سید مرتضیٰ جو بڑے محقق مذہب شیعہ ہیں وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ حضرت امیر پر اپنی خلافت اور حکومت کے زمانے میں بھی تقیہ باقی تھا، الٰہی یہ تقیہ نہ ہوا ایک جان کا وبال ہوا، کسی راہ حضرت امیر کا پیچھا چھوٹتا ہی نہیں مگر کوئی ان سے پوچھے کہ اگر اس وقت بھی تقیہ ان پر واجب تھا تو امیر معاویہ کو کیوں معزول کیا۔ حضرت تو پہلے سے ان سے ڈرین تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس شخص کا مکر بہت بڑا ہے حالانکہ مغیرہ بن شعبہ اور عبداللہ بن عباس کی صلاح بھی یہی تھی کہ ابھی معزول نہ فرمایئے بعد استقامت معزول فرمایئے گا، مگر آپ نے نہ مانا اور یہ نہ ماننا آخر کو موجب کیا کیا خرابیوں کا ہوا، یہ سب شیعوں ہی کی کتابوں میں ہے۔

سید مرتضیٰ صاحب کی دلیل سنئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خلافت مرتضوی برائے نام تھی، امیر معاویہ ہمیشہ ان سے لڑتے رہے، مع ہذا آپ کی فوج اور آپ کے ساتھی اکثر اولاد صحابہ تھے جو آپ کے دشمن جان گزرے ہیں اور ان کے دل میں خلیفہ اوّل اور ثانی کا عدل اور فضل جما ہوا تھا، اگر حضرت امیر اس وقت **"کما ینبغی"** اظہار حق کرتے تو بہت دُشواری ہو جاتی۔ گمان غالب تھا

کہ فوج بھی پھر جاتی، اس سبب سے عالم خلافت میں بھی ان پر تقیہ واجب تھا اور اظہارِ حق حرام۔
اس اعتقاد میں ہر چند سید مرتضیٰ نے تمام امامیوں کا خلاف کیا ہے کیونکہ وہ سب اس بات کے قائل ہیں کہ قبل خلافت آپ پر تقیہ واجب تھا اور بعد خلافت آپ پر بھی حرام تھا لیکن بزعم خود بڑی دور اندیشی اور کمال چالاکی کری تھی پر خدا نے چلنے نہ دی۔

خلافت امیر میں تقیہ کے بہتان کا پس منظر

انہوں نے اپنے عندیہ میں اس کا بچاؤ کیا تھا کہ مبادا کوئی سنی، حضرت کے ایام خلافت کے خطبوں اور ملفوظات کو جن میں اصحاب کرام خصوصاً خلیفہ اوّل اور خلیفہ ثانی کی تعریف ہے دیکھ کر ناک میں دم کردے، یا یہ گرفت کر بیٹھے کہ دین شیعہ حق ہے تو حضرت امیر کی خلافت تو سب میں اخیر تھی، آپ نے کیوں نہ اس کو شائع ذائع کیا، اگر آپ دین شیعہ کو رواج دیتے اور اسے مشہور کرتے تو روئے زمین میں یہی دین ہوتا اور سنیوں کا دین نیست و نابود ہو جاتا۔ جیسے ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو تمہارے گمان کے موافق نیست و نابود کردیا اور اپنا ساختہ پرداختہ مروج کردیا اور آپ کے بعد کسی نے دین کے باب میں چنداں کنج کاؤ نہیں کی۔ سو آپ ہی کا دین باقی رہنا چاہیے تھا اور القصہ حضرت امیر آخر میں خلیفہ ہوئے تھے، یہ بات دین کی ترقی کے لیے ایسی مفید ہوئی تھی کہ درصورت برعکسی ترتیب کے ہرگز متصور نہیں، پھر کیا سبب کہ دین اہل سنت و جماعت ہی مشہور رہا، اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی دین اہل سنت ہی پسند تھا۔ الغرض اس اندیشہ سے سید مرتضیٰ صاحب نے یہ چکر کھایا اور یہ پلٹے لیے تھے۔

حضرت امیر وسائل رکھتے ہوئے بھی اظہارِ دین نہ کر سکے

لیکن یہ نہ سوجھی کہ خلافت اور ولایت اسے کہتے ہیں کہ ملک میں تصرف ہو، حکم احکام چلتے ہوں محصول اور خراج رعیت سے وصول کر سکے، چور قزاق کو سزا دے سکے۔ سو یہ بات سوائے شام کے اور کون سے ملک میں حاصل نہ تھی۔ خصوصاً حجاز اور عمان اور حرمین اور بحرین اور عراقین اور آذربائیجان اور فارس اور خراسان میں بے کھٹکے آپ کی حکومت تھی، پھر یہ تھوڑی سلطنت تھی؟ امیر معاویہ کے پاس تو اتنا ملک تھا بھی نہیں وہ اپنے ملک میں جو حکم چاہتے تھے جاری کرتے تھے۔ ادھر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقط ملک عرب میں حکومت چھوڑ کر اس عالم سے تشریف لے گئے تھے اور پھر اس پر چار طرف معاندین زور پر تھے۔ مسیلمہ کذاب اور بنو حنیفہ ملک

یمامہ میں ایک طرف اور سجاح متنبیہ بنی تمیم میں کہ ان سے بڑھ کر عرب میں کوئی قبیلہ ہی نہ تھا، جدا ہی برسرِ پرخاش، منکرین زکوۃ اپنی ہی طرف کو کھینچ رہے تھے۔ بنو عسفان جامہ سے باہر جدا نکلے جاتے تھے۔ ادھر گرد و نواح مدینہ کے مرتدین کا جدا زور شور تھا، آپ کے ساتھی گنے چنے مکہ مدینہ والے ہی تھے اور پھر بایں ہمہ کسی بات میں کسی سے نہ دبے اور کسی حکم میں مداہنت نہ کی، اگر زکوۃ نہ دینے والوں کو ان کے طور پر راضی کر دیتے اور اوروں کو ان کے طور پر تو کچھ مشقت نہ ہوتی۔

صدیق نے بے سروسامانی میں اظہارِ حق کیا

ابوبکر صدیق باوجود اس قلت سامان اور عدم شجاعت کے اتنے دشمنوں سے بھی نہ گھبرائے حالانکہ اکثر ان کے دشمن لڑائی کے مشتاق تھے اور بعضے بعضے تو چھوٹے سے بادشاہ تھے اور حضرت علی بایں ہمہ شجاعت و کرامت اور زور و قدرت اور شوکت اور سلطنت اور امامت و ولایت کہ ابوبکر کو ایک بھی ان اوصاف جزیا میں سے نصیب نہ تھا اظہارِ حق میں (اور بھی کسی امر میں نہیں) اتنی سستی فرمائیں؟ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ اوصاف کہیں سے مل جاتے، پھر کافر نام کوئی پھونس کا آدمی بھی دُنیا میں رہتا تو ہمارا ذمہ تھا، باقی یہ کہنا کہ آپ کی فوج اکثر اولاد صحابہ تھی، اگر کوئی سنی کہتا تو زیب بھی دیتا، سید مرتضیٰ صاحب کس منہ سے کہتے ہیں قاضی نوراللہ صاحب کی نہیں سنتے وہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ قریش میں سے کل پانچ ہی آدمی تھے، باقی تیرہ قبیلہ معاویہ کے ساتھ۔ اس لیے آپ کو فتح میسر نہ ہوئی۔ بالجملہ شیعوں کے اقرار سے آپ کے ہمراہی کوفیان جاں نثار تھے جو مقتدایان شیعہ ہیں اور اگر وہ نہ ہوتے اور صحابہ کی اولاد ہی ہوتی تو جیسے ان کو عدل اور فضل شیخین کا (دیکھے بھالے) اعتقاد تھا اور اس کے باعث ان کی راہ روش پسندیدہ تھی ایسے ہی اپنے ماں باپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی سنے سنائے یاد تھا۔

مع ہذا اگر پھر جاتے تو کیا تھا، آخر دین مرتضوی میں وہ وہ آسائشیں اور سہولتیں ہیں کہ منکر بھی معتقد ہو جائے۔ متعہ کا آوازہ سن کر امیر معاویہ کے ہمراہی بھی ہمراہ ہو جاتے بلکہ جس اہل مذہب کے کان میں یہ بشارت پہنچتی کہ جیتے جی یہ مزے ہیں اور مر کر یہ مرتبے، کیسے ہی دین کے پکے کیوں نہ ہوتے حضرت امیر کی ہمرکابی اختیار کرتے، علاوہ بریں غسل رجلین کی تخفیف، تراویح سے بے کھٹکے، ایسا دین اور ایسا ایمان تو قسمت ہی سے ملتا ہے۔ اگر اظہارِ دین خود کرتے تو تمام ملک عرب اور طوائف عجم مدد و معاون ہوتے۔ سبحان اللہ! سنیوں سے مقابلہ اور پھر یہ سامان، اتنا ہی سوچا ہوتا کہ ابتداء سے لے کر آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدد و معاون وہی لوگ تھے

جو آپ کے دشمنان جانی کے بھائی برادر یا اولاد تھے، خالد بن الولید، عکرمہ بن ابی جہل بلکہ خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ ابوجہل کے بھانجے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابوقحافہ کے بیٹے، حضرت عثمان ابوسفیان کے قرابتی، علیٰ ہذاالقیاس اور لوگ ایسے ہی تھے۔

مقربان الٰہی کا طریقہ اظہارِ حق کرنا اور جفائیں اُٹھانا ہے

اب بس کیجئے اور ایک دو آیت لکھ دیجئے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ مقربان الٰہی کا کام ہمیشہ سے ستم کشی اعداء دین رہا ہے اور مدام اچھے لوگوں نے ان کے ہاتھ سے ایذائیں اُٹھائی ہیں۔ اور خداوند کریم کو دین کے مقدمہ میں سختی اور پختگی پسندیدہ ہے نہ کہ سستی اور مداہنت "اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ "...... "یعنی جو لوگ انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جو حق بات کہتے ہیں ان کو سخت عذاب کی بشارت سنا دے۔" اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء اور اچھے لوگ تقیہ نہیں کیا کرتے بلکہ حق گوئی میں دریغ نہیں کرتے اور اسی سبب سے ان کو قتل کر دیتے تھے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىٕمٍ ط ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ط ۝

"یعنی اے ایمان والو جو تم میں سے مرتد ہو جائے گا تو بلا سے، اللہ اور ایسے لوگوں کو لے آئے گا، جن سے خدا کو محبت ہوگی اور خدا سے ان کو محبت ہوگی، مومنوں کے سامنے تو ذلیل نظر آئیں گے اور کافروں کے سامنے بڑے سخت ہوں گے خدا کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی کے بھلا برا کہنے سے نہ ڈریں گے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے محب و محبوب وہی لوگ ہیں جو کافروں کے سامنے دب کر نہ رہیں اور ان کی خوشامد نہ کریں بلکہ ان سے کھچے ہی رہیں اور کسی کی ملامت سے نہ ڈریں، اب فرمایئے کہ تقیہ میں سوا کفار کی خوشامد اور ان کی موافقت اور اندیشہ ملامت کے اور کیا ہوتا ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقیہ محبوبوں اور محبوں کا کام نہیں بلکہ دشمنان خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے۔

تقیہ عرف اور دستور کی کسوٹی پر

اب الحمدللہ کہ عاقلان منصف کے لیے خوبی تقیہ عقل ونقل سے خوب واضح ہوگئی، مناسب

وقت یوں ہے کہ عرف اور دستور خلائق پر بھی اس کو منطبق کر کے کچھ اس کی بزرگی بتلا دیجئے۔ جملہ آفاق میں پسندیدہ خلائق پختگی اور استقامت ہے اور تلوّن کو سب لوگ ناپسند کرتے ہیں، خاص کر دین کے مقدمات میں اور وہ بھی پھر اتنا کہ ایک دفعہ شوراشوری اور پھر بالکل بے نمکی، سو پیغمبران دین اور آئمہ ہدیٰ اگر ایک دفعہ احکام دین سنا کر پھر خوف جان یا خوف آبرو سے ہم کاسۂ کفار ہو جائیں تو سب کے نزدیک یہ ذہن نشین ہو جائے کہ یہ لوگ خام طمع دُنیا طلب ہیں۔ پھر وہ معجزات کا عطا ہونا جو محض حسن اعتقاد خلائق کے لیے ہے سب رائیگاں ہو جائے اور جو لوگ کہ آمادۂ ہدایت ہوں، وہ منحرف ہو جائیں اور جو راہ پر آلئے ہوں وہ اس حب جاہ کو دیکھ کر بے اعتقاد ہو کر پلٹ جائیں بلکہ ایسے لوگوں کو سخت دُنیا دار سمجھیں۔ مع ہذا ظاہر ہے کہ نصیحت کی تاثیر کے لیے خود عمل کرنا رُکن اعظم ہے۔ جب تقیہ ہوا تو عمل کجا؟ تو لاجرم اس صورت میں ہدایت کی کوئی صورت نہیں۔

بالجملہ تقیہ کے بطلان پر عقل اور نقل اور عرف تینوں متفق ہیں، پر جس کی چشم انصاف کور ہو اس کو کیا نظر آئے؟ اور نقل مشہور ہے بلکہ حدیث شریف ہے "حُبُّکَ الشَّیءَ یُعْمِی وَیُصِمّ" یعنی تجھے اگر کسی چیز سے محبت ہو جائے تو اس کے عیوب اور نقصانات کے دیکھنے سننے میں وہ محبت تجھ کو اندھا بنا دیتی ہے، اگر محبت مذہب دل سے ایک طرف کر کے ان تقریروں اور اثبات تقیہ کی تقریروں کو موازنہ کریں تو ان شاء اللہ مولوی عمار علی صاحب بھی توبہ کر اُٹھیں، میر نادر علی کو تو شیعہ کیا بتائیں؟ اور اب ہم کو اس کی ضرورت نہیں رہی کہ بعد اس کے بھی کچھ بیان کریں لیکن اتمام حجت کے لیے اتنا اور معروضِ خدمت علماء شیعہ ہے کہ اگر بالفرض والتقدیر فرض محال تقیہ ثابت بھی ہو جائے تو موافق جمہور شیعہ حضرت امیر پر ہنگام خلافت تقیہ حرام تھا، پھر تعریف صحابہ کو تقیہ پر کیوں محمول کیا جائے؟

حضرت ابو بکر صدیق کو، صدیق نہ کہنے والے کیلئے حضرت جعفر کی بددُعاء

اور سلمنا کہ ہنگام خلافت بھی ان پر تقیہ فرض تھا، تو قطع نظر اس کے کہ یہ تعصب ہی تعصب ہے اور اس قول کے قائل نے عقل کی بھی ناک کتر لی ہے، اس میں کیا عذر کریں گے کہ حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ موافق مذہب شیعہ وہ خدا کی طرف سے تقیہ کرنے سے ممنوع تھے اور تقیہ ان پر حرام تھا۔ علی بن عیسیٰ اردبیلی امامی اثناعشری اپنی کتاب کشف الغمہ عن معرفۃ الائمہ میں نقل کرتے ہیں۔

سئل الامام ابوجعفرُ عَن حِلْیَۃِ السَّیْفِ هَلْ یَجُوْزُ فَقَالَ نَعَمْ قَدحلی اَبُوبَکْر الصِّدِّیْقُ سَیْفَهٗ فَقَالَ الرَّاوِیْ اَتَقُوْلُ هٰکَذَا فَوَثَبَ الامامُ عن مکانه فَقَالَ نَعم الصِّدِّیْقُ نَعَمْ

الصِّدِّیقُ نَعَمَ الصِّدِّیقُ فَمَنْ لَمْ یَقُلْ له الصِّدِّیقُ فَلاَ صَدَّقَ اللّٰہُ قَوْلَہٗ فِی الدُّنیَا وَالْآخِرَۃ

''یعنی حضرت امام ابوجعفر یعنی امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ وعن آباءٰ الکرام سے کسی نے پوچھا کہ تلوار کے قبضہ پر چاندی سونے کا کچھ نقش ونگار یا بوٹے وغیرہ بھی درست ہیں یا نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں درست ہے اس لیے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تلوار پر چاندی کا جھول کرایا تھا۔ راوی نے کہا کیا آپ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، آپ غصہ میں اپنی جگہ سے اُچک بیٹھے اور فرمانے لگے ہاں صدیق، ہاں صدیق، ہاں صدیق، جو انہیں صدیق نہ کہے اللہ اس کی بات کو دُنیا اور آخرت میں سچی مت **کیجیو۔ فقط''**

اب گوش گزار اہل انصاف یہ ہے کہ سب امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ علی بن عیسیٰ اردبیلی علم و فضل میں یکتا اور نقل اور روایت میں بڑے معتمد علیہ ہیں ان کی روایت پر کوئی سقم نہیں پکڑ سکتا۔

امام جعفر پر تقیہ حرام تھا

باقی رہی یہ بات کہ حضرت امام محمد باقر پر تقیہ کے حرام ہونے کی کیا دلیل ہے؟ سو یہ وجہ معقول ،اس کا جواب بھی ہم سے معقول ہی سنئے۔ کلینی میں روایت ہے:

عن معاذ بن کثیر عن ابی عبداللّٰہ قال ان اللّٰہ عزّوجلّ انزل علٰی نبیّہ کتابًا فقال یا محمّد ھذہٖ وصیّتک الی النّجباء فقال ومن النّجباء یا جبریل فقال علی بن ابی طالب وولدہ کان علی الکتاب خواتیم من ذھب فدفعہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم الٰی علی وامرہٗ ان یفُکّ خاتما منہ فیعمل بما فیہ ثمّ دفعہٗ الی الحسن ففکّ عنہٗ خاتمًا فعمل بما فیہ ثمّ دفعہ الی الحسین ففکّ خاتمًا فوجد فیہ اخرج بقوم الی الشھادۃ فلا شھادۃ لھم الاّ معک واشتر نفسک للّٰہ ففعل ثُمّ دفعہٗ الٰی علیّ بن الحسین ففکّ خاتمًا فوجدہ فیہ ان اطرق واصمت والزم منزلک واعبد ربّک حتّی یاتیک الیقین ففعل ثمّ دفعہٗ الٰی ابنہٖ محمّد بن علیّ ابن الحسین علیہ السلام ففکّ خاتمًا فوجد فیہ حدّث الناس وافتھم وانشر علوم اھل بیتک وصدِق اباء ک الصّالحین ولا تخافنّ احدًا لاّ اللّٰہ فانّہٗ لاسبیل لاحد علیک ثمّ دفعہ الٰی جعفر الصّادق ففکّ خاتمًا فوجد فیہ حدِثِ النَّاسَ وافتھم ولا تخافنّ احداً الاّ اللّٰہ وانشُرْ علوم اھل بیتک وصدِق اباء ک الصّالحین فانّک فی حِرزٍ واَمَانٍ ففعل ثمّ دفعہ الی ابنِہٖ موسٰی علیہ السلام وھکذا

الی قیام المھدی ورواہ من طریق آخر عن معاذ بن کثیر ایضاً عن ابی عبد اللہ ولیہ فی الخاتم الخامس وقل الحق فی الامن والخوف ولا تخش الا اللہ انتھی۔

''حاصل روایت کا یہ ہے کہ کلینی میں معاذ بن کثیر سے روایت ہے وہ حضرت امام محمد باقر سے روایت کرتے ہیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے نازل کی اپنے نبی پر ایک کتاب اور فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ تیری وصیت ہے نجباء کو، آپ نے فرمایا جبریل نجباء کون ہیں؟ جبریل نے کہا علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد، اور اس کتاب پر سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں (یعنی جیسے خطوں پر لاکھ لگا کر مہر لگا دیتے ہیں، ایسے ہی اس خط پر لاکھ کی جگہ سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں) سو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وصیت نامہ کو حضرت علی کو دیا اور یہ فرمایا کہ ایک مہر کو توڑیں اور جو اس کے نیچے سے نکلے اس پر عمل کریں، پھر انہوں نے حضرت امام حسن کو دیا، انہوں نے بھی ایک مہر توڑ کر اس کے نیچے جو کچھ نکلا اس پر عمل کیا، پھر انہوں نے حضرت سید الشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ کو دیا انہوں نے مہر توڑی تو اس کے نیچے سے یہ نکلا کہ ایک قوم کو شہادت کی طرف لے جا۔ اس لیے کہ ان کی شہادت تیرے ہی ساتھ ہے اور اپنی جان کو اللہ کے واسطے خرید لے، سو انہوں نے ویسا ہی کیا، بعد اس کے انہوں نے حضرت امام زین العابدین کو وہ وصیت نامہ دیا، انہوں نے مہر کو توڑا تو اس میں نکلا کہ سر جھکا کر بیٹھ رہ اور اپنے گھر ہی میں رہ اور اپنے رب کی عبادت کیے جا، یہاں تک کہ موت آجائے، سو انہوں نے ویسا ہی کیا، پھر انہوں نے وہ وصیت نامہ اپنے بیٹے امام محمد باقر کو دیا، انہوں نے جو مہر کو توڑا اس میں یہ پایا کہ لوگوں سے حدیثیں بیان کر اور فتوے دے اور اپنے اہل بیت کے علوم کو پھیلا اور اپنے آباؤ اجداد صلحا کو سچا کر اور سوا خدا کے کسی سے مت ڈر، اس لیے کہ کوئی تجھ پر قادر نہ ہو سکے گا، پھر انہوں نے اپنے بیٹے امام جعفر صادق علیہ السلام کو وہ وصیت حوالہ کی، انہوں نے جو مہر توڑی تو اس میں بھی یہ پایا کہ حدیثیں بیان کر لوگوں سے اور فتوے دے اور کسی سے سوائے خدا کے مت ڈر اور اپنے اہل بیت کے علوم کو پھیلا اور اپنے آباؤ اجداد صالحین کی تصدیق کر، اس لیے کہ تو خدا کے حفظ و امان میں ہے۔ سو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹے امام موسیٰ علیہ السلام کو وہ وصیت دی اور اسی طرح حضرت امام مہدی تک ہوتا چلا گیا۔

اور دوسری سند سے کلینی ہی معاذ بن کثیر مذکور کے واسطے سے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے اور اس روایت میں پانچویں مہر میں یعنی حضرت امام باقر کی نوبت میں اتنا اور بھی ہے اور کہتا رہ حق بات امن میں اور خوف میں اور سوا خدا کے کسی سے مت ڈر۔ فقط''

اس روایت میں غور فرمایئے کہ حضرت امام محمد باقر کو کس تاکید سے تقیہ کی ممانعت ہے، پھر بھی حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ جن کو یہ وصیت تھی کہ حق کے سوا بھی کچھ اور مت کہیو، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اتنی کچھ تعریف فرماتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ بجز نبوت کے نہیں، اس لیے کہ بعد انبیاء کے کلام اللہ میں صدیقین ہی کو ذکر فرماتے ہیں اور پھر تعریف بھی اس تاکید سے کہ بددعا فرماتے ہیں ان لوگوں کے حق میں جو انہیں صدیق نہ کہیں اور برا کہنے کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔

امام جعفر کی بدعا سے حقانیت اہل سنت اور بطلان مذہب شیعہ ظاہر ہو گیا

ہمیں اس روایت سے فقط یہی فائدہ نہیں ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صدیق ہونا بے غل وغش ثابت ہو گیا اور کسی کو تقیہ کے احتمال کی گنجائش نہ رہی بلکہ شیعوں کے مذہب کا بطلان اور سنیوں کے مذہب کی حقانیت بھی بہ تحقیق معلوم ہو گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرات شیعہ قاطبۃً خواہ امامیہ خواہ غیر امامیہ خواہ اثنا عشریہ خواہ غیر اثنا عشریہ اس بددعا کے اندر داخل ہیں جو حضرت امام معصوم مستجاب الدعوات امام محمد باقر کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، ہم کو تو ہم شیعوں کو بھی اس کے قبول ہونے میں تامل نہیں، سو اس سبب سے ہم کو بالیقین معلوم ہو گیا کہ ان کے دعوے محبت اہل بیت اور دعوے اسلام اور دعوے ایمان سب خداوند کریم کے نزدیک جھوٹا ہے اور آخرت میں بھی خداوند کریم ان کی تکذیب فرمائے گا۔ سو اس سے زیادہ اور کونسا مرتبہ باطل ہونے کا ہوگا۔ دوسرے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کیا سب حسب فرمان الٰہی اور موافق وصیت پیغمبری تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے جو بیعت کی، علیٰ ہذا القیاس حضرت امام حسن نے جو خلافت امیر معاویہ کے حوالے فرمائی، سب حسب ایماء خداوندی اور ارشاد پیغمبری تھا بوجہ تقیہ نہ تھا اور جب ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت موافق ارشاد خداوندی کی تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ قابل اسی کے تھے، علیٰ ہذا القیاس، دختر مطہرہ حضرت اُم کلثوم کا نکاح جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا تو وہ نکاح بھی خدا کے حکم کے موافق ہونے میں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح سے کچھ کم نہیں، جیسے ان کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موافق ارشادِ خداوندی ہوا تھا، ویسے ہی حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حسب فرمان الٰہی تھا۔ وھوالمراد الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ سب حیلہ و حجت امامیہ کا جواب دندان شکن بن پڑا، یہ اسی خداوند نعمت کا کرم ہے حق کو حق کر دکھایا اور باطل کو باطل۔

امام جعفر پر ایک اعتراض جو خودکشی کی نوعیت رکھتا ہے

مگر ہاں اتنا کھٹکا باقی ہے کہ شاید فرقہ امامیہ اہل سنت کی ضد میں اگر یہ حجت کریں کہ واقعی کلام اللہ اور اقوال عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنیوں کے برحق ہونے اور شیعوں کے باطل پر ہونے کے دو گواہ عادل ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے: "اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَحَدُھُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْاٰخِرِ کِتَابُ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ" ...... "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تم میں دو چیزیں بھاری چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، ایک ان میں دوسرے سے بڑا ہے وہ دونوں کیا ہے ایک تو کلام اللہ دوسرے میرے اہل بیت۔ فقط" اور اس حدیث کو سنی شیعہ دونوں فریق باتفاق بر سر وچشم رکھتے ہیں اور اس کی حدیث ہونے کے قائل ہیں۔

القصہ شیعہ اب اگر تین پانچ کریں تو یوں کریں کہ موافق حدیث مسطور کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنیوں کے برحق ہونے اور شیعوں کے باطل پر ہونے کے دو گواہ عادل بہت ہیں لیکن اس بات کو کیا کیجئے کہ اقوال عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہم تلک پہنچے ہیں تو وہ سب کے سب امام معصوم مستجاب الدعوات اعنی امام محمد باقر علیہ السلام کی بددعا میں جس کا ابھی مذکور ہوا داخل ہیں کیونکہ ہمارے سارے پیشواء ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صدیق ہونے کے منکر ہیں، ان سب کا قول ہر چہ بادا باد قابل تسلیم نہ رہا کیوں کہ بددعا تو یہی ہے کہ خدا ان لوگوں کی بات سچی نہ کرے، پھر جب ان کی بات ہی سچی نہ ہوئی تو ان کی روایات کیا اعتبار؟

مع ہذا اکثر پیشوایان مذہب شیعہ اور راویان اخبار صحیحہ مذہب مذکور کافر مطلق اور بے دین محض تھے کہ فتوئ شیعہ بھی ان کے حق میں بجز تکفیر اور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بعض بعض کا احوال کچھ اوپر آیت محمد رسول اللہ لآ یت کے ترجمہ اور متعلقات میں گزر چکا اور اوروں کا حال کچھ نہ پوچھئے کہ پردہ ہی میں بہتر ہے، زرارۃ بن اعین کے باب میں تو امام جعفر صادق نے اس بات کی گواہی دی کہ وہ اہل نار سے ہے۔ چنانچہ کتب معتبرہ میں ابن سمان سے موجود ہے اور قاضی نور اللہ صاحب رقم فرماتے ہیں کہ زرارۃ بن اعین کے چار بھائی حمران، عبدالملک، بکیر، عبدالرحمٰن اور زرارہ کے دو بیٹے حسن حسین اور بھتیجے یعنی چاروں بھائیوں کے بیٹے حمزہ محمد خریش، عبداللہ جہم، عبدالمجید، عبدالاعلیٰ عمر سب کے سب زرارہ بن اعین کا سا عقیدہ رکھتے تھے یعنی مثل زرارہ، سب اس بات کے قائل تھے کہ خداوند کریم ازل میں جاہل تھا (نعوذ باللہ منہا) تو اس صورت میں "کُنَّا بِکُلِّ شَیْءٍ

عَالِمِیْنَ" کے مضمون کے منکر تھے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کلام اللہ کا منکر کون ہوتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اوروں کو سمجھئے یہ تو بڑے مقتداؤں اور بڑے حاملان اخبار کا ذکر ہے اور ضعفاء اور مجاہیل کا کچھ حساب ہی نہیں، پھر ہم اپنی روایات کا کس طرح اعتبار کریں۔ اس صورت میں ایک گواہ کی گواہی تو ہمارے نزدیک مسلم، یعنی کلام اللہ کا فرمانا تو خیر جبراً کرھاً برسر کیونکہ ہر قرن میں بتواتر منقول ہوتا رہا ہے، پر دوسرے گواہ کی گواہی یعنی اہلبیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی جب قابل اعتبار ہو کہ وہ بھی ایسی ہی طرح منقول ہو اور یہ بھی نہیں تو سند ایسی تو ہو کہ اس کے راوی دیندار مؤمن ہوں کافر تو نہ ہوں، سو چونکہ ہماری روایات کے ایسے راوی نہیں اور سنیوں کا ہمیں پہلے سے اعتبار نہیں تو فقط ایک گواہ باقی رہ گیا اور شریعت میں ایک گواہ کا اعتبار نہیں، اس لیے ہم صحابہ کے معتقد نہیں ہو سکتے گو اس میں ہمارے مذہب کی ہی بیخ و بنیاد اکھڑ جائے اور سب کو یہ معلوم ہو جائے کہ شیعوں کے دین اور روایات کا یہ حال ہے:

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی　　　گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

سو اس کا جواب ہمارے پاس ہر چند بوجہ عقل بہت کچھ ہے لیکن اب بھی بہتر ہے کہ یوں کہا جائے کہ اگر تم ہماری ضد میں اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہوئے تو صاحب ہم ہارے تم جیتے۔ خیر اب بفضلہ تعالیٰ یہ بات ثابت ہو گئی کہ بشہادت ثقلین اعنی کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مذہب شیعہ غلط ہے اور یہی فقط مقصود تھا تو اب مناسب یوں ہے کہ بقدر مناسب اور باندازہ فرصت مولوی عمار علی صاحب کے خط کی بھی خبر لیجئے مگر مناسب یوں ہے کہ اوّل اس خط کو لفظاً لفظاً نقل کیجئے تا کہ ناظرین جواب کو لذت کامل نصیب ہو اس لیے اوّل وہ خط ہی پیش نظر کرتا ہوں، وہ خط یہ ہے:

نقل خط مولوی عمار علی

میر صاحب مظہر عنایت و کرم مجمع محامد شیم زاد فضلہ و کرمہ بعد سلام کے واضح خدمت عالی ہووے کہ عنایت نامہ تمہارا پہنچا، جو کچھ آپ نے لکھا تھا معلوم ہوا آپ نے لکھا تھا کہ مجھے صحت علماء شیعہ سے فدک کے غصب ہونے میں نہیں ہوتی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ آپ کی ملاقات کسی عالم واقف اور خبردار سے آج تک حاصل نہیں ہوئی، اگر مجھ سے آپ کی ملاقات ہووے اور میری زبانی آپ سنیں تو آپ پر واضح ہو جاوے کہ اہل سنت بالکل غلطی پر ہیں اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں اور بھس پر لیپا لیپتے ہیں اور تین سوال جو آپ نے عبدالحق کی طرف سے لکھے تھے ان کا جواب مختصر یہ ہے کہ سوال اوّل میں آپ نے لکھا تھا کہ رسول خدا کی بیٹیوں کا نکاح کس سے ہوا، یہ سوال بے محل ہے، اس واسطے

کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نطفہ سے ایک بیٹی تھی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا، سو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب تھی اور دو بیٹیاں جو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلسنت مشہور کرتے ہیں وہ دونوں حضرت کے نطفہ سے نہ تھیں بلکہ وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر کے نطفہ سے تھیں، ہمراہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آئی تھیں اور نام ان دونوں صاحبزادیوں کا رقیہ اور اُم کلثوم رضی اللہ عنہن تھا۔ ابن حجر محدث اہل سنت نے کتاب اصابہ میں لکھا ہے کہ ایک کا نکاح تو ان میں سے عتبہ بن ابی لہب سے ہوا تھا اور دوسری کا نکاح ابوالعاص بن الربیع سے اور یہ دونوں کافر تھے لعین، بعد اس کے نکاح ان دونوں کا عثمان سے ہوا جس وقت کہ باوجود قوت اسلام کے کافروں کے نکاح میں رہی ہیں اور پیغمبر خدا نے ان سے علیحدہ نہ کیا۔ اگر عثمان کے نکاح میں آئیں تو کیا قباحت ہے۔ عثمان تو خود مسلمان تھا، حضرت کے روبرو اور ان کافروں سے بدرجہ بہتر تھا۔

البتہ بعد وفات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسی بدعتیں عثمان نے کیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس کے حق میں کہتی تھی "اقتلوا نعثلا لعن اللہ نعثلا اقتلوا حراق المصاحف" یعنی قتل کرو اس ریش دراز کو لعنت کرو اس ریش دراز پر، قتل کرو اس قرآن کے جلانے والے کو، چنانچہ استیعاب میں لکھا ہے یہاں تک بدعتیں کیں کہ صحابہ رسول نے تنگ ہو کر اسے قتل کیا، یہ سب ماجرا اہل سنت کی کتابوں میں مذکور ہے، اگر سند اس کی مطلوب ہوگی تو روانہ کردی جائے گی اور اگر یہ دونوں صاحبزادیاں بھی رسول خدا کے نطفہ سے ہوتیں تو ان کے فضائل کچھ مذکور ہوتے جیسے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فضائل سنی، شیعہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ سیدۃ نساء العلمین سیدۃ نساء اہل الجنۃ، الفاطمۃ بضعۃ منی اور سوا اس کے فضائل فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صدہا کتابوں میں مذکور ہیں اور ان دونوں کے فضائل ایسے مذکور نہیں ہیں، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نطفہ سے ہوتیں تو البتہ مذکور ہوتے۔

سوال دوسرا، علی رضی اللہ عنہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بہتر جنگیں کیں، اگر باغ فدک اصحاب ثلاثہ نے غصب کیا تھا تو علی نے ان پر جہاد کیوں نہ کیا، جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سوال بھی غلط ہے اس واسطے کہ علی نے عائشہ سے بہتر جنگیں نہیں کیں بلکہ ایک جنگ کی تھی سو عائشہ رضی اللہ عنہا کو شکست ہوئی۔ چنانچہ اہلسنت کی کتابوں میں لکھا ہے اور فدک کے غصب کرنے سے جہاد لازم نہ ہوا تھا، اس واسطے کہ جہاد مال دُنیا کے غصب کرنے سے واجب نہیں ہے بلکہ پیغمبر اور امام واسطے ترقی دین کے جہاد کرتے ہیں نہ واسطے مال دُنیا کے اور علی کے پاس جہاد کرنے کو انصار کب تھے کہ وہ جہاد کرتے، جہاد کرنے کا حکم تنہا کے واسطے نہیں ہے بلکہ جس وقت انصار و مددگار بہم

پہنچیں اس وقت جہاد کرنا چاہیے، جیسے کہ رسول خدا جب تک مکہ میں رہے بسبب نہ ہونے انصار کے حکم جہاد کا نہ ہوا، جب مدینہ گئے کافروں کے خوف سے ہجرت کر کے اور انصار بہم پہنچے تو جہاد کفار پر کیا اور جب تک مکہ میں رہے کچھ نہ ہو سکا بلکہ کچھ کچھ مددگار بھی وہاں موجود تھے۔ ان مددگاروں میں ایک علی بھی تھے ان سے بھی کچھ نہ ہو سکا، آخر کفار کے خوف سے سب نے اپنا وطن اصلی چھوڑ دیا مگر ایسے ہی حال علی کا بعد رسولِ خدا کے تھا کہ خلفاء ثلثہ کے زمانہ میں ان کو انصار و مددگار بہم نہ پہنچے تو جہاد نہ کیا اور جب بہم پہنچے تو عائشہ پر بھی جہاد کیا اور معاویہ پر بھی۔

اور سوال تیسرا یہ کہ علی کی بیٹیوں کا نکاح کس سے ہوا تھا، جواب اس کا یہ ہے کہ فاطمہ کے پیٹ سے علی کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی بیٹی زینب کہ جس کا نکاح عبداللہ بن جعفر طیار سے ہوا تھا اور دوسری بیٹی کلثوم تھی کہ جس کا نکاح محمد بن جعفر طیار سے ہوا تھا، فقط یہی سوال تھا جس کا جواب ہوا اگر کچھ زیادہ لکھتے تو زیادہ لکھا جاتا اور فدک کا غصب ہونا جو آپ نے دریافت کیا تھا اس کو ایک دفتر چاہیے لیکن کچھ مختصر تھوڑا سا آپ کی خدمت میں تحریر کرتا ہوں، اگر آپ کی طبیعت میں انصاف ہے تو اسی قدر کفایت کرتا ہے اور جو کچھ لکھتا ہوں یہ سب اہل سنت کی معتبر کتابوں سے ہے جس شخص کو کچھ تردد ہو مطابق کرلے اور بعد اس کے انصاف کرے کہ یہ ظلم ہے یا نہیں؟ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درمنثور میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اور ابو علی موصلی نے اپنی مسند میں اور صاحب معارج النبوۃ نے معارج النبوۃ میں اور سوا اس کے اور علماء اہل سنت نے روایت کی ہے کہ جس وقت نازل ہوئی آیت "وات ذا القربیٰ حقہٗ" یعنی دے تو اے محمد قریبوں کو حق ان کا، تو اس وقت پیغمبر خدا نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ قریب میرے کون ہیں اور حق ان کا کیا ہے، جبریل علیہ السلام نے عرض کی کہ قریب تمہارے فاطمہ ہے اور حق اس کا فدک ہے، فدک اس کو دیدو اس وقت رسول خدا نے فدک فاطمہ کو دے دیا، پس تحریر سے ان علماء کی ثابت ہوا کہ رسول خدا نے فاطمہ کو فدک دیا اور فاطمہ مالک فدک کی تھی۔

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا سے رحلت فرمائی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو فدک کو فاطمہ سے چھین لیا اور ان کا قبضہ اُٹھا دیا، اب فرمایئے؟ کہ یہ غصب نہیں تو کیا ہے؟ اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ تاریخ آل عباس کہ کتب معتبرہ اہلسنت سے ہے اس میں لکھا ہے کہ جس وقت اولاد حسنین نے مامون رشید خلیفہ عباسی سے دعویٰ فدک کا کیا تو اس نے دو صد علماء اہل سنت جمع کر کے کہا کہ حال فدک کا راست راست بیان کرو، انہوں نے بروایت واقدی اور بشیر بن ولید

بیان کیا کہ بعد فتح خیبر آیت "و آت ذا القربیٰ حقہ" نازل ہوئی تو رسول خدا نے جبریل سے پوچھا کہ ذوالقربیٰ میرے کون ہیں اور حق ان کا کیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے عرض کی کہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا تمہاری قریب ہے اور حق اس کا فدک ہے، اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے دیا، جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک سے منع کیا تو فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ فدک مجھ کو میرے باپ نے دیا ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبول کیا اور چاہا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کاغذ معافی کا لکھ دے اور فدک فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پھیر دے، اس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہ طلب کر کہ پیغمبر خدا نے اس کو کب دیا ہے؟ اس وقت فاطمہ زہرا، حضرت علی اور اُم ایمن کہ ایک بی بی تھیں اور حسنین علیہ السلام کو گواہ اپنا لائی اور انہوں نے گواہی دی کہ پیغمبر خدا نے فاطمہ کو فدک دیا ہے تو اس وقت ابوبکر نے فاطمہ کو کاغذ فدک کا لکھ دیا کہ اپنے حق پر قابض ہووے، عمر نے وہ کاغذ ابوبکر سے لے کر پھاڑ ڈالا اور کہا کہ فاطمہ ایک عورت ہے اور علی اس کا شوہر ہے اپنے نفع کے لیے کہتا ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی قبول کیا اور یہ دعویٰ کرنا فاطمہ کا ابوبکر سے ہبہ فدک کا اور گواہی دینا علی اور حسنین کا اور اُم ایمن کا اور رد کرنا اور نامنظور کرنا ابوبکر کا ان کی گواہی کو اہلسنت کی بہت کتابوں میں لکھا ہے، مثل صواعق محرقہ اور فصل الخطاب اور معجم البلدان اور ریاض النضرہ اور کنز العمال اور تاریخ حاکم اور جمع الجوامع اور شرح مواقف اور نہایت العقول اور سوا اس کے بہت کتابوں میں ہے لیکن ابوبکر نے فاطمہ کو اور اس کے گواہوں کو اس دعوے میں جھوٹا جانا اور سوائے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جس کسی نے ابوبکر سے دعویٰ کیا اس کو ابوبکر نے سچا جانا اور گواہ اس سے طلب نہ کیے جو کچھ اس نے مانگا دے دیا۔

چنانچہ صحیح بخاری میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتا ہے کہ میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مال بحرین کا آوے گا تو میں تجھ کو اس میں سے اس قدر مال دوں گا اور مال بحرین کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ آیا لیکن اب تمہارے پاس آیا ہے تم اس میں سے مجھ کو دو کہ حضرت نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن کر اسی وقت تین مٹھی مال کی مجھے بھر کر دی اور گواہ مجھ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کرنے کے طلب نہ کیے اور فتح الباری شرح صحیح بخاری میں وجہ اس کی اس طرح لکھی ہے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو جابر سے گواہ طلب نہ کیے اور دعویٰ کرتے ہی مال اس کو دے دیا، سبب اس کا یہ ہے کہ جابر سا صحابی معاذ اللہ

ت پیغمبر خدا پر جھوٹا دعویٰ کرے کہ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر جابر سچا نہ ہو تو پھر کون سچا ہو سکتا ہے؟ اس واسطے ابوبکر نے اس سے گواہ طلب نہ کیئے اور بدون گواہی اس کو مال دے دیا، اب کہتا ہوں میں کہ وائے بر دینداری اہل سنت کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو کہ پارہ جگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہے جابر کے برابر بھی نہ جانا کہ ادنیٰ صحابی تھا اور ان کے نزدیک فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مرتبہ جابر کے برابر بھی نہ ہوا کہ جابر کو تو بدون گواہوں کے مال دے دیا اور اس کو جھوٹ سے بچایا اور کہا کہ جابر سچا نہ ہوگا تو اور کون سچا ہوگا؟ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جھوٹا سمجھ کر اس سے گواہ طلب کیے جب گواہوں نے اس کی گواہی دی تو ان کی گواہی کو رد کیا، علی رضی اللہ عنہ کو تو کہا کہ یہ شوہر اس کا ہے اپنے نفع کے لیے کہتا ہے۔ علی کو بھی جھوٹا جانا ہر چند علی بھی صحابی تھے لیکن جابر رضی اللہ عنہ کے برابر سچے نہ تھے اور حسنین کو کہا یہ فرزند اس کے ہیں اور لڑکے ہیں اور اُم ایمن جو باقی رہی وہ ایک عورت ہے اس کی گواہی کیسے درست ہووے۔

اب فرمایئے کہ یہ غصب نہیں تو اور کیا ہے۔ سو اس کے اور غصب کس کو کہتے ہیں؟ اور یہ عداوت ہے یا دوستی؟ اور مروت اور رعایت حق رسول؟ اور حق اور سچ تو یہ ہے کہ اہل بیت کی دشمنی میں حق رسول کی بھی رعایت نہ کی۔ آپ نے لکھا تھا کہ مجھے غصب فدک کی کسی سے صحت نہیں ہوتی، اب آپ کو چاہیے کہ میری صحت علماء سنت سے کرایئے اور میری باتوں کا جواب لکھوا کر بھجوایئے کہ کیا سبب ہے کہ جابر کو سچا جانا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جھوٹا سمجھا اور اس مظلومہ کے گواہوں کو بھی رد کیا اور یہ بھی سننا چاہیے کہ جب فاطمہ نے جانا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے ہبہ فدک میں جھوٹا سمجھا تو اس معصومہ نے دعویٰ وراثت کا کیا اور ابوبکر سے کہا کہ میں پیغمبر خدا کی بیٹی ہوں، مجھے ان حضرت کا مال وراثت میں پہنچتا ہے اور فدک میرے باپ کا مال ہے مجھے دے دے، اس وقت ابوبکر نے ایک جھوٹی روایت قرآن کے خلاف بنا کر کہا کہ میں نے پیغمبر خدا سے سنا ہے کہ وہ حضرت فرماتے تھے کہ انبیاء کا مال سب صدقہ ہے کسی کو ان کے وارثوں میں سے نہیں پہنچتا۔ اوّل تو یہ روایت خلاف قرآن کے ہے، دوسرے یہ کہ پیغمبر خدا نے اپنے وارثوں میں سے نہ بیٹی سے نہ اپنی بیبیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے تم کو نہیں پہنچتا، تم دعوے نہ کرنا اور حکم خدا کا جو کچھ ان کے واسطے تھا، اس کو ان سے چھپا کر رکھا اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا کی وراثت میں نہ تھا اس کے کان میں کہہ دیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔

لیکن باوجود اس کے پھر ایک مرتبہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئی اور اس

وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ منبر پر تھے، کہا کہ اے ابوبکر! تیری بیٹی تو تیرا ترکہ پاوے اور میں اپنے باپ کا ترکہ نہ پاؤں، اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ منبر سے نیچے اُترا اور کہا کہ لے میں تجھ کو فدک دیتا ہوں یہ کہہ کر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کاغذ لکھ دیا، اتنے میں عمر رضی اللہ عنہ آئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ کیسا کاغذ ہے کہا کہ میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک لکھ دیا ہے، عمر رضی اللہ عنہ نے وہ کاغذ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لے کر پھاڑ ڈالا اور کہا کہ لوگوں کو کیا دے گا؟ عربوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔

چنانچہ یہ روایت سبط ابن جوزی نے اپنی سیرت میں تحریر کی ہے اور واقدی محدث اہل سنت اور برہان الدین حلبی شافعی نے اپنی سیر میں لکھا ہے فاطمہ نے ابوبکر سے دعویٰ فدک کا کیا کہ فدک میرا ہے میرے باپ نے مجھ کو دیا تھا، اس وقت ابوبکر نے فاطمہ کو فدک کا کاغذ لکھ دیا، جب فاطمہ رضی اللہ عنہا وہ کاغذ لے کر وہاں سے پھری تو رستہ میں عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، عمر نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ یہ کیسا کاغذ ہے؟ فاطمہ نے کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ کو فدک لکھ دیا ہے، عمر رضی اللہ عنہ نے وہ کاغذ ہاتھ فاطمہ سے چھین کر پھاڑ ڈالا، اگر کوئی کہے کہ ابوبکر کا اس میں کیا قصور ہے، اس نے تو لکھ دیا تھا، جواب اس کا یہ ہے کہ ابوبکر حاکم تھا اس کو اس امر میں تابعداری عمر کی نہ چاہیے تھی، عمر رضی اللہ عنہ کو اس شر سے باز رکھتا اور اس کے کہے پر عمل نہ کرتا لیکن وہ تو اس کا ہر امر میں شریک تھا اس کے مشورہ بدون کچھ نہیں کر سکتا تھا اور میں کہتا ہوں کہ اگر صحابہ ابوبکر کو اس امر میں سچا جانتے تھے اور علی بھی ابوبکر کو سچا جانتے تھے کہ ابوبکر سچ کہتا ہے پیغمبر خدا کا سب ترکہ صدقہ ہے کسی کو نہیں پہنچتا تو پھر علی اور عباس رضی اللہ عنہم نے عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں عمر رضی اللہ عنہ سے جا کر کیوں دعویٰ کیا؟ پیغمبر کے ترکہ کا اس وقت عمر نے علی اور عباس کو کہا کہ تم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے تھے اور مجھے بھی تم دونوں کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے ہو اور میں وہی کروں گا جو کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کرتا تھا یہ روایت صحیح مسلم میں لکھی ہے۔

اور مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں عثمان سے بھی پھر دعویٰ کیا تھا، پس اگر ابوبکر سچا ہوتا تو ان کے زمانہ میں دعویٰ ہرگز نہ کرتے، معلوم ہوا کہ ابوبکر اس روایت میں بالکل جھوٹا تھا، ازراہ عداوت کے روایت بنا کر فاطمہ کا حق غصب کیا اور عمر خود علی اور عباس سے اقرار کرتا ہے کہ تم ابوبکر کو کاذب اور خائن جانتے تھے اور مجھے بھی تم کاذب اور خائن جانتے ہو۔ پس جس وقت علی نے ان کو کاذب اور خائن جانا تو بیشک ہم بھی ان کو کاذب اور خائن جانیں گے اور یہی مطلب غصب سے ہے اور صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ جس وقت

ابو بکر نے فدک کے دینے سے انکار کیا تو فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس پر غضب ناک ہوئی اور تمام عمر پھر کبھی اس سے کلام نہ کیا اور صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ فاطمہ نے وقت مرنے کے وصیت کی کہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما میرے جنازہ پر نہ آنے پائیں۔ فقط

جواب خط

یہاں تک خط مذکور کی عبارت تھی بلکہ بلا کم و کاست لفظاً لفظاً نقل کر دیا ہے لیکن اب ہماری بات سننے کے لیے بھی تیار ہو جایئے تا کہ مولوی صاحب کی اس طمطراق کی حقیقت اور مولوی صاحب کی قابلیت اور علماء شیعہ کی فہم و فراست بخوبی معلوم ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ یہ خط ہر چند عبارت میں تو زیادہ لیکن مثل غذا قلیل الکیموس کہ باوجود قلت کیموس کے سیئ الکیموس بھی ہو خلاصہ نکالیے۔ تو کل دو چار ہی باتیں ہیں پھر وہ بھی غلط اگر اعتبار نہ آئے تو دیکھئے۔

اوّل مولوی صاحب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نطفہ سے فقط ایک ہی بیٹی تھی جن کا نام حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا تھا اور اہل سنت جو دو بیٹیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مشہور کرتے ہیں وہ آپ کے نطفہ سے نہ تھیں بلکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کے نطفہ سے تھیں خیر غنیمت ہے کہ جناب مولوی عمار علی صاحب نے اتنا تو لحاظ رکھا کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی اولاد ہونے سے تو ان کو خارج نہیں کیا۔ ہم ایسی ناانصافی پر اس کے بھی شکر گزار ہیں ورنہ جہاں مولوی صاحب نے جرأت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نسب منقطع کیا تھا اگر حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے بھی ان کا نسب منقطع کر دیتے جیسے بعضے ایسے ہی دشمنان پنہانی اہل بیت نے کیا ہے تو کون مانع تھا۔ بات یہ ہے کہ اس جگہ تو مولوی صاحب نے غیرت کی ناک ہی کتر لی ہے اور موافق مثل مشہور: "دروغ گویم بر روئے تو" یہ ستم کیے ہیں کہ سنیوں کی ضد میں اہل بیت پر جفا کر کے (سوکھی) اپنے ایمان پر بھی تو قلم پھیر گئے، نہ کلام اللہ کی سنی نہ اپنی معتبر کتابوں کا لحاظ کیا، آفرین ہے کیوں نہ ہوں مولوی عمار علی ...... ع ...... "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

بنات طیبات از روئے کلام اللہ شریف

برائے خدا اہل انصاف بے روی و ریا ہو کر میری گزارش کو سنیں اگر بیجا ہو جب ہی کہیں، کلام اللہ موجود ہے اگر مولوی عمار علی صاحب کو یہ عذر ہو کہ شیعوں کو کلام اللہ یاد نہیں ہوتا ہم کلام اللہ کے حوالوں کی کیونکر تصدیق کریں تو میں پتے وار بتلاتا ہوں۔ سورۂ احزاب میں بائیسویں پارہ میں

قریب ربع کے آخر کے رکوع سے پہلے رکوع کے شروع ہی میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ

''یعنی کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیبیوں اور بیٹیوں کو اور مومنوں کی عورتوں کو کہ اپنے اوپر اپنی چادریں ڈال لیا کریں۔'' فقط

اب گزارش یہ ہے کہ اتنی بات تو مولوی عمار علی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ بنات جمع ہے اور جمع کم سے کم تین پر بولی جاتی ہے اور اگر کبھی توسع کر کے دو پر بھی اطلاق کر دیں تب بھی ایک سے تو زیادہ ہی ہوگا۔ بہر حال یہ کہنا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا اور کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹی ہی نہ تھی تب بھی غلط ہوگا۔ افسوس مولوی صاحب کو اتنی شرم بھی تو نہ آئی کہ کوئی سنے گا تو کیا ہوگا مگر مولوی صاحب نے ہم جانے یہ سن رکھا ہے۔ ''**الحیاء یمنع الرزق**'' یعنی حیاء رزق روک دیتی ہے اس لیے شاید اس پر بھی دھیان نہ فرمایا، **الحیاء شعبة من الایمان** کیونکہ ایمان کا ثمرہ بالفرض کچھ ہوا بھی تو آخرت میں ہوگا، رزق تو آج ہاتھ سے جائے ہے اور پہلے لوگ فرما گئے ہیں۔

''نقد را بنسیہ گذاشتن کار خرد منداں نیست''

بالجملہ یا تو مولوی صاحب یہ تسلیم فرمائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں تھیں، پھر یہ آپ تسلیم کریں گے کہ وہ حضرت رقیہ وغیرہا تھیں کیونکہ سوا ان کے اور کسی کی نسبت تو کسی نے یہ دعویٰ کیا ہی نہیں ورنہ آیات ربانی کے منکرین کے لیے یہ تازیانہ موجود ہے۔ ''**وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْکٰفِرُوْنَ**''...... ''یعنی نہیں انکار کرتے ہماری آیات سے مگر کافر'' اور اگر کافر بن جانا گوارا کریں اور اس بات کو نہ مانیں کہ سوا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بھی کوئی بیٹی تھی تو ناچار پھر ہمیں شیعوں ہی کی کتابوں کی سند دینی لازم ہوگی انہیں تو جھوٹا نہیں بتائیں گے اور اگر ہماری ضد میں ان سے بھی دست بردار ہوں تو سبحان اللہ ''چشم ما روشن دل ماشاد''

بنات طیبات کی تعداد از روئے کتب شیعہ

بہر حال اس اُمید پر اس باب میں روایات کتب معتبرہ شیعہ ہی نقل کرتے ہیں۔ نہج البلاغت میں جو شیعوں کے نزدیک مثل صحیفہ آسمانی اور آیات قرآنی کے ہے اور اس کے مرویات کو سب اثنا عشریہ متواتر سمجھتے ہیں۔ علامہ رضی جو اس کے جامع ہیں حضرت امیر کا قول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خطاب میں یوں نقل فرماتے ہیں: ''**قَدْ بَلَغْتَ مِنْ صِهْرِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ مَالَمْ یَنَالَا**'' یعنی الشیخین حاصل اس کا یہ ہوا کہ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان ذی النورین کو کسی

مقام میں یوں فرماتے ہیں کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا وہ شرف میسر آیا ہے کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بھی میسر نہیں آیا اور شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی تہذیب میں جو صحاح اربعہ شیعہ میں سے ہے اور ہم سنگ کافی کلینی ہے۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کرتے ہیں: "كَانَ يَقُوْلُ فِيْ دُعَائِهٖ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى رُقَيَّةَ بِنْتِ نَبِيِّكَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اُمِّ كَلْثُوْمَ بِنْتِ نَبِيِّكَ"...... "یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ دُعا میں یوں کہا کرتے تھے کہ یا اللہ! رحمت بھیج حضرت رقیہ پر جو تیرے نبی کی بیٹی ہیں، یا اللہ رحمت بھیج حضرت اُم کلثوم پر جو تیرے نبی کی بیٹی ہیں۔" اور اس پر بھی تسکین خاطر نہ ہو اور جناب مولوی صاحب قبلہ اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جائیں اور اس کی یوں تاویل کرنے لگیں کہ عرف کی رُو سے انہیں بیٹیاں کہہ دیا ہو، لے پالک کو سارا جہاں بیٹا بیٹی کہا کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی بیٹی تھیں تو میں بھی ان شاء اللہ مولوی صاحب سے تسلیم ہی کرا کر چھوڑوں گا۔ کلینی میں روایت موجود ہے:

تَزَوَّجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ خَدِيْجَةَ وَهُوَ ابْنُ بِضْعٍ وَعِشْرِيْنَ سَنَةً فَوُلِدَ لَهٗ مِنْهَا قَبْلَ بَعْثِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَلْقَاسِمُ وَرُقَيَّةُ وَزَيْنَبُ وَاُمُّ كُلْثُوْمٍ وَوُلِدَ لَهٗ بَعْدَ الْمَبْعَثِ الطَّيِّبُ وَالطَّاهِرُ وَفَاطِمَةُ.

"حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے جب نکاح کیا تو اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کچھ اوپر بیس برس کی تھی، سو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے نطفہ سے پہلے نبوت کے تو حضرت قاسم اور حضرت رقیہ اور حضرت زینب اور حضرت اُم کلثوم پیدا ہوئے اور بعد نبوت کے حضرت طیب اور حضرت طاہر اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہم اجمعین پیدا ہوئے۔"

اس روایت میں شیعوں کو کچھ تین پانچ کرنے کی گنجائش نہیں، لے پالک ہونے کے احتمال کو بھی پیش نہیں کر سکتے اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں، ایک تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور تین اور۔ حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہن اور یہی سنیوں کا دعویٰ ہے۔

پر مولوی صاحب نے کمال تورع کے باعث تین کے عدد کو منہ پر لانا بھی گوارا نہ کیا اور اہل سنت کی طرف دو ہی صاحبزادیوں کا سوائے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ کرنا بیان کیا۔ مع ہذا انہوں نے سمجھا حریف کی بات کو جتنا گھٹایا جائے مناسب ہے، سبحان اللہ! اس پر تجبر پر، اہل سنت کی بیسیوں کتابوں

کے نام گناتے چلے جاتے ہیں کوئی جانے مولوی صاحب کی نظر میں سب گزری ہوئی ہیں، حضور کو اس بات کی تو خبر ہی نہیں جو زبان زدعام وخاص اہل سنت ہے، اہل سنت کی کتابوں کو دیکھنا تو کہاں نصیب؟ میں جانوں کسی سنی طالب علم سے کتابوں کے نام سن بھاگے ہیں ورنہ بعضی بعضی کتابیں جو حضور نے رقیمہ کریمہ میں ان کے حوالہ سے غصبِ فدک بیان فرماتے ہیں شاید خواب میں بھی نہ دیکھیں ہوں۔ خصوصاً جمع الجوامع اور مسند احمد بن حنبل، علیٰ ہذا القیاس اور کتابیں بھی ایسی ہی ہیں۔ ہر چند بعد اس تحریر کے مجھ کو کچھ ضرورت تحریر نہیں، اہل فہم اور اہل انصاف کے نزدیک دوٹوک بات ہوگئی۔

مذکور نہ ہونا معدوم ہونے کی دلیل نہیں ہے

لیکن مولوی صاحب کی خوش فہمی کی تعریف بھی ہمارے ذمہ واجب ہے، جناب مولوی صاحب اس دعوے کی دلیل کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سوا حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی صاحبزادی نہ تھی، یوں رقم فرماتے ہیں ”کہ اگر حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہوتیں تو ان کے فضائل بھی مذکور ہوتے۔ جیسے حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے فضائل طرفین کی کتابوں میں موجود ہیں، کیا دلیل ہے؟ کسی نے ایسوں ہی کی تعریف میں کہا ہے کہ...... ع ...... ”بریں فہم و دانش بباید گریست“ اگر مولوی صاحب کو قواعد استدلال کی خبر نہ تھی تو کسی سے پوچھ لیتا تھا۔ آخر اتنا بھی اوروں ہی کی تے چشی کے بھروسے پر ہے، جب ہی تو یوں بے تحقیق جو چاہا لکھ دیا، جناب مولوی صاحب معقولات کے طور پر تو اتنا ہی جواب بہت ہے کہ عدم الاطلاع یا عدم الذکر عدم الشے پر دلالت نہیں کرتا لیکن آپ کے سامنے تو بے نقل کام نہیں چلتا کیونکہ کمال تورع سے معقولات کے ذکر کو تو آپ حرام ہی جانتے ہوں گے۔ جناب باری تعالیٰ سورہ نساء کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے: ”وَرُسُلاً قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلاً لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ“...... ”یعنی بہت رسول تو ایسے ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے تجھ سے کہلایا ہے پہلے سے، اور بہت سے رسول ایسے ہیں کہ ان کا قصہ اور احوال ہم نے تجھ سے بیان ہی نہیں کیا۔“ غرض اگر کسی کا ذکر نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل ہوا کرے تو لازم آئے کہ سوا ان رسولوں کے جن کا کلام اللہ میں مذکور ہے (نعوذ باللہ منہ) کوئی اور رسول پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ مع ہذا یہ کچھ لازم ہے کہ کسی بزرگ کی اولاد سب کی سب برابر ہوا کرے اور اگر اس بات کو مانیں تو مولوی صاحب سنبھل کر مانیں۔ پھر حضرت امام محمد باقر اور زید شہید کو جوان کے بھائی تھے برابر کہنا پڑے گا یہ تو مولوی صاحب نے فرمایا ہوتا کہ اہل سنت حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور

حضرت اُم کلثوم کو برابر سمجھتے ہوں۔ حاشا وکلا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو شرف ہے، وہ اور کے لیے نہیں۔ "ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ"

عمارعلی کی تاریخ دانی

باقی یہ جو مولوی صاحب رقم فرماتے ہیں کہ حضرت رُقیہ اور حضرت اُم کلثوم میں سے ایک کا نکاح ابوالعاص سے ہوا تھا۔ یہ مولوی صاحب کی قوت حافظہ کی دلیل ہے۔ "آرے دروغ گورا حافظہ نباشد" جناب من ابوالعاص سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تھا اور وہ دونوں صاحبزادیاں جن کا نام آپ نے لکھا ہے ابولہب کے دو بیٹوں سے منسوب ہوئی تھیں اور حافظ ابن حجر کا نام کیوں بدنام کرتے ہو۔ خطا تو اپنی ہے اور لگاتے ہیں اوروں کے ذمہ، اور یہ جو مولوی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ باوجود قوت اسلام کے وہ کافروں کے نکاح میں رہیں یہ مولوی صاحب ہی کی جرأت ہے۔ سبحان اللہ! وہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں نہ تھیں تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں تو تھیں۔

اور ہم جانیں کہ شیعہ بھی اُم الاطہار حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی اتنی تو پاسداری ضرور کرتے ہوں گے کہ ان کی بیٹیوں کو مسلمان تو سمجھتے ہوں گے اور خیر کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، مولوی صاحب تو ان کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں کیونکہ اگر وہ دونوں کافر ہوتیں تو اس کے کہنے کی کیا حاجت تھی "جس وقت کہ باوجود قوت اسلام کے کافروں کے نکاح میں رہیں اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے علیحدہ نہ کیا اگر عثمان کے نکاح میں آئیں تو کیا قباحت ہے، عثمان رضی اللہ عنہ تو خود مسلمان تھا، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اور ان کافروں سے بدرجہا بہتر تھا انتہیٰ" پھر کسی مسلمان کے خیال میں آسکے ہے کہ باوجود قوت اسلام اور شوکت اہل اسلام کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادنیٰ مسلمان عورت کو بھی (چہ جائیکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں) کفار کی قید میں رہنے دیتے۔

مسلمان عورت کو قید کفار سے رہائی دلانے کا قرآنی حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خداوند کریم تو ہر خاص و عام کو اس کی تاکید فرماتا ہے کہ مسلمان عورتوں کو کفار کی قید سے چھڑاؤ۔ یقین نہ ہو تو سورۂ نساء کی یہ آیت موجود ہے۔

وَمَالَكُمْ لَاتُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا

مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا○

''یعنی خداوند کریم مسلمانوں کو یوں ارشاد فرماتا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے جو تم خدا کی راہ میں قتال نہیں کرتے اور ضعیفوں کے چھڑانے کے لیے نہیں لڑتے، یعنی واسطے ناتوانوں کے مردوں سے اور عورتوں سے اور بچوں سے جو یوں کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی خبر گیراں اور مددگار بنا دے۔''

مع ہذا شیعوں کو بھی معلوم ہوگا کہ ان آیات کا نزول قبل فتح مکہ ہے اور فتح مکہ سے پہلے ایسی شوکت اسلام نہ تھی کہ آپ ملک عرب میں جو چاہیں سو کرلیں، سو اگر مولوی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ اس آیت کے نزول تک وہ مکہ معظمہ ہی میں تھیں تب تو قطع نظر جھوٹ کے ان کا کفار کے پنجہ میں رہنے کا قائل ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس پردہ میں طعن کرنا ہے اور اگر اس آیت کے نزول سے پہلے ہی وہ تشریف لے آئی تھیں۔ سو شوکت ہی آپ کو کون سی تھی جو باوجود اس کے آپ نے ان کا کافروں کے نکاح میں رہنا گوارا کیا اور اگر ہم سے پوچھئے تو حق یوں ہے کہ قبل بعث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں صاحبزادیوں کا نکاح ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے ہوا تھا، بعد بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جب ابولہب برسر پرخاش حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوا تو عداوت کے باعث اپنے بیٹوں سے کہہ کر آپ کی صاحبزادیوں کو طلاق دلوادی۔ سو وہ دونوں اوّل سال ہجرت ہی میں مدینہ منورہ آ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ غزوۂ بدر میں جو پہلے ہی سال ہجرت میں واقع ہوا ہے، ایک صاحبزادی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اور انہیں کی بیماری کے باعث حضرت عثمان کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں رہنے کی اجازت دی تھی مگر تاریخ دانی اور راست بیانی مولوی صاحب پر ختم ہے جو چاہیں فرمادیں۔

ذوالنورین کے فضائل اور واقعہ شہادت کی تفصیل

باقی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے باب میں جو کچھ مولوی صاحب نے لکھ کر اپنی عاقبت خراب کی ہے اس کا جواب ہم سے نہیں ہوسکتا، ہم کس کو کہیں؟ ہمیں حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما دونوں بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں۔ بجز اس کے کہ یوں کہیں کہ مولوی صاحب کو خدا سمجھے اور کیا کہیں؟ اور یہ جو ارشاد ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عثمان رضی اللہ عنہ نے بدعتیں کیں۔ اس کا جواب تو جب لکھا جاتا جب ان کو لکھتے مع ہذا آیت ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمنوا'' اور اس کے مابعد کی آیات کے ترجموں میں بزرگی اصحاب ثلاثہ بالخصوص اور باقی اصحاب بالعموم مذکور ہولی ہے اس لیے

اس گوزشتر پر نکتہ گیری مناسب نہیں اور باقی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نسبت "اُقْتُلُوا نَعْثَلاً یا لَعَنَ اللّٰهُ نَعْثَلاً یا اُقْتُلُوا حَرّاقَ الْمَصَاحِفِ" کہنا یہ سب ابن قتیبہ اور ابن اعثم کوفی سمساطی کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں اور یہ جماعت کی جماعت کذاب مشہور ہیں اور شیعہ غالی ہیں ان کے کہنے کو سنیوں کی طرف منسوب کرنا اسی مثل مشہور کا مصداق بننا ہے۔ "پادے آپ لگا دے اوروں کو" مولوی صاحب کو شرم نہیں آتی کہ ان افسانہ ہائے دروغ کو سنیوں کی کتابوں کی طرف منسوب کر کے ایک دوسرا جھوٹ اپنی گردن پر رکھتے ہیں۔

عمار علی کی فنون عربیہ میں مہارت

خیر جو صاحب کہ ان کتب پر عبور رکھتے ہیں وہ تو حقیقت الامر کو آپ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے ان کے اطمینان کے لیے اتنی بات بہت ہے کہ "اُقْتُلُوْ" جو جمع ہے اس کے ترجمہ میں تو قتل کر، جو واحد کا ترجمہ ہے، رقم فرماتے ہیں چنانچہ ملاحظہ نقل خط مولوی صاحب سے معلوم ہو جائے گا، اس میں تو خیر یہ بھی احتمال ہے کہ کرو کی واؤ بہانہ، سہو مولوی صاحب کے قلم سے رہ گئی ہو مگر اس میں تو سہو کی بھی گنجائش نہیں کہ "لَعَنَ اللّٰهُ" کا ترجمہ لعنت کرو، زیب رقم ہے کجا ماضی کجا معنی امر؟ بایں ہمہ لفظ اللہ کے ترجمہ میں ضمیر واحد غائب کے معنی واحد حاضر کے کیے، نہ معلوم یہ کون سے محاورہ کے موافق مولوی صاحب نے ترجمہ کیا ہے؟ ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ کسی طفل میزان خوان کو مصدر کے معنی بتلا دیجئے تو اگر اس میں پایہ فہم ہوگا تو وہ صحیح صحیح "اُقْتُلُوْ اور لَعَنَ" کے معنی بتلا سکتا ہے مگر جناب مولوی صاحب اس تحریر پر کہ مقتدائے شیعہ اور امام امامیہ اسی سبب سے ہو گئے ہیں، ہنوز جمع اور واحد اور ماضی اور امر کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جاتا کہ یا تو حضور کو میزان تک کا سلیقہ نہیں اور یہ عمامہ بندی اور کرتہ پوشی اور دعوائے علم و امامت فقط اتنی بات پر ہے کہ دو چار باتیں کہیں سے سن بھاگے ہیں اور بوجہ جعلسازی عوام کی نظر بندی کر کے روٹیاں مروڑتے پھرتے ہیں یا قدر قلیل مایۂ علم تو ہے پر خداوند کریم نے موافق وعدہ "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" مولوی صاحب کو بوجہ شامت بداعتقادی اور بدگوئی مقربان الٰہی صحابہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین اظہار بطلان مذہب مولوی صاحب کے لیے اتنی بھی تو ہدایت نہیں کرتا کہ ترجمہ ہی ٹھیک کر لیں۔

بہر حال اس سلیقہ اور اس استعداد پر ایسے ایسے مضامین عالی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں اور اہل سنت سے کہ ان کا طریقہ ہو بہو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس میں ہرگز گنجائش حرف گیری نہیں اُلجھنے کو موجود ہیں اور بایں ہمہ ایسی ایسی کتب کا حوالہ دیتے ہیں کہ بجز ادیب کامل ان کا

مطلب صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ اس استعداد کو دیکھ کر تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اگر بالفرض کچھ قریب نہیں تب بھی غلطیٔ فہم سے تو مولوی صاحب کی باتیں خالی نہ ہوں گی مگر ایک توجیہ ہو سکتی ہے یعنی یوں کہیے کہ مولوی صاحب بھی سچ فرماتے ہیں، بیشک اہل سنت کی معتبر کتابوں میں ان روایات کو لکھ کر یوں لکھ دیا ہے کہ یہ روایات موضوع اور افترا ہیں۔ شیعوں کی گھڑی ہوئی ہیں وہاں کچھ اور مطلب تھا، مولوی صاحب کمال فطانت سے اپنا مطلب سمجھ گئے۔

سو اس قاعدہ پر اگر مولوی صاحب جمے رہیں تو ہمیں یقین ہے کہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے کتاب اللہ سے مال کے نہ دینے کے مضمون نکال کر مال داروں سے بہت سا کچھ کما لیں گے کیونکہ کلام اللہ میں "لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ مَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ" کے بعد "هُوَ خَیْرٌ لَّهُمْ" لکھا ہوا ہے تو کل کو مولوی صاحب فرمانے لگیں گے، زکوٰۃ کا نہ دینا بہتر ہے ادھر فرعون کے حق میں "رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" مذکور ہے تو فرعون کو رب اعلیٰ بتائیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس مولوی صاحب کا یوں رقم فرمانا کہ استیعاب میں لکھا ہے یہاں تک بدعتیں کیں کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنگ ہو کر اسے قتل کیا سراسر دروغ اور بہتان صاف ہے، اتنی بات تو عوام اور نادان بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت میں سے کوئی شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نسبت حرف گیر نہیں، دل وجان سے ہر کوئی اُن کا معتقد خالص ہے اور مبتدع اور اہل بدعت کو اہل سنت سراسر گمراہ سمجھتے ہیں اور کلی مخالفت ان سے رکھتے ہیں اور کیونکر مخالفت نہ رکھیں بدعت تو خلاف سنت ہی کو کہتے ہیں، سو اگر ایسی معتبر کتابوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نسبت مبتدع ہونا مذکور ہوتا تو اہل سنت میں سے ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا چہ جائیکہ یہ اعتقاد۔

یہ سب مولوی عمار علی صاحب کی جعلسازی ہے مگر موافق نقل مشہور "حق بر زبان جاری شود" مولوی صاحب بلکہ پیشوایان مولوی صاحب اس جھوٹ میں بھی بے ساختہ حق کہہ گزرے، اتنا تو معلوم ہوا کہ اہل بدعت قابل قتل ہیں، سو اہل سنت کو سمجھنا چاہیے کہ وہ کس درجہ کو مقبول ہوں گے اور جب اہل سنت مقبول ہوئے تو لاجرم شیعی مردود اور داخل زمرۂ اہل بدعت اور قابل قتل ہوں گے۔ القصہ اگر آدمی فہمیدہ ہو اور مولوی صاحب کی ان فریب بازیوں کو دیکھے تو بلا تامل دجال نہیں تو کوچک ابدال دجال سمجھے، اللہ اللہ ایسے فریب باز ہم نے بھی نہ دیکھے تھے نہ سنے تھے، اپنی کتابوں کی روایات کو جو حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم کے بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے پر دلالت کرتی ہیں، چھپا کر اگر جھوٹ بول دیا تو بظاہر یہ احتمال تھا کہ اہل سنت کو شیعوں کی روایات کی کیا خبر ہوگی، پر اس بے حیائی کو دیکھنا کہ اہل سنت کے سامنے اہل سنت ہی کی کتابوں کے حوالے سے جھوٹ بولتے ہیں۔ "دروغ گویم بر روئے تو"

ذی النورین کے بچاؤ کیلئے صحابہ اور اہل بیت کی جانکاہی

خیر مولوی صاحب کو تو اس شرمانے سے کب شرم آتی ہے، حیا تو حیا والوں ہی کو آتی ہے اس لیے لازم یوں ہے کہ صحابہ کا اور اہل بیت کا بدل و جان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بچانے کی تدبیروں میں معروف رہنا اور متمنی اجازت حضرت عثمان در باب قتال اہل ہوا ہونا روایات صحیحہ اور تواریخ طرفین سے ثابت کیجئے تا کہ مسلمانان سادہ لوح مولوی عمار علی صاحب کی ان ابلہ فریبیوں سے فریب میں نہ آ جائیں اور شاید مولوی صاحب کی بھی اس خواب غفلت سے آنکھ کھل جائے اور اس نشۂ ضلالت سے چونک اُٹھیں۔ بغور سنئے کہ جو کچھ مولوی صاحب نے رقم فرمایا ہے محض افترا اور سراسر بہتان ہے، لڑکے اور دیوانے بھی ہوں تو سمجھ جائیں کہ یہ فقط مولوی صاحب کی شرارت ہے اس لیے کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اور حضرت عائشہ اور امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص جو حضرت امیر سے لڑتے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص ہی کے لیے لڑتے تھے چونکہ قاتلان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حضرت امیر کے ساتھ ہو لیے تھے اور حضرت بنا چاری انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ وہ بسبب کثرت اور شورہ پشتی کے کسی سے دبتے نہ تھے اور بجائے خود یوں سمجھتے تھے کہ جب ہم نے بنی بنائی خلافت کو درہم برہم کر دیا تو اوروں کی کیا ہستی ہے؟ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر وغیرہم کو تو اس قسم کے توہمات تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دربارۂ قصاص مداہنت کرتے ہیں اور امیر معاویہ اور ان کے ذیل کے لوگ یوں سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اشاروں سے قتل ہوئے ہیں۔

خیر تواریخ طرفین شیعہ و سنی (کی) حاضر ہیں، صحابہ نے بلواء قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے دبانے میں اپنی طرف سے کچھ قصور نہیں کیا، پر مقدر یوں ہی تھا تا مقدور کلمہ کلام سے بلوائیوں کو سمجھایا جب کچھ ان کی سمجھ میں نہ آئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قتل قتال کی اجازت چاہی پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی قتل قتال اور جنگ وجدال کے روادار نہ ہوئے بلکہ کمال تاکید سے مانع آئے لاچار ہو کے صحابہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ بایں ہمہ پانی کے پہنچانے اور بلوائیوں کے ہٹانے میں آخر تک تدبیروں میں مشغول رہے۔ حضرت زید بن ثابت انصار تمام انصاریوں کو لے کر آئے اور جوانان انصار نے کہا اگر فرماؤ تو دوبارہ انصار خدا ہنیں؟

عبداللہ بن عمر تمام مہاجرین کے ساتھ آئے اور یہ کہا جنہوں نے تم پر بلوا کر رکھا ہے وہی لوگ ہیں جو ہماری ہی تلواروں سے مسلمان ہوئے ہیں اور اب تک ان صدموں کے ڈر سے پاجامہ میں ہگے

دیتے ہیں۔ یہ ساری بڑھ بڑھ کر باتیں کرنی ان کی اس سبب سے ہیں کہ کلمہ گو ہیں اور تم کلمہ گوئی کا لحاظ کرتے ہو، اگر فرماؤ تو انہیں ان کی حقیقت دکھلا دیں اور وہ بھولے دن پھر انہیں یاد دلا دیں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا، یہی بات مت کہو، ایک میری جان کے لیے اتنا ہنگامہ اسلام میں برپا مت کرو مگر بایں ہمہ حضرات حسنین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، ابوہریرہ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ اور سوا ان کے اور صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے ساتھ ان کے گھر میں تھے اور جب بلوائی ہجوم کرتے تھے تو یہ سب صاحب پتھر لاٹھی مار مار ہٹاتے تھے اور دروازہ بند کر دیتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام جو ایک فوج کی فوج تھے، یہاں تک کہ اگر آپ ان کو حکم دے دیتے تو اہل بلوا کو حقیقت معلوم ہو جاتی، ہتھیار اور لڑائی کا سامان لے کر حاضر ہوئے اور کمال زاری اور بے قراری سے کہا کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ خراسان سے افریقہ تک کوئی ہماری تلوار کے سامنے نہیں ٹھہرا، اگر حکم ہو تو ان لوگوں کا گھمنڈ نکال دیں اور تماشا دکھلا دیں کیونکہ سمجھانے سے تو ان کی اصلاح نہیں ہوتی، انہوں نے دیکھا کہ کلمہ گوئی کے باعث ہمیں کوئی چھیڑ نہیں سکتا، اس لیے روبراہ نہیں ہوتے اور تمہارے اور سوا تمہارے اور بڑے بڑے صحابہ کی بات نہیں سنتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہی فرمائے جاتے تھے کہ اگر میری خوشی منظور ہے اور میرا حق نمک ادا کرنا چاہتے ہو تو ہتھیار الگ کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ رہو اور جو ہتھیار الگ کر دے گا اسے میں نے آزاد کیا، واللہ خونریزی خلائق سے پہلے اگر میں مقتول ہو جاؤں تو یہ مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے، اس بات سے کہ خونریزی کے بعد مارا جاؤں، یعنی میری شہادت تو لکھی ہوئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرما دیا تھا تم لڑو یا نہ لڑو میں مقتول ہوں گا۔ سو کیا فائدہ کہ لوگ بھی مارے جائیں اور مطلب بھی حاصل نہ ہو۔

اور تواریخ فریقین میں موجود ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں اور حضرت جعفر کی اولاد کو اور اپنے چیلے قنبر کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر متعین کر رکھا تھا اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے بھی اپنے بیٹوں کو دروازہ پر بٹھا دیا تھا تا کہ بلوائیوں کو دھکے دیتے رہیں۔ سو جب اہل بلوا ہجوم کر کے آتے تھے یہ سب صاحب لاٹھی لکڑی سے جو ہاتھ میں آجاتا تھا، لڑتے تھے یہاں تک کہ حضرت سبط اکبر امام ہمام امام حسن رضی اللہ عنہ خون آلودہ ہو گئے۔ محمد بن طلحہ اور قنبر کے سر پر زخم لگا، جب دروازہ کی راہ سے اہل بلوا کو آنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور اندر گھسنے کی کوئی تدبیر نہ بنی تو پیچھے سے بعض انصاریوں کے گھر میں نقب دے کر اندر گھس گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

ذوالنورین کے لیے امام کی مدافعت

نہج البلاغت جواصح الکتب شیعہ ہے اس بات کی گواہ ہے۔ حضرت امیر سے اس میں روایت ہے کہ انہوں نے یہ فرمایا "وَاللّٰہِ لَقَدْ دَفَعْتُ عَنْہُ" یعنی حضرت علی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ واللہ میں نے تو حضرت عثمان سے اس بلا اور اس بلوا کو بہت ہی ہٹایا، اس کی شرح میں تمام شراح نہج البلاغت نے روایت کیا ہے کہ حضرت امیر بلوا کے دنوں میں جب حضرت عثمان کے گھر میں آتے تھے تو بلوائیوں کو چابک مار مار دفع کرتے تھے اور برا بھلا کہتے تھے اور لعنت کرتے تھے۔ ابن عثم کوفی یعنی شیعوں کا مؤرخ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ اصحاب کرام کا دشمن جان ہے وہی اپنی فتوح میں نقل کرتا ہے کہ حضرت امیر نے فرزند ارجمند سبط اکبر امام حسن رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور کہو میرے والد کا دل تمہاری ہی طرف لگا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں میں سنتا ہوں کہ یہ لوگ تمہارے مقدمہ میں کچھ بہت شور وغل کر رہے ہیں اور کسی کی نصیحت نہیں سنتے اور تمہارے قتل کا مصمم ارادہ کیے بیٹھے ہیں اس لیے تمہاری طرف سے مجھے بہت اندیشہ ہو رہا ہے اگر فرماؤ تو میں بھی آ کر تمہارا مددگار رہوں اور ان لوگوں سے لڑوں اور جس طرح بن پڑے ان لوگوں کو تمہارے دروازہ سے ہٹاؤں۔ حضرت امام حسن حسب ارشاد والد ماجد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہ پیام پہنچایا، انہوں نے فرمایا مجھے یہ منظور نہیں کہ آپ تکلیف اُٹھائیں اور ان لوگوں سے لڑیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے، یوں فرماتے ہیں اگر ان لوگوں سے لڑو تو لڑو فتح ہوگی اور نہ لڑو تو روزہ ہمارے پاس کھولیو۔ سو اب یہی تمنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر روزہ کھولئے۔ حضرت حسن چپ ہو کر چلے آئے۔

حضرت امام کا کوئی معاملہ ظاہرداری نہ تھا

اب سنئے اہل ایمان کا تو یہ کام نہیں کہ حضرت امیر کے تمام معاملات کو نفاق اور ظاہرداری پر محمول کریں۔ شیعہ اگر بحکم "اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ" حضرت امیر اور صاحبزادوں کے ان معاملات اور ان تمام گفتگوؤں کو منافقانہ سمجھیں تو انہیں اہل ایمان ہی کون سمجھتا ہے۔ معاذ اللہ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور نفاق "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی" اور اگر بالفرض محال نفاق ہی تھا تو اسی وقت ہوگا، اپنی خلافت میں کوفہ میں جب خطبہ میں اس بات پر قسم کھائی کہ میں نے قاتلان عثمان کو بہت ہٹایا تو اس وقت کیا دباؤ تھا جب تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شہید

ہو لیے تھے اور قطع نظر شجاعت کے کار فرمائے۔ خلافت بھی آپ ہی تھے، مرے ہوئے سے تو نامرد بھی نہیں ڈرتے اور بے سروسامان کو ہراس نہیں ہوتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس شجاعت اور اس شوکت پر کیا ہوا کہ اب تک بھی عثمان کا خوف نہ گیا، اگر بزعم شیعہ اس میں کچھ نفاق ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد بآواز بلند یوں کیوں فرماتے؟

دفاعِ عثمان کے لیے دیگر صحابہ کا رویہ

ادھر حضرت عبداللہ بن سلام ہر صبح کو بلوائیوں کے پاس جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل مت کرو ورنہ ان کے قتل کے بعد بہت سے فتنے فساد اُٹھیں گے۔" اور حضرت حذیفہ بن الیمان جن کو منافقین کا علم تھا اور حضرت امیر نے بھی ان کے حق میں اس علم کی گواہی دی۔ چنانچہ شیعوں کی کتابوں میں موجود ہے بلوائیوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے بتاکید منع کرتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ ان کا مارا جانا بہت فتنوں کا باعث ہو جائے گا، اب کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ یہ لوگ جن کا مذکور ہوا صحابہ نہیں تو اور کون ہیں؟ پھر ان میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تو وہ ہیں کہ وہ اکیلے لاکھوں کے برابر ہیں۔ خصوصاً شیعوں کے نزدیک، سو اگر بالفرض والتقدیر صحابہ ہی نے ان کو قتل کیا ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تو مانع ہی تھے، پھر مولوی صاحب نے کس خوبی پر ہجو کے موقع میں کہہ دیا کہ صحابہ رسول نے تنگ ہو کر اُسے قتل کیا مگر میں ہی چوکا مولوی عمار علی صاحب بلکہ تمام شیعہ حضرت امیر اور بزرگانِ مسطور الاسم کو صحابہ نہیں سمجھتے، یہ تو اوباش کوفہ اور بدمعاشان مصر اور منافقان اُمت کو صحابہ سمجھتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے لیے اکٹھے ہو کر آئے تھے۔ سو مولوی صاحب نے اپنے عندیہ کے موافق سچ ہی کہا ہے، زوف ہے اس عقل ناہنجار پر کہ اپنے مذہب کے پابند بھی تو نہیں، بہر حال یہ جو مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ صحابہ نے تنگ ہو کر قتل کیا سراسر بہتان اور دروغ صریح ہے، پر جسے نہ خدا کا ڈر ہو نہ خلق کی شرم وہ جو چاہے سو کرے مگر ہم تو اس بے حیائی اور اس جرأت پر غش ہیں کہ کس دلاوری سے فرماتے ہیں، اگر سند مطلوب ہو تو روانہ کر دی جاوے۔

ع...... چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بزدلی کا بہتان

اور یہ جو کچھ جناب مولوی صاحب حضرت عائشہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جنگ کے باب

میں رقم فرماتے ہیں کہ ان کی باہم بہتر جنگ نہیں ہوئی ہیں اور جہاد مال دُنیا کے واسطے نہیں ہوتا یہ بجا درست، مگر تعجب ہے کہ اس بات میں مولوی صاحب نے کچھ جھوٹ کیوں نہیں بولا، ہم جانیں یہ مثل سچی ہے "اَلْکَذُوْبُ قَدْ یَصْدُقْ"...... "یعنی جھوٹا کبھی سچ بھی بول دے ہے" لیکن تاہم بھی حق سے چشم پوشی کر ہی گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحابہ ثلاثہ سے جہاد نہ کرنے کو اس وجہ پر محمول کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس انصار اور مددگار کب تھے، کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ انصار اور مددگار کی ضرورت جہاد میں فقط اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ تن تنہا آدمی مجمع کثیر کے مقابلہ میں کیا کرے گا؟ سو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر بوجہ نہ ہونے انصار کے قبل مدینہ منورہ کو آنے کے جہاد نہ کیا تو بجائے خود تھا کہ آپ میں تن تنہا تاب مقابلہ کفار نہ تھی۔ حضرت امیر کو کیا عذر تھا جو انہوں نے تن تنہا جہاد نہ کیا دیکھو تو وہ خود اپنے حال میں کیا فرماتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام دُنیا پر بھاری تھے

نہج البلاغت میں جو اصح الکتب شیعہ ہے علامہ رضی نقل کرتے ہیں:

قَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِنِّیْ وَاللّٰہِ لَوْ لَقِیْتُھُمْ وَحِدًا وَھُمْ طِلَاعُ الْاَرْضِ کُلِّھَا مَابَالَیْتُ وَلَا اسْتَوْحَشْتُ وَاِنِّیْ مِنْ ضَلَالَتِھِمُ الَّتِیْ فِیْھَا وَالْھُدَی الَّذِیْ اَنَا عَلَیْہِ لَعَلٰی بَصِیْرَۃٍ مِنْ نَفْسِیْ وَیَقِیْنٍ مِنْ رَبِّیْ وَاِنِّیْ اِلٰی لِقَاءِ اللّٰہِ وَلُحُسْنِ ثَوَابِہٖ لَمُنْتَظِرٌ وَرَاجٍ.

یعنی فرمایا حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے کہ تحقیق قسم اللہ کی اگر میں ان سے تن تنہا ملوں اور وہ اس کثرت سے ہوں کہ تمام روئے زمین کو ڈھکے ہوئے ہوں تو میں کچھ پروانہ کروں اور نہ گھبراؤں اور مجھے ان کی گمراہی اور اپنی ہدایت (جانو) آنکھوں سے نظر آ رہی ہے اور خدا کی طرف سے اس کا یقین ہو گیا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے ملنے اور اس کے اچھے ثواب کا منتظر اور اُمیدوار ہوں۔ فقط"

جو شخص کہ تمام روئے زمین کے آدمیوں بلکہ اتنے آدمیوں سے بھی جو زمین کو ڈھک لیں تن تنہا نہ ڈرے اس کو انصار اور مددگار کی کیا حاجت؟ ہاں اماموں کی موت اپنے اختیار میں نہ ہوتی تو یوں بھی کہہ سکتے کہ نہ گھبرانے اور نہ پروا کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدمی مارا بھی نہ جائے۔ شاید اس سبب سے جہاد نہ کیا ہو، آپ نے سمجھا میں تن تنہا لڑوں گا تو فتح تو معلوم مارا ہی جاؤں گا پھر کیا حاصل؟ جہاد اعلاء دین کے لیے ہے جب وہ تو حاصل نہ ہوا اور فقط جان ہی جاتی رہے پھر جہاد کاہے کے لیے کیجئے؟ کچھ خدا کو فقط جان گنوانا تو مطلوب نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ شجاعت میں بے مثل اور اپنی موت پر قابو یافتہ تھے (بزعم شیعہ)

اور در صورت یہ کہ امام کا انتقال اس کے اختیار میں ہو۔ چنانچہ کلینی نے اس کو ثابت کیا اور تمام امامیہ اس پر متفق ہیں تو پھر تن تنہا جہاد میں وہ ترقی دین ہوتی کہ مجمع کی صورت میں ہرگز ممکن نہیں، مددگاروں کی وجہ سے اگر آدمی نہ مارا جائے تو کرشمے کی بات نہیں، ہاں تن تنہا ہو کر پھر تمام جہان جس کو نہ مار سکے اس سے زیادہ اور کیا معجزہ ہوگا۔ ہندو جو عجائب پرست ہیں اگر ایسا معجزہ کسی سے دیکھ لیں تو بیشک پکار اٹھیں "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" ایک دو دفعہ بھی اگر ایسی لڑائی لڑ لیتے تو بہت سے بہت تکلیف ہوتی تو اتنی ہی ہوتی کہ آپ زخمی ہی ہو جاتے یا بیہوش ہو جاتے لیکن عموماً یہ اعتقاد لوگوں کے دل میں بیٹھ جاتا کہ چیرتے تو نکلتا اور موافق مخالف سب حلقہ بگوش حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہو جاتے اور دین کی ایسی ترقی ہوتی کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کرات مرات کثیر کثیر انبوہ سے جہاد کرنے میں وہ ترقی نہ ہوئی تھی کیونکہ کفار غلبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بوجہ جمعیت سمجھ کر معتقد نہ ہوئے تھے اسی واسطے اپنے غلبہ کی بھی اُمید رکھتے تھے اور لڑنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اگر حضرت امیر تن تنہا لڑتے تو جو مطلب کہ حضرت امام ہمام امام مہدی کے آنے پر موقوف تھا وہ ابھی حاصل ہو جاتا اور اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ گزرا وہ ظہور میں نہ آتا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ لڑنا تو شے دیگر، حضرت امیر تو اصحاب ثلاثہ کے سامنے کبھی اتنا بھی نہ بولے جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوجہل اور اُمیہ بن خلف اور ابولہب اور ولید بن عقبہ وغیرہم کے سامنے بول لیے تھے، طرفہ تماشا ہے کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زور اور بل اور قوت اور شجاعت کے باب میں کوئی روایت نہ ہو اور وہ تو حق گوئی کی بدولت کفار نگونسار کے ہاتھ سے عالم تنہائی میں کیا کیا جفائیں اُٹھائیں، یہاں تک کہ علاوہ دشنام ہائے نافرجام اور دست درازی ہائے بے اندازہ کی نوبت یہ پہنچی کہ گھر بار سب کو الوداع کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوری زندگی خوف وذلت سے گزاری (بزعم شیعہ)

حضرت امیر کو ایک دفعہ بھی یہ نوبت نہ آئی کہ علی الاعلان حق گوئی اختیار کریں اور جفائیں اُٹھائیں یا مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے شرف ہجرت کو اضعاف مضاعف فرماتے بلکہ ہم پیالہ اور ہم نوالہ انہیں کے پیچھے نمازیں پڑھتے، عید جمعہ میں انہیں کے خطبہ سنتے، انہیں سے رشتہ پیوند

قرابت پیدا کرتے، تمام عمریوں ہی گزاری اور بھی کچھ نہیں ہو سکے تھا تو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقیہ نہ کیا تھا آپ بھی نہ کرتے۔ القصہ حضرت امیر کے جہاد نہ کرنے کو اس بات پر محمول کرنا کہ آپ کے ساتھ انصار اور مددگار نہ تھے کمال سفاہت ہے بلکہ در پردہ حضرت امیر کی تکذیب کرنی ہے تو حضرت امیر تو یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے مقابلہ میں سارا جہان بھی آ جائے تو کچھ اندیشہ نہیں اور پھر بوجہ موت کے اختیاری ہونے کے تنہائی کی صورت میں اور اُمید بہبودی تھی اور مولوی صاحب یوں ارشاد فرمائیں کہ حضرت امیر انصار کے محتاج تھے، مع ہذا اور کتابوں کو تو پلٹ کر دیکھیں، انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بزعم شیعہ سب انصار و مددگار حضرت امیر تھے، اولاد انصار آپ کی مددگار رہی، آپ کے ایام خلافت میں اکثر اولاد انصار آپ کے ساتھ تھی، پھر کیا وجہ کہ آپ نے اصحاب ثلاثہ کے زمانہ میں جہاد نہ کیا؟ انصاف یوں ہے کہ حضرت امیر بہ دل معین و مددگار خلفائے ثلثہ رہے، خصوصاً شیخین کہ آپ نے ان کی تعریفیں اپنی خلافت میں بھی کی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ زمانہ تقیہ کا نہ تھا، باعتقاد جمہور امامیہ اس زمانہ میں آپ پر تقیہ حرام تھا۔ چنانچہ پہلے مرقوم ہو چکا، اور نیز اس زمانہ میں ان کا انتقال ہو چکا تھا مرے ہوئے سے تو نامردوں کو بھی خوف نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ حضرت علی؟ پھر ان سب وقائع کے ملاحظہ کے بعد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور کمالات اور قوت ایمانی کو خیال کر کے اہل فہم کو تو بجز اس کے خیال میں نہیں آ سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سکوت فقط اسی وجہ سے تھا کہ ان کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ باوجود بے مثل شجاعت کے جگر گوشۂ رسول کو فدک نہ دلا سکے

باقی جناب مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ "جہاد مال دُنیا کے لیے ہوتا ہے۔" ہر چند درست ہے لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مظلوم کی نصرت دین میں سے ہے یا دُنیا میں سے؟ اور مظلوم بھی کون جگر گوشۂ جناب سید الاولین و آخرین، اگر ایسے مظلوموں کی نصرت داخل دین ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باوجود اتنی استطاعت کے کہ اکیلے سارے جہان کا مقابلہ کر سکتے تھے اور اپنی جان کا کچھ زیان بھی نہ تھا، مع ہذا انصار ان کے انصار تھے کیوں حضرت زہرا کی مدد نہ کی؟ اگر حضرت زہرا معاف کر دیتی جب بھی ایک بات تھی حسب الارشاد مولوی صاحب موصوف "تادم واپسیں ابوبکر صدیق کا ظلم ان کے پیش نظر تھا" اور اگر یوں کہیئے کہ نصرت مظلوم کار دُنیاوی ہے تو دُنیا کی خوبی اور بزرگی تو سب ہی جانتے ہیں۔ اس صورت میں نصرت مظلوم اگر ممنوع بھی نہ ہو گی تو موجب ثواب بھی نہ ہو گی، واجب تو درکنار، پھر بایں ہمہ ترک نصرت حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جو سنی ہائے شیعہ لبریز شکایت

صحابہ اور اولاد صحابہ سے محض بیجا ہوا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ مولوی صاحب نصرت مظلوم کو منجملہ دین بلکہ واجب ہی قرار دیں گے کیوں اوّل تو کلام اللہ اور احادیث طرفین اس مضمون سے مشحون ہیں، دوسرے صحابہ کے مطاعن کی کوئی بات چاہیے۔ مولوی صاحب تو اس پر غش ہیں بلا سے حضرت امیر پر بھی حرف آ جائے مگر ہمیں خدا کی ذات سے یقین ہے کہ ہم نے جو کچھ تقیہ کے باب میں اوپر لکھا ہے اگر مولوی صاحب بغور دیکھیں تو زبان سے بھی نہ کہیں گے تو دل سے تو بیشک اس بات کے معتقد ہو جائیں گے کہ حضرت امیر کا اصحاب ثلاثہ سے بیعت کرنا اور فدک کے نہ دینے پر سکوت کرنا سب بوجہ حقانیت اصحاب ثلثہ تھا نہ بوجہ تقیہ اور آگے جو کچھ آتا ہے ان شاء اللہ وہ تقریر ماسبق کی اور تاکید کرے گا۔

اس مجموعہ کو دیکھ کر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت امیر کی وہ لوگ زیادہ قدر کرتے ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ آپ کسی سے ہارے ہوئے نہ تھے، اور بسبب ضعف اور ناتوانی کے خلفاء کے ساتھ موافقت نہ رکھتے تھے بلکہ محض خدا واسطے یا وہ لوگ جو یوں کہتے ہیں کہ آپ ذلیل وخوار بے سروسامان ناتوان ناچاری کے باعث اطاعت کرتے تھے اور آپ کے دل میں کچھ تھا اور زبان پر کچھ تھا، تمام عمر اخفاءِ حق اور کتمان دین میں مصروف رہے اور باوجود یہ کہ آیہ "وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (جس کا یہ مضمون ہے کہ خلط ملط مت کرو حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو جان بوجھ کر) آپ کو یاد تھی، پھر بھی حضرت اصحاب کے ساتھ ایسے ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہوئے کہ بظاہر حق و باطل کی تمیز دشوار ہوگئی۔ چنانچہ گروہِ اعظم اہل سنت اسی دھوکے میں اصحاب ثلثہ کی حد سے زیادہ توقیر کرنے لگے اور معاملہ سب برعکس ہو گیا، دین اصلی بہت ضعیف اور مخفی رہ گیا۔

حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کی بحث

تیسرا مطلب حضور کے رقیمہ میں یہ ہے "کہ حضرت اُمِ کلثوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صلب اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے شکم سے تھیں، ان کا نکاح حضرت محمد بن جعفر طیار سے ہوا تھا۔" ہر چند یہ جواب سوال سائل پر بظاہر منطبق ہے لیکن حقیقت میں دیکھئے کہ یہ جواب سوال سائل سے ایسی ہی نسبت رکھتا ہے جیسے کہ کسی گاہک کے اس سوال کے ساتھ کہ لالہ تیل بھی ہے لالہ کا یہ جواب ہاں میاں آلو بھی ہے، اتنا تو مولوی صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ سائل کی غرض اس بات کے پوچھنے سے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کا نکاح کس کس سے ہوا ہے؟ یہی ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت اُمِ کلثوم دختر مطہرہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ اور یہ بھی احتمال ہے کہ

مولوی صاحب نہ سمجھے ہوں اس لیے کہ بات بھی تو بہت مشکل ہے۔ بہرحال جناب مولوی صاحب نے اس جواب میں طرفہ چالاکی کی ہے کہ جواب کا جواب دے دیا اور بات کی بات رکھ لی مگر نامعلوم اس جواب میں پہلی چال کیوں بھول گئے یا اور کوئی عمدہ مصلحت نظر آئی یہ تو حضرت اُم کلثوم کی مولوی صاحب کی طرف شکایت ہی رہ گئی کہ ان کی خالاؤں کو تو مولوی صاحب نے جفاء قطع نسب سے مستحق اجر عظیم کیا، انہوں نے کیا قصور کیا تھا جو مولوی صاحب نے اس عنایت سے محروم رکھا؟

کیا وہ اہل بیت میں سے نہ تھی جو اس جفا سے دریغ کیا مگر مولوی صاحب کی طرف سے میں جواب دیئے دیتا ہوں "اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمِ"...... "یعنی بزرگی پہلوں ہی کے لیے ہے۔" اس مثل کے خلاف کیونکر کر دیں، شاید ملازمان مولوی صاحب کو یہ گمان ہوا ہو کہ حضرت اُم کلثوم بنت سیدۃ النساء کی تزویج کا قصہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کے نکاح کے جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا تھا ایک جدید امر ہے اور تازہ بات، مبادا اس کا کوئی جاننے والا ہو اور قلعی کھل جائے مگر میں ذمہ کش ہوں، اہل سنت ان دونوں قصوں کو یکساں پرانا سمجھتے ہیں اور اس فرق کو فرق نہیں سمجھتے۔ اب کے جناب مولوی صاحب اگر میر نادر علی صاحب کو یہ مضمون لکھ کر کہ حضرت اُم کلثوم حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی بیٹی ہی نہ تھیں اصلاح تحریر متقدم کر دیں اور اندیشہ بدظنی سنیاں ہو تو عذر بدا موجود ہے، آپ کچھ خدا سے تو زیادہ نہیں؟ جب خداوند کریم کو بایں ہمہ علم غیب بدا واقع ہوتا تو آپ تو آدمی ہی ہیں۔

القصہ مصلحت یوں ہے کہ اسماء بنت عمیس کی طرف منسوب کر دیجئے اور جھوٹ ہے تو بلا سے "چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست" جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کی نسبت میں تصرف کیا ہے تو اسی کے نسب میں بھی سہی۔ مع ہذا اور ابنائے روزگار فقط دُنیا کے لیے سینکڑوں جھوٹ بولتے ہیں آپ نے اگر دو جھوٹ حفظ دین کے لیے بول دیئے تو کیا غضب ہوا؟ بلکہ بنظر پاس ننگ و ناموس دین اور متابعت بزرگان اور آئمہ اطہار اُمید ثواب عظیم ہے کیوں کہ یہ بھی ایک قسم کا تقیہ ہے۔

عمار علی کی تلبیس

لیکن جناب مولوی صاحب کے لوازم رائے زنی اور مشورہ گوئی میں سے ہے کہ جملہ مراتب نفع ونقصان سے اطلاع کر دیجئے۔ اس لیے معروض ہے کہ بایں ہمہ منافع ایک اس میں نقصان بھی ہے کہ جناب باری تعالیٰ یوں بھی فرماتا ہے: "وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (یعنی حق باطل کو مت رُلاؤ اور نہ چھپاؤ حق کو جان بوجھ کر) دوسرے یوں بھی فرماتا ہے: "وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكْتُمْهَا فَاِنَّهُ اٰثِمٌ قَلْبُهُ"...... "یعنی نہ چھپاؤ گواہی اور جو چھپائے گواہی تو اس کا دل گنہگار ہے۔" ان دونوں آیات پر نظر کر لیجئے مگر مجھ ہی سے غلطی ہوئی آپ نے اب کون سی (حق و باطل کے رُلانے اور شہادت حق کے چھپانے میں) کمی کی ہے جو اس کا اندیشہ ہو، اس سے زیادہ اور کیا رُلانا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح کا نام ہی نہ لیا بلکہ اصل رلانا تو یہی ہے اگر صاف انکار کر دیتے اور کہہ دیتے کہ حضرت زہرا کے یا حضرت علی رضی اللہ عنہما کے کوئی بیٹی ہی نہ تھی تو یہ رُلانا نہ تھا اسے انکار کہتے ہیں اور عربی زبان میں اسے جحود کہتے ہیں اور یہ جو اکثر آتا ہے "وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَا" تو اسی مقام میں آتا ہے اور یہ انداز کہ جواب کا جواب ہو جائے اور پھر بات ہاتھ سے نہ جائے جیسے مولوی صاحب نے اس مقام میں کیا ہے تو یہ عین حق و باطل کا رلا دینا ہے۔ مع ہذا حق باطل کے خلط ملط کر دینے میں جو برائی ہے تو فقط اسی سبب سے ہے کہ دوسرا کوئی دھوکا نہ کھائے۔ درصورت یہ کہ اہل سنت جماعت نے شیعوں کی روایات سے یہ ثابت کر دیا ہو کہ حضرت اُم کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا تو کیا اندیشہ؟ وہ دھوکے کی بات ہی نہ رہی جس سے ڈرے اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو یہ دیکھئے آپ کے یہاں کی روایتیں اس باب میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ آپ اپنی عادتِ سلف دغا وفریب کو نہ چھوڑیئے۔

فاروق رضی اللہ عنہ سے اُم کلثوم کا نکاح حضرت عباس نے کیا تھا

قاضی نور اللہ صاحب شہید رابع حضرت عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال میں رقم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بہت محبت تھی اور ان کے حق میں یوں فرماتے تھے کہ عباس میرے باپ کی جگہ ہے اور سوائے اس کے بہت ہی کچھ ان کے فضائل لکھے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے کے موافق حضرت امیر سے حضرت اُم کلثوم کے نکاح کی خواستگاری کی۔ حضرت امیر نے اوّل بار انکار فرمایا، دوسری دفعہ سکوت فرمایا، بعد ازاں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود حضرت اُم کلثوم کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کر دیا۔ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بوجہ تقیہ منع نہ کر سکے، اس لیے چپکے ہو رہے یہ ہے قاضی صاحب کا بیان۔

بزعم شیعہ حضرت عباس اعراف میں ہوں گے

میں نے اپنے اعتقاد کے موافق حضرت عباس اور حضرت کے نام پر لفظ حضرت لگا دیا ہے

ورنہ قاضی صاحب سے اس تعظیم کی کسے اُمید ہے؟ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو ان کے نزدیک حضرت عمر ہیں وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں بھی اسی بیان کے پس وپیش میں یوں لکھتے ہیں بلکہ یہ تقریر بھی بطور دلیل ہی بیان کی ہے اور مطلب اصلی ان کا یہ ہے کہ وہ اعراف میں ہوں گے لیکن حق بات چھپی نہیں رہتی، عاقل خود جانتے ہیں کہ جو ایسے محبوب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں وہ اعراف میں کیوں کر رہیں گے؟ ان کے تو نیاز مند بھی اگر جنت میں چلے جائیں تو کچھ بعید نہیں، حیف صد حیف محبان حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تو یہ رُتبہ ہو کہ ان کے محبوں کو کوئی گناہ ضرر نہ کرے بلکہ گناہ تو گناہ کفر بھی ضرر نہ کرے۔

محبوب رسول اعراف میں اور یہودی ونصرانی جنت میں

چنانچہ رضی الدین لغوی نے زنیما بن اسحٰق نصرانی کے جنتی ہونے کا فقط چند بیتوں (شعر زنیما نصرانی)

عدیّ وتیم لا احاول ذکرهم بسوء ولکنی محب لها شم

وما یعترینی فی علیّ واهله اذا ذکروا فی الله لومة لائم

یقولون مابال النصاریٰ لحبّهم واهل النبی من اعرب واعاجم

فقلت لهم انّی لاحسب حبهم سری فی قلوب الخلق حتی البهائم

کی تصنیف کے باعث جن کے مضمون سے محبت حضرت علی رضی اللہ عنہ ٹپکتی ہے حکم کر دیا ہے حالانکہ انہیں ابیات سے اس کا نصرانی ہونا ثابت ہے اور ایسے ہی ابن فضلون (لا بن فضلون)

هب لی من المعیشة سولی واعف عنی بحق ال الرسول

واسقنی شربة بکف علیّ سیّد الاولیاء بعل بتول

یہودی کو سب علماء (اس فرقہ کے) بزرگ سمجھتے ہیں اس کا باعث بھی یہی دو تین بیتیں ہیں۔ القصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تو یہ رُتبہ کہ ان کے محب بھی اگر چہ کافر ہی کیوں نہ ہوں جنت میں جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب بھی جنت میں نہ جانے پائیں، اعراف سے آگے قدم رکھنے کی اجازت نہ ہو اور پھر محبوب بھی کون؟ چچا جان اور وہ بھی مسلمان کیوں کہ اگر کافر ہوتے تو اعراف تک کی نوبت میسر کہاں آتی کیوں کہ کفار کے لیے تو سعیر تیار ہے، فرماتے ہیں: "اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا"...... "یعنی ہم نے کافروں کے لیے تیار کر رکھی ہیں زنجیریں اور طوق اور سعیر"...... دوسری آیت "وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ"...... "یعنی جو لوگ کافر ہوئے ان کا ٹھکانہ بجز جہنم کے اور کچھ نہیں۔"

بہر حال قاضی صاحب کی تحقیق کی خوبی دیکھنی چاہیے کہ کس دعویٰ کو کس دلیل سے ثابت کرتے ہیں، اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان کو بجائے پدر بزرگوار ہی سمجھتے تھے، اگر بالفرض اپنا جی نہیں بھی چاہتا تھا تب اس وجہ سے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا فرمانا اس قابل نہیں کہ نہ مانئے ان کا فرمانا قبول کر لیا نہ کہ تقیہ کی وجہ سے چپکے ہو رہے مگر حق گمراہ کرتا ہے تو اُلٹی ہی سمجھ میں آتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خاموشی رضامندی کی وجہ سے تھی

بہر حال اتنی بات ثابت ہے کہ حضرت اُم کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بالضرور ہوا ہے، باقی رہا عذر تقیہ، سو اہل عقل آپ پہچانتے ہیں کہ یہ خیال خام اہل تشیع ہے ورنہ یہ روایت خود ہی اس کی تکذیب کرتی ہے کہ یہ سانحہ بوجہ تقیہ حضرت امیر پر گزرا ہو، کوئی مسلمان سمجھ سکتا ہے کہ اوّل تو حضرت امیر اور پھر تقیہ؟ یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی یوں کہے کہ شیر ہو کر گیدڑوں سے ڈرتا ہے اور پھر حضرت امیر کا تقیہ بھی ایسے قصہ میں کہ کوئی کافر بے دین اور بے غیرت اور بے تمکین بھی گوارا نہ کرے، مع ہذا یہ بھی منجملہ محالات عادی کے ہے کہ محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ ہی کے خاندان کے ساتھ ایسی جفا ظہور میں آئے، اس لیے کہ محبت نبوی تو میزانِ حق و باطل ہونی چاہیے جس طرف کو آپ کی محبت جھکی وہ حق ہو دوسری جانب باطل، الغرض محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاریب اہل حق میں سے ہوں گے پھر اہل حق سے کہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کی نواسی کو ایک کافر بے دین کے حوالے کر دے؟ مع ہذا ہم نے مانا کہ بوجہ تقیہ ہی حضرت امیر نے یہ نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا لیکن تاہم یہ عذر تقیہ بدتر از گناہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی کیوں ساتے ہو؟

فاروق اگر کافر ہوں تو امام علی بھی محفوظ نہیں

بالجملہ یہ نکتہ محفوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہیں اور کامل الایمان ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضرور باایمان ہیں کہ ان کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر (نعوذ باللہ) کافر ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ (نعوذ باللہ) پہلے ہیں، کافر نہیں، فاجر سہی کہ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا، اپنے آپ کیا تو کفر میں کچھ شک نہیں اور زبردستی کر دیا تو باوجود اس استطاعت کے اتنی بے عزتی (نعوذ باللہ) کہ ادنیٰ چمار بھی گوارا نہ کرے، حضرت علی رضی اللہ عنہ تو درکنار، الٰہی تو خوب جانتا ہے کہ میں اس عقیدہ سے بدل و

جان ناخوش ہوں اور حضرت زہرا کی صاحبزادی کا یہ قصہ بناچاری لکھتا ہوں کہ کسی طرح مولوی عمار علی صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بدظن نہ رہیں۔

تزویج اُم کلثوم کا کتب شیعہ سے ثبوت

اور خیر یہ بھی نہ سہی ہم بھی (ہوں گے تو) ان شاء اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کو اماموں کے اقوال سے جھوٹا کریں گے، کتب امامیہ میں صحیح صحیح روایتیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لائق فائق سمجھ کر اپنی صاحبزادی مطہرہ کا نکاح کیا نہ کہ جبراً کرھاً۔

سُئِلَ الْإِمَامُ محمّد بن علی الباقر عَنْ تَزْوِيْجِهَا فَقَال لَوْلَا اِنَّهٗ رَاٰهُ اَهْلاً لَمَا كَانَ يُزَوِّجُهَا اِيَاهُ وَكَانَتْ اَشْرَف نِسَاءِ الْعَالِمِيْن جَدُّهَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ وَاَخَوَاهَا الْحَسَنُ وَالْحُسَيْن عَلَيْهِمَا السّلام سيّد الشِبَاب اَهْلُ الْجَنَّةِ وَاَبُوْهَا عَلِيٌّ ذوالشَّرَفِ وَالْمَنقَبَةِ فِي الْاِسْلَامِ وَاُمُّهَا فَاطِمَة بنت مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَدَّتُهَا خَدِيْجَةُ بِنْت خُوَيْلَدَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا.

"حاصل اس کا یہ ہے کہ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے حضرت اُم کلثوم کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح کی وجہ پوچھی گئی، انہوں نے فرمایا کہ اگر حضرت علی حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت اُم کلثوم کے لائق نہ سمجھتے ہرگز اُن کا نکاح اُن سے نہ کرتے، وہ سارے جہان کی عورتوں سے زیادہ شرافت والی تھیں، اس لیے کہ نانا توان کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دو بھائی ان کے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو جوانانِ جنت کے سردار ہیں، باپ ان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اسلام میں شرف اور منقبت رکھتے ہیں اور اماں ان کی حضرت فاطمہ سیدۃ نساء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور نانی ان کی خدیجۃ الکبریٰ خویلد کی بیٹی رضی اللہ عنہا فقط"

شیعہ کو اہل بیت سے محبت نہیں، صحابہ سے عداوت ہے

اس روایت کو دیکھئے اور حضرت قاضی صاحب کی بناوٹ کو دیکھئے، زوف اس دعویٰ محبت پر کہ اس پردہ میں کیا کہتے ہیں، مشہور تو یوں کرتے ہیں کہ ہم کو اہل بیت سے محبت ہے اور اس لیے صحابہ سے عداوت ہے اور ہماری تشخیص میں یوں آتا ہے کہ آپ کو اصل صحابہ سے عداوت ہے اور اس سبب سے اہل بیت کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، سو اہل بیت کب اس طرح کھنچتے ہیں؟ بلکہ اس طرف سے کھنچتے ہیں اور کیونکر نہ کھنچیں۔ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ پر تقیہ حرام تھا چنانچہ بحث تقیہ

میں اس کی سند گزر چکی، ان کے فرمانے کے بعد بھی حضرت علی اور حسنین رضی اللہ عنہما کیا ان کے ساتھ بنی ہاشم کو بے غیرت اور بے حیا بتلائے جاتے ہیں اور طاہرہ مطہرہ جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" کی بشارت تطہیر میں داخل ہے، بدشنام وزنا (نعوذ باللہ) پیش آتے ہیں، خدا ان خبیثوں کو سمجھے، پھر اہل بیت کا ان پر غصہ نہ ہو تو اور کیا ہو جس کے دل میں ایمان ہے وہ ایسی واہیات کو سن کر کانپ اُٹھتے ہیں، پر خدا جانے ان تیرہ درونوں کو کیا ہوا کہ اپنے اس عیب قبیح کے ہنر بنانے کے لیے اماموں پر بھی بہتان باندھتے ہیں، یہ بے ایمان کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ پر بہتان باندھتے ہیں اور اپنا گناہ ان کے سر دھرتے ہیں اور اس نکاح کے عذر میں یہ ناپاک الفاظ نقل کرتے ہیں کہ جن کی نقل سے بھی جی ڈرتا ہے۔ ترجمہ تو درکنار وہ الفاظ یہ ہیں "وَهُوَ اَوَّلُ فَرْجٍ غُصِبَ مِنَّا" اے خداوند عالم الغیب تجھ پر روشن ہے کہ میں بدل وزبان اس خیال ناپاک سے بری ہوں اور یوں سمجھ کر کہ نقل کفر کفر نباشد بایں خیال نقل کرتا ہوں کہ شاید کوئی بے خبر ان دغابازوں کے دام میں پھنسا ہوا ان کے کہ کفریات سن کر شاید راہ راست پر آ جائے۔

حب حضرت علی رضی اللہ عنہ کفر کے باوجود اگر جنتی بناتی ہے تو قرابت بھی بنائیگی

افسوس ایک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عداوت کے سبب خاندان نبوی کو تو اتنا بٹہ لگا دیا پر یہ نہ ہو سکا کہ بتصدق اہل بیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کو شامل رحمت اور مغفرت خداوندی سمجھ لیتے، کیا یہ نسبت تزویج زینبا بن اسحق نصرانی اور ابن فضلون یہودی کے اشعار سے بھی گئی؟ حب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ تاثر ہے کہ ایمان کی بھی ضرورت نہیں حالانکہ کلام اللہ سے کفار کا ٹھکانہ جہنم ہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا، پھر کیا اتنی بھی تاثیر نہ ہوگی کہ اپنے واسطے داروں کو بخشوالیں، بہر حال علماء شیعہ حضرت اُم کلثوم کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح ہونے میں متفق ہیں پر بعضے بھولے چوکے حق بات بول جاتے ہیں اور معنی بری طرح ادا کرتے ہیں۔ سو ہمارا تو مذہب یہ ہے کہ "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِر" لیکن مولوی عمار علی صاحب سب سے بڑھتے رہے انہوں نے سمجھا حق کو حق کہئے تو مذہب کی خیر نہیں بلکہ مذہب تو مذہب، سنیوں سے ہزار مرتبہ زیادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معتقد ہونا پڑے گا کہ وہ اہل بیت میں داخل ہو جائیں گے اور تقیہ کی صورت میں بھی باوجود جھوٹ بولنے کے وہی خرابی کی خرابی برسر، بلکہ اس سے زیادہ کیونکہ بطفیل اہل بیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ناحق میں اتنی خرابی نہیں جتنا بطفیل عمر اہل بیت کے نہ ماننے میں خرابی ہے۔ خصوصاً حضرت امیر کے اور در صورت

تقیہ ظاہر ہے کہ کمال بے غیرتی اور بزدلی اور بے حیائی اور دین کی سستی اور حدود اور احکام میں مداہنت اور مداہنت بھی اس قدر لازم آتی ہے، سو مولوی صاحب نے ہمارے نزدیک بہت اچھا سمجھا کیونکہ جب جھوٹ بولنا ہی ٹھہرا تو معقول ہی کیوں نہ بولئے گو کچھ زیادہ ہی سہی۔

چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست

چونکہ مولوی صاحب کے اس جعل سے فی الجملہ ہوشیاری ٹپکتی ہے تو عجب نہیں کہ اگر سچ کی بات کہی جائے تو ان کے دل میں لگ جائے اور شاید اس سبب سر دست نہیں تو رفتہ رفتہ حق کو حق سمجھ جائیں، ہمیں بھی لازم پڑا کہ کوئی اور روایت بھی بیان کریں کہ اس میں ایک تو مولوی صاحب کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر غیظ و غضب کم ہو جائے گا، دوسرے کثرت روایات سے شرما کو شادان و فرحان نہیں تو (ملتے ہی) زبان سے شاید مان جائیں وہ روایت یہ ہے:

رَوَی ابْنُ اَبِی الْحَدِیْد شَارِحُ نَھْجِ الْبَلاَ غَةِ فِیْ قِصَّةِ تَزْوِیْجِ اُمِّ کُلْثُوْم فَجَاءَ عُمَر اِلٰی مَجْلِسِ الْمُھَاجِرِیْنَ بِالرَّوْضَةِ وَقَالَ رَفِّئُوْنِی رَفِّئُوْنِیْ قَالُوْا بِمَا ذَا یَا اَمِیْرَ الْمومِنِیْنَ قَالَ تَزَوَّجْتُ اُمَّ کُلْثُوْم بِنْتَ عَلِیِّ بن ابی طالب رَضِی اللّٰہ عَنْہُ۔

”حاصل یہ ہے کہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغت حضرت اُم کلثوم کے نکاح کے قصہ میں بیان کرتا ہے کہ جس جگہ مہاجرین روضہ میں بیٹھے ہوئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور یہ فرمایا کہ مجھے مبارکباد دو، مجھے مبارک باد دو، انہوں نے کہا یا امیر المومنین! کاہے کی مبارک باد؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت اُم کلثوم علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کیا ہے۔ فقط“

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس نکاح سے بڑا افتخار تھا، اہل انصاف کے نزدیک تو یہی بات کفایت کرتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معتقد ہو جائیں کیونکہ بظاہر افتخار اسی وجہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت حاصل ہوگئی اور کوئی یوں نہ سمجھے، لو ہم کون سے گلے پر چھری رکھے ہوئے ہیں۔

حضرت اُم کلثوم سے فاروق کی اولاد

اب مناسب یوں ہے کہ اس بات کا خاتمہ کیجئے پر بطور تنبیہ ایک اور امر معروض خدمت ہے، بعضے امامیوں نے سنیوں کے سامنے شرم اُتارنے کے لیے حضرت سارہ زوجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں سے اخذ کر کے یوں بات بنائی ہے کہ حضرت عمر حضرت اُم کلثوم پر قادر نہ ہوئے اور وجہ یہ ہوئی کہ ایک جن بیچ میں حائل ہو جاتا تھا۔ سو ہر چند اس جا جھوٹا ہونا اس روایت

نامعقول سے بھی نکلتا ہے کہ جو حضرت امام جعفر صادق کی طرف سے بنائی ہے مگر بایں ہمہ بتواتر ثابت ہے کہ حضرت اُم کلثوم کے شکم مبارک سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹا پیدا ہوا، ان کا نام زید رکھا، وہ جوان ہوئے، آخر کو بیس برس کی عمر میں بنی عدی کی باہم کی خانہ جنگی میں شہید ہوئے۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ" اوران کی والدہ بھی اسی روز بیماری میں انتقال کرگئی تھیں اورنو جنازوں کوایک دفعہ نکالا اور حضرت امام حسین اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جنازہ کی نماز پڑھ کر دفن کر دیا اور یہ بھی نہ سہی یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ مدت العمر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہیں۔ حضرت سارہ کسی ایسے کی نواسی نہ تھیں، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جب ان کوایک دم میں چھڑا دیا تو حضرت اُم کلثوم کی تو زیادہ ہی قدر کرنی چاہیے۔

باب مباحث فدک

الحمدللہ کہ مولوی عمار علی صاحب کی تمام افتراپردازیوں کے جواب سے فراغت پائی مگر جو کچھ انہوں نے در بارہ فدک زبان درازیاں اور افتراپردازیاں کی ہیں، اس کی مکافات میں حسب مثل مشہور جیسے کو تیسا اور جواب ترکی بہ ترکی، مناسب تو یوں تھا کہ ہم بھی کچھ نظم ونثر سے پیش آتے اور مولوی صاحب کی مہملات کے جواب میں مولوی صاحب کو بے نقط سناتے مگر چونکہ ایسی خرافات کا بکنا پاجیوں کا کام ہے ہم کو کیا زیبا ہے کہ ایسی نازیبا باتوں میں مولوی صاحب کے ہمصفیر ہوں اور اپنی زبان کو گندہ کریں اور اہل عقل اور ارباب حیاء سے شرمندہ ہوں؟ مع ہذا اصحاب ثلثہ کی اہانت کے انتقام میں مولوی عمار علی صاحب سے دست و گریباں ہونا تو ایسا ہی جیسا چاند سورج پر تھوکنے کی سزا میں کتے کے کوئی پتھر لگائے یا آسمان کی طرف تھوکنے کے عوض میں کسی کم عقل نانجار کے منہ میں کوئی پیشاب کی دھار لگائے، ظاہر ہے کہ اوّل تو چاند، سورج کو ان حرکات ناشائستہ سے کیا نقصان؟ بلکہ عقلاء کے نزدیک اور دلیل رفعت مکان ہے، دوئم کجا شمس و قمر کجا سگ و کم عقل سگ نژاد؟ مساوات ہوتو ایک بات بھی ہے ورنہ سگ اور سگ مزاجوں کی اتنے میں کچھ عزت نہیں جاتی ہاں اپنی اوقات البتہ فی الجملہ خراب جاتی ہے۔ سو ایسے ہی اصحاب ثلثہ کو اوّل تو مولوی عمار علی صاحب جیسوں کی اہانت یا برا کہنے سے کیا نقصان؟ بلکہ اُلٹا باعث رفعت شان ہے۔ چاند، سورج کی طرح وہ روشن ہوئے تو کتے ان پر بھونکے اور اوروں پر کیوں نہ بھونکے؟ دوئم کجا اصحاب ثلثہ کجا امثال مولوی عمار علی؟ جو ان کے برا کہنے کے عوض میں ان کو برا کہہ کے جی ٹھنڈا ہو اور دل کا بخار نکلے، یہاں تو یہی نسبت مذکور ہے۔ سو مولوی عمار علی صاحب جیسوں کے برا کہنے میں ان کی تو کچھ

عزت نہیں جاتی جو قصاص تبرا یا اہانت اصحاب ہو، ہاں اپنی اوقات خرافات میں صرف ہوگی۔ سو ہم کون سے مجتہد زمانی طوسی ثانی مولوی میرن صاحب کے چیلے چانٹوں میں سے ہیں جو عقل کی یہ شہادت در بارہ دشنام نہ سنیں "دشنام بمذہبے کہ طاعت باشد مذہب معلوم واہل مذہب معلوم" اور دشنام کو عبادت نہ سمجھ کر مولوی عمار علی صاحب کو گالیاں دے کر ان کی عزت بڑھائیں اور مولوی عمار علی صاحب یا امثال مولوی عمار علی صاحب کو چھوڑ کر کسی برے کو برا کہیں تو کس کو کہیں۔

حب اہل بیت وحب صحابہ ایمان کے دو پر ہیں

اہل بیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے حق میں چشم و چراغ ہیں، ہمارے نزدیک اعتقاد اصحاب اور حب اہل بیت دونوں کے دونوں ایمان کے لیے بمنزلہ دو پر کے ہیں، دونوں ہی سے کام چلے ہے، جیسے ایک پَر سے طائر بلند پرواز نصف پرواز تو کیا ایک بالشت بھی نہیں اُڑ سکتا، ایسے ہی ایمان بھی بے ان دو پَروں کے سہارے کے موجب فوز مقصود (جس کی طرف "اُولٰئِکَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ یا فَازَفَوْزًا عَظِیْمًا" وغیرہ میں اشارہ ہے) نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا ایمان ایسا ہی ایمان ہے، جس کا آیت "لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُھَا" میں بیان ہے ہاں اگر ہم قدم بقدم حضرات شیعہ ہوتے تو جیسے انہوں نے موافق مثل مشہور غیروں کی بدشگنی کے لیے اپنی ناک کاٹ لی، سنیوں کی ضد میں اصحاب کرام کو برا کہہ کر اپنے ایمان کا زیان کیا، ہم بھی شیعوں کی ضد میں نعوذ باللہ اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہہ کر مثل خوارج ونواصب اپنے ایمان کو خراب کرتے لیکن ہم کو تو پابندی عقل ونقل سے ناچاری ہے شیعہ تو نہیں کہ مثل شتر بے مہار پراگندہ رفتار جائیں۔

حب اہل بیت وحب صحابہ ایمان کی دو آنکھیں ہیں

راہ کی بات تو یہ ہے کہ ہم کو دونوں فریق بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں، کس کو چھوڑیں جس کو چھوڑیں اپنا ہی نقصان ہے بلکہ جیسے کوئی حسین متناسب الاعضاء ہو کہ اس کی آنکھ ناک سب کی سب مناسب اور متناسب ہوں اور پھر اس کی ایک آنکھ بیٹھ جائے تو دوسری آنکھ کی زیب بھی جاتی رہے گی اور اس پر اگر بیٹھی ہوئی آنکھ کے حصہ کی فراخی بھی دوسری ہی آنکھ میں آجائے اور اس میں بجائے سپیدی بھی سیاہی ہی چھا جائے، بجائے حسن ایسا قبیح المنظر ہو جائے کہ دلدادگان قدیمی اور عاشقان صمیمی بھی اس کی صورت پر لاحول پڑھنے لگیں، خاص کر دوسری آنکھ جو باقی رہی ہے بسبب اس کے کہ اپنے اندازہ سے زیادہ فراخ اور کشادہ اور سپیدی کی جا بھی سیاہی ہی ہوگئی ہے، ایسی بری اور بدشکل ہو جائے گی کہ

کچھ نہ پوچھو بلکہ اگر چشم باقی ماندہ کو شعور اور اختیار ہو تو اپنی اسی حالت اصلی پر آ جائے اور دوسری آنکھ کو بھی بدستور قائم کر دکھلائے کیونکہ اپنا حسن بھی اصلی کیفیت اور دوسری آنکھ کی معیت میں ہے۔

شیعوں نے اپنے ایمان کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی

سو بعینہ یہی قصہ حضرات شیعہ کے ایمان کے ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اعتقاد صحابہ اور حب اہل بیت جو بمقتضائے شہادات کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے لیے بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں۔ چنانچہ رسالہ ہذا کے ملاحظہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہ رہے گا، ان دونوں آنکھوں میں سے شیعوں نے ایک آنکھ کو پھوڑ دیا اور اس کے حصہ کی فراخی اور کشادگی بھی بلکہ اس سے بھی زیادہ دوسری آنکھ کو دے کر اس کو خراب کر دیا۔ یعنی اعتقاد صحابہ کو جو بمنزلہ چشم ایمان ہے اپنے ہاتھوں کھو کر دوسری آنکھ یعنی حب اہل بیت کو اس قدر بڑھایا کہ صحابہ کے حصے کی محبت بھی انہیں کے لیے صرف کر دی، پھر جیسے کہ آنکھ میں سفیدی کی جا بھی سیاہی آ جائے، ان حضرات بزرگوار فرقہ مسمی بشیعہ نے بھی ایسا ہی کیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جیسے آنکھ میں تل اور سیاہی اور سفیدی غرض چند قسمیں ہوتی ہیں ایسے ہی عترت میں بھی چند قسمیں تھیں، اولاد اور ازواج اور سوا ان کے اور اقربا کیونکہ باتفاق اہل لغت عترت کے معنی خویش اور اقربا کے ہیں۔ سو ان سب میں سے حضرات شیعہ نے فقط اولاد کو اور اولاد میں سے بھی فقط دس بارہ کو اور سوا اولاد ایک آدھے کسی اور کو تو مخدوم و مکرم سمجھا، باقی سب کے لیے تبرا ہے، پر جن کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنایا اور مخدوم و مکرم ٹھہرایا، ان کے حق میں محبت کو کچھ ایسا حد سے بڑھایا کہ گویا صحابہ باقی ماندگان عترت کے حصہ کی محبت بھی انہیں کے نثار کی، سو یہ بعینہ وہی مثل ہے کہ آنکھ اپنے اندازہ سے زیادہ کشادہ تو ہوئی تھی پر سفیدی کے عوض بھی سیاہی ہو گئی، شاید اس اجمال میں ناواقفان شیعہ کو بحکم مثل مشہور "اَلْمَرْءُ یَقِیس عَلٰی نَفْسِہٖ" کے احتمال جعل و تلبیس ہو اس لیے تفصیل اس اجمال کی ضرور کرنی پڑی تا کہ اپنی کتاب اور اہل کتاب کی طرف مراجعت کر کے بآسانی تحقیق کر کے بعد تطبیق اس ہیچمداں کی تصدیق کریں۔

شیعوں نے عترت میں سے بعض کی تکریم کی اور اکثر پر تبرا کیا

سو تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرات شیعہ حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم دختران مطہرہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہی نہیں سمجھتے،

یہاں تک کہ زبان زد خاص شیعہ یہ بات ہوگئی ہے، عام تو درکنار خاص بھی اسی حساب سے عام ہی ہیں بلکہ عام سے بھی پرے اور تو کیا کہوں حالانکہ انہیں کی کتب معتبرہ سے ان دونوں مطہرات کا بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قریب ہی اس بات کی شرح مرقوم ہو چکی اور حضرت عباس عم بزرگوار سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اولاد اور ایسے ہی حضرت زبیر بن العوام کو بھی داخل عترت نہیں سمجھتے اور اس قرابت قریبہ پر بھی لحاظ نہیں کرتے۔ حضرت عباس کی قرابت تو مشہور و معروف ہی ہے پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی بسبب کثرت علاقہ ہائے قرابت گویا بمنزلہ برادر حقیقی کے تھے، اوّل تو ان کی والدہ حضرت صفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمہ اور ان کی دادی ہالہ بنت وہب بن عبد مناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی خالہ اور ان کے باپ کی پھوپھی اُم حبیب بنت اسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی اور ان کی حقیقی پھوپھی حضرت اُم المؤمنین خدیجہ الکبریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ، پھر ان سب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم زلف ان کی بیوی حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما، حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن، ماسوا ان سب کے پانچویں پشت یعنی قصی بن کلاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتے ہیں، علماء نسب نے لکھا ہے کہ اتنی کثرت سے قرابت کے علاقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔

لیکن آفرین ہے حضرات شیعہ کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء کے دشمن ہوں تو ایسے ہوں کہ حضرت زبیر جیسے قریب عزیز کو (تو باوجود یہ کہ وہ مہاجرین اوّلین میں اور مجاہدین سابقین میں سے ہیں اور سینکڑوں بشارات فرقانی اور وعدہ ہائے قرآنی ان لوگوں کی بزرگی پر گواہ ہیں)۔ از جملہ کفار نگونسار اور منافقین بدکردار سمجھتے ہیں۔

اہل بیت سے مراد کون ہیں؟

باقی رہیں ازواج مطہرات جو اُمہات مؤمنین یعنی سب مسلمانوں کی مائیں ہیں، ان کی نسبت جو کچھ حضرات شیعہ ثنا خوان ہیں سب ہی جانتے ہیں حالانکہ اصل اہل بیت وہی ہیں کیونکہ اوّل تو اہل بیت کے معنی بعینہ اہل خانہ ہے، اتنی بات تو (گو نہ جانتے ہوں) مولوی عمار علی صاحب بھی جانتے ہوں گے، دوسرے لفظ اہل بیت جو کلام اللہ میں واقع ہوا ہے تو ازواج مطہرات ہی کی شان میں وارد ہوا ہے۔ گو حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی بوجہ عموم لفظ یا بہ سبب التماس حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت ہونے کی فضیلت میں داخل

ہوگئے ہیں۔ مزید تسکین کے لیے جس آیت میں یہ لفظ واقع ہے ماقبل اور مابعد سمیت لکھ کر اس کا ترجمہ لکھے دیتا ہوں تا کہ سب شیعہ و سنی متنبہ ہو جائیں۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاۚ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًاۚ وَاذْكُرْنَ مَا یُتْلٰى فِیْ بُیُوْتِكُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًاۚ

"یعنی اے نبی کی عورتو! تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی عورتیں، اگر تم ڈر رکھو تو دب کر نہ کہو بات، پھر لالچ کرے کوئی جس کے دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول اور قرار پکڑو، اپنے گھروں میں اور دکھاتی نہ پھرو جیسا دکھانا دستور تھا، پہلے نادانی کے وقت میں اور کھڑی رکھو نماز اور دیتی رہو زکوٰۃ اور اطاعت میں رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی، اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے گھر والو، اور ستھرا کرے تم کو ایک ستھرائی سے اور یاد کرو اے پیغمبر کی بیبیو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور عقل مندی، مقرر اللہ ہے بھید جاننا خبردار۔"

یہاں تک ترجمہ تھا۔ اب عرض یہ ہے کہ شیعہ ہی اپنے علماء سے پوچھیں کہ میں نے ترجمہ صحیح کیا یا غلط۔ بہر حال ان آیات سے اوّل یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اہل بیت ازواج ہی ہیں۔

خاندان امام کو عباء میں لے کر دُعا کرنے کی وجہ

اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کو ایک عباء میں لے کر یہ دُعا کی کہ الٰہی یہ میرے اہل بیت ہیں تا کہ وہ بھی اس فضیلت میں داخل ہو جائیں، یہ ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ قدر شناس چشم پوش اپنے وزیر سے یوں کہے کہ تمہارے گھر کے سب لوگوں کو ہم جدا جدا جگہ کر دیں گے تو وہ وزیر موافق محاورہ کے یوں سمجھ کر کہ ایسے موقع میں بی بی اور بیٹا مراد ہوا کرتے ہیں اور بیٹی اور نواسی مراد نہیں ہوتی کیونکہ وہ دوسرے گھر کی ہوتی ہیں، کچھ اپنے جی میں سوچ کر وقت دیکھ کر بیٹی اور داماد اور نواسوں کو بھی پیش کرے، وہ بادشاہ اگر پوچھ بیٹھے کہ یہ کون ہیں تو بایں لحاظ کہ بیٹی اور نواسی اور داماد بھی قرابت میں کچھ بیٹی اور پوتی اور بی بی سے کم نہیں، یہ کہے کہ حضور میرے گھر کے لوگ ہیں تو اس بادشاہ کو گویہ معلوم ہو جائے کہ یہ داماد اور نواسی اور بیٹیاں ہیں، اس کے گھر کے لوگ نہیں، پر بمقتضائے اپنی چشم پوشی ذاتی کے ان کو بھی جا کر دے گا۔

یالفظ اہل بیت اصل سے عام ہے ازواج اور حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سب کو شامل ہے۔ گو فقط ازواج ہی کی شان میں نازل ہوا ہو، جیسے دلی والا ایک لفظ عام ہے سب دلی والوں کی نسبت بول سکتے ہیں، اگر کوئی دولی کے رہنے والوں کو یوں کہے کہ یہ دلی والے ہیں تو اس سے کوئی کودن گنوار تک بھی یہ نہیں سمجھتا کہ دلی والے فقط یہی ہیں ان کے سوا اور کوئی دلی والا نہیں، اس تقریر سے سب پر واضح ہو گیا کہ کلام اللہ سے جو ازواج کا اہل بیت ہونا ثابت ہوتا ہے، سب صحیح اور درست ہے، اگرچہ شیعوں کی سمجھ میں نہ آتا ہو، بالجملہ ازواج مطہرات کو باوجود یکہ وہ اصلی اہل بیت ہیں اور کلام اللہ میں ان کی شان میں یوں آیا ہے "وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ"......"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں مؤمنوں کی مائیں ہیں۔" پھر بھی حضرات شیعہ اپنی زبان نہیں سنبھالتے اور لگام نہیں دیتے۔ اگر دوسری آیت کا یوں جواب دیں کہ وہ مؤمنوں کی مائیں ہیں ہماری تو نہیں، تو سلمنا پر آیت اوّل کا۔ یعنی جس سے ان کا اہل بیت ہونا ثابت ہوتا ہے کیا جواب دیں گے؟ بالجملہ ازواج مطہرات کے اعتقاد اور محبت کا اس مذہب میں یہ حال ہے۔

شیعہ اولاد فاطمہ کی اکثریت کے دشمن ہیں

باقی رہی اولاد سوان کا حال بھی سنیئے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اکثر اولاد کے حضرات شیعہ دشمن جانی ہیں اور برا کہتے ہیں۔ من جملہ ان کے حضرت زید شہید فرزند ارجمند حضرت امام ہمام امام زین العابدین رضی اللہ عنہما جو عالم اور متقی اور متورع تھے اور مروانیوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور ان کے بیٹے یحییٰ بن زید ہیں جو بزعم اثنا عشریہ مرتد ہیں اور ایسے ہی ابراہیم بن امام موسیٰ کاظم اور جعفر بن امام موسیٰ کاظم جن کا لقب شیعوں نے کذاب رکھ چھوڑا ہے حالانکہ وہ کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں اور بایزید بسطامی انہیں کے مرید ہیں اور جعفر بن علی برادر امام حسن عسکری کہ شیعوں کے عرف میں ان کا بھی لقب کذاب ہے اور حسن بن حسن مثنی اور ان کے فرزند عبداللہ محض اور ان کے فرزند محمد نام جو ملقب بنفس زکیہ ہیں کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور ابراہیم بن عبداللہ کو اور زکریا بن محمد باقر کو اور محمد بن عبداللہ بن الحسین بن الحسن اور محمد بن القاسم بن الحسن اور یحییٰ بن عمر کو بھی جو حضرت زید شہید کے پوتوں میں سے تھے، کافر اور مرتد جانتے ہیں اور جماعت کی جماعت سادات حسنیہ اور حسینیہ کو جو حضرت زید شہید کی امامت اور بزرگی کے قائل ہیں گمراہ اور اہل ضلالت میں سے سمجھتے ہیں حالانکہ کتب انساب اور کتب تواریخ سادات اس بات پر شاہد ہیں کہ اکثر سادات حسنی، حسینی حضرت زید کی امامت اور فضیلت کے معتقد تھے۔

حاصل یہ کہ اکثر اثنا عشریہ ان بزرگواروں کو کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور بزعم خود یوں بکتے ہیں کہ یہ سب جگر گوشہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لخت جگر حضرت بتول ہمیشہ ہمیشہ ابدالآباد تک جہنم میں رہیں گے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک دوازدہ امام میں سے کسی امام کی امامت کا منکر ایسا ہی کافر ہے جیسا کسی نبی کی نبوت کا منکر اور سب جانتے ہیں کہ کافر ابدالآباد تک جہنم میں رہیں گے۔ الغرض قول اکثر اثنا عشریہ کا یہی ہے اور یہی ان کے قواعد پر منطبق ہے کہ یہ بزرگواران مذکور کافر ہیں اور ان کے لیے کبھی نجات نہ ہوگی، اگرچہ بعضے اس بات کے قائل ہیں کہ یہ گروہ مثل حضرت عباس عم بزرگوار سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم اعراف میں رہیں گے اور بعضے کہتے ہیں کہ بعد عذاب شدید کے اپنے آباؤ اجداد کی شفاعت سے نجات پائیں گے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں قول پوچ ہیں کیونکہ جب منکر امامت کافر ہوا تو شفاعت کے ہونے اور اعراف میں رہنے کے کیا معنی، شفاعت بالاجماع کافروں کے حق میں نہ کوئی کر سکے اور نہ مقبول ہو اور اعراف میں کافروں کا جانا خلاف قرآن ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ○ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ○

"یعنی مقرر جو لوگ کہ کافر ہوئے اور کفر پر ہی مرے ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے، ہمیشہ اس میں رہیں گے نہ ان سے عذاب کم کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ملے گی۔"

الحاصل حضرات شیعہ کو دعوائے محبت تو اس قدر اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد اور اقرباء اور ازواج رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اماموں کی اولاد اور ان کے بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک، خاک پڑے اس محبت پر، ان میں اور ناصبیوں میں دس بارہ ہی نمبر کا فرق ہے، فقط اتنا ہی تو ہے کہ شیعہ دوازدہ امام اور ان کے بعض اقربا کی بزرگی کے معتقد ہیں اور ناصبی معتقد نہیں، سو اس اعتقاد سے تو ان کی بے اعتقادی ہی بھلی کیونکہ اوّل تو یہ فرقہ محبت کے پردہ میں حضرات آئمہ کے ذمہ صدہا عیب لگاتے ہیں اور پھر ان کفریات کو ہر کس و ناکس اپنے بیگانے کے سامنے گاتے ہیں، چنانچہ کچھ کچھ تو اس رسالہ کے دیکھنے والوں کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔

اہل شیعہ کی حضرت علی سے محبت جو دشمنی سے بدتر ہے

یہاں ہر چند اس بات کے مفصل لکھنے کا موقع ہے لیکن اس رسالہ مختصر کے مناسب نہیں، اس لیے بطور نمونہ اشارہ کیے جاتا ہوں۔ حضرت امام الائمہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے احوال کچھ ایسے

تراش رکھے ہیں کہ جس سے ہر کوئی سمجھ یہ جائے کہ (نعوذ باللہ) وہ بڑے بے غیرت نامرد جھوٹے کذاب تھے کہ اپنی بیٹی کافروں کے حوالے کردی اور بہ خوف جان نہ اس مقدمہ میں کچھ چون وچرا کی، نہ کسی اور بات میں دم مارا، کافروں کے پیچھے ساری عمر نمازیں پڑھیں اور ہمیشہ ان سے ہم پیالہ اور ہم نوالہ رہے اور ان کی تعریفیں بارہا ایسی کریں کہ مومنان باخلاص کی اس کے عشر عشیر بھی ایک دفعہ بھی نہ کی جب ان کا یہ حال ہے تو اوروں کا تو کیا ذکر۔

ع:......قیاس کن زگلستان من بہار مرا

خارجی اور ناصبی ہر چند حضرت علی کو برا سمجھتے ہیں، پر اتنا نہیں سمجھتے۔

انبیاء آئمہ سے بلکہ تمام مخلوق سے افضل ہیں

دوسرے پھر اس محبت نامعقول کو اتنا حد سے بڑھایا کہ انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کو بھی اماموں سے گھٹایا، چنانچہ مذہب امامیہ بہ نسبت تمام آئمہ ہدیٰ کے کہتا ہے کہ وہ سب تمام انبیاء سے افضل ہیں حالانکہ کلام اللہ اور خود ان کی کتابیں اس بات پر شاہد ہیں کہ انبیاء سب سے افضل ہیں، کلام اللہ میں برابر انبیاء کی نسبت اصطفا اور اجتبا جو بمعنی چھانٹ لینے کے ہے، مستعمل ہے اور ظاہر ہے کہ چھانٹی ہوئی چیز باقی سے افضل ہوتی ہے، مع ہذا کل چار فرقوں کی خداوند کریم تعریف فرماتا ہے، انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، سو ہر جگہ انبیاء ہی کو مقدم کیا ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ نبی باقی تین فرقوں سے افضل اور رُتبہ میں مقدم ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے آئمہ ہدیٰ نبی تو تھے ہی نہیں پھر ان تینوں فرقوں میں سے جونسے کو شیعہ پسند کریں اختیار ہے، بہت سے بہت اماموں کو صدیق کہیں گے اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے۔ تب بھی انبیاء سے بعد ہی میں رہے۔

افضلیت انبیاء کتب شیعہ سے

لیکن ہم جانتے ہیں کہ شیعہ کلام اللہ کی کاہے کو سنیں گے؟ اس لیے مناسب ہے کہ انہیں کی کتابوں سے ان کو جھوٹا کیجئے اور جتا دیجئے کہ یہ جو مثل مشہور ہے کہ ''دروغ گورا حافظہ نباشد'' اور ایسے ہی یہ مثل کہ ''حق برزبان جاری شود'' دونوں سچی ہیں، پیشوایان شیعہ نے ہر چند ان روایات کے تراشنے میں جہد بلیغ کیا جس سے اماموں کا انبیاء سے افضل ہونا ثابت ہو جائے لیکن بمقتضائے مثل اوّل چوک کر بمقتضاء مفہوم مثل ثانی حق بات کہی گئی۔

روی الکلینی عن ھشام الاحول عَنْ زَیْد بن عَلِیّ اَنَّ الْاَنْبِیَاءَ

اَفۡضَلُ مِنَ الۡاَئِمَّةِ وَاِنَّ مَنۡ قَالَ غَیۡرَ ذَالِکَ فَھُوَ ضَالٌّ

''یعنی کلینی بواسطہ ہشام احول کے زید بن علی سے روایت کرتا ہے کہ مقرر انبیاء اماموں سے افضل ہیں اور بیشک جو اس کے سوا کہے وہ گمراہ ہے۔ فقط''

ادھر ابن بابویہ کتاب الامالی میں بروایت صحیح ایک حدیث طویل کے ضمن میں جس میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کا قصہ مندرج ہے اس طرح روایت فرماتے ہیں:

عَنِ الصَّادِقِ عَنۡ آبائِهٖ عَلَیۡھِمُ السَّلَامُ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَالَ لِسُکَّانِ الۡجَنَّةِ مِنَ الۡمَلَائِکَةِ وَاَرۡوَاحِ الرُّسُلِ وَمَنۡ فِیۡھَا اَلَا اِنِّیۡ زَوَّجۡتُ اَحَبَّ النِّسَاءِ اِلَیَّ مِنۡ اَحَبِّ الرِّجَالِ اِلَیَّ بَعۡدَ النَّبِیِّیۡنَ.

''یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنے باپ دادوں سے روایت کرتے ہیں کہ مقرر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جنت کے رہنے والوں سے، یعنی فرشتوں سے اور رسولوں کی ارواح سے اور جو سوا ان کے جنت میں تھے، ان سے خداوند کریم نے فرمایا کہ خبردار رہو کہ میں نے اس عورت کا نکاح جو سب عورتوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے اس مرد سے کر دیا ہے کہ جو سب مردوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے، انبیاء کے بعد''

غور فرمانے کی جا ہے یہ روایتیں با آواز بلند ہی کہتی ہیں کہ حضرت امیر کا رُتبہ بعد انبیاء کے ہے مگر ستم یہ ہے کہ باوجود ان روایات کے پھر آئمہ کو انبیاء سے افضل ہی بتلائے جاتے ہیں، ظاہراً اس کا سبب یہی ہے کہ صحابہ کے حصہ کی محبت اور نیز اکثر اہل بیت کے حصہ کا اعتقاد فقط انہیں چند اشخاص معدود کے حق میں صرف کرتے ہیں، سو بہ سبب ادغام اور اجتماع محبت ہائے کثیرہ کے محبت دوازدہ امام اپنی حد سے باہر نکل گئی۔

اور فی المثل شیعوں کے وہی مثل ہو گئی جو نصرانیوں کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس قدر محبت کو بڑھایا کہ ان کو عبودیت سے نکال کر معبودیت تک پہنچایا، چونکہ یہ قصہ بعینہٖ آنکھ کی مثال کا سا ہے، یعنی جیسے کسی حسین متناسب الاعضا متناسق الاطراف کی ایک آنکھ بالکل پٹ ہو جائے اور اس کے حصہ کی فراخی بھی دوسری ہی آنکھ میں آ جائے اور اس ایک ہی کی ساحت دونوں کی مساحت کے برابر ہو جائے اور پھر اس آنکھ میں بھی بجائے سفیدی سیاہی ہی چھا جائے، ایسے ہی حضرات شیعہ نے حب اہل بیت اور حب اصحاب میں سے ایک کو رکھا اور ایک کو کھو دیا اور جس کو رکھا اس کو ایسا بڑھایا کہ دونوں کے برابر اس ایک ہی کو کر دیا اور جیسے آنکھ میں سفیدی کی جا

بھی سیاہی ہی چھا جائے تو انہوں نے بھی تمام اہل بیت میں سے چند اشخاص معدودکو بزرگ سمجھا اور باقی کو مردود اور مرتد قرار دیا اور بایں وجہ کہ جن کے ساتھ شیعہ محبت کرتے ہیں ان کی محبت حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ یوں سمجھ میں آتا ہے کہ باقیوں کے حصہ کی محبت بھی انہیں چند اشخاص معلوم کے لیے ہے تو اس صورت میں جیسے آنکھ مذکور خود نازیبا معلوم ہوگی اور تمام چہرے کو بے زیب کردے گی، ایسے ہی حب اہل بیت اور حب اصحاب جو بمنزلہ ایمان کی دو آنکھوں کے ہیں ان میں سے اگر ایک جاتی رہے اور دوسری بڑھ جائے تو دوسری بھی نازیبا ہو جائے گی اور ایمان کے حسن کو بھی بے زیب کردے گی، اس لیے بالیقین یوں سمجھ میں آتا ہے کہ دوازدہ امام بھی اس محبت سے خوش نہ ہوں بلکہ متنفر ہوں اور اس بات کے خواستگار ہوں کہ ان کی محبت اپنے اندازہ پر آجائے تاکہ بری نہ معلوم ہو اور اس کے ساتھ اصحاب سے بھی محبت اور اعتقاد دل میں جمایا جائے تاکہ جیسے ایک آنکھ سے دوسری کی زیب وزینت ہونے ہی سے چہرہ پر حسن آتا ہے، ایسے ہی حب اصحاب سے حب اہل بیت کو زینت ہو اور دونوں ہی سے ایمان اور اسلام کی خوبصورتی ظاہر ہو۔

شیعوں نے صدیق کے بارے میں خدا کی گواہی اور آئمہ کی شہادت بھی رد کردی

سو چونکہ اہل سنت رضا اہل بیت میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں تو یہ خاکپائے غلامان اہل بیت کی طرف سے نیابۃً تمام شیعوں کے عموماً اور مولوی عمار علی صاحب کے خصوصاً کان کھولتا ہے کہ اے مدعیان محبت اہل بیت یہ محبت نامعقول جب تک مقبول نہ ہوگی جب تک کہ حب اصحاب اس کے برابر نہ ہو ورنہ ان کے برا کہنے میں تمہارا ہی برا ہوگا۔ خصوصاً رفیق غار جان نثار سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرت ابوبکر صدیق جن کے صحابی ہونے کا خدا خود گواہ ہے۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا اور جن کے صدیق ہونے کی اماموں نے شہادت دی ہے اور بمبالغہ ان کی تعریف کی ہے چنانچہ معلوم ہو چکا ان کا برا کہنا خدا اور آئمہ کو جھٹلانا ہے، ایسی صورت میں تو ہزار عیب بھی اگر آنکھوں سے نظر آئیں تو یوں سمجھیے کہ ہو نہ ہو ہماری نظر اور فہم کا قصور ہے، خدا کا فرمایا اور آئمہ ہدیٰ کا کہا غلط نہیں ہو سکتا جن کو ہم عیب سمجھتے ہیں وہ ہنر ہی ہوں گے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو مت آؤ، ہم تو ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود اس جلالت قدر اور کمال علم وفضل اور نور نبوت اور وفور عقل کے حضرت خضر کی کشتی کے توڑنے اور لڑکے کے قتل کرنے کو کہ وہ ظلم ہرگز نہ تھا، عین مطابق مرضی خدا

وندی تھا، ظلم عظیم سمجھا حالانکہ خداوند کریم کی ہدایت کے موافق گئے تھے اور جناب باری تعالیٰ نے پہلے ہی حضرت خضر کے علم اور بزرگی کی اطلاع کر دی تھی۔ چنانچہ یہ تمام قصہ سورۂ کہف میں رکوع "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتَاهُ" سے لے کر رکوع "وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ" تک مذکور ہے پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے رسول جو مرسلین اولوالعزم میں سے بھی اکثروں سے زیادہ ہیں، آدھے قرآن کے قریب انہیں کے ذکر سے پُر ہوگا۔ حضرت خضر کے افعال کی حقیقت کو نہ سمجھیں حالانکہ حضرت خضر محققین کے نزدیک ولی ہیں نبی نہیں اور اگر نبی بھی ہیں تو بالاتفاق اس رُتبہ کے ہرگز نہیں جو رُتبہ کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوا تو حضرات شیعہ تو نہ نبی ہیں نہ ولی نہ عقل و دانش سے ان کو کچھ بہرہ۔ چنانچہ اسی لیے یہ مثل ہی ہوگئی ہے کہ "اَلشِّیْعَةُ نِسْوَانُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ"......"یعنی شیعہ اس اُمت کی عورتیں ہیں۔"

ایسے نادان اگر اُمت مصطفوی کے سیدالاولیاء کے کسی فعل کی حقیقت نہ سمجھیں تو کیا بعید ہے بلکہ عین مقتضائے قیاس ہے کیوں کہ یہ اُمت اور اُمتوں سے افضل، اس اُمت کے اولیاء پہلی اُمتوں کے اولیاء سے افضل اور بھی نہیں تو جو اس اُمت میں ایسا ہو کہ خدا اور آئمہ ہدیٰ دونوں اس کی تعریف کریں وہ تو بیشک پہلی اُمتوں کے اولیاء سے افضل ہوگا، ایسے شخص کے افعال کی حقیقت تو اگر آئمہ ہدیٰ بھی نہ سمجھیں اور ظلم وستم کا گمان کریں تب بھی اہل عقل کے نزدیک کچھ حرج نہیں، بہت ہو تو شیعوں کو یہ خلجان ہو کہ آئمہ ہدیٰ ہمارے عقیدہ کے موافق افضل الخلائق ہیں، ابوبکر اگر بزرگ بھی ہوں تب بھی ان سے افضل یا ان کے برابر نہیں ہو سکتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تم خداوند کریم اور آئمہ ہدیٰ کی گواہی ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بزرگی کے باب میں قبول کرلو، پھر اس کا جواب ہم سے سنو۔

اگر بالفرض والتقدیر آئمہ ہدیٰ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل ہی ہوں اور خدا کا مہاجرین کو علی العموم باقی اُمت سے صراحۃً افضل بتلانا پھر ان میں سے ابوبکر صدیق کو اشارۃً سب سے افضل کہنا، چنانچہ اوّل مفصل مرقوم ہو چکا، تمہارے عقیدہ خلط کے موافق غلط ہو تب بھی تو کچھ دُشوار نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تو حضرت خضر علیہ السلام سے افضل تھے پھر ان کے افعال کی حقیقت نہ سمجھے اور احسان کو نقصان اور عدل کو ظلم سمجھ کر ایسے مغلوب الغضب ہوئے کہ اپنے سب عہد و پیمان بھول گئے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کا واقعہ کج فہموں کیلئے عبرت ہے

القصہ مقتضائے ایمان خدا اور ادب آئمہ ہدیٰ تو یوں تھا کہ اگر بالفرض والتقدیر حضرت ابوبکر صدیق بظاہر ملحد و زندیق ہی شیعوں کو نظر آتے تو خدا کی گواہی اور آئمہ کی شہادت کے بعد جو ان کی

بزرگی کی نسبت اوّل میں اور اوسط میں اس رسالہ کے مرقوم ہو چکی ہے اپنی بھی نہ سنتے اور اپنی عقل نارسا کی تکذیب کرتے اور حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کے قصہ کو پیش نظر کر کے تسکین خاطر پریشان اور تسلی طبع کج کر لیتے کیونکہ جناب باری تعالیٰ نے اس قصہ کو ایسے ہی کودنوں کے واسطے بیان فرمایا ہے۔ حضرات شیعہ جیسے عقل کے دشمن اپنی کج فہمی کے باعث خدا کے مقربوں اور دوستوں سے بدگمان ہو کر خدا کو اپنا دشمن بنالیں۔ قربان جایئے خدا علیم کے، کتنی دور کی سوجھتی ہے مگر آفرین ہے شیعوں کی عقل پر بھی کہ اس پر بھی نہ سمجھے، خیر خدا انہیں سمجھے القصہ مقتضائے ایمان وادب تو یہ تھا۔

بالفرض اگر صدیق سے گناہ ہوا تو وہ نیکی بن چکا ورنہ آئمہ ان کی تعریف نہ کرتے

اور اگر بحکم ''چشم بداندیش کہ برکندہ باد...... عیب نماید ہنرش در نظر''...... یہ بات ان کو دُشوار ہی تھی تو یہ تو شیعہ بھی خواہ مخواہ مانیں ہی گے کہ قیامت کو بعض گنہگاروں کے اعمال بد کو حسنہ بنا دیں گے کیونکہ کلام اللہ موجود ہے۔ دیکھو کیا فرماتے ہیں: ''اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحًا فَاُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِہِمْ حَسَنَاتٍ''...... ''یعنی مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو ان کے گناہوں کو بھی خدا نیکیاں بنا دے گا۔ فقط'' اور اگر خوردہ بینان مذہب شیعہ کو یہ خلجان ہو کہ اس آیت میں جن گناہوں کی نیکیاں بنانے کی طرف اشارہ ہے ظاہر میں وہی گناہ معلوم ہوتے ہیں جن کا سیاق میں ذکر ہے اور وہ ظاہر ایام کفر کے گناہ ہیں، سو اگر ابوبکر صدیق کا کوئی گناہ نیکی بنے گا بھی تو وہی بنے گا جو ایام جاہلیت کے گناہوں میں سے ہوگا۔ ہمیں تو ایسی بہت سی باتوں میں کلام ہے جو بعد زمانہ ایمان ان سے صادر ہوئیں۔ مثلاً غصب فدک کہ وہ بعد وفات سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات ان سے ظہور میں آیا تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ ایسا شیوہ انہیں لوگوں کا ہے کہ جن کا دل شبہ میں پڑا ہوا ہے اور اب تک درجہ یقین اور ایمان تک نہیں پہنچا۔ اگر ماسبق میں گناہان زمانہ کفر ہی کا ذکر ہو اور انہیں کی نسبت تبدیل کا یعنی نیکی بنا دینے کا اشارہ ہو تب بھی اتنی بات ثابت ہوگئی کہ خدا کو گناہوں کا نیکی بنا دینا آتا ہے پھر جب کفر کے زمانہ کے گناہوں کو (کہ وہ نسبت گناہان ایام ایمان کے گناہوں سے زیادہ ہی ہوتے ہیں) خدا کو نیکی بنا دینا آتا ہو تو ایام ایمان کے گناہوں کا نیکی بنا دینا تو سہل ہی ہوگا۔ پھر جس کی خدا اور آئمہ ہدیٰ تعریف فرمائیں، اس کے ایمان اور بزرگی میں اسے ہی شک ہوسکتا ہے جس کو خدا اور آئمہ ہدیٰ کی

بات میں شک ہو۔ غرض جب ایمان اور صلاحیت اعمال ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بشہادت خداوندی اور بگواہی آئمہ ہدیٰ ثابت ہوگئی تو اس بات میں کیوں تامل ہے کہ ان کے گناہ نیکیاں ہو جائیں۔

گناہ سے توبہ پر جنت میں داخلہ سب کو مسلم ہے

اور اگر یوں کہیئے کہ گناہوں کا نیکیاں بن جانا توبہ کے ساتھ معلق ہے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے سے معلوم ہو کہ توبہ کر کے مرے ہیں تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ اگر معلق ہو بھی تو گناہوں کے نیکیاں بنا دینے کا وعدہ معلق ہوگا کچھ امکان تو معلق نہیں، پھر جب خداوند کریم اور آئمہ دین ان کی تعریف فرمائیں تو اگر ان سے یہ خطا ہوئی بھی تھی، تب بجز اس کے ان کی تعریف کی اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ ان کی خطا کو بھی جناب باری تعالیٰ نے نیکی بنا دیا ہو گو انہوں نے توبہ نہ کی ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر توبہ ہی پر تبدیل سیئات بحسنات موقوف ہے تو خداوند متین اور آئمہ دین کی تعریف خود اس بات کی گواہ ہے کہ وہ توبہ کر کے اس عالم سے تشریف لے گئے، نہیں تو وہ قابل تعریف تو کجا البتہ لائق ہجو اور مستوجب سزا تھے۔ ہاں اگر شیعہ یہ گرفت کریں کہ خداوند علیم نے تو تعریف پہلے کی تھی یہ خطا ان سے بعد میں سرزد ہوئی تو اس کا جواب ہمارے پاس بجز اس کے کچھ نہیں کہ البتہ شیعوں کا خدا ایسا ہی ہوگا جسے چار دن کے بعد کی بھی خبر نہ ہو ہمارا خدا عالم الغیب ہے، ازل سے ابد تک سب اس کے پیش نظر ہے، اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حسب گمان بدشیعہ برے ہی ہوتے تو خداوند کریم ہرگز تعریف نہ فرماتا، اس کو کیا ضرورت تھی کہ ایک غلط بات کہہ کے آج شیعوں سے شرماتا۔ اگر خدا کی نہیں مانتے تو نعوذ باللہ آئمہ ہدیٰ تو بزعم شیعہ خدا سے بھی بڑھ کر ہیں، خدا کو تو بدا بھی واقع ہوا، آئمہ کو تو بدا بھی نہیں ہوتا، پھر اس پر علم "ما کان" اور علم "مَا یکون" ان کو حاصل، ان کی تعریف کا تو بجز اس کے کچھ جواب ہی نہیں کہ حضرت صدیق اکبر کے گناہ بھی نیکیاں ہی بن گئے ہوں۔

توبہ کا ثبوت بروایت شیعہ

اور یہ بھی نہ سہی ہم اور جواب رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ روایات شیعہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ابوبکر صدیق گناہِ غصب فدک سے تائب ہو کر مرے ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ تعالیٰ قریب ہی بحوالۂ روایات کتب شیعہ یہ مضمون مرقوم ہوگا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گو فدک غصب کر لیا تھا لیکن پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کے حوالے کر دیا اور نیز یہ بھی مرقوم ہوگا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سے راضی ہوگئیں۔ اب فرمائیے توبہ اور کسے کہتے ہیں اسی کا نام توبہ ہے۔

نیکیاں زیادہ ہونے پر جنت میں داخلہ متفق علیہ ہے

اور اگر اس پر بھی شیعوں کے دل کا کفر نہ جائے تو اس کی اور بھی تدبیر ہے۔ آخر شیعوں کے نزدیک بھی اتنی بات مسلم تھی کہ قیامت کو حساب کتاب کے بعد جس کے اچھے عمل زیادہ نکلیں گے، وہ جنت میں جائے گا جس کے برے عمل زیادہ ہوں گے وہ دوزخ میں اور اگر بنظر دور اندیشی اس وقت اس عقیدہ میں کچھ شک بھی آ جائے تو لیجئے یہ کلام اللہ کی آیت موجود ہے اور کلام اللہ میں سے عم ہی کے سیپارہ کی، اس میں سے بھی اوّل ہی کی سورتوں میں کی جو شیعوں کے یاد بھی نہیں حتی یاد تو ضرور ہی ہوں گی وہ آیت یہ ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا هِيَهْ ۝ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝

''یعنی جن کے عمل تول میں بھاری ہوں گے تو وہ اچھے اور جن کے عمل ہلکے نکلیں گے ان کا ٹھکانہ ہاویہ ہے اور تجھ کو کیا معلوم وہ کیا ہے؟ وہ ایک آگ ہے گرم دہکتی۔ فقط''

اب تو کچھ تکرار کی بات باقی نہیں۔ سو اس صورت میں خداوند علیم اور آئمہ تعلیم جس کی تعریف فرمائیں وہ اگر خطاوار بھی تھا، تب معلوم ہوا کہ اس کے اچھے عمل زیادہ تھے، پھر ان خطاؤں کے باعث ان سے رنجیدہ رہنا ویسا ہی ہے جیسا کسی نے کہا ہے ''مدعی ست گواہ چست'' یا عربی کی مثل ہے ''رَضِيَ الْخَصْمَانِ وَمَا رَضِيَ الْقَاضِيْ'' یعنی مدعی مدعا علیہ تو راضی ہو گئے، پر قاضی جی راضی نہ ہوئے، خداوند کریم اور آئمہ دین تو راضی ہو جائیں پر شیعی راضی نہ ہوں۔

مہاجرین اوّلین سے جنت عدن، مغفرت، رضا کا وعدہ ہو چکا اور خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا

اور اس پر بھی خاک ڈالو، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اچھے عملوں کا زیادہ ہونا بھی شیعوں کو ناگوار ہو تو اس میں تو کچھ دھوکا ہی نہیں کہ وہ مہاجرین اوّلین اور مصاحبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ سو مہاجرین اوّلین اور ہمراہیان رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا حال آیت **''والسابقون الاوّلون من المهاجرين والانصار''** اور آیت **''محمّد رسول الله الآية''** کی شرح کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے کہ خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنات عدن تیار کر رکھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ مغفرت گناہان

اور وعدہ اجر عظیم کا کرلیا ہے۔ سو اگر بالفرض والتقدیر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گناہ ہی زیادہ تھے یا فرض کرو کہ وہ سراپا گناہ اور ہمہ تن ظلم و جفا ہی تھے۔ تب اس صورت میں جائے طعن باقی نہ رہی کیونکہ خداوند کریم اپنے وعدہ کا سچا اور بات کا پکا ہے۔ مثل حضرات شیعہ نہیں، جن کے دین کی باتوں میں بھی جہل ہے، دُنیا کا تو کیا ذکر؟ سو ہم کو یقین ہے کہ خدا ان سے راضی ہے، گو شیعہ ناراض ہوں، وہ ناراض ہوں گے، خدا کو ناراض اور اہل بیت کو رنجیدہ کریں گے کیونکہ اہل بیت تو ایسے نہیں کہ گوشۂ عنایت خداوندی کسی طرف کو دیکھیں، پھر اس طرف کو نہ جھکیں بلکہ ان کی سعادت ازلی اور ہدایت لم یزلی سے یوں یقین کامل ہے کہ اگر بفرض محال حسب مقالہ شیعہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کچھ ان پر ظلم اور تعدی بھی کی ہو، تب اپنے حقوق سے درگزریں اور لحاظ رضا خداوندی حسب مثل مشہور ''ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است'' اپنے اوپر جفا کو وفا سمجھیں، نقل مشہور ہے جدھر رب اُدھر سب، اور اہل بیت اپنے حقوق سے آپ کیا درگزر کریں گے اور کیا راضی ہوں گے؟ خداوند کریم جب راضی ہوگا سب کو راضی کردے گا۔ آخر کلام اللہ میں موجود ہے: ''وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ط'' یعنی خداوند کریم بعضے جنتیوں کے حق میں فرماتے ہیں ''اور نکال ڈالے ہم نے جو کچھ ان کے دلوں میں رنج تھے، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے ہوئے۔ فقط'' اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ بعضے جنتی ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے باہم دُنیا میں رنج و عداوتیں تھیں، پر جب خداوند کریم ان کو جنت میں داخل کرے گا ان رنجوں کو ان کے دلوں سے نکال ڈالے گا۔ سو اسی طرح یہاں بھی تصور فرمالینا چاہیے۔ آخر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جنتی ہونا بشہادت کلام خدا اور کلام آئمہ ہدیٰ شیعوں کو جبراً کرھاً تسلیم کرنا تو پڑا ہے اور اہل بیت کے جنتی ہونے کا پہلے ہی سنیوں، شیعوں کو باتفاق یقین ہے اور اگر شیعہ سنیوں کی ضد میں ان کے جنتی ہونے میں کلام کرنے لگیں تو ان کی ہٹ دھرمی سے کچھ بعید بھی نہیں۔ غرض جب دونوں فریق جنتی ہوئے تو ان کے کینے اور عداوتیں خداوند کریم آپ نکال دے گا۔

حضرت کلیم کا بچھڑے کو جلانا مبنی بر حکمت تھا

اور اگر بایں ہمہ فہمائش بلیغ متبعان عبداللہ بن سبا کو کچھ اثر نہ ہو اور جیسے سامری کے ایک کرشمے پر بنی اسرائیل بہک گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہزار معجزوں پر بھی ڈھیٹ راہ پر نہ آئے، اس دغا باز کے سخن بے سروپا پر ایسے جمیں کہ میرے ان دلائل محکم اور مستحکم سے بھی اکھڑ جائیں تو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دستاویز ضلالت آمیز سامری کو باطل کردیا۔ یعنی اس

سونے کے بچھڑے کو جو برکت خاکپائے حضرت جبریل علیہ السلام بولنے لگا تھا اور بنی اسرائیل اسے پوجنے لگے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلا کر دریا میں ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیا تا کہ ہر کس و ناکس سمجھ جائے کہ اگر یہ معبود بحق اور خداء برحق ہوتا تو بندوں کے ہاتھوں سے یوں کیوں ذلیل ہوتا۔ اسی طرح میں بھی حیلہ ہائے حجت نمائے مولوی عمار علی صاحب کو (کہ ہو بہو طرز و انداز میں عبداللہ بن سباء ثانی اور دغاہائے تازہ کے بانی مبانی ہیں بلکہ ان کی حجتیں اسی سرگروہ شقاوت پژوہ کی تراشی ہوئی باتیں ہیں اور اسی کی پرانی خرافاتیں ہیں۔ سوان دلائل قاطعہ سے قطع نظر کر کے مولوی صاحب کے ہاتھ) کاٹے دیتا ہوں تا کہ ہر کوئی جان جائے کہ مختاں پریشان مولوی صاحب اگر قابل پذیرائی اہل انصاف ہوتے تو یوں مثل گوز شتر ہوا کے سہارے نہ اُڑ جاتے۔

غصب فدک پر آیت ذالقربیٰ سے استدلال

سو گوش گذارانِ مولوی صاحب کو یہ بات یاد رہے کہ دربارہ غصب فدک جو کچھ مولوی صاحب نے مکاری کر کے زیب رقم فرمایا ہے، بزعم خود بہت ہی چالاکی کی تھی لیکن جن کا خدا حافظ ہو، ان کو ایسے دھوکوں سے کیا اندیشہ۔

چہ باک از موج بحرآں را کہ باشد نوح کشتیبان

ہاں ایسے عقل کے اندھے جیسے (گستاخی معاف) ملازمان مولوی صاحب ہیں۔ البتہ اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے، مولوی صاحب اپنے نامہ موسومہ میر نادر علی صاحب میں کہ مثل نامہ سیاہ مولوی صاحب کے خوبی کا اس میں نام و نشان نہیں، یوں رقم فرماتے ہیں کہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درمنثور میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اور ابو یعلی موصلی نے اپنی مسند میں اور صاحب معارج النبوت نے اور سوا اس کے اور علمائے اہل سنت نے روایت کی ہے کہ جس وقت نازل ہوئی آیت "وَآتِ ذَالْقُرْبٰی حَقَّهٗ" یعنی" دے تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریبوں کو حق ان کا" تو اس وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ قریب میرے کون ہیں؟ اور حق ان کا کیا ہے؟ جبریل نے عرض کی کہ قریب تمہارے فاطمہ ہے اور حق اس کا فدک ہے، فدک اس کو دے دو، اس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو فدک دے دیا۔ پس تحریر سے ان کی ثابت ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو فدک دیا اور فاطمہ مالک فدک کی تھی۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا سے رحلت فرمائی اور ابوبکر خلیفہ ہوئے تو فدک کو فاطمہ سے چھین لیا اور ان کا قبضہ اُٹھا دیا۔ اب فرمائیے کہ یہ غصب نہیں تو کیا ہے۔ انتہی۔ یہاں تک مولوی صاحب کی عبارت تھی۔

غصب فدک کے بہتان کا تاریخی جائزہ

اب ہماری سنئے کہ یہ اعتراض غصب فدک ایک پرانی بات ہے کچھ ملازمان مولوی صاحب ہی کو نہیں سوجھی، سارے شیعہ اسے ہی گاتے رہے ہیں، القصہ مولوی صاحب وہی پرانی تے جانتے ہیں جو اگلے اُگلتے چلے آئے ہیں، پر افسوس یہ ہے کہ ابتداء میں کسی نے یہ دروغ بے فروغ اگر زبان سے نکالا تھا تو جب تک علماء اہل سنت کو اس کی خبر بھی نہ تھی، نکالا تھا۔ لیکن جس وقت علماء اہل سنت نے جوابات دندان شکن سے شیعوں کے دانت توڑ دیئے، تب تو غیرت کی بات یہ تھی کہ اس بات کو منہ پر بھی نہ لاتے، اگر صواقع اور صواعق کیاب تھے تو بفضلہٖ تعالیٰ تحفہ اثناعشریہ تصنیف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ اور منتہی الکلام وغیرہ مصنفات مناظر بے بدل مولوی حیدر علی سلمہ ربہ کہ علماء لکھنؤ بھی ان کے سامنے بول گئے تھے کثرت سے موجود ہیں ان میں اس دروغ بے فروغ کے جو کچھ جواب لکھے ہیں پہلے ان کو رد کرنا تھا جب کہیں اس بات کو زبان پر لانا تھا، اگر خدا سے شرم نہ تھی کیا غیرت دُنیاوی کو بھی طاق میں اُٹھا دھرا، کیسا ہی کوئی نامعقول کیوں نہ ہو، پر اپنی بات کا جواب معقول سن کر ایک دفعہ تو چپ ہی ہو رہا کرتا ہے۔

ہاں نامرد بے حیا کا یہ کام ہے کہ اگر دلاوران شجاعت نژاد کسی ناسزا کی سزا میں کچھ سرزنش کرتے ہیں اور ہاتھ پاؤں سے معقول کرتے ہیں تو وہ چونکہ ہاتھا پائی سے مارا ہوا ہوتا ہے، اپنی زبان چلانے سے باز نہیں آتا اور اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جایا کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے مرد کے ہاتھ چلیں نامرد کی زبان، سو یہی وطیرہ حضرات شیعہ کا ہے کہ اہل سنت کے جوابات دندان شکن سن کر بھی منہ بند نہیں کرتے اور وہی بکے جاتے ہیں۔ اس موقع میں مناسب تو یوں تھا کہ ہم بھی جوابات سابقہ پر اکتفا کرتے لیکن چونکہ مولوی عمار علی صاحب نے اپنے عندیہ میں میدان خالی دیکھ کر یہ ہاتھ پاؤں ہلائے ہیں تو ہم کو بھی لازم ہے کہ ان کو ان کی حقیقت دکھلا دیجئے۔

یہ آیت مکیہ ہے مکہ میں فدک کہاں تھا؟

سو عرض یہ ہے کہ ملازمان مولوی صاحب کو تو کلام اللہ نہ یاد ہے نہ یاد ہو، اگر یقین نہ ہو تو کوئی صاحب بھی پوچھ دیکھیں کہ یہ آیت کون سے سیپارہ میں ہے؟ بالجملہ اگر مولوی صاحب اور ہم مذہبان مولوی صاحب کو کلام اللہ یاد ہوتا تو اس آیت کو فدک کے باب میں زبان پر بھی نہ لاتے بلکہ اگر ہم بھی کہتے جب بھی نہ مانتے، وجہ اس سخن کی یہ ہے کہ یہ آیت کل دو جگہ کلام اللہ

میں آئی ہے، ایک سورہ بنی اسرائیل میں، دوسری سورہ روم میں، سو دونوں کی دونوں خبر سے کہ میں نازل ہولی تھیں۔ علماء تو اس بات کو جانتے ہی ہیں پر عوام کی تفہیم اور تسکین کے لیے اتنا اشارہ بہت ہے کہ دُنیا میں ہزاروں کلام اللہ موجود ہیں، کھول کر دیکھ لیں ان دونوں سورتوں کے اوّل میں مکیہ لکھا ہوا ہوگا، اور اگر کوئی اُلٹی کا مجھن بار مصاحف کا بایں وجہ اعتبار نہ کرے کہ کلام اللہ تو سنیوں ہی کی سی کہے گا تو لیجئے شیعوں ہی کی گواہی موجود ہے۔

طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں لکھا ہے "**سورة الروم مكية الا قوله فسبحان الله الخ**" یعنی علامہ طبرسی جس کے حوالہ سے یہ مذکور ہوگا کہ جب آیت "**فات ذاالقربیٰ**" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک حضرت فاطمہ کو عطا فرمایا وہی تفسیر مجمع البیان میں رقم فرماتے ہیں کہ سورۂ روم سوائے آیت "**فسبحان الله الخ**" سب مکی ہے اب کوئی مولوی صاحب سے پوچھے کہ مکہ میں فدک کہاں تھا؟ فدک تو ہجرت سے چھٹے ساتویں سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا تھا۔ اس صورت میں تو سنیوں کی معتبر کتابوں میں بھی اگر بتصریح یوں لکھ دیتے کہ یہ آیت بعد خیبر کی فتح کے نازل ہوئی ہے تب بھی اعتبار نہ کرنا تھا۔

کسی آیت کے مکی یا مدنی ہونے سے کیا مراد ہے؟

بالجملہ پیشوایان مذہب شیعہ نے بات تو بنائی تھی لیکن کیا کریں کلیہ ہے۔ "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" تقدیر سے چوک گئے، باقی کسی کو یہ شبہ ہو کہ مکی اسے بھی کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ یا نواح مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہو، خواہ قبل ہجرت ہو یا بعد ہجرت، سو ہو سکتا ہے کہ غزوہ فتح میں۔ مثلاً یہ سورتیں نازل ہوئی ہوں اور اس سبب ان کو مکی کہتے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو سورہ بنی اسرائیل کی اس آیت "**وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ الخ**" اور سورہ روم کی پہلی آیت کی شانِ نزول خود اس بات پر شاہد ہے کہ ان کا نزول ہجرت سے پیشتر ہے۔

علاوہ بریں مولوی دلدار علی صاحب رسالہ ضیغمیہ میں سنیوں کے اس استدلال پر کہ آیت "**اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ**" حرمت متعہ پر دلالت کرتی ہے جو اعتراض کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں کہ یہ آیت مکی ہے۔ سو یہ اعتراض جب ہی وارد ہو سکتا ہے کہ مکی مدنی سے یہی مشہور اصطلاح مراد ہو یعنی مکی وہ ہے جو قبل ہجرت نازل ہوئی ہو اور مدنی وہ جو بعد ہجرت نازل ہوئی اور مولوی دلدار علی صاحب اس باب میں ہمارے موافق ہوں مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں آیت "**وآت ذا القربیٰ**" کی یہ تفسیر جو مولوی عمار علی صاحب اور سوا ان کے اور شیعہ کرتے ہیں سراسر غلط ہوگی۔

ذاالقربیٰ سے سیدہ اور حقہ سے فدک مراد ہوتو کئی محذور لازم آئیں گے، پہلا محذور خویش پروری

ماسوااس کے اہل فہم ودانش سے یہ التماس ہے کہ خدارا میری رورعایت نہ کریں پرانصاف کرنا بھی تو کچھ اہل بیت پر ظلم کے برابر نہیں جو اتنا پرہیز ہے کیا "ذاالقربیٰ" کے یہی معنی ہیں اور "حقہٗ" کا یہی ترجمہ ہے جو اس روایت میں مذکور ہے، بھلا سنیوں کو اوّل تو پاس ایمان، دوسرے یہ خبر بھی ہے کہ یہ روایت ساختہ و پرداختہ حضرات شیعہ ہے۔ پر جیسے یہودی، نصرانی، ہندو، عربی خوان کہ نہ ان کو یہ خبر ہے کہ یہ خبر سراسر غلط ہے اور نہ کچھ پاس عزت وعظمت رسول اکرم نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم، اگر اس آیت کو دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، سو بدولت عنایات حضرات شیعہ بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ دشمنان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ تہمت دُنیا طلبی اور حیلہ پردازی متہم کرکے یوں کہیں گے کہ یہ جبریل کا حوالہ فقط اس لیے گھڑ لیا تھا کہ اپنی بیٹی کے دینے میں کوئی تکرار نہ کرے ورنہ کلام اللہ کے الفاظ سے اس تفسیر کو کچھ مساس نہیں، "ذاالقربیٰ" ایک لفظ کلی ہے بمعنی قریب، فقط، حضرت فاطمہ میں کیوں کر منحصر ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتی کچھ ایک دو نہ تھے ہزاروں تھے خاص کر حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم جو بہ شہادت قرآن اور اصح الکتب شیعہ کافی کلینی قرابت میں حضرت فاطمہ ہی کے برابر تھیں، کچھ کم نہ تھیں۔ چنانچہ سند اس کی اوپر مرقوم ہو چکی اور اگر یوں کہیے کہ یہ دونوں صاحبزادیاں اس آیت کے نزول سے پہلے وفات پا چکی تھیں تو یہ تو غلط کیونکہ یہ مکی ہے اور ان دونوں کا انتقال مدینہ میں ہوا۔

دوسرا بلاغت کی مخالفت تیسرا بقیہ اقربا پر ظلم

اور سلمنا حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرات حسنین اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہم وغیرہ تو فدک کے قبضہ میں آنے کے وقت موجود تھے اور یہ سب باتفاق عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتی ہیں تو اس صورت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حق کیا دیا اور سب قرابتیوں کا حق تلف کر دیا اور اگر ہمارا یقین نہ ہو تو ان معنوں کی تصدیق کے لیے ہم مولوی عمار علی صاحب کو ہی شاہد لاتے ہیں، دیکھ لیجئے وہ خود اس آیت کے معنی یہی لکھتے ہیں کہ "دے تو اے محمد قریبوں کو حق ان کا" دوسرے حقہ کی تفسیر میں فدک کا کہنا بعینہ ایسا ہی مہمل جواب ہے جیسا کہ کسی نے اپنا نام ابجد سے بتلایا تھا۔ ع ف زبر عف غ ف زبر غف، میرا نام محمد یوسف، بھلا ایسی پوچ باتیں اللہ

اور اللہ کے رسول کی طرف نسبت کرنے میں انہیں اتنا بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں کسی نے کچھ کہہ لیا تو کہہ لیا، پر خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی کیا کہے گا، شاید ان افتراپردازیوں سے یہ غرض ہو کہ ہم سے اگر خدا اور رسول کے موافق نہیں ہوا جاتا، آؤ جتنا ہو سکے خدا اور رسول ہی کو اپنے موافق کرلیں۔ سبحان اللہ! ان تیرہ دروغوں سے یہ تو نہ ہوا کہ اعجاز کلام اللہ اور شرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آب وتاب دیں اور ظاہر کر دکھلائیں، پر ایسی باتیں کر کے دونوں کو چھپالیا بلکہ ایسی باتیں تراشیں کہ جن کو سن کر ناواقفوں کے تو ایک دفعہ کان کھڑے ہو جائیں اور جی میں متردد ہوں کہ یہ بلاغت اور فصاحت کلام اللہ کا شہرہ اسی خوبی پر ہے تو بلاغت اور فصاحت معلوم، اس چیستان لاحل بولنے سے کیا حاصل تھا۔ اگر ''وآتِ فاطمه فدک'' فرمادیتے تو لفظ مختصر اور معنی واضح ہو جاتے۔

چوتھا آنحضرت کی طرف ادائیگی حقوق میں کوتاہی کی نسبت

ہاں اگر اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بیع یا ہبہ وغیرہ سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی ملکیت فدک میں ثابت ہو جاتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے دینے میں کسی وجہ سے نعوذ باللہ کچھ تقصیر ہوئی ہوتی تو البتہ اس صورت فدک کی جگہ حقہ کہنے کا موقع بھی تھا کیوں کہ اگر کوئی کسی کی کوئی چیز دبالیتا ہے تو اس کو کہا کرتے ہیں کہ فلانے کا حق دے دو۔ القصہ جہاں مخاطب کے پاس کوئی کسی کی خاص چیز دبی ہوتی ہے یا کسی کے ذمہ کوئی حق معلوم ہوتا ہے تو وہاں البتہ اس چیز کا یا اس حق کا لفظ حقہ سے تعبیر کرنا بجائے خود ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل فہم پر پوشیدہ نہیں، کم فہم نہ سمجھیں تو بلا سے نہ سمجھیں۔

سو اگر مولوی صاحب کا کہنا سچ بھی ہو اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ احتمال محال ہو بھی سکے تب بھی کام نہیں چلتا کیونکہ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ فدک اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ملک میں ہو حالانکہ یہ بات خلاف مزعوم شیعہ ہے کیونکہ بیع کے انعقاد سے تو شیعوں کو بھی انکار ہے، باقی رہا ہبہ، سو وہ ان کے اعتقاد کے موافق بعد نزول اس آیت ہی کے واقع ہوا، اس لیے کہ وہ اس آیت ہی کو قبالۂ ہبہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت مذکورہ سے صاف ظاہر ہے اور ظاہر ہے کہ شے موہوب قبل از ہبہ واہب ہی کے ملک میں ہوتی ہے تو پھر فدک کو حقہ کی تفسیر میں کہنا روایت کے بنانے والے کی کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، عیب کرنے کو ہنر چاہیے۔

پانچواں بنی ہاشم کے لیے خمس حرام

اور اگر بپاس خاطر حضرات شیعہ مولوی صاحب کی بات کے بنانے کے لیے موافق نقل مشہور

"دروغے راجزا باشد دروغ" ہم بھی یوں کہنے لگیں کہ ہاں سچ ہے، یہ روایت سچی ہے اور "ذاالقربیٰ" سے مراد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حقہ کے معنی فدک ہی میں ہیں تو مولوی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے کہ اس صورت میں جہاں کہیں کلام اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا کا ذکر "بلفظ ذاالقربیٰ" ہوگا تو لازم ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی مراد ہوں اور جب یہ قرار پایا تو بعد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے کسی اور کو بنی ہاشم میں سے خمس کا حصہ لینا درست نہ ہوا اور وجہ اس نادرستی کی (درصورت مرقومہ) یہ ہے کہ آیت "وَاعْلَمُوا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ" کا ترجمہ یہ ہے "اور رسول کے واسطے اور قرابت والے کے واسطے اور محتاج کے لیے اور مسافر کے لیے فقط"

اب خمس کی یہ تقسیم جو اس آیت میں مذکور ہے ہماری تمہاری مقرر کی ہوئی نہیں خدا کی مقرر کی ہوئی ہے۔ اس میں کمی وبیشی مسلمانوں سے تو ہو ہی نہیں سکتی، پھر جب کہ "ذاالقربیٰ" حضرت فاطمہ ٹھہریں تو بعد ان کے اور کسی کو اولاد میں سے یا بنی ہاشم میں سے ان کے خمس میں سے لینا درست نہ ہو؟ حالانکہ مذہب شیعہ اس باب میں یہ ہے کہ نصف خمس امام وقت کا اور نصف باقی یتامیٰ اور مساکین اور ابن السبیل کے لیے، اور ظاہر ہے کہ امام شیعوں کے نزدیک سوائے دوازدہ آئمہ کے اور کوئی نہیں۔ سو وہ سب کے سب باتفاق شیعہ معصوم ہیں، سو شیعوں کی تقسیم کے موافق جو کچھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت میں خمس میں سے لیا، یا حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ لیں گے، بفحوائے روایت مرقومہ بالا ظلم اور حرام ہوگا اور اگر کوئی شیعہ مذہب جودتِ طبع کو کار فرما کر یوں کہے کہ ہرچند "ذا القربیٰ" حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی ہیں اور خمس اصل میں انہیں کے لیے ہے لیکن آئمہ کو بوجہ میراث خمس کا لینا جائز ہے تو میری یہ عرض ہے کہ اوّل تو میراث بقدر حصہ وارث چاہیے، سو کیا بعد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اماموں کے وقت میں سوائے اماموں کے سادات میں سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا اور کوئی وارث ہی نہ تھا؟ جو نصف خمس سارے کا سارا امام کے لیے تجویز ہوا۔

چھٹا، بعد وفات سیدہ جو غنائم آئیں وہ انکی ملک نہ تھیں تو حقہ کیوں فرمایا؟

اور سلمنا کہ حضرت زہرا کے مال کی وراثت انہیں اشخاص معدودہ کے لیے ہے لیکن جو چیز کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور حضرت امام مہدی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں غنیمت آئی یا آئے گی وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ملک ہی میں نہیں، مالک ہونے کے لیے حیات ضروری ہے تو اس صورت میں اوّل تو خداوند علیم حکیم کے اس فرمانے کے کیا معنی ہوں؟ کہ جو کچھ غنیمت لاؤ اس کا خمس ذاالقربیٰ یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور یتامیٰ وغیرہ کے لیے ہے؟

ساتواں، مالِ غنیمت آئمہ کیلئے حرام ورنہ دیگر مستحقین کیلئے بھی جائز

دوسرے جب وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ملک ہی نہ ہوئی تو بوجہ وراثت اماموں نے کیوں لیا اور یہ بھی نہ سہی خمس وراثت میں نہ آیا ہو بلکہ استحقاق خمس وراثت میں آیا ہو لیکن یہ کیا انصاف ہے کہ "ذاالقربیٰ" یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا استحقاق خمس تو بطور وراثت اولاد میں منتقل ہو جائے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یتیموں اور مساکین اور مسافروں کا استحقاق خمس بطور وراثت ان کی اولاد میں منتقل نہ ہو، اگر یہی توریث ہے تو اس زمانے کے یتامیٰ اور مساکین اور ابناء سبیل کی اولاد بھی ہر چہ بادا باد یتیم ہوں کہ نہ ہوں اور مساکین ہوں کہ غنی، مسافر ہوں یا مقیم، مصرف خمس ہوں اور اماموں کے زمانہ کے یتیم اور مسکین اور ابناء سبیل کو اس میں سے دینا درست نہ ہو، وہ یوں ہی خاک پھانکتے پھریں، مع ہذا جو سخن شناس ہیں وہ اس لفظ "فات ذاالقربیٰ حقہٗ" سے یوں سمجھتے ہیں کہ جناب باری کا حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوں ارشاد ہوا ہے کہ "ذاالقربیٰ" کا حق پورا پورا ادا کردو۔

آٹھواں، سیدہ کیلئے صرف فدک اور اغیار کیلئے سب کچھ

سو اگر "ذاالقربیٰ" حضرت فاطمہ ہوئیں اور ان کا حق فدک ٹھہرا تو اس صورت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تو ادا ہو گئے، باقی جو کچھ بچا اور جو کچھ سوا اس کے بطور فئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آیا، یا اس کے بعد غنیموں میں سے خمس میں آیا یا اس سے پہلے غنیمت میں سے خمس میں آیا تھا یا سوا اس کے جو کچھ اس آیت کا مفہوم قرار دیجئے، وہ سب مساکین اور ابن سبیل کا رہا اور ظاہر ہے کہ فدک اس قدر مجموعہ کے ساتھ ہزارویں حصہ کی نسبت بھی نہیں رکھتا، سو موافق گفتار شیعان "قدر شناسی عالم بالا معلوم" اس تقسیم میں خدا سے بھی بڑی افراط و تفریط ہوئی کہ حضرت فاطمہ سیدۃ النساء جگر گوشۂ سید المرسلین صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ اجمعین کے لیے تو فقط فدک اور باقی ساری دولت اغیار کے لیے اگر دُنیا سے بچانا تھا تو اس قدر کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی، قوت لا یموت تو فدک سے پہلے بھی ملے تھے، نعوذ باللہ منہا خداوند کریم عادل کجا اور یہ تقسیم ناموزوں کجا، یہ بعینہ ایسی ہی تقسیم ہے جیسا کہ مشہور ہے "از صحن خانہ تا بلب بام از آن من وز بام کاخ تا بہ ثریا از آن تو"

نواں، خدا پر بے انصافی کا الزام

سنیوں کے طور پر تو اس تقسیم کے جواز کی ایک صورت بھی ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی شان وہی

ہے جیسے کلام اللہ میں ہے: ''ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ'' لیکن شیعہ تو خداوند احکم الحاکمین کے ذمہ عدل بمعنی معلوم ایسے اُمور میں واجب بتلاتے ہیں۔ سو بڑے خیف کی بات ہے کہ (نعوذ باللہ) خدا ہو کر ایسی ناانصافی کہ زیادہ استحقاق والوں کو کم، اور کم استحقاق والوں کو زیادہ اور اگر کوئی صاحب یوں ارشاد فرمائیں کہ یہ روایت سنیوں کی کتابوں کے حوالوں سے مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے، اگر غلط ہو تو شیعوں کو کیا نقصان، سنیوں کے الزام کے لیے اتنا بھی بہت ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے تو اس کا جواب ہم سے سنئے، اوّل تو یہی غلط کہ روایت شیعوں کی نہیں کیونکہ مجمع البیان طبرسی میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت امام محمد باقر اور حضرت حضرت امام جعفر صادق کے حوالے سے یہ روایت موجود ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک عطا فرمایا اور اس کو ان کے سپرد کر دیا۔

اہل سنت کے یہاں روایت کے صدق وکذب کا معیار قرآن مجید ہے

باقی رہا سنیوں کی کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے تو اس کا جواب معقول ہم سے سنئے۔ جناب من یہ روایت سراسر دروغ ساختہ پرداختہ حضرات شیعہ ہے، چنانچہ تقریر ماسبق میں بخوبی اس بات کی تحقیق مندرج ہو چکی ہے لیکن مزید تسکین کے لیے اتنا اور بھی سنئے کہ سنی اوّل تو ایسے بے عقل نہیں کہ جھوٹ سچ کی تمیز ان کو نہ آتی ہو، اس پر کلام اللہ کے حرف، حرف کے اکثر سنی حافظ اور محافظ، ان کو ہر آیت کے سیاق سباق پر نظر رہتی ہے اور ایک مضمون کی جتنی آیتیں ہوتی ہیں ان سب کی خبر رکھتے ہیں، جیسے شیعہ بہ سبب اپنی تیرہ درونی اور کج عقلی اور کلام اللہ کے محفوظ نہ ہونے اور موقع استدلال کے سیاق سباق کے یاد نہ ہونے کے باعث صحیح مطلب کی جگہ غلط سمجھ جاتے ہیں، سنی غلط نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وہ بفضلہ تعالیٰ ان عیوب سے پاک ہیں بلکہ جیسے کسوٹی پر چاندی سونے کو لگا کر کھرا کھوٹا پرکھ لیتے ہیں، سنی روایات کو کلام اللہ پر مطابق کر کے صحیح ضعیف کو دریافت کر لیتے ہیں، سو وہ کیونکر ایسی روایات بے سند کو کہ قطع نظر بے سند ہونے کے اس آیت کا سیاق اور سباق بلکہ خود اس روایت کے لفظ اور معنی اس کے غلط ہونے کے گواہ ہوں، اپنی کتب میں درج کریں، یہ سب مقتدایان شیعہ کی چالاکی ہے تاکہ عوام اہل سنت کو اس تلبیس ابلیس سے جادہ مستقیم سے برطرف کر دیں۔

روایت فدک آیت کے سیاق سباق کی مخالف ہے

اوّل سیاق سباق آیت کی مخالفت تفسیر مذکور سے گوش گزار اہل انصاف ہے، خدارا غور سے

سنیں، میں نہیں کہتا کہ میری رورعایت کریں، ہاں البتہ انصاف کا خواہاں ہوں، سورۂ بنی اسرائیل میں دوسرے رکوع "وَقَضٰی رَبُّکَ" سے لے کر مابعد تک آیت "وَآتِ ذاالقربیٰ حقَّہ" کو ملاحظہ فرما کر دیکھیں کہ حروفِ خطاب سے مقصود فقط نفس نفیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا تمام اُمت؟ سو اہل فہم جانتے ہیں کہ مقصود خطاب سے تمام اُمت کا خطاب ہے کیونکہ "لَا تَعْبُدُوْا" اور "رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِکُمْ الخ" اور "لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ" وغیرہ میں تو ضمائر جمع ہی کے ہیں، باقی رہا "اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ وَآتِ ذَاالْقُرْبٰی" وغیرہ میں ہر چند بظاہر بوجہ وحدت خطاب اور بقرینہ "وَقَضٰی رَبُّکَ" جس میں ظاہراً خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ "وَآتِ ذاالقربیٰ" وغیرہ میں خطاب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے مگر نظر بعموم حکم و لحاظ قرینہ "لَا تعبدوا" وغیرہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب ہر شخص کے لیے ہے اور اس کا مخاطب ہر عام و خاص ہے، اس میں اور "لا تعبدوا" میں اگر فرق ہے تو یہی ہے کہ وہاں "اعنی لاتعبدوا" وغیرہ میں مخاطب متعدد، پر خطاب ایک، اور یہاں دونوں متعدد ہیں، جتنے مخاطب، اتنے ہی خطاب۔

رہی یہ بات کہ بقرینہ "وقضٰی ربک" خطاب بجانب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام وعلیٰ آلہ الکرام معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جملہ "وقضٰی ربک" اس امر کے لیے جب ہی قرینہ ہوسکتا ہے کہ جملہ وآت ذاالقربیٰ وغیرہ اس پر معطوف ہوں، سو اس بات کو اہل معانی و بیان سے دریافت کرنا چاہیے کہ انشاء کا عطف خبر پر اور ماضی کا عطف امر پر درست ہے کہ نہیں؟ حق یہی ہے کہ جملہ "وآت ذاالقربیٰ" اگر معطوف ہے تو "لاتعبدوا" پر معطوف ہے اور اگر یوں کہیے کہ "وَقَضٰی رَبُّکَ" اگرچہ بظاہر خبر ہے پر حقیقت میں بمعنی امر ہے قرینہ "لاتعبدوا" موجود ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں بھی "لاتعبدوا" کا قرینہ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ اگر یہ جملہ خبر بمعنی امر ہے تو خطاب بھی عام ہے۔

ہاں یہ بات اس صورت میں قابل استفسار ہے کہ جب دونوں جگہ مخاطب تمام اُمت ہی تھی تو نظم و نسق عبارت یوں مختلف کیوں ہوا؟ یا دونوں جگہ ضمیر جمع ہوتی؟ یا دونوں جگہ ضمیر واحد آتی؟ سو وجہ اس تغیر و تبدیل کی بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی حکم احکام متعددہ میں سے جو ایک ساتھ صادر فرمائے جائیں، بہ نسبت اور احکام کے زیادہ تر عظیم الشان ہوتا ہے یا بہ نسبت کسی خاص حکم کے مخاطبوں کی طرف سے تقاعد اور تکاسل کا گمان ہوتا ہے تو ایسی صورت میں حکام والا شان بنظر مزید

تاکید ہر ہر فرد بشر کی طرف خطاب کر کے حکم کیا کرتے ہیں۔ سو یہاں بھی بایں لحاظ کہ شرک کی برائی اور بر والدین کی بھلائی ہر عاقل کی عقل میں خود بخود جمی ہوئی ہے، اس کی ضرورت نہ دیکھی کہ جمدیہ منع فرمائیں اور بتاکید راہ پر لائیں، فقط تقدیم ذکر ہی پر، کہ یہ بھی ایک قسم کی تاکید ہے، اکتفا فرمایا۔

ہاں اداء حقوق ذوی القربیٰ علیٰ ہذا القیاس اس لحاظ سے صرف بیجا میں، اکثر بشر قاصر اور غافل نظر آئے، مناسب مقام یہ ہوا کہ زیادہ تر اہتمام کیا جائے۔ علاوہ بریں امر ونہی در بارہ توحید و شرک سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ خالق سے کیونکر معاملہ رکھنا چاہیے، ادھر اوامر ادائے حقوق اہل حقوق اور نواہی اسراف و تبذیر سے یہ غرض ہوتی ہے کہ خلائق کے ساتھ کیونکر رہنا چاہیے۔ غرض معاملات کی دو قسمیں ہیں، ایک خالق کے ساتھ ایک مخلوق کے ساتھ، علیٰ ہذا القیاس اور امر و نواہی بھی منقسم بدو قسم ہیں چونکہ اصلاح معاملات منظور ہے اور ہر معاملہ دو ہی شخصوں سے تمام ہوتا ہے سو معاملہ خالق میں تو تمام مخلوق برابر ہیں، ایک ہی خالق اور پھر سب کے ساتھ ایک ہی نسبت اس لیے اس کو تو ایک ہی معاملہ تصور کیجئے اور معاملہ مخلوق میں ہر شخص کا حال جدا کیونکہ اوّل تو ہر ایک کے اقرباء جدا، پھر اقربا میں سے بھی ہر شخص سے جدا قرابت، اس لیے ہر قرابتی کے ساتھ ایک جدا ہی معاملہ ہوگا۔ جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ اوّل صورت میں تو بلحاظ وحدت معاملہ ایک ہی خطاب مناسب ہے اور صورت ثانی میں بنظر تعدد معاملہ خطاب بھی جدا جدا چاہیے۔

وآت ذی القربیٰ میں مخاطب خاص اور خطاب عام ہے

اور اگر اب بھی کسی کے دل سے خلجان نہ جائے تو پھر بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ یہ تعصب بیجا ہے مگر تاہم ہمارا مطلب کہیں نہ گیا اگر خطاب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف ہوگا، تب بھی صحیح یہ ہے کہ مخاطب ساری ہی اُمت رہے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ "اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَا الخ" کے معنی یہی ہیں ''اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ماں باپ میں سے ایک یا دونوں، تو نہ کہہ ان کو ہوں اور نہ جھڑک ان کو، اور کہہ ان کو بات ادب کی الخ فقط'' اب میں پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد چالیس برس کے کلام اللہ نازل ہونا شروع ہوا اور والدین آپ کے بچپن ہی میں گزر گئے تھے، پھر جو آپ کو یہ حکم سنایا گیا تو بجز اس کے اور بھی کچھ معنی ہیں کہ اُمتیوں کو سنا سنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے ہیں۔ سو اسی طرح لفظ "آت ذا القربیٰ" کو سمجھنا چاہیے اور بیشتر اس قسم کے خطاب کہ سب سے بڑے کو منہ پر دھر لینا وہاں کہا کرتے ہیں کہ کسی وجہ سے اس کام کا زیادہ تر اہتمام اور عوام کی طرف سے اس میں کسی طرح کا تقاعد

ظہور میں آیا ہو یا تقاعد کا گمان ہو تو ایسے میں بڑے محبوبوں اور مقربوں اور افسروں کو منہ پر دھر کے کہا کرتے ہیں تا کہ سب سمجھ جائیں کہ جب ایسے محبوب اور مقرب کو اس حکم کی یہ تاکید یں ہیں تو ہمارا تو کیا ذکر ہے ہم کو بدرجہ اولیٰ اس حکم کی رعایت چاہیے، بالجملہ "اِمَّا یَبْلُغَنَّ" کے قرینہ سے مثل آفتاب روشن ہے کہ گو مخاطب خاص ہے پر خطاب عام ہے۔ چنانچہ "لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا" بھی فی الجملہ اس کی طرف اشارہ کرے ہے کیونکہ تبذیر سے منع کرنا کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں اور پھر یہ بات بھی قرینہ مذکورہ سے واضح ہو گئی کہ ماں باپ بھی ذا القربیٰ میں داخل ہیں بلکہ اس آیت میں زیادہ تر لحاظ انہیں کی طرف ہے لیکن خطاب عام جبھی ہو سکتا ہے کہ لفظ حقہ سے مطلقاً صلہ رحمی مراد ہو۔ چنانچہ ظاہر اور متبادر بھی یہی ہے ورنہ حقہ کا مصداق اگر فدک ہی ہو تو پھر کس کس مؤمن مسلمان کے پاس فدک ہے جو اقربا کے حوالے کرے۔ بالجملہ سیاق سباق آیت "آتِ ذا القُربٰی الخ" مندرجہ سورہ بنی اسرائیل تو بشہادت وجوہ مذکورہ اس تفسیر سے انکار کرتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس سورۂ روم کو خیال فرمایئے کیونکہ "اللّٰہ یبسط الرزق" سے لفظ "آت ذا القربٰی" کے مابعد تک اگر بغور تامل کیا جائے تو صاف واضح ہو جائے کہ یہاں بھی گو مخاطب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں لیکن خطاب عام ہے کیونکہ پہلے تو یہ مضمون ہے کہ اللہ کو اختیار ہے جس کو چاہے روزی فراخ دے، جس پر چاہے تنگ کر دے، اسی پر تفریع کر کے فرماتے ہیں کہ تو قرابتیوں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دیتا رہ۔ یعنی ہم نے اپنی بے نیازی سے کسی کسی کو مفلس اور تنگدست بنا دیا سو تو ان میں سے اس ترتیب کے موافق خبر لیتا رہ۔ پھر اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ یہ بات بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور وہی لوگ فلاح کے پہنچنے والے ہیں اور اس کے بعد اور بھی ایسے ہی مضمون عام ہیں۔ الغرض یہ جو لفظ "ذالک" کا اشارہ ہے یعنی یہ جو ارشاد ہوا کہ یہ بات بہتر ہے یہ اسی قرابتیوں کے حقوق اور مساکین اور ابناء سبیل کے حقوق کے ادا کرنے کی طرف اشارہ ہے، سو اسی طرح سے اشارہ فرما کر کہنا کہ یہ بات بہتر ہے ایمان والوں کے لیے، جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ کوئی حکم عام ہو۔ سو در صورت یہ کہ فدک مراد ہو تو اس تفسیر کا حال ہم تو نہیں کہہ سکتے، ایسا ہو جائے گا جیسے نعوذ باللہ مشہور ہے "من چہ می گویم وطنبور من چہ می گوید" الغرض دستاویز ہبہ فدک و فرمان عطاء فدک شیعوں کے نزدیک سورۂ روم کی آیت تھی۔ سو اس کے سیاق سباق کا بھی حال معلوم ہو گیا۔

حَقَّهٗ کا معنی فدک کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا

مع ہذا حقہ کی تفسیر فدک ہی ہو تو دو حال سے خالی نہیں یا معنی حقیقی ہو یا معنی کا ایک فرد ہو اور جیسے

کوئی شخص گھوڑے کو نہ جانتا ہو اور وہ کسی سے پوچھے کہ گھوڑا کیا شے ہوتا ہے اور اتفاق سے کوئی گھوڑا اس وقت سامنے آ جائے تو وہ دوسرا کہنے لگے کہ دیکھو یہ ہے گھوڑا، تو یہ جواب بیان معنی اور تفسیر حقیقت نہیں بلکہ حقیقت اسی کے ایک فرد کو بتا کر گویا یوں سمجھا دینا ہے کہ باقی افراد بھی اسی پر قیاس کر کے حقیقت مشترکہ کو سمجھ لو۔ ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے ہوں؟ اور حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک فرد کو افراد حقوق ذی القربیٰ میں سے بتلا کر مطلب کا راہ نکال دیا ہو؟ یا یوں کہیے کہ نہ یہ معنی لغوی ہیں اور نہ کوئی فرد معین منجملہ افراد کے بلکہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فقط مقدار حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے ہوں، سو اسی کا سوال کیا اور حضرت جبریل علیہ السلام نے اس مقدار ہی کا ذکر فرمایا۔ بالجملہ ان تین احتمال سے زیادہ اور کوئی احتمال نہیں جس کو غرض اصلی تفسیر مذکورہ کی قرار دیجئے اور حقیقت میں دیکھئے تو ایک بھی احتمال نہیں، مطلب آیت کا ظاہر ہے تفسیر کی کچھ حاجت نہیں۔

سو خیر اگر اس معنی کو معنی لغوی قرار دیجئے تو یہ تو ظاہر ہے کہ ظاہر البطلان ہے کونسا کودن یوں کہہ دے گا کہ اس لفظ کے معنی لغوی اور موضوع لہ مطابقی یہ معنی ہیں؟ اور اگر یوں کہیے کہ مدینۃ العلم اور معدن حکمت یعنی سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات حقیقت حق ذی القربیٰ کو نہ جانتے تھے اور حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک فرد کا بیان فرما کر حقیقت الامر سے مطلع فرما دیا تو یہ جرأت بھی مولوی عمار علی صاحب جیسے صاحبوں سے ہو سکتی ہے، اہل فہم کی زبان تو ایسی باتوں کے لیے نہیں اٹھتی، عاقل چھوڑ دیوانے بھی اتنا تو جانتے ہیں کہ حقیقت حق ذی القربیٰ یہی دُنیا دلانا ہے۔ چنانچہ لفظ آت خود صاف یہی کہتا ہے پھر جب کبھی کچھ دینے دلانے کا اتفاق ہوگا، وہی ایک فرد اس حقیقت کا ہو جائے گا۔

باقی رہا تیسرا احتمال بادی النظر میں البتہ فی الجملہ کچھ آیت مذکورہ کے پاس پاس کو پھرتا ہے لیکن بغور دیکھئے تو جواب خیر سے یہ بھی بعید ہے کیونکہ اوّل تو اقربا کے حق کی کوئی حد نہیں۔ شیعہ سنیوں کا سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جتنا کرے اتنا تھوڑا، دوسرے اس صورت میں لازم تھا کہ بیگھوں سے یا جریبوں سے مثلاً، یا باعتبار ربع یا ثلث مال کے تعین مقدار بیان فرماتے۔ اس صورت میں اس سوال و جواب کی وہی مثل ہو جائے گی، سوال از آسمان۔ جواب از ریسماں۔ نعوذ باللہ، اگر اس احتمال پر حضرات امامیہ جمیں تو غرابیہ کے اس عقیدہ کو بھی منظور فرمالیں کہ خداوند کریم کی طرف سے حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس وحی کے لے جانے کا ہوا تھا، پر حضرت جبریل علیہ السلام نے غلطی کے باعث حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی پہنچا دی کیونکہ اس

جواب سے بھی حضرت جبریل علیہ السلام کی خوش فہمی کچھ اس خوش فہمی سے جو غرابیہ کے طور پر دربارہ وحی رسانی ان سے ظہور میں آئی ہے کم نہیں۔

القصہ یہ تینوں احتمال اس تفسیر کے ابطال سے مالا مال ہیں۔ ہاں اگر فدک پہلے سے مملوکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہوتا اور بوجہ غلطی مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں ہوتا تو البتہ یہ تفسیر باعتبار ظاہر ٹھیک ہو جاتی لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اتنی بات کے سنی تو در کنار شیعہ بھی قائل نہیں بلکہ باتفاق شیعہ فدک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا، پر بعد نزول اس آیت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا۔ علی ہذا القیاس ذا القربیٰ کی تفسیر میں جو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا نام ہے اس میں بھی ان تینوں احتمالوں کا بطلان سمجھئے۔

ابن سبیل اور مسکین بھی استحقاق میں ذا القربیٰ کے ہم پلہ ہیں

اور ان سب باتوں کو جانے دیجئے۔ اگر ذا القربیٰ اور حقہ کے معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھے تو لفظ مسکین اور ابن سبیل بھی اس طرح کے اشکال اور خفاء معنی میں کچھ ذا القربیٰ اور حقہ سے کم نہ تھا۔ علی الخصوص تعیین مقدار حق مسکین اور حق ابن سبیل کہ ان دونوں کا عرف میں بھی کوئی قانون نہیں بخلاف قرابتیوں کے کہ ان کے لینے دینے کا ہر قوم میں ایک دستور بندھا ہوتا ہے، پھر کیا وجہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور اقربا کے حقوق کو تو حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا اور مسکین اور ابن سبیل بیچاروں کی بات بھی نہ پوچھی؟ اگر یہ عذر ہے کہ اس روایت میں نہ سہی، کسی اور روایت میں ہوگا تو مسلم، لیکن کسی دوسری ہی روایت سے مثل ذا القربیٰ کے مسکین اور ابن سبیل کے اشخاص معین کیجئے اور تعیین مقدار حق مسکین اور ابن سبیل بیان فرمایئے اور قطع نظر اس بات کے جناب باری تعالیٰ اس آیت میں ایک ساتھ تینوں کو ذکر فرماتا ہے۔ آیت "واعلموا انما غنمتم" وغیرہ کے ملاحظہ سے بھی یوں سمجھ میں آتا ہے کہ مسکین اور ابن سبیل استحقاق میں ذا القربیٰ کے ہم پلہ ہیں، جیسا ان کا دینا ضروری ہے، ویسا ہی ان کا، پھر کیا وجہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذا القربیٰ کے حق کے ادا کرنے کا تو فکر ہوا اور اس باب میں کنج کاؤ اور تفتیش اور استفسار فرمایا اور دربارۂ مسکین اور بیچارۂ ذلیل ابن سبیل کچھ لب کشا نہ ہوئے؟

باقی رہی روایات طرفین کی جو درباب فضیلت خدمت گزاری مساکین اور ابناء سبیل کے وارد ہیں، سو ایسی روایتیں صلہ رحمی کے فضائل میں بھی صدہا مشہور معروف ہیں، اگر مساکین اور ابن سبیل اور ان کے حقوق کی تفصیل اور تحقیق کا پہلے سے معلوم ہونا، اس قسم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے تو ذا

القربیٰ اوران کے حقوق کی تفصیل اور تحقیق کا معلوم ہونا بھی صلہ رحمی کے فضائل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ مسکین اور ابن سبیل کے باب میں اگر پوچھنے کی حاجت نہ تھی تو یہاں بھی نہ تھی اور اگر احادیث فضائل صلہ رحمی میں یہ احتمال ہے کہ شاید بعد اس آیت کے نزول کے لب مبارک نبوی سے صادر ہوئی ہوں تو یہاں بھی وہی احتمال، نہ ان کی کسی کے پاس تاریخ لکھی ہوئی نہ ان کی۔

آیت ذاالقربیٰ اگر مدنی ہے تو واعلموا کی طرف اشارہ ہے

یہ سب ردّ و کد تو اس صورت میں ہے کہ جیسا تمام اُمت خاص کر شیعہ اس آیت کو مکی کہتے ہیں، مکی ہی کہیں، اور اگر سارے جہان کے برخلاف جیسے مولوی صاحب نے واقدی اور بشیر بن ولید کے حوالہ سے اس آیت کا مدنی کیا؟ بعد خیبر کے نازل ہونا بیان فرمایا ہے۔ ہم بھی اس کے بعد خیبر کی فتح کے قائل ہوں تب ایک بات میں جھگڑا ہو چکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر یہ آیت بعد خیبر کے نازل ہوئی تو آیت "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ" پہلے نازل ہوئی ہے کیونکہ یہ تقسیم آیت واعلموا میں ہے۔ اسی تقسیم کے موافق فتح خیبر سے پہلے ہمیشہ غنیمتیں تقسیم ہوتی رہیں۔ سو اس صورت میں کیا حاجت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس تقدیر پر آیت "آت ذا القربیٰ حقہ" میں تقسیم مذکور کی طرف اشارہ ہوگا اور چونکہ اس تقدیر پر ذوی القربیٰ اور مسکین اور ابن سبیل تینوں کے حق سے شرح مشرح معلوم ہو جائے گی تو جو جو خرابیاں بر تقدیر صحت روایت معلومہ معلوم ہوتی تھیں، سب کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ بہر حال چار طرف وجوہات متعددہ اور قرائن داخلی خارجی اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ روایت محض دروغ اور سراسر بہتان ہے، بالجملہ باعتبار روایت کے تو سنیوں کو اس روایت کے غیر معتبر ہونے میں ان وجوہ سے تامل نہیں اور بے تامل یہ سمجھتے ہیں کہ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ مؤمنو اقربا اور مساکین اور مسافروں سے سلوک کرتے رہو اور اقربا میں سے ہر ایک کے ساتھ درجہ بدرجہ احسان اور محبت اور ادب اور تواضع سے پیش آؤ۔ ماں باپ کے ساتھ ادب اور خدمت گزاری اور اولاد کے ساتھ محبت اور خبرداری اور بھائی بند کے ساتھ حسن اخلاق اور مددگاری سے ملتے رہو۔ القصہ علی العموم سب مؤمنوں کو یہ حکم ہے، گو مخاطب فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، نہ یہ کہ فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فقط فدک حوالہ کر کے اس بار حکم سے سبکدوش ہو کر فارغ البال ہو جائیں۔

روایت مذکورہ کے وضعی ہونے کی دلیل خود عمار علی ہے

باقی رہا بطور قواعد روایت کے اس روایت کا غلط ہونا، سو اوّل تو اس روایت کے غلط ہونے میں اس وجہ سے شک وشبہ نہیں کہ مولوی عمار علی صاحب اس بات کے ناقل ہیں کہ یہ روایت سنیوں کی معتبر کتابوں میں ہے۔ اس سے زیادہ اس روایت کے غلط ہونے کی اور کیا نشانی ہوگی؟ کیونکہ مولوی صاحب کا صدق مقال اور راستی گفتار در بارہ نقلیات (ان تحریروں سے جو قریب ہی حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم دختران مطہرہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت اُم کلثوم جگر گوشۂ حضرت بتول رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقدمہ میں گزری ہیں بلکہ سوا اس کے اور تحریروں سے بھی) واضح ہو چکا ہے۔ پھر جب مولوی صاحب روایت میں ایسے امانت دار ٹھہرے کہ شیعوں کی ضد میں اپنے علماء اور اپنی معتبر کتابوں کو جھوٹ کی طرف نسبت کر دی ہو اور اپنے سب دین وآئین کا اعتبار کھو دیا ہو، سنیوں کے ذمے ایک بہتان باندھتے ہوئے ان کو کیا اندیشہ رہ گیا؟ ایسی باتوں میں یا خدا کا ڈر ہوتا ہے یا دُنیا کی شرم ہوتی ہے۔ سو قربان جایئے تقیہ کے، اس کے صدقہ سے دونوں کو بغل میں مارا مگر بایں ہمہ خنظروں کے اطمینان خاطر اور ناظرین کے دفع خلجان کے لیے لازم ہے کہ کچھ مفصل بھی بیان کیا جائے تا کہ یہ جو بالاجمال مولوی صاحب کا جھوٹا ہونا ثابت ہوا ہے، خوب دل نشیں ہو کر اہل فہم کو اہل سنت کی حقانیت اور شیعوں کا بطلان کالعیان ہو جائے مگر شاید مولوی صاحب کو اپنی اہانت کی شکایت ہو، سو ملازمان مولوی صاحب کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا کب ہو سکتا ہے؟ آپ کے دین کو تو دروغ ہی سے فروغ ہے۔ سو فروغ کی باتوں میں اگر آپ کی استقامت ہماری تقریر یا تحریر سے ثابت ہو جائے تو ہمارا ممنون احسان ہونا چاہیے۔

فصل، کتاب ومصنف کتاب کے قابل قبول ہونے کی چھ شرطیں

بالجملہ مزید اطمینان کے لیے اس باب میں کچھ دل لبریز تو کر یز قلم ہے مگر اوّل بطور تنبیہ یہ گزارش ہے کہ کتابیں آدمیوں ہی کی تصنیف ہوتی ہیں، جیسے آدمی سب طرح کے ہوتے ہیں، جھوٹے سچے معتبر غیر معتبر، فہمیدہ غیر فہمیدہ، ایسے ہی کتابیں بھی سب طرح کی ہوتی ہیں، ملحدانِ بے دین نے بہت سی کتابیں تصنیف کر کے اچھے اچھے بزرگوں کے نام لگا دیئے ہیں اور اس میں اپنے واہیات سینکڑوں بھر دیئے ہیں اور جو کتابیں کہ کبرائے اہل سنت کی تصنیف ہیں، اس میں سے بھی اکثر ایسی ہیں کہ وہ لوگوں کی فیض رسانی کے لیے تصنیف نہیں ہوئیں بلکہ بطور بیاض کے جمع

ی گئیں تا کہ نظر ثانی کر کے ان کی روایات کا حال معلوم کریں اور اتفاق سے نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا یا ہوا اور کسی وجہ سے وہ بیاضیں لوگوں کے ہاتھ پلہ پڑ گئیں اور بعضی کتابیں ایسی ہیں کہ وہ بہت کمیاب اور بدرجہ غایت نادر الوجود بلکہ بمنزلہ مفقود ہیں اور وہ ملحدوں اور مبتدعوں کے ہاتھ لگ گئی ہیں انہوں نے اپنی گھڑی ہوئی روایتیں اس میں داخل کر دی ہیں، یا اہل سنت کے مقابلے کے وقت کسی روایت کو ان کتابوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں تا کہ اہل سنت خاموش ہو جائیں۔

سو اہل تشیع اکثر ایسا ہی کرتے ہیں اور ایسی ہی کتابوں کا حوالہ دیا کرتے ہیں اس لیے اہل حق کو لازم ہے کہ جب کسی شیعہ سے کسی کتاب کا حوالہ سنے تو اوّل تو یہ دریافت کرے کہ یہ روایت اس کتاب میں ہے کہ نہیں؟ دوسرے اس کتاب کا حال تحقیق کرے کہ معتبر ہے کہ نہیں؟

پہلی شرط

اور معتبر ہونے کی یہ صورت ہے کہ کسی کتاب کی روایات کے معتبر ہونے میں چند باتیں ضروری ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس کتاب کے مصنف کو تفریح طبائع محزونہ کے لیے فقط قصہ گوئی اور افسانہ خوانی مدنظر نہ ہو بلکہ واقعات واقعی کے مشتاقوں کی تسکین کے لیے اس کتاب کو تصنیف کیا ہو ورنہ چاہیے کہ بہار دانش اور بوستان خیال کے افسانے اور چہار درویش اور بکاؤلی کی کہانیاں اور فسانہ عجائب اور فسانہ غرائب کے طوفان، سب کے سب دستاویز خاص و عام ہو جائیں۔

دوسری شرط

دوسرے یہ کہ مصنف کتاب کسی کی رو رعایت اور کسی سے بغض وعداوت نہ رکھتا ہو اور اس کا حفظ اخبار اور صدق گفتار اس درجہ کو مشہور ہو کہ اس کی تحریر کی نسبت کسی کے دل میں شک وشبہ نہ ہو، ورنہ طومار کے طومار اخباروں کے لڑکیوں کی زبانوں میں اپنے بزرگوں کی شجاعت اور ان کے غنیموں کی بزدلی سے مشحون ہوا کرتے ہیں، بالاتفاق مسلم ہو جائیں؟ اور یہ جو زبان زد خاص وعام ہے کہ اخباروں کا کیا اعتبار ؟ ایک حرف بیجا اور عقیدۂ ناسزا ہو جائے اور شیعہ سنیوں کی اور سنی شیعوں کی سندیات بر سر و چشم رکھنے لگیں اور ہر کس و ناکس کی بات قبول کرنے لگیں اور یہ فرق قوت وضعف، حفظ و تفاوت، صدق و کذب اور علیٰ ہذا القیاس یہ تہمت رو و رعایت، اور کینہ وعداوت، ہرگز قابل لحاظ نہ رہے۔

تیسری شرط

تیسرے یہ کہ مصنف کتاب باوجود صدق و دیانت اور حفظ عدالت کے اس فن میں جس فن کی

وہ کتاب ہے دستگاہ کامل اور ملکہ کما ینبغی رکھتا ہو نہ یہ کہ دین میں مثلاً نیم ملا ہو جس سے خطرۂ ایمان ہو یا طب میں مثلاً نیم طبیب ہو کہ بیماروں کو خطرۂ جان ہو۔

چوتھی شرط

چوتھے یہ کہ وہ کتاب باوجود شرائط مذکورہ کے قدیم سے مشہور و معروف اور ایسے قسم کے لوگوں کے واسطے سے جو مجموعہ اوصاف مرقومہ ہوں دست بدست ہم تک پہنچی ہو ورنہ لازم کیا الزم تھا کہ انجیل اور توریت جو کلام ربانی ہیں اور اس خدا کی تصنیف ہیں جو بوجہ اتم جامع اوصاف مذکورہ کیا۔ مجموعہ جمیع صفات کمال اور معدن جملہ کمالات جلال و جمال ہے۔ اعتبار اور اعتماد میں ہم پلہ قرآن مجید اور فرقان حمید کے ہو جائے؟

پانچویں شرط

پانچویں یہ کہ روایت کی کتاب میں اعتبار کے لیے ضروری ہے کہ مصنف کتاب نے اول سے التزام اس بات کا بھی کیا ہو کہ بجز صحیح روایتوں اور محقق حکایتوں کے اور روایتیں اپنی کتاب میں درج نہ کروں گا جیسے صحاح ستہ کہ ان کے مصنف نے یہ شرط کر لی ہے کہ بجز صحیح روایت کے اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے۔ اسی واسطے ان کتب کا نام صحاح ستہ مشہور ہو گیا۔ سو اگر کوئی کتاب کسی کی بیاض ہو کہ اس نے اس میں ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں اور صحیح غلط حکایتیں اس غرض سے فراہم کر لی ہیں کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح صحیح کو قائم رکھ کر باقیوں کو نقل کے وقت حذف کر دوں گا۔ جیسا کہ امام بخاری اور امام مسلم نے کیا یا صحیح کو صحیح بتلا کر موضوع یعنی بنائی ہوئی باتوں اور گھڑی ہوئی حکایتوں اور ضعیف وغیرہ کو لکھ کر اس کے بعد لکھ جاؤں گا کہ یہ موضوع ہے یا ضعیف ہے۔ مثلاً جیسے امام ترمذی نے کیا لیکن اتفاقات تقدیر سے ان کا یہ ارادہ پیش نہ کیا اور یہ آرزو پوری نہ ہونے پائی تھی، جی کی جی ہی میں تھی کہ اجل نے آ دبایا تو ایسی کتاب کی روایات کا ہرگز اعتبار نہ ہوگا ورنہ کون سا مصنف نہیں کہ اس نے اوّل ایک مجموعہ بیاض بطور کلیات کے فراہم نہیں کیا؟ امام بخاری سے بہت سندوں سے منقول ہے کہ انہوں نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر بخاری شریف کی حدیثیں نکالی ہیں اور عبدالرزاق بخاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے کوئی تین دفعہ حدیثوں کی بیاض اکٹھی کی تھی، چھانٹ کر بخاری شریف کا مسودہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ مضمون بخاری شریف مطبوعہ دہلی مطبع احمدی کے مقدمہ کی دوسری اور تیسری فصل میں مندرج ہے۔

بہر حال ایسی بیاضوں کا جمع کرنا ایسے ایسے آئمہ حدیث کی نسبت بھی ثابت ہے، سو اگر اتفاق سے امام بخاری مثلاً بعد فراہمی بیاض کے قبل اس کے کہ بخاری شریف کی حدیثیں اس میں سے چھانٹ کر بخاری تصنیف کریں، اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتے تو گو وہ بیاض امام بخاری ہی کی تصنیف سمجھی جاتی لیکن کوئی بتائے تو کیا وہ قابل اعتبار کے ہو جاتی؟ سب جانتے ہیں کہ اگر وہ ایسی ہوتی تو امام بخاری کو چھانٹنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس صورت میں خود امام بخاری ہی اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ میری بیاض قابل اعتبار نہیں، پھر ہم کیونکر فقط اس سبب سے اس کا اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ایسے بڑے محدث امام المحدثین کی تصنیف ہے کہ جہان میں نہ کوئی ثانی ان کا ہوا ہے نہ ہو۔ غرض اگر کوئی کتاب اس قسم کی کسی کو مل جائے اور اس کے مصنف کو کتنا ہی بڑا محدث کیوں نہ ہو، اس کی تہذیب اور تالیف کا اتفاق نہ ہوا ہو تو وہ کتاب کسی طرح علماء کیا جہال کے نزدیک بھی بشہادت عقل قابل اطمینان نہیں۔ ہاں مولوی عمار علی صاحب جیسے ماہر فن حدیث کا ذکر نہیں کہ وہ اُلٹی کے گجھن ہار ہیں۔ وہ اگر ایسی نامعقوم بات کہہ پڑیں۔ چنانچہ ان کا خط ایسی باتوں سے مشحون ہے تو اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہ ہوگا کہ باضافت مصدر الی المفعول کسی نے کہا ہے، جواب جاہلان باشد خموشی۔ بہر حال یہ نکتہ محفوظ رکھنا چاہیے کہ بسبب اس کے ملحوظ نہ رہنے کے اکثر عالم نام سے، گرفتارِ دام اوہام ہو جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ جاہل۔

چھٹی شرط

چھٹے یہ کہ اگر چند روایتیں باہم مختلف ہوں اور پھر اختلاف بھی حد تضاد یا تناقض کو پہنچ جائے، دونوں کا صحیح ہونا فقط مستبعد ہی نہ ہو تو پھر ترجیح باعتبار قوت سند ہی کے ہوگی ورنہ لازم ہے کہ شیعوں کے نزدیک روایات شیعہ اور روایاتِ اہل سنت جو مخالف روایاتِ شیعہ ہیں، دونوں صحیح ہوں، ایسے ہی کلینی کی یہ روایت کہ کلام اللہ کی سترہ ہزار آیتیں تھیں لیکن ماسواء مندرجہ مصاحف متداولہ کے سب چوری گئیں اور ابن بابویہ صدوق کی روایت کہ کلام اللہ اتنا ہی تھا، جتنا اب ہے، دونوں صحیح ہو جائیں۔ سو سب جانتے ہیں کہ اجتماع نقیضین اور ارتفاع نقیضین دونوں محال ہیں جب یہ بات مقرر ہو چکی تو گوش گزار اہل انصاف ہو کہ اوّل تو یہ روایت اور نیز باقی روایتیں جو الزام اہل سنت کے لیے اہل سنت کی کتابوں کے حوالہ سے مولوی عمار علی صاحب نے اپنے رقیمہ میں درج فرمائی ہیں ان کتب میں نہ سمجھنی چاہیے کیونکہ اعتبار کے ساقط ہو جانے کے لیے آدمی کا ایک جھوٹ بھی بہت ہے۔ مولوی صاحب کا دروغ تو اُمور متعددہ میں متحقق ہو چکا۔ چنانچہ ناظران ابحاث متعلقہ

نکاح حضرت اُم کلثوم جگر گوشۂ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور ملاحظہ کنانِ تقریر نسب حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم بنات مطہرہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود جانتے ہیں۔ گزارش مکرر کی کچھ حاجت نہیں، اگر یاد نہ رہا ہو تو پانچ سات ورق پلٹ کر ملاحظہ فرمالیں۔ معلوم ہو جائے گا کہ جب مولوی عمار علی صاحب نے اپنی کتب مشہورہ معتبرہ کی مرویات سے چشم پوشی کر کے ایک غرض خفیف یعنی سنیوں کی بات کے ہلکا کرنے کے لیے رقیمہ موسومہ میر نادر علی صاحب میں بہت سا کچھ خلاف واقع لکھ دیا اور پھر جرأت کر کے یہ کہہ دیا کہ اگر سند مطلوب ہو تو روانہ کر دی جائے اور یہ خیال نہ فرمایا کہ ہماری صحیح روایتیں غلط ہوئی جاتی ہیں۔ اگر سنیوں کے سر پر بھی ایک طوفان دھر دیں تو اس میں تو یہ بھی اندیشہ نہیں اور بڑی دلیل اس بات کی یہ ہے کہ جن کتابوں کے حوالے سے یہ روایت درج رقیمہ مولوی صاحب ہے، خود انہیں کتب کے مصنفوں کی مشہور کتابیں، اس روایت کو ردّ کرتی ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ مذکور ہوگا۔

اہل سنت کی کتب میں اہل تشیع کے الحاقات

اور سلمنا کہ یہ روایتیں سنیوں کی بعضی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن وہ کتابیں ایسی غیر مشہور ہیں کہ کمیابی میں بیضہ عنقا سے کم نہیں، سنیوں کو اُن کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ حفظ اور ضبط تو در کنار۔ سوا گر یہ روایتیں اُن کتابوں میں ہوں بھی تو بیش بریں نیست کہ جیسے بعض سیہ کاران قبیلۂ یہود نے منافقانہ نصرانی بن کر انجیل میں بہت سی خرافات خلاف عقل صریح اور مناقض نقل صحیح درج کر دی ہیں۔ ایسے ہی مقتدیان عبداللہ بن سبا یہودی منافق اعنی حضرات شیعہ بھی کہ بالیقین تبدیل و تحریف میں کوچک ابدال یہود مردود اور موافق نقل مشہور "سگ زاد برادر شغال" تیرہ درونی میں ان کے ہمرنگ اور قساوت قلبی اور سنگدلی میں ان کے ہم سنگ ہیں، قدیم سے درپے تخریب دینِ احمدی اور ہمہ تن مصروف تحریف آئین محمدی علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام رہے ہیں اور اہل سنت و جماعت کی جماعت پر دانت پیستے چلے آئے ہیں لیکن بایں وجہ کہ امتیان مسیح علیہ السلام کو نہ حفظ و محافظت انجیل سے کچھ کام تھا اور نہ اس کی تلاوت اور یادداشت میں چنداں اہتمام تھا، یہود مردود کا انجیل پر بھی داؤ چل گیا، چہ جائیکہ دیگر کتب زائد غیر مشہور۔

اہل سنت کا نظام حفاظت

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ ایک ایک حرف قرآن پر لکھو کھا سنیوں نے جھونپڑا باندھ رکھا ہے اور ہر ہر روایت صحاح ستہ وغیرہ کتب صحاح احادیث پر ہزاروں محدثین بیدار مغز نے تنقیح اور

تبلیغ اور حفظ وضبط کی یہ نوبت پہنچادی کہ کسی ملحد بے دین کو مجال زیادہ کم کرنے کی باقی نہ رہی۔ چنانچہ کثرت حفاظ قرآنی اور شیوع محدثین ربانی فرقہ اہلسنّت میں اس درجہ کو پہنچی ہے کہ مابہ الامتیاز ور مابہ الافتراق اہل سنت اور شیعہ ایک یہ بات بھی ہوگئی ہے الغرض اس وجہ سے کتاب اللہ اور صحاح ستہ وغیرہ کتب مشہورہ اہلسنّت تک تو ان تیرہ درونوں کا دست تطاول نہ پہنچا۔ گو بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے اور وعدہ ہائے "اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْن" اور "وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ" نے ان نابکاروں کی سعی بیجا کو انجام تک نہ پہنچایا لیکن نقل مشہور ہے۔ "اصل بداز خطا خطا نہ کند" جیسے اس بات سے ہارے تھے جھک مار کر چپ ہو رہتے۔ لاچار ہوکر کتب غیر مشہورہ کی طرف متوجہ ہوکر اپنے دل کے پھولے پھوڑے اور بہت سے طوفان ایسے جوڑے کہ عوام کیا بعض علماء سادہ لوح بھی ایک دفعہ کو بہل جائیں۔ سو منجملہ ان کے روایات مندرجہ رقیمہ مذکور بھی ہیں لیکن بحمد اللہ فرقہ اہل سنت وجماعت کہ ایک جماعت کلاں ہے۔ محققین سے کبھی خالی نہیں رہا، ان کو خداوند کریم جزائے خیر دے وہ لوگ ان کی دھوکہ بازیوں کو سمجھ گئے اور بامداد خداوندی انہیں روایات میں سے علامات اور امارات کذب و دروغ نکال کر عاقلوں کو متنبہ کردیا اور "عاقلوں کو طریقہ تمیز حق و باطل کا بتلا دیا۔ چنانچہ ان روایات کے ابطال کی تقریر کو دیکھ کر ان شاء اللہ یہ دعویٰ مدلل ہو جائے گا۔

القصہ دغا بازان شیعہ کی یہ چالا کی کتب غیر مشہورہ میں چل گئی، اسی واسطے علمائے اہل سنت ان کتب کو ہم سنگ توریت وانجیل سمجھتے ہیں اور ان کی روایات کو معتبر نہیں رکھتے۔ ہاں ان کی روایات کو روایات صحاح ستہ ودیگر کتب صحاح مشہورہ پر پیش کر کے جو مطابق نکلے اس کو بر سر و چشم رکھتے ہیں اور جو مخالف نکلے اس کو ملحدان بدعت کیش دروغ پیشہ شیعہ وخوارج وغیرہ کے سر مارتے ہیں اور جو روایات خلاف و وفاق سے برطرف ہو، اگر دلائل عقلیہ کے مخالف ہو تو اس کا بھی یہی حال ہے ورنہ اگر تکذیب نہیں کرتے تو تصدیق بھی نہیں کرتے۔ بہر حال جو روایت کہ ان کتب میں بلاشرکت غیر بھی پائی جائے، اگر روایت صحاح کے مخالف بھی نہ ہو تب بھی قابل تمسک اور لائق حجت نہیں سمجھتے اور مثل مرویات اہل کتاب بلکہ خود انجیل و توریت نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب۔

مصنف معتبر ہو تو ضروری نہیں کہ تصنیف بھی معتبر ہو

سو اگر کسی شیعہ کم فہم کو ان کتب کے غیر معتبر ہونے میں اس وجہ سے وثوق نہ ہو کہ اُن کتب کے مصنف منجملہ مقتدایان اہلسنّت ہیں تو کوئی ان سے پوچھے کہ انجیل و توریت کے مصنف تو خداوند اکرم الاکرمین ہیں اگر مصنف کا معتبر ہونا موجب اعتبار کتاب ہو جائے تو قرآن تو قرآن انجیل و

توریت شیعوں کے نزدیک معتبر ہو جائیں ورنہ لازم آئے کہ (نعوذ باللہ) جناب خداوند تعالیٰ کا شیعوں کے نزدیک کچھ اعتبار نہ ہو؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ شیعوں کو اس الزام سے کچھ اندیشہ نہیں کیونکہ وہ اب کون سے خدا کا اعتبار کرتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا بے اعتباری ہوگی کہ خدا کی رائے اور علم کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور بدا کے قائل ہو گئے "لعنۃ اللہ" علیٰ ہذا المذہب۔ بہرحال اہلسنت و جماعت کتب غیر مشہور غیر متداولہ کو ہرگز قابل اعتقاد نہیں جانتے اور بملاحظہ عداوت اور تجربہ دعادتِ دروغ بزرگواران شیعہ اس سے مطمئن نہیں کہ جیسے انجیل و توریت کو دشمنانِ دین نے تحریف کر دیا، کتب غیر مشہورہ کو ان حضرات نے حسب مطلب بدل دیا ہو۔

مصنف تحفہ کی ایک عبارت

اور اگر کوئی سادہ لوح میری اس بات کو کودنوں کی بات اور واہیات سمجھے تو بڑوں کی بات تو بڑی ہوتی ہے دیکھئے شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو شیعوں سے بھی زیادہ شیعوں کی عادات اور اُصول و فروع مذہب سے واقف ہیں تحفہ اثنا عشریہ میں باب مکائد شیعہ میں جو دوسرا باب ہے، کیا فرماتے ہیں، احتیاطاً بعینہا انہیں کی عبارت بلاغت آمیز نقل کرتا ہوں۔

کید سی و دوم ۳۲ آنکہ جمعی کثیر از علماء ایشان سعی بلیغ نمودہ اند، و در کتب اہل سنت خصوصاً تفاسیر کہ بیشتر دستمال علماء و طلباء می باشند و بعضے از کتب احادیث کہ شہرہ ندارند، و نسخ آن کتب متعدد بدست نمی آید، اکاذیب موضوعہ کہ موید مذہب شیعہ و مبطل مذہب سنیان باشد الحاق نمایند، چنانچہ قصہ ہبہ فدک در بعض تفاسیر داخل نمودہ اند کہ سیاق آن حدیث چنین روایت نمودہ کہ لَمَّا نَزَلَتْ وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهُ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ وَاَعْطَاهَا فِدَكَ اما بحکم آنکہ "دروغ گورا حافظ نباشد" بیاد شان نماند کہ این آیت مکی است و در مکہ فدک کجا بود؟ و نیز بایستے کہ برائے مساکین و ابن السبیل نیز چیزے وقف می کرد تا عمل بر تمام آیت میسر میشد و نیز اعطاھا فدک دلالت صریح بر ہبہ و تملیک نمی کند پس لفظ وہبہا بایستے وضع کرد۔ و علی ہذا القیاس در تفاسیر و سیر جستہ جستہ الحاقات ایشان یافتہ میشود، و درین کید ہم اکثر مغفلان از علمائے اہل سنت خبط می کنند و تشویش می کنند، و در شہر دہلی در عہد بادشاہ محمد شاہ دو کس بودند از امراء این فرقہ کہ کتب اہل سنت را مثل صحاح ستہ و مشکوٰۃ و بعض تفاسیر بخط خوش سے نویسانیدند و در آن حدیث مطلب خود از کتب امامیہ برآوردہ داخل نمودند، و آن نسخ را مجدول و مطلا و مذہب نمودہ بقیمت سہل در گزر سے میفر وختند، و در اصفہان آغا ابراہیم ابن علی شاہ کہ یکے از امراء کبار سلاطین صفویہ

بود، ہمیں اسلوب عمل کردہ لیکن بایں کید ایشان حاصلے نشد، زیرا کہ کتب مشہورہ اہلسنت بجہتِ کمال شہرت وکثرت نسخ قابل تحریف، نیستند وکتب غیر مشہورہ رااعتبارے نہ، والہذا محققین اہلسنت از کتب غیر مشہورہ نقل راجائز نداشتہ اند، مگر درترغیب وترہیب، وودرحکم صحائف انبیاء پیشین می شمارند کہ ہیچ عقیدہ وعمل رازان اخذ نتوان کرد بجہت احتمال تحریف انتہی، کلامہ الشریف۔

ترجمہ: بتیسواں ۳۲ مکر۔ ان کے علماء کے بڑے گروہ نے بے حد کوشش کی ہے کہ کتب اہل سنت میں (خصوصاً تفاسیر میں (جوان کے طلباء وعلماء کی دستمال بنی رہتی ہیں) اور بعض کتب احادیث میں جو غیر مشہور ہیں اوران کے متعدد نسخے ہاتھ نہیں لگتے) خود ساختہ ایسے بڑے جھوٹ شامل کر دیں جو شیعہ مذہب کی تائید کریں اور مذہب اہل سنت کی جڑ کاٹ دیں۔ چنانچہ ہبہ فدک کا قصہ بعض تفاسیر میں داخل کر کے یوں روایت لاتے ہیں کہ جب آیت "وآتِ ذا القربیٰ حقّہٗ" نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اوران کو فدک عطا فرمایا لیکن موافق مثل مشہور "جھوٹے کی یادداشت نہیں ہوتی" ان کو یہ یاد نہ رہا کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں فدک کہاں تھا؟ اور یہ بھی تو چاہیے تھا کہ آپ ابن سبیل اور مساکین کے لیے بھی کچھ وقف کرتے تا کہ پوری آیت پر تو عمل ہو جاتا۔ نیز "اَعْطَاھَا فِدَکَ" یہ الفاظ ہبہ وتملیک پر صریح دلالت بھی نہیں کرتے۔ "وَھَبَھَا" کا لفظ گھڑنا چاہیے تھا۔ الغرض اس جیسی کئی مثالیں تفسیرات اور کتب سیرت میں پائی جاتی ہیں اور اس چال میں کئی سیدھے سادھے علمائے اہل سنت بھی چکرا جاتے ہیں۔ شہر دہلی میں محمد شاہ کے عہد میں دو آدمی جو فرقہ شیعہ کے امراء میں سے تھے، اہل سنت کی کتابیں مثل صحاح ستہ، مشکوٰۃ اور بعض تفسیریں خوش خط لکھتے اوران میں کتب شیعہ سے ایسی روایتیں داخل کر دیتے جو ان کے مطلب کی ہوتیں، پھر ان کی اعلیٰ جلد بندی، جس پر سونے چاندی کا کام بنا ہوا ہوتا، کرا کے سستے داموں کسی راہ گزر میں فروخت کر دیتے۔ اسی طرح اصفہان میں آغا ابراہیم ابن علی شاہ جو سلاطین صفویہ کے بڑے امراء میں سے تھا، یہی چال چلتا تھا لیکن اس مکر سے ان کو کچھ حاصل نہ ہوا کیونکہ اہل سنت کی مشہور کتابیں بے حد شہرت اور کثرت تعداد کی وجہ سے تحریف اور تبدیل کو قبول نہیں کرتیں اور غیر مشہور کتابیں ان کے ہاں معتبر ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ محققین نے کتب غیر مشہورہ سے سند لانے کو جائز نہیں رکھا (سوائے ترغیب وترہیب کے) بلکہ ان کو صحف انبیاء جیسا سمجھا ہے جن پر عقیدہ وعمل کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ کلام مبارک ختم ہوا۔ ترجمہ از ناشر

عمارعلی نے بعض کتب شیعہ بھی اہل سنت کی طرف منسوب کردیں

اگر ہم بپاس خاطر مولوی عمار علی صاحب اور بھی چشم پوشی کریں اور ان کے اور ان کے بزرگواروں کے ذمہ اس بات کی نسبت نہ کریں کہ انہوں نے اپنے مطلب کے موافق بعضی روایتیں سنیوں کی غیر مشہور کتابوں میں رلا ملا دی ہیں، تب بھی مولوی عمار علی صاحب کی بات کا پتہ معلوم کیونکہ جن کتابوں کا حوالہ مولوی صاحب نے درج رقیمہ کریمہ فرمایا ہے، ان میں بعضی کتابیں تو ایسی ہیں کہ سنیوں میں سے کسی نے ان کا نام بھی نہیں سنا اور نہ ان کے مصنفوں کا اہل سنت میں سے کوئی نام نشان جانے، مثل تاریخ آل عباس کہ علماء سنت نے اس کتاب کو شاید کبھی سنا بھی نہ ہو بلکہ یہ اس قسم کی کتابیں ہیں جیسے شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے۔

''کید بست ویکم آنکہ کتابے رانسبت کنند بیکے از کبراء اہل سنت ودوران مطاعن صحابہ و مبطلات مذہب اہلسنت درج نمایند الے آخرہ''

ترجمہ از ناشر، اکیسواں مکر: ''کسی کتاب کو اکابر علمائے اہلسنت کی طرف منسوب کردیتے ہیں، پھر اس میں مطاعن صحابہ اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی روایتیں گھڑ کر داخل کردیتے ہیں۔''

سو اگر یہ کتاب موجود بھی ہو تب کسی شیعہ مکار کی ہوگی اور بعضی کتابیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مصنفوں کو فنِ حدیث اور فنِ تاریخ میں دستگاہ کامل اور تمیز صحیح وغلط ہرگز نہ تھی، جیسے معارج النبوۃ، ہاں مدارج النبوۃ کا حوالہ اگر زیب رقیمہ ہوتا تو ہمارے بر سرو چشم تھا لیکن ایسی معتبر کتاب میں سے مولوی صاحب کے ہاتھوں میں کیا آتا؟

علامہ سیوطی کی تصانیف پر مصنف کتاب کی رائے

اور بعضی کتابیں ایسی ہیں کہ ہر چندان کے مصنف فن حدیث میں مہارت کامل اور مشق کماینبغی اور تبحر وافر رکھتے تھے۔ جیسے شیخ جلال الدین سیوطی وغیرہ، لیکن انہوں نے اپنی ان کتابوں میں جن کا حوالہ مولوی صاحب کے رقیمہ میں مندرج ہے یہ التزام نہیں کیا کہ بجز روایات صحیحہ اور کچھ داخل نہ کریں گے بلکہ رطب ویابس بطور بیاض کے جمع کرلیا ہے۔ جیسے جمع الجوامع کہ اس کا نام ہی اس بات پر شاہد ہے اور نیز اس کا حال شہرہ علمائے آفاق ہے۔ یا بغرض تفریق وتمیز صحیح وغلط جمع کیا ہے ۔ جیسے تفسیر درمنثور اور علیٰ ہذا القیاس موضوعات ابن جوزی کہ ان دونوں کتابوں میں اگرچہ ہر قسم کی مخالف موافق روایتیں پائی جاتی ہیں لیکن ان روایتوں کے ساتھ اس میں یہ بھی ساتھ ہی لگا ہوا ہے

کہ یہ روایات غلط ہیں اور یہ اس واسطے کیا ہے کہ کل کو مولوی عمار علی صاحب جیسے مکار دغا باز ان روایتوں کے بھروسے کسی سادہ لوح کو دھوکا نہ دے بیٹھیں اور اسی غرض کے لیے متقدمین محدثین بھی ایسا کرتے ہیں۔ چنانچہ امام ترمذی اور امام ابوداؤد اکثر جگہ لکھ جاتے ہیں ہذا حدیث ضعیف۔

اور بعضی کتابیں ایسی کمیاب ہیں کہ اگر مولوی عمار علی صاحب یوں فرمانے لگیں کہ اس کی تمام روایتیں ہو بہو مطابق مذہب شیعہ اور اصول وفروع شیعہ بتمامہا اس کی روایات کے مطابق ہے تو بوجہ کمیابی ان کتب کے مولوی صاحب کی کسی سے زبان نہ پکڑی جائے، سچا تو خدا سے ڈرے جھوٹے کو کس کا ڈر، اس کی زبان کو لگام بھی نہیں ہوتی مگر جتنا کچھ اس خط میں مولوی صاحب نے کیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں اور انہوں نے کیا کیا، یہ مکاریاں اور دغا بازیاں تو میراث بزرگواران شیعہ ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہ العزیز رقم فرماتے ہیں۔

''کید بست و دوم آنکہ مطاعن صحابہ و مبطلات مذہب اہلسنّت از کتب نادر الوجود کمیاب ایشان نقل نمایند حالانکہ در آن کتب اثرے ازان نباشد و بسبب آنکہ آں کتب پیش ہر کس و در ہر وقت و ہر مکان موجود نمیشود اکثر ناظران در شبہ و شک افتند و بخاطر شان رسد کہ اگر ایں نقل صحیح باشد تطبیق درمیان او و دیگر روایات اہل سنت چہ قسم خواہد بود۔ حالانکہ ایں بیچارہا عبث در دسرے کشند و نمی فہمند کہ اگر بالفرض نقل صحیح ہم باشد محتاج تطبیق وقتے خواہیم باشد کہ ہر دو روایت در یکدرجہ باشند از شہرت و صحت ماخذ و صراحت دلالت و کمیت رواۃ و چوں ایں امور در ان نقل مخفی مستور است مقابل روایات مشہورہ صحیحۃ الماخذ صریحۃ الدلالۃ چرا باید کرد و کتابہائے کہ ازان فرقہ شیعہ برائے الزام اہل سنت نقل می کنند ہمہ ازیں قبیل است کہ نادر الوجود کمیاب میباشند و علی تقدیر الوجدان مصنف آن کتب التزام صحت جمیع مافیہا نہ کردہ اند بلکہ بطریق بیاض رطب و یابس در آں جمع نمودہ محتاج نظر ثانی گذاشتہ اند، اردبیلی صاحب کشف الغمہ و حلی صاحب الیقین ازہمیں قبیل دختر دختر نقل کنند و بزعم خود گوئے از میدان مناظرہ برند و ابن طاؤس نیز در مؤلفات خود ازہمیں جنس خر دور ہا پر کردہ و باعتقاد خود اہلسنّت را الزام دادہ انتہے کلامہ الشریف''

ترجمہ از ناشر: بائیسواں مکر: ''یہ ہے کہ اہل سنت کی نادر الوجود کمیاب کتابوں سے صحابہ کی اہانت کرنے والی اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی روایات نقل کرتے ہیں حالانکہ ان کتابوں میں ایسی روایات کا نام نشان بھی نہیں ہوتا لیکن چونکہ ہر جگہ ہر وقت ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتیں۔ لہٰذا اکثر سننے دیکھنے والے شک وشبہ میں پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل میں یہ آتا ہے

کہ اگر یہ نقل صحیح ہوئی تو اس میں اور دیگر روایات اہل سنت میں مطابقت کس طرح ہوگی حالانکہ (یہ بیچارے مفت پریشان ہوتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے) اگر بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہو تو تطبیق کی ضرورت اس وقت پڑے گی جب دونوں روایتیں شہرت وصحت ماخذ وصراحت دلالت وعدد رواۃ وغیرہ میں برابر ہوں اور جب یہ باتیں اس مخفی روایت کے بارے میں معلوم ہی نہیں تو روایات مشہورہ صحیحۃ الماخذ وصریحۃ الدلالت کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے اور وہ کتابیں جن سے اہل شیعہ اہل سنت کو الزام دینے کے لیے روایات نقل کرتے ہیں، وہ ایسی ہی ہیں جو ہاتھ نہ آنے والی اور کمیاب ہوں اور اگر ملیں بھی تو ایسی ویسی ہوتی ہیں کہ مصنف نے ان میں مندرجہ تمام روایات کی صحت کا التزام نہیں کیا ہوتا بلکہ بطریق بیاض رطب ویابس اس میں جمع کر کے نظر ثانی کے لائق چھوڑا ہوتا ہے۔ اردبیلی صاحب کشف الغمہ اور حلی صاحب الیقین اس قسم کی روایتوں کے دفتر وں کے دفتر نقل کر کے اپنے خیال میں گویا میدان مناظرہ میں جیت جاتے ہیں اور ابن طاؤس نے بھی اپنی مؤلفات اسی طرح کی دھوکہ بازیوں سے بھر رکھی ہیں اور بزعم خود اہل سنت کو بڑے بڑے الزام دے دیئے ہیں۔"

بہر حال جب ان بزرگواروں کی ایسی ایسی بزرگیاں تجربہ معلوم ہو چکی ہوں تو پھر کتب کمیاب کے حوالہ کا کیا اعتبار رہ گیا؟ اوّل تو یہی یقین کرنا چاہیے کہ ان کتب میں اصل سے ان روایات کا نام ونشان بھی نہیں اور اگر اس پر تسکین نہ ہو تو بالفرض اگر ایسی روایتیں ان کتب میں ملیں بھی تو وہ انہیں کذابوں کی تراشی ہوئی ہیں۔ پھر اس پر اکثر یہ کتابیں بطور بیاض کے مجموعہ رطب ویابس ہیں ان کے مصنفوں کو نظر ثانی کا اتفاق نہ ہوا جو تلخیص کر کے صحیح صحیح روایتیں جدا کر کے باقیوں کو حذف کر دیتے، یا لکھ جاتے کہ یہ روایتیں موضوع ہیں یا ضعیف ہیں۔

واقدی کے بارے میں آئمہ محدثین کی رائے

مع ہذا مولوی صاحب نے بعض ایسی کتابوں کا حوالہ لکھ دیا ہے کہ نہ ان کتابوں کو کوئی جانے نہ اس کے مصنف کو کوئی پہچانے، جیسے تاریخ آل عباس، پھر جرأت تو، دیکھو کس دلیری سے کہتے ہیں کہ تاریخ آل عباس اہل سنت کی معتبر کتابوں میں سے ہے۔ پھر اس پر اس کتاب میں یہ روایت بھی ہے تو واقدی کی روایت سے جن کی جھوٹی تو جھوٹی سچی بات بھی جھوٹی ہی سمجھی جاتی ہے، ان کی تعریف میں جو کچھ محدثین نے لکھا ہے دیکھئے پیش نظر کرتا ہوں، مجمع البحار میں امام نسائی کے حوالے سے جو فن حدیث میں امام ہیں اور ان کی کتاب من جملہ صحاح ستہ ہے یوں لکھا ہے کہ امام نسائی نے فرمایا ہے کہ ایسے کذاب جو حدیثوں کے بنانے میں معروف ہیں، چار ہیں۔ ابن ابی یحییٰ مدینہ میں واقدی بغداد

میں، مقاتل بن الیمان خراسان میں، محمد بن سعید مصلوب شام میں اور پھر زیدف نے شرح الشفاء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ واقدی کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔ بعدازاں امام شافعی کا قول واقدی کی شان میں مقاصد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹی ہیں۔ اب مولوی صاحب انصاف فرمائیں کہ جب تاریخ آل عباس کا تو یہ حال ہو کہ علماء اہل سنت میں سے کوئی اسے جانتا ہی نہیں اور پھر ان کے راوی ایسے نورعلی نور ''وزیرے چناں شہریارے چنیں'' تو پھر اہل سنت کیونکر ان روایات پر اعتماد کریں، اگر شیعوں کی طرح سنیوں کے دین کا جھوٹ پر دارومدار ہوتا تو البتہ مضائقہ نہ تھا، سوایسی کتابوں کا ناواقفان اہلسنت کے سامنے حوالہ دینا کمال بددیانتی اور دغابازی اور بے حیائی کی بات ہے، اہل فہم پر مثل آفتاب روشن ہے کہ یہ کتاب اگر ہے بھی تو کسی شیعہ دغاباز کی تصنیف ہے۔

عمار علی کی تاریخ دانی

پر اس دغا کا حوصلہ مولوی صاحب کا تو معلوم نہیں ہوتا ہاں البتہ کسی پرانے ابلیس طینت کی کرتوت ہے ورنہ اس استعداد اور اس سلیقہ پر کہ مامون عباسی کے نام پر لفظ رشید بھی بڑھا دیا، یہ فتنہ گری ممکن معلوم نہیں ہوتی کیونکہ عیب کرنے کو ہنر چاہیے۔

فلک کا منہ نہیں اس فتنہ کے اُٹھانے کا ستم گر ایک تیرا ناز ہے سارے زمانے کا

سبحان اللہ! مولوی صاحب کو اس تبحر اور اس علم و فضل پر کہ اب تک یہ بھی نہیں جانتے کہ ملقب برشید ہارون تھا یا مامون تھا؟ دربارہ غصب فدک یہ یقین ہوگیا ہے کہ خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا شاید اب تک آپ کو اتنا یقین نہ ہو؟ اور تنہائی میں سنیوں پر یہ جوش وخروش ہے کہ جامہ سے باہر نکلے جاتے ہیں۔

فدک فیئ تھا موہوب ومملوک نہ تھا

کوئی مولوی صاحب کو تھامے تو ہم مولوی صاحب کو سارے مراتب سمجھا کراتا اور سمجھائیں کہ اگر ہم ان سب مراتب سے درگزریں تو ہمیں ابھی اور بہت گنجائش باقی ہے کیونکہ اوّل تو آیت ''مَآ اَفَاءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ'' جو سورہ حشر میں واقع ہے اس بات پر شاہد ہے کہ قریہ فدک ہو یا غیرہ، بالاتفاق از قسم فیئ تھا، مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہ تھا۔ چنانچہ ان شاء اللہ بحث میراث میں جو حدیث ''لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ'' سے متعلق ہے، معلوم ہو جائے گا۔ یہ ہبہ ہونے کی کون سی صورت ہے۔ جو روایت ہبہ فدک کو صحیح سمجھئے؟ بلکہ بالیقین غلط ہوگی کیونکہ اس

صورت میں روایت ہبہ کلام اللہ کی مخالف ہوگی اور جو روایت کہ کلام اللہ کے مخالف ہو، وہ بالا جماع بالیقین غلط ہے۔ مع ہذا مشہور کتابوں میں جو تمام علماء کی دستمال رہتی ہیں اور اعتبار میں قریب قریب کلام اللہ کے ہیں، وہ روایتیں موجود ہیں کہ وہ فدک کے ہبہ نہ ہونے پر اسکی واضح دلالت کرتی ہیں کہ مولوی صاحب نے جو روایتیں اپنے صحیفہ میں درج فرمائی ہیں، وہ فدک کے ہبہ ہونے پر اتنی دلالت نہیں کرتیں، سو اُن روایتوں کی شہرت اور صحت اور صراحت دلالت کو چھوڑ کر ایسا کون نادان ہوگا کہ مولوی صاحب کے ان ہذیانات پر کان لگائے گا اور سوائے مولوی صاحب کے ایسا کون ہے کہ ان افسانہ ہائے بے سند پر تکیہ جمائے گا، اگر باور نہ ہو تو ملاحظہ فرمائیے۔

فدک کے مختلف تاریخی دور

مشکوٰۃ شریف جو اشہر کتب اہل سنت ہے اس میں یہ روایت موجود ہے۔ ابوداؤد کی روایت سے حضرت مغیرہ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن مروان خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مروانیوں کو جمع کیا اور یہ کہا کہ:

"اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهٗ فِدَكٌ فَكَانَ يُنْفِقُ مِنْهَا وَيَعُوْدُ مِنْهَا عَلٰى صَغِيْرِ بَنِيْ هَاشِمٍ وَيُزَوِّجُ مِنْهَا اَيِّمَهُمْ وَاِنَّ فَاطِمَةَ سَالَتْهُ اَنْ يَجْعَلَهَا لَهَا فَاَبٰى فَكَانَتْ فِيْ حَيَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا اَنْ وَلِيَ اَبُوْبَكْرٍ رضی اللہ عنہ عَمِلَ بِهَا بِمَا عَمِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَيٰوتِهٖ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا اَنْ وُلِّيَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَمِلَ فِيْهَا بِمَا عَمِلَا حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ ثُمَّ اَقْطَعَهَا مَرْوَانُ ثُمَّ صَارَتْ الْعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ فَرَاَيْتُ اَمْرًا مَنَعَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ وَاِنِّيْ اُشْهِدُكُمْ اَنِّيْ رددتها عَلٰى مَا كَانَتْ، يعنى عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِيْ بَكْرٍ و عُمَرَ"

"حاصل اس کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک تھا۔ سو اس میں سے خرچ کیا کرتے تھے اور دیتے رہتے تھے۔ بنی ہاشم میں کے یتیموں کو اور بے شوہر عورتوں کے نکاح اس مال میں سے کرادیا کرتے تھے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے یہ درخواست کی کہ فدک حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو عنایت فرمائیں اور ہبہ کردیں، سو آپ علیہ السلام نے اس بات سے انکار فرمایا اور بدستور مذکور اسی طرح آپ اس میں سے تادم واپسیں خرچ مذکور نباہتے رہے، یہاں تک کہ آپ اس عالم سے تشریف لے گئے، بعد میں جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بھی جیتے جی

یہی عمل کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ بھی واصل بحق ہوئے، پھر جب حضرت عمر والی ہوئے تو وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے موافق عمل کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ بھی چل دیئے، پھر جب مروان کا (یعنی اپنے وقت میں) قابو چلا تو اس نے اسے اپنی جاگیر کرلیا، پھر رفتہ رفتہ مجھ تک نوبت پہنچی اور یہ چیز میرے قبضہ میں آئی، سو میری رائے میں یوں آتا ہے کہ جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہ دی ہو مجھے سزاوار نہیں اور میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ میں نے فدک کو اسی انداز پر کردیا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں تھا۔ فقط"

یہاں تک حاصل مطلب روایت تھا اب اول تو عرض یہ ہے کہ اس روایت میں جو بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذکر کے مروان کی جاگیر بنالینے کا ذکر ہے تو مولوی صاحب یا کوئی ان کا ہمرنگ ہمسنگ یہ نہ سمجھ جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد متصل ہی فدک پر اس کا قبض وتصرف ہو گیا تھا بلکہ یہاں قصہ کو مختصر کرکے یوں کہہ دیا ہے کہ انجام کار مروان کے قبض وتصرف میں آ گیا ورنہ باتفاق اہل تواریخ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی بدستور سابق ہی رہا اور قصہ کے مختصر کرنے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اول تو لفظ "اقطعها" اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ یہ کام اس نے اپنی خلافت میں کیا۔ چنانچہ عربی دان جانتے ہیں کہ اقطاع کے معنی جاگیر کردینے کے ہیں، سو جاگیر کردینے کا اختیار بجز خلیفہ اور کسی کو نہیں ہوتا، دوسرے اگر قصہ مختصر نہ ہو تو یہ معنی ہوں کہ بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متصل ہی مروان قابض ہو گیا اور علی الاتصال قابض رہا اور پھر بعد اس کے متصل ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے قبض وتصرف میں آ گیا۔

سو واقفانِ فنِ تاریخ پر روشن ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، بعد حضرت عمر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے اختیار میں تھا اور ان کے بعد باتفاق شیعہ وسنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اختیار میں تھا، پھر جب کبھی مروان کا زمانہ ہوا تو البتہ اس نے اس کو اپنی جاگیر کرلیا، پھر اس کے مرنے کے بعد کئی خلیفہ ہوئے ان کے بعد کہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی نوبت آئی اور یہ قصہ کا مختصر کرنا کلام اللہ میں بیسیوں جگہ موجود ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت یوسف علیہم السلام کے قصہ کو ملاحظہ فرما دیکھیں۔ بہرحال قصہ مختصر یہ ہے باجماع اہل سیر وتواریخ وعلمائے حدیث ثابت اور محقق ہے کہ فدک وغیرہ متروکہ، نبوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے قبضہ میں تھا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا قبضہ رہا، حضرت

عباس کا دخل اُٹھ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن، حضرت حسن کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما، پھر امام زین العابدین اور حضرت حسن بن حسن رضی اللہ عنہما کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد زید بن حسن برادر حسن بن حسن کا قبضہ رہا رضی اللہ عنہم اجمعین، یہاں تک تو اس کا جمع خرچ بدستور قدیم رہا، ان سب کے بعد مروان کے پنجوں میں پھنس گیا، یہاں تک کہ نوبت حضرت عمر بن عبدالعزیز کی آئی، انہوں نے بہ سبب کمالِ عدل کے پھر بدستور قائم کر دیا۔

جب یہ گزارش ہو چکی تو اب یہ التماس ہے کہ مشکوٰۃ تو شہرۂ آفاق ہی ہے۔ ابوداؤد، صحاح ستہ میں سے ہے تو جو روایت کہ ایسی کتابوں میں ہو اس کی صحت اور شہرت کو خیال کرنا چاہیے کہ کس قدر اور کس مرتبہ کی ہوگی۔ مع ہذا یہ روایت کتنی صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تادم واپسیں فدک جناب سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات کے قبضہ میں رہا اور باوجود استدعاء حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فدک عنایت نہ فرمایا بلکہ جیسے حکیم تماردار بیمار سے ان چیزوں کے دینے سے انکار کیا کرتا ہے جو اس کو خلل کریں، ایسے ہی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاصۂ اہل بیت سے فدک کے دینے سے جو مال دینا تھا انکار فرمایا۔ (اور کیونکر انکار نہ فرمائیں آیت "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" جس کا یہ حاصل ہے کہ "اللہ کا ارادہ اے اہل بیت یوں ہے کہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تم کو خوب پاک کر دے" اس مال دُنیا ہی کی طلب گاری کے مقدمہ میں نازل ہوئی)۔

ہبہ اور عطاء میں فرق

بہر حال یہ روایت فدک کے ہبہ نہ ہونے پر مثل آفتاب روشن دلالت کرتی ہے اور وہ روایت جو بزعم شیعہ دستاویز ہبہ ہے، ہبہ کے ہونے پر صراحتاً دلالت نہیں کرتی کیونکہ عربی کی روایت میں جس کا ترجمہ مولوی صاحب نے زیب رقم فرمایا ہے لفظ "اَعْطَاهَا" ہے سو یہ لفظ عام ہے ہبہ میں بھی بولا جاتا ہے اور عاریت میں بھی استعمال کرتے ہیں، سر مو تفاوت نہیں، دونوں موقع میں بلا تفاوت بولتے ہیں اور بڑی دلیل اس کے عموم کی یہ ہے کہ اعطاء کا ترجمہ ہندی زبان میں دینا ہے۔ سو سب جانتے ہیں کہ بسا اوقات عاریتاً کو کہا کرتے ہیں کہ فلانے شخص کو دی ہے یا دے رکھی ہے۔

القصہ لفظ اعطاء سے ہبہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ سو اب روایت مشکوٰۃ کو تو ایک طرف دھریئے اور اس روایت کو جو مولوی صاحب نے درج صحیفہ شریفہ فرمائی ہے، ایک طرف رکھئے اور پھر اس کی صحت اور شہرت اور صراحت دلالت کو اس روایت کے ضعف اور اخفاء اور عدم دلالت مقصود سے موازنت

فرمائیے اور پھر فرمائیے کہ کس طرف پلہ جھکتا ہے؟ سو اگر مولوی صاحب عقل کو کار فرمائیں گے تو بیشک اس بات کو تسلیم فرمائیں گے کہ واقعی قابل اطمینان اور لائق اعتماد روایت مشکوٰۃ ہی ہے۔

اس روایت مندرجہ مشکوٰۃ سے صاف واضح ہوگیا کہ اگر بفرض محال روایت ہبہ فدک کتب مذکور میں ہو بھی اور یہ کتابیں بھی سب کی سب ایسے لوگوں کی تصنیف ہوں جو موصوف بشرائط اعتبار روایت اعنی صدق وصلاح وفہم وفراست وحفظ ودیانت ہوں اور پھر اس کے بعد اعطاء سے مراد بھی ہبہ ہی ہو تو بیش برین نیست کہ ان کتب کے مصنفوں نے یہ کتابیں بطور بیاض کے اکٹھی کر لی تھیں اور رطب ویابس غلط صحیح سب ان میں جمع کر لیا تھا، تاکہ بعد انفراغ جمع نظر ثانی کر کے تلخیص کریں گے۔ چنانچہ سب مصنفین کرتے ہیں لیکن اتفاقات تقدیر سے ان کی عمر نے وفا نہ کی یا فرصت نہ ملی۔ سو اس لیے بہت سی روایتیں شیعوں کی بنائی ہوئی ان کی کتب میں درج ہوگئیں اور کم فہم اپنی غلطیٔ فہم سے ان روایات کو اکابر محدثین کی تصنیفات میں دیکھ کر بچل گئے۔

اہل شیعہ کی مستندات رطب ویابس سے زیادہ نہیں

چنانچہ شاہد اس کا موجود ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب جو عمدۃ المحدثین اور زبدۃ المورخین ہیں، تحفہ میں رقم فرماتے ہیں کہ ''صاحب جامع الاصول نے نقل کیا ہے کہ خطیب نے جو متاخرین محدثین اہلسنّت سے ہے، شریف مرتضٰی سے جو اجلۂ علمائے شیعہ میں سے ہے اور علامہ رضی شیعہ مذہب کا بھائی ہے، شیعوں کی حدیثیں اسی غرض سے نقل کیں کہ بعد جمع وتالیف کے ان میں نظر کرے کہ ان کی کچھ اصل بھی ہے کہ نہیں اور اس سے اوّل شاہ صاحب عمدۃ المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب ہی رقم فرماتے ہیں کہ جو محدثین کہ فرقہ اہلسنّت میں آخر میں پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے جو دیکھا کہ پہلے محدث روایات صحیحہ اور حسنہ کو تو خوب ضبط کر گئے ہیں اور ان میں سعی کی گنجائش نہیں تو وہ ایسی حدیثوں کی طرف جن کی سندیں ضعیف ہیں یا وہ جھوٹی بنائی ہوئی ہیں یا غلطی سے کسی حدیث کی سند کسی متن کے ساتھ لگ گئی ہے، ایسے متوجہ ہوئے تاکہ سب کو بطور بیاض کے ایک جا فراہم کر کے نظر ثانی کریں اور موضوعات کو حسان وغیرہا سے جدا کر دیں لیکن بسبب کوتاہی عمر اور قلت فرصت کے یہ مہم ان سے تمام نہ ہو سکی مگر جو محدث کہ ان کے بھی بعد پیدا ہوئے، انہوں نے ان کی بیاضوں کی حدیثوں میں باہم امتیاز کر دیا۔ چنانچہ ابن جوزی نے جس کا حوالہ مولوی صاحب بھی اپنے رقیمہ میں رقم فرماتے ہیں موضوعات کو جدا کر دیا اور اس کے مقابل میں حسان لغیرھا کو مقاصد حسنہ میں جدا لکھ دیا اور ایسے ہی سیوطی نے تفسیر در منثور میں کیا اور خود ان محدثوں نے اپنی کتابوں کے مقدمہ میں جو بطور بیاض کے ہیں، اس غرض کو کھول کر لکھ دیا ہے۔ انتہیٰ''

اہلسنّت نے جو روایات بغرض تردید نقل کی ہیں شیعہ ان کو سند بناتے ہیں

اس نقل سے ہر کس و ناکس سمجھ جائے گا کہ جن کتب کا حوالہ مولوی صاحب نے اپنے خط میں درج کیا ہے وہ اکثر ایسی ہیں کہ ایسی ایسی روایتوں کے رڈ کرنے اور حقیقت حال کے بتلانے کے واسطے جمع کی گئی تھیں جن روایتوں کو مولوی عمار علی صاحب اور ان کے پیشوا گاتے پھرتے ہیں لیکن اتفاقات سے ان کے مصنفوں کو اجل نے آدبایا اور بعضی ایسی کتابیں ہیں، جیسے تفسیر دُرمنثور اور کتاب ابن جوزی کہ ان میں اگر ایسی روایتیں ہیں بھی جن سے شیعہ تمسک کرتے ہیں تو وہ اس طور پر ہیں جیسے تحفہ اور منتہی الکلام اور صواقع وغیرہ میں ہبہ فدک کی روایت مندرج ہے تو ایسا کون ہے جو یہ نہیں جانتا کہ تحفہ میں اس روایت کو لکھ کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ روایت بنائی ہوئی ہے۔ سو مولوی عمار علی صاحب بڑے چونکے کہ تحفہ اثنا عشریہ اور منتہی الکلام وغیرہ تصنیفات مولانا حیدر علی کا نام نہیں لکھا، اس میں دو فائدے تھے ایک تو کتابوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی جس سے ہر کسی کے ایک دفعہ کو کان کھڑے ہو جاتے، دوسرے عوام اور جہال اہل سنت شاہ عبدالعزیز اور مولوی حیدر علی صاحب کو جس قدر جانتے ہیں۔ اتنا متقدمین کو نہیں جانتے اور پھر اس پر یہ مشہور ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے رڈ رفض پر کمر چست باندھ رکھی ہے۔ سو اگر ان صاحبوں کا نام بھی ہوتا تو چنداں جھوٹ بھی نہ تھا اور عوام کو ایک بار تو یہ وہم ہو ہی جاتا کہ جب شاہ عبدالعزیز صاحب نے باوجود شہرۂ علم و فضل و تبحر فن حدیث و بایں ہمہ صرف ہمت در بارہ رڈ روافض اس روایت کو اپنی کتاب میں درج کر دیا تو ہو نہ ہو یہ روایت صحیح ہی ہوگی مگر شاید یہ اندیشہ ہوا ہو کہ یہ کتابیں فارسی زبان میں اور پھر کثیر الوجود اور فارسی خوان بکثرت مبادا قلعی کھل جائے۔

بہر حال زوف ہے اس دینداری پر اور اس پرہیزگاری پر، اگر شیوہ دغابازی اختیار ہی کرنا تھا تو اس کے لیے بھی دُنیا جیف تھی۔ دین کو کیوں بٹہ لگایا اور دین احمدی کو خراب کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر بھی خیر گزری کہ آپ نے سنیوں کے دغا دینے کا ارادہ کیا جو ایسے ایسوں کو لاحول میں اُڑا دیتے ہیں اور ایسے ویسے دام میں نہیں آتے لیکن شیعوں کی خیر نظر نہیں آتی کیونکہ جب ان کے ایسے مقتداء کا یہ دماغ چلا ہے کہ یہ تمیز باقی نہیں رہی کہ فلانی روایت فلانی کتاب میں کس غرض سے بیان کی ہے؟ آیا بطور رڈ کے یا بطور اعتبار کے اور اعتماد کے تو لاجرم عنقریب ہی مولوی صاحب اس بات کو تشہیر کریں کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند کریم ساحر اور مجنون اور کاہن اور مفتری فرماتا ہے اور پھر شیعوں کی اندھی عقل سے یقین ہے کہ اس کو تسلیم کر جائیں اور یہ نہ سمجھیں

کہ کلام اللہ میں کفار کا قول منقول ہے اور وہ بھی بایں غرض کہ ان کے قول کو رد فرماتے ہیں، بہر حال مولوی صاحب کی یہ چالاکیاں دیکھ کر محبان دینی اور دینداران یقینی کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ ان مکاریوں پر نہ جائیں۔ ایسے ہی دجالوں نے دین میں رخنہ ڈالا ہے، اس علم کے پردہ میں انہوں نے جاہلوں کے نام کو بھی عیب لگایا، عالم تو درکنار۔

درمنثور کے حوالہ کی حقیقت

اب آگے عرض یہ ہے کہ مجملاً تو اس روایت کا ہونا نہ ہونا بہ نسبت سب کتابوں کے معلوم ہو گیا لیکن اگر مفصل بھی کچھ بیان کیا جائے تو اور اچھا ہے اس لیے ایک دو کتابوں کو بالخصوص ذکر کر کے ان میں اس روایت کا ہونا نہ ہونا بیان کرتا ہوں تا کہ موافق مثل مشہور ''مشتے نمونہ خروارے'' مولوی صاحب کے سب جوابوں کا حال معلوم ہو جائے مگر چونکہ ان سب کتابوں میں سے تفسیر درمنثور کا حوالہ عوام تو عوام بعض علماء سادہ لوح کو بھی شاید متردد کردے کیونکہ مصنف شیخ جلال الدین سیوطی خاتم المحدثین اور خلاصۃ المفسرین ہیں اور بسبب کثرت تصانیف اور رواج جلالین وغیرہ کے ان کا نام شہرۂ آفاق ہو گیا ہے تو اس لیے میں بھی انہی کی کتابوں کی نسبت اس روایت کے ہونے نہ ہونے کی تحقیق کرتا ہوں، سو اس لیے گوش گزار اہل انصاف ہوں کہ تفسیر درمنثور میں اس روایت کے ہونے کا کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ وہ موضوعات وغیرہا ہی کے امتیاز کے لیے تصنیف ہوئی ہے۔ سو اس میں یہ کیا اور بہت سی موضوع روایتیں ہیں لیکن موقع سند میں اس کا نام لینا مولوی صاحب کی کمال حیا اور خوبیٔ ذہن وذکا پر دلالت کرتا ہے۔ سو اگر یہی استدلال ہیں تو کل کو کہنے لگیں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں کیونکہ کلام اللہ میں موجود ہے۔

جلالین اور اتقان میں ذا القربیٰ اور حقہ کی تفسیر

اور اگر بوجہ کمیابی درمنثور اس بات کی تسلیم میں تامل ہو تو جلالین اور اتقان تو کثیر الوجود ہیں یہاں تک کہ دونوں چھپ گئی ہیں۔ خصوصاً جلالین کہ تفسیروں میں میزان الصرف کا حکم رکھتی ہے بلکہ تفاسیر کی بسم اللہ کہیے۔ سو اس میں ملاحظہ فرما دیکھیں کہ آیت "وَ آتِ ذَا الْقُرْبٰی" کی تفسیر میں ذا القربیٰ اور حقہ کی کیا تفسیر کی ہے، اگر ان کے نزدیک روایت متنازع فیہا معتبر اور صحیح ہوتی تو اوّل تو مع حوالہ اس حوالہ کو لکھتے نہیں تو اختصار ہی کرتے، تب بھی اس میں کیا دریغ تھا کہ ذا القربیٰ کے بعد حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نام اور حقہ کے بعد لفظ فدک لکھ جاتے؟ حالانکہ اور جا ایسا ہی کیا کہ جو تفسیر کسی لفظ کی کسی

صحیح حدیث سے ثابت ہوئی ہے وہی بعینہ لکھ دی ہے بلکہ حدیثوں کے حوالے تک لکھ دیئے ہیں۔

مع ہذا اتقان کے مضامین سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت جھوٹی بنائی ہوئی ہے کیونکہ اس میں اوّل ہی نوع میں اسانید متعددہ سے کہ جن میں سے بعضی سندوں کو اپنے آپ جید لکھتے ہیں۔ سورۂ روم اور سورۂ بنی اسرائیل کا مکی ہونا مرقوم ہے اور پھر بعد اس کے سورہ قرآنی کی تفصیل کی ہے کہ فلانی فلانی سورتوں میں اختلاف ہے کہ مکی ہے یا مدنی؟ اور فلانی فلانی میں اتفاق ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی؟ اور پھر اس پر سورۂ روم اور سورہ بنی اسرائیل کو ان میں داخل رکھا ہے جو باتفاق مکی ہیں، کسی ایک متنفس کو بھی اس کے مکی ہونے میں خلاف نہیں اور اسی اثناء میں یہ بھی تحقیق کی ہے کہ فلانی سورہ اگر مکی ہے تو اس میں فلانی فلانی آیت مدنی ہے، پر ان دونوں سورتوں میں سے کسی آیت کو استثناء نہیں کیا اور اس بات کی سند بھی وہی سند ہے جس کو وہ جید لکھتے ہیں اور اگر بعضے علماء کے اقوال کے موافق ان دونوں سورتوں میں سے کسی آیت کا استثناء کیا بھی ہے تو اور ہی آیتوں کا استثناء کیا ہے، پر اس آیت کو کسی نے یوں نہیں کہا کہ یہ مدنی ہے۔ الغرض اتقان کی عبارات بآواز بلند یوں کہتی ہے کہ یہ دونوں سورتیں خاص کر یہ دونوں آیتیں باتفاق اہل ملت مکی ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ شیعہ بھی اس بات میں سنیوں کے موافق ہیں۔ چنانچہ طبری صاحب مجمع البیان کا قول پہلے مرقوم ہو چکا ہے کہ سورہ روم سوا۔ آیت **"فسبحان الله"** کے سب مکی ہے۔ الغرض اوّل تو اتقان کی اس تحقیق سے محقق ہو گیا کہ آیت **"آتِ ذا القربی"** مکہ ہی میں نازل ہو چکی تھی تو اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال و جواب میں حضرت جبریل علیہ السلام کا یوں کہنا کہ ذا القربیٰ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا حق فدک ہے، ہرگز درست نہیں ہو سکتا اور ایسا جواب نامعقول حضرت جبریل علیہ السلام سے نہیں ہو سکتا، ہاں اگر حضرت جبریل علیہ السلام شیعہ مذہب ہوتے تو البتہ کم فہمی کا احتمال ہو سکتا تھا۔

سیوطی نے اس روایت کو موضوع سمجھ کر نقل نہیں کیا

دوسرے انہتر (۶۹) ویں نوع میں جو دربارہ معرفت شروط مفسر ہے۔ فصل اختلاف تفسیر میں یوں رقم فرماتے ہیں کہ ایسی تفسیریں جن کی سند صحیح ہو بہت کم ہیں اور پھر اس میں بھی ایسی جن کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی اور بھی کم ہیں اور پھر وعدہ کیا کہ میں ان سب کو برابر ترتیب وار بیان کروں گا۔ چنانچہ موافق اپنے وعدہ کے بترتیب سورہ قرآنی ان تفاسیر کو مع بیان ماخذ بیان کیا اور اس پر نہ سورہ بنی اسرائیل میں اس روایت متنازع فیہا کو بیان کیا اور نہ سورۂ روم میں جس کی آیت کو شیعہ دستاویز ہبہ فدک سمجھتے ہیں بلکہ "والنّاس" کے متعلق کی جو روایت تھی اس کو لکھ کر آخر

میں یہ لکھا کہ یہ ہے جو کچھ مجھے معلوم ہے اور حاضر ہے تفاسیر مرفوعہ میں سے جن کے مرفوع ہونے پر لوگوں نے تصریح کی ہے۔ خواہ وہ صحیح ہیں، خواہ حسن ہیں، خواہ ضعیف ...... خواہ مرسل خواہ معضل لیکن موضوعات اور اباطیل کو میں نے نہیں لیا۔

اب غرض یہ ہے کہ اس وعدہ اور دعدہ کے قرینہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو روایت لکھی ہے وہ سمجھ کر لکھی ہے اور جو باوجود معلوم ہونے کے چھوڑ دی ہے وہ سمجھ کر چھوڑ دی، بھولے چوکے نہیں چھوڑی۔ سو یہ روایت متنازعہ فیہا جو نہیں لکھی تو دیدہ و دانستہ نہیں لکھی۔ اس کو موضوعات اور اباطیل میں سے سمجھا ہوگا جو نہیں لکھا ورنہ اس کتاب میں ضعیف اور مرسل اور معضل تک نہیں چھوڑا تو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کی کتابوں میں کسی ضعیف طریق اور ضعیف روایت سے یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نزول آیت مذکورہ کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک ہبہ کیا ہے۔ جو روایت اس بات پر دلالت کرے وہ لاریب موضوع ہے بلکہ صحیح یہی ہے کہ فدک تادم واپسیں جناب پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا۔ چنانچہ روایت صحیح اس مضمون کی گزر چکی۔

فدک کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رویہ اس روایت کے بطلان کی بڑی دلیل ہے

اور قطع نظر قوت سند اُس روایت کی بڑی دلیل اس کی صحت کی (اور دلیل بھی کون سی جس کو شیعہ بھی مان جائیں) یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے فدک میں عمل کیا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وارثوں پر اس کو تقسیم نہ کیا بلکہ بدستور قدیم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم کرتے رہے، اگر اپنا حصہ خدا کی راہ میں دیا تھا تو سب وارثوں کو کیوں محروم رکھا؟ اور یہ بات شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اسی واسطے اس کے چار جواب دیتے ہیں، ان چاروں جوابوں کو مع ان کی تردید کے پیش نظر کرتا ہوں تاکہ خوش فہمی اور انصاف پرستی علماء شیعہ ہر کس و ناکس پر آشکارا ہو جائے۔

اہل شیعہ کی طرف سے حضرت علی کے رویہ کی پہلی تاویل

اوّل تو یہ ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم غصب کی ہوئی چیز کو نہیں لیا کرتے، چنانچہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کو جو بعد ہجرت کے کفار نے دبا لیا تھا کفار سے نہ لیا، یہ اسی قسم کا جواب ہے۔ جیسا مثل مشہور ہے کہ مرد کے ہاتھ چلیں اور نامرد کی زبان چلے۔

میں یہ لکھا کہ یہ ہے جو کچھ مجھے معلوم ہے اور حاضر ہے تفاسیر مرفوعہ میں سے جن کے مرفوع ہونے پر لوگوں نے تصریح کی ہے۔ خواہ وہ صحیح ہیں، خواہ حسن ہیں، خواہ ضعیف ...... خواہ مرسل خواہ معضل لیکن موضوعات اور اباطیل کو میں نے نہیں لیا۔

اب عرض یہ ہے کہ اس وعدہ اور وعدہ کے قرینہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو روایت لکھی ہے وہ سمجھ کر لکھی ہے اور جو باوجود معلوم ہونے کے چھوڑ دی ہے وہ سمجھ کر چھوڑ دی، بھولے چوکے نہیں چھوڑی۔ سو یہ روایت متنازعہ فیہا جو نہیں لکھی تو دیدہ و دانستہ نہیں لکھی۔ اس کو موضوعات اور اباطیل میں سے سمجھا ہوگا جو نہیں لکھا ورنہ اس کتاب میں ضعیف اور مرسل اور معضل تک نہیں چھوڑا تو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کی کتابوں میں کسی ضعیف طریق اور ضعیف روایت سے یہ بھی نہیں ثابت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نزول آیت مذکورہ کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک ہبہ کیا ہے۔ جو روایت اس بات پر دلالت کرے وہ لاریب موضوع ہے بلکہ صحیح یہی ہے کہ فدک تادم واپسیں جناب پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا۔ چنانچہ روایت صحیح اس مضمون کی گزر چکی۔

فدک کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رویہ اس روایت کے بطلان کی بڑی دلیل ہے

اور قطع نظر قوت سند اُس روایت کی بڑی دلیل اس کی صحت کی (اور دلیل بھی کون سی جس کو شیعہ بھی مان جائیں) یہ ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے فدک میں عمل کیا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وارثوں پر اس کو تقسیم نہ کیا بلکہ بدستور قدیم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم کرتے رہے، اگر اپنا حصہ خدا کی راہ میں دیا تھا تو سب وارثوں کو کیوں محروم رکھا؟ اور یہ بات شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اسی واسطے اس کے چار جواب دیتے ہیں، ان چاروں جوابوں کو مع ان کی تردید کے پیش نظر کرتا ہوں تاکہ خوش فہمی اور انصاف پرستی علماء شیعہ ہر کس و ناکس پر آشکارا ہو جائے۔

اہل شیعہ کی طرف سے حضرت علی کے رویہ کی پہلی تاویل

اوّل تو یہ ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم غصب کی ہوئی چیز کو نہیں لیا کرتے، چنانچہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کو جو بعد ہجرت کے کفار نے دبا لیا تھا کفار سے نہ لیا، یہ اسی قسم کا جواب ہے۔ جیسا مثل مشہور ہے کہ مرد کے ہاتھ چلیں اور نامرد کی زبان چلے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے نہ لینے کو اسی پر محمول کیا ہے ورنہ اگر گھر کے نہ لینے کی یہ وجہ ہو کہ اہل بیت شئے مغصوب کو نہیں لیا کرتے، جیسے شیعہ فرماتے ہیں تو یہ تو بشہادت مولوی عمار علی بلکہ بشہادت عام اسلاف شیعہ غلط ہے کیونکہ مولوی عمار علی صاحب اپنے رقیمہ کریمہ میں رقم فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے دعویٰ فدک کا کیا۔ سو اگر شے مغصوب اہل بیت نہیں لیا کرتے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس لیے یہ دعویٰ کیا تھا؟

اور اگر یوں کہیئے کہ ان دونوں خلافتوں میں دعویٰ کیا، سنیوں کی روایتوں کے حوالے سے بیان کیا ہے، ان کو اس سے الزام نہیں دیا جاسکتا تو یہ شیعوں کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فدک غصب کرلیا اور زہرا کا دعویٰ ہبہ نہ سنا تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے میراث کا دعویٰ کیا۔

از روئے قواعد شیعہ سیدہ رضی اللہ عنہا کا مطالبہ فدک غلط تھا

سو اگر اہل بیت نبوی رضی اللہ عنہم شے مغصوب کو نہیں لیا کرتے تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے پھر کیوں فدک طلب کی؟ اور اگر عقلاء شیعہ سنیوں کی ضد میں عقل و انصاف کو طاق میں دھر کر یوں فرمانے لگیں کہ یہ دونوں دعوے اگرچہ بصورت دو ہیں لیکن چونکہ متصل بلا فصل واقع ہوئے ہیں ہم ایک ہی دعویٰ اسے قرار دیتے ہیں۔ سو بعد گفت و شنود کے ختم ہو جانے کے غصب متحقق ہوا اور پہلے غصب تھا ہی نہیں، جو کچھ خرابی لازم آوے۔

تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم ایسے ایسے فقروں میں درگزر کر جاتے ہیں ورنہ اسی بات سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا فدک مغصوب کی نسبت دعوے کرنا ثابت کیا؟ مثل آفتاب روشن ہے لیکن چونکہ علماء شیعہ خصوصاً مولوی عمار علی صاحب کی عقل کی رسائی معلوم ہے۔ اس لیے اس بات سے چشم پوشی کر کے ہم اور جواب دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہی فدک عمر بن عبدالعزیز کے وقت میں حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے لیا اور وہ انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ پھر خلفاء عباسیہ اس پر متصرف ہو گئے۔ یہاں تک کہ سن دو سو بیس میں مامون عباسی نے اپنے عامل قثم بن جعفر کو لکھا کہ فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد کے حوالے کردے۔ سو اس وقت امام علی رضا نے لیا، پھر متوکل عباسی اس پر متصرف ہو گیا۔ بعد ازاں معتضد نے پھر ہٹا دیا۔ چنانچہ یہ سب قصہ مفصل قاضی نور اللہ نے مجالس المومنین میں لکھا ہے اگر کوئی سنی لکھتا تو شیعوں کے نزدیک اعتبار کے قابل بھی نہ ہوتا۔

قواعد شیعہ کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلافت قبول کرنا بھی درست نہ تھا

اور اس کو بھی جانے دیجئے۔ مجالس المؤمنین کا حال تو پڑھے لکھے یا صحبت یافتہ علماء جانتے ہوں گے یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے بعد شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلافت مغصوبہ قبول کی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ یزید پلید سے خلافت مغصوبہ کے طالب ہوئے، یہاں تک کہ نوبت شہادت کی پہنچی اور اگر ان اُمور میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا تو شے مغصوب کے لینے کے جواز میں اور دلانے کے وجوب میں عقلائے ابوالباب کے نزدیک پھر بھی کچھ تامل نہ تھا کیونکہ سابق میں محقق ہو چکا ہے کہ آیت "وآتِ ذا القربٰی" میں گو مخاطب خاص ہے لیکن خطاب عام ہی ہو۔ اگر "ذا القربٰی" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قرابتی مراد ہوں تو ان کے حق کا دلانا سب کے ذمہ واجب ہو۔

اور نیز وجوب عدل وانصاف کی فرضیت سے کلام اللہ بھرا ہوا ہے اور عدل وانصاف اسے ہی کہتے ہیں کہ اہل حق کے حقوق دلائے جائیں۔ سو بعد غصب کے اگر مالک کا حق باقی رہتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمہ فدک کا حضرت زہرا کے وارثوں کو پہنچانا فرض تھا اور اگر بعد غصب اہل بیت کا حق ساقط ہو گیا تو اس میں اور عفو میں کیا فرق ہے؟ جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باب میں یہ زبان درازیاں ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رویہ کی دوسری تاویل

دوسرا جواب علمائے شیعہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فدک میں تصرف مالکانہ نہ کرنے کا اس طرح دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا اقتداء کیا۔ یعنی جیسے انہوں نے فدک سے کچھ انتفاع نہیں اُٹھایا، اس جواب پر تو مناسب یوں ہے کہ علمائے شیعہ کے قربان ہو جائیے۔ سبحان اللہ کیا فہم کی رسائی ہے۔ خیر فہمیدہ لوگوں کے لیے تو اس جواب کی تردید کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ عقل خود اس جواب کے مضمون کو ایسے اُگلتی ہے جیسے مکھی کو معدہ۔

تاویل کا جواب

لیکن چونکہ سب ایک قسم کے نہیں ہوتے تو اس لیے یہ گزارش ہے کہ جن اماموں نے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باقرار سرگروہ شیعہ قاضی نور اللہ فدک کو لیا، چنانچہ ابھی مذکور ہوا ہے۔ انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بلکہ حضرت امیر کا بھی کس لیے اقتداء نہ کیا؟ اور نیز یہ اقتداء

فرض تھا یا نفل؟ اگر فرض تھا تو اوراماموں نے کیوں نہ کیا؟ اور اگر نفل تھا تو اوّل تو آئمہ اہل بیت سے ایسی سنت معمول بہا حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما بلکہ معمول بہا حسنین اور معمول بہا حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہما کا ترک کرنا مستبعد ہے اور معمول بہا ہونا حسنین اور امام زین العابدین رضی اللہ عنہما کا خود ظاہر ہے کیونکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جیسے بناچاری فدک سے منتفع نہ ہوئی تھیں، ایسے ہی یہ بزرگوار بھی بناچاری منتفع نہ ہو سکے، دوسرے حضرت امیر المؤمنین نے اس نفل کے واسطے حق داروں کے حق پہنچانے کو جوان کے ذمہ فرض تھا کیوں ترک کیا؟

اقتداء کن افعال میں ہوتا ہے؟

اور نیز کسی کا اقتداء احتمال اظہاریہ میں ہوا کرتا ہے۔ افعال اضطراریہ میں کوئی کسی کا اقتداء نہیں کیا کرتا ورنہ لازم آئے کہ حضرت امام مہدی حضرات آئمہ ماضیین کا اقتداء تقیہ میں جو بوجہ ناچاری وہ کیا کرتے تھے کریں اور ایسے ہی حضرت امام حسین تقیہ میں اتباع حضرت امیر کرتے، سو اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کسی کے ظلم وستم کے باعث فدک سے منتفع نہ ہو سکیں تو ناچار تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے وقت خلافت میں اس مظلومیت کے اقتداء کے کیا معنی؟ بایں ہمہ اگر حضرت امیر کو حضرت زہرا کا اقتداء ہی کرنا تھا، اپنے حصہ میں کیا ہوتا۔ حضرات حسنین اور ان کی بہنوں کو کیوں محروم المیراث کر دیا۔

اہل شیعہ کی تیسری تاویل

تیسرا جواب جو شیعوں نے اعتراض معلوم کا دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امیر اس لیے فدک سے منتفع نہ ہوئے تاکہ لوگوں کو تحقق ہو جائے کہ حضرت امیر کی گواہی درباره ہبہ فدک "حسبة للہ" تھی اپنے نفع کی اُمید پر نہ تھی۔

تاویلی کا جواب

یہ جواب بھی مثل جواب ہائے سابق سرتاپا خلل ہے، اوّل تو جو لوگ اس مقدمہ میں حضرت امیر کی طرف سے گمان فاسد رکھتے ہیں، وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے حضرت امیر کی گواہی کو قبول نہ کیا، سو وہ لوگ پہلے ہی اس جہان سے چل دیئے تھے، ان کی خلافت میں ان میں سے کون تھا جو اس کے جتلانے کے لیے آپ نے فدک نہ لیا؟ اور اگر مُردوں کا جتلانا مدنظر تھا تو اوّل تو ان کو اطلاع نہیں ہو سکتی، دوسرے اپنے مرنے کے بعد ان کو خود حضرت امیر کی حقانیت اور اپنا ظالم ہونا معلوم ہو گیا ہوگا۔ سو یہ نہ لینا یوں ہی رائیگاں گیا، بے وجہ حضرت امیر نے مال حلال کو ہاتھ سے کھویا، نہ نفع دین نہ نفع دینا۔

اور اگر یوں کہیے کہ خلفاء ثلثہ مر گئے تھے تو کیا ہوا، ان کے معتقد اور نواصب تو موجود تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یوں تو یہ احتمال پھر بھی باقی رہا۔ جب آپ کی بعض اولاد نے لیا۔ خصوصاً مامون کے زمانہ میں کہ وہ مائل بہ تشیع تھا اور فدک کو حق اہل بیت ہی سمجھ کر حضرت امام علی رضا کے حوالہ کیا، جب بھی آخر نواصب کو یہ شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ حضرت امیر کی گواہی اس پیش بندی کے لیے تھی بلکہ بیشتر اولاد ہی کے لیے ایسی ایسی تدبیریں دور دراز کیا کرتے ہیں۔ سو نواصب بحکم المرء یقیس علیٰ نفسہ کے بالضرور یہ سمجھے ہوں گے کہ حضرت امیر کی گواہی فقط اس لیے تھی کہ اگر یہ تیر ہمارے زمانہ میں نشانہ پر نہ بیٹھا، تو کبھی نہ کبھی تو کارگر ہوگا ہی، سو اگر یہی رفع تہمت مدنظر تھا تو لازم تھا کہ اپنی اولاد کو وصیت کر جاتے کہ ہرگز اس مال کو نہ **لیجیو**، نہیں تو میری شہادت میں خلل آ جائے گا۔

اہل شیعہ کی چوتھی تاویل

چوتھا جواب شیعوں کی طرف سے یہ ہے کہ یہ سب پرہیز گاری اور فدک سے دست برداری تقیہ کی وجہ سے تھی۔ القصہ شیعہ لاچار ہو کر اپنیوں پر آ گئے لیکن "دروغ گو را حافظہ نباشد" علمائے شیعہ کو اس جواب کے وقت یہ یاد نہ رہا کہ سب آدمیوں کا مذہب تقیہ میں یہ ہے کہ جب امام جہاد کے لیے تیار ہو اور قتل و قتال میں مشغول ہو تو پھر اس پر تقیہ حرام ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ہرگز تقیہ نہ کیا۔ سو اگر حضرت امیر اپنی خلافت کے زمانہ میں تقیہ کرتے تو اور اُلٹے مرتکب فعل حرام کے ہوتے، نعوذ باللہ اس جواب والوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہی مثل کر دی ہے جیسے کہا کرتے ہیں "یکے نقصان مایہ دیگر شماتت ہمسایہ" مال کا مال گیا وبال گناہ پلہ بندھا، خدا نادانوں سے باہ نباہ نہ ڈالے، کسی نے سچ کہا "دشمن دانا بہتر از نادان دوست"

تاویل کا جواب

مع ہذا اگر تقیہ خلفائے ثلثہ سے تھا تو وہ خود پہلے ہی اس جہان سے چل دیئے تھے اور مُردوں سے تو نامردوں کو بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ یا باقی ماندوں سے؟ سو وہ یا تو آپ کے لشکری تھے اور شیعہ مخلص یا منجملہ رعیت، سو رعیت میں سے ایسے اُمور میں اگر اندیشہ ہوتا ہے تو ان سے ہوتا ہے جن کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ سو یہاں وہ فقراء اور مساکین اور ابن سبیل تھے، ان سے ڈرنا بھی ہم وزن خوف مُردگان ہے۔ سوائے ان کے اور کسی کی بلا کو کیا غرض تھی کہ فدک کے سبب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل ہو کر اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتا؟

اور اگر بفرض محال یہ صورت ظہور ہی پکڑتی تو اوّل تو حضرت امیر کے برابر کسی میں زور اور بل اور شجاعت اور لشکر نہ تھا، اگر کچھ گمان ہو بھی تو امیر معاویہ یا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف ہوتا ہے۔ سو انہوں نے اب کون سی کمی کی؟ دوسرے ایسے مفسدے بجز اس کے کہ رعیت بادشاہ کے مقابلہ پر مجتمع ہو جائے...... تصور میں نہیں آتے۔ حضرت ابوبکر صدیق جب خلیفہ ہوئے تو زیر حکم اسلام سواء ملک عرب اور کچھ نہ تھا، سو وہ بھی بجز دو فات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے سب منحرف ہو گئے۔ چنانچہ مختصراس کا بیان ہو چکا ہے۔

لیکن ابوبکر صدیق بایں ہمہ تنہائی کہ سوائے سکانِ مکہ و مدینہ اور کوئی ان کا یار اور مددگار نہ تھا اور لشکر عظیم حضرت اُسامہ کے ساتھ بنی غسان کی طرف بھیج چکے تھے، ہرگز نہ ڈرے اور مانعین زکوٰۃ کی نسبت باوجود یہ کہ اکثر صحابہ بسبب قلت اعوان و انصار کے ان پر جہاد کرنے سے اندیشہ مند تھے۔ یوں فرمایا کہ واللہ! اگر وہ ایک رسی بھی جو خدا کی راہ میں دیا کرتے تھے نہ دیں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا بلکہ یوں بھی کہا کہ اگر اور کوئی نہ جائے گا تو میں تن تنہا جاؤں گا۔

خلیفہ چہارم کے پاس خلیفہ اوّل کی نسبت اعوان وانصار کی کثرت

جب ابوبکر باوجود اس بے سروسامانی اور کثرت اعداء کے ایسی ناچیز چیزوں پر تن تنہا جہاد کرنے کو تیار ہو جائیں تو حضرت امیر تو اشجع الناس تھے اور لشکر کثیر جس میں سے اکثر وہ لوگ جنہوں نے ایک بنی بنائی خلافت کو درہم برہم کر دیا، ان کے ہمراہ اور جس مال پر تکرار وہ مالیت فراوان اور حق بھی ایسے مظلوموں کا کہ ان پر ظلم ہونا دوسری قیامت، پھر نہ جانے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تقیہ ہونے کے کیا معنی؟ بہر حال جوابات شیعہ تو جیسے ہیں، سب ہی جان گئے، ان جوابوں سے حصول مطلب شیعہ بھی معلوم ہو گیا۔

لیکن انہیں ان جوابوں سے نفع ہو کہ نہ ہو، سنیوں کو یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فدک میں تصرف مالکانہ نہ کرنا اور بدستور سابق رہنے دینا جو سنیوں کا دعویٰ تھا، سچا ہے، پھر جو ان جوابوں کی تردیدوں کو دیکھے گا، وہ آپ سمجھ جائے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فدک کو بدستور سابق رہنے دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تادم وفات کسی کو ہبہ نہیں کیا تھا اور پھر متروکہ نبی میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی، چنانچہ عنقریب ان شاء اللہ مشروحا مفصلاً اس کا اثبات آتا ہے، جب یہ بات محقق ہو چکی تو ہر دانا و نادان کو محقق ہو گیا کہ روایت متنازعہ فیہا جو مستند شیعہ ہے، سراسر بہتان اور دروغ تراشیدہ حضرات شیعہ ہے اور جیسے حسب درایت اس کا غلط ہونا

صحیح ہو گیا تھا باعتبار قوانین روایت بھی ایک افسانہ بے اصل نکلا، علیٰ ہذا القیاس مامون عباسی کے زمانے میں اولاد حسنین کا بہ نسبت فدک دعویٰ کرنا اور اس کا دوسو علماء اہل سنت کو جمع کر کے در بارہ فدک استفسار کرنا، الی غیر ذلک بمنزلہ خیالات بوستانِ خیال اور حکایات باغ بہار ہے، اگر سراسر غلط نہیں تو مثل مرویات صحیحہ بالکل صحیح بھی نہیں۔

اتنی بات بیشک ظہور میں آئی کہ مامون عباسی نے بوجہ میلانِ تشیع فدک کو اولاد حسنین کے حوالے کر دیا۔ القصہ جب ان افسانوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا تو دعویٰ ثبوت ہبہ جس پر مولوی عمار علی صاحب بیڑا اُٹھا کر عزم اثبات غصب کیا تھا۔ مثل خانہ شیخ چلی مکہ سوائے خیال اور کچھ نہ تھا، بنا بنایا ڈہ گیا اور بعد ازیں ہم کو کچھ ضرورت تردید نہ رہی کہ اہل انصاف کے لیے فدک کے غصب نہ ہونے میں اتنا ہی سامان اور سامانِ علم الیقین ہے اور حضرات شیعہ جیسے ناانصافوں کے لیے اسی قدر جواب دندان شکن اور قاطع ہر مہین وکہین ہے۔

کتب اہل سنت میں دعوائے سیدہ برائے فدک بروایت ضعیف بھی مذکور نہیں

لیکن بایں ہمہ اور زیادہ طریق تنزل مناظرہ میں علامت حقانیت ہوتا ہے۔ اس لیے بطور تنزل معروض ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں سند ضعیف سے بھی یہ روایت نہیں کہ بعد وفات سرور کائنات علیہ وعلی آلہ...... افضل الصلوٰت واکمل التحیات حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعوئے ہبہ فدک کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کا دعویٰ نہ سنا اور گواہ مانگے اور حضرت زہرا حضرت علی اور حضرت اُم ایمن یا حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کو علی اختلاف الروایات گواہ لائیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (بسبب نہ ہونے دو مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کے) ان کی گواہی کو رد کر دیا، یہ سب خوبی اور بزرگی انہی بزرگوارنِ شیعہ کی ہے کہ ان روایات کو گھڑ کر زادِ راہ جہنم تیار کیا اور سرمایہ نعمت ابدی بہم پہنچایا اور پھر جرأت تو دیکھو کہ علمائے اہل سنت سے جواب طلب ہے۔

محبان دین کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ اہل سنت کا شیوہ یہ نہیں کہ وقت پڑے پر جھوٹ بول جائیں۔ ان کے مذہب میں تقیہ کے جواز کی بھی کوئی صورت ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ اس لیے جو امور واقعی ہیں، اگر چہ ظاہر نظر میں جائے گرفت اور محل طعن ہوں، اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں اور انکار نہیں کرتے۔ مثلاً حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا میراث کا دعویٰ کرنا اور حضرت ابوبکر صدیق کا نہ دینا اور قضیہ قرطاس اور واقعہ جمل کہ یہ سب امر واقعی ہیں اور ان کے جواب معقول رکھتے ہیں، اگر جھوٹ ہی بولتے تو جیسے شیعہ وقت پڑے پر جاہلوں کے سامنے اپنی مرویات صحیحہ سے بھی انکار کر جاتے ہیں، سنی

بھی ایسے اُمور سے انکار کیا کرتے تھے لیکن جو بات اصل سے بے اصل ہو اس کو کیونکر سر دھریے۔

پر اس عداوت اور اس دیانت کو دیکھیے کہ سنیوں کے دین کی خوبی کے حسد میں مقتدایان شیعہ اور پیشوایان امامیہ اپنے دین کو بھی خراب کرنے لگے اور جھوٹی روایتیں تراش کر سنیوں سے گریباں گیر ہونے لگے، سو دروغ پسندوں کو جھوٹی باتیں ہی سن کر اطمینان ہوتا ہے، اس لیے ہم بھی ان کی خوشی کے لیے یہی کہتے ہیں کہ جو کچھ شیعہ فرمائیں سب سچ ہے۔ ع..... ''دروغے راجزا باشد دروغے''

روایت ہبہ کے غلط ہونے کی دو دلیلیں

مگر بپاس خاطر اہل صدق اس روایت کے غلط ہونے کی دو دلیلیں بیان کرتا ہوں، ایک سنیوں کی طرف سے، ایک شیعوں کی طرف سے، سنیوں کی طرف کی دلیل تو ایسی لیجیے کہ جس سے اپنے دل کا تردد رفع ہو جائے اور دشمن کا اعتراض دفع ہو جائے، سو وہ وہی روایت مشکوٰۃ ہے جس میں عمر بن عبدالعزیز کا فدک کو بدستور سابق کر دینا مذکور ہے۔ اس روایت کی صحت اور شہرت کی طرف پہلے بھی اشارہ گزرا، اور اب بھی کہنا پڑا کہ مشکوٰۃ کی شہرت تو سب ہی کو معلوم ہے اور ابو داؤد جو اس روایت کا ماخذ ہے وہ خود صحاح ستہ میں سے ہے۔

بالجملہ یہ روایت صحیح سنیوں کی کتابوں میں موجود، پھر جو روایت اس کے مخالف ہو اور وہ بھی ایسی کہ نہ اس کی سند اس کی سند کے برابر اور نہ اس کا ماخذ اس کے ماخذ کے برابر، وہ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کے بعد اگر کوئی کہے کہ سنیوں کی کتابوں میں بطریق صحیح ایسی حدیث موجود ہے جس سے ہبہ ہونا فدک کا ثابت ہوتا ہے تو نادان بھی سن کر یقین کر لے گا کہ یہ بات غلط ہے اور اگر صحیح بھی ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ بطور تردید کے یعنی اس بات کے بتلانے کے لیے کہ یہ روایت غلط ہے۔ اس روایت کو کسی کتاب میں داخل کیا ہوگا، یا کسی نے اپنی کتاب میں اور رطب یابس کے ساتھ اس روایت کو بھی داخل کر دیا ہوگا کہ بعد میں نظر ثانی کر کے صحیح غلط میں امتیاز کر دیا جائے۔ سو علماء شیعہ نے بوجہ چالاکی اور غلط انداز سے ایسے مواقع سے اس قسم کی روایات کو چن لیا ہے۔

دوسری دلیل شیعوں کی طرف سے جس سے وہ اُلٹے الزام کھائیں اور خاموش رہ جائیں۔ سو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فدک کو بدستور سابق فقراء اور مساکین اور ابن سبیل پر تقسیم کرنا اور آپ نہ لینا اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے وارثوں کو نہ دینا ہے، جس کو شیعہ بر سر و چشم رکھتے ہیں اور اس کے واقعی ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ اس کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے اور یہ بھی گزر چکا کہ شیعوں نے اس کے عذر میں ہر چند بہت دست و پا مارے لیکن سب رائیگاں گئے۔ بالجملہ اس قضیہ مسلم الثبوت طرفین

اور نیز روایت مشکوۃ سے ہبہ کا معین ہونا سراسر بہتان اور غلط ہے۔ پھر کیا امکان کہ سیدۃ النساء جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور ہمارے نزدیک محفوظ ہیں، ایسا دعوائے دروغ بایں بزرگی سرزد ہوا؟ اور پھر حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما جو باعتبار طرفین یا معصوم ہیں یا محفوظ، شہادتِ زُور جو ہمسنگ کفر ہے، اس طرح برملا علی الاعلان ادا کریں۔

بہر حال یہ روایت سنیوں کی کتاب میں اصلاً موجود نہیں۔ شیعوں کا افترا اور بہتان ہے، پھر ایسی روایتوں سے سنیوں کے الزام کے درپے ہونا اوران سے ان کا جواب طلب کرنا کمال سفاہت اور عین حماقت کی دلیل ہے۔ باقی یہ جو مولوی صاحب نے نو دس کتابوں کے نام لکھ دیئے ہیں، یہ وہی قدیمی کید ہے اور پرانی دغا اور فریب کی بات ہے جو مولوی صاحب کو سینہ بسینہ پہنچی ہے اور ہم نے اس کی طرف بحوالہ تحفہ اشارہ کیا جس کا یہ مضمون ہے کہ شیعہ اکثر اپنے مطلب کی باتیں کمیاب نادر الوجود کتابوں سے نقل کر دیتے ہیں حالانکہ ان کتابوں میں اس بات کا نشان بھی نہیں ہوتا اور اگر ایک دو نسخہ میں کسی کتاب کی یہ روایت ہووے بھی تو وہ بھی بیشک ایسے ہی دغا بازوں کی چالاکی ہے کیونکہ ان کی ایک یہ بھی عادت ہے کہ کتب غیر مشہورہ میں جو خال خال ملتی ہیں، اکثر روایات اپنے مذہب کی یا اپنے آپ تراش کر داخل کر دیتے ہیں، چنانچہ تحفہ ہی کے حوالے سے یہ بات بھی مفصل مرقوم ہو چکی ہے۔

کتب محولہ کے مؤلفین نے صحت کا التزام نہیں کیا

اور اگر فرض کیجئے کہ ان سب کتابوں کے بھی نسخوں میں یہ روایت ہے تو اوّل اس بات کا اثبات چاہیے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے التزام کرلیا ہے کہ جو کچھ ہم ان کتابوں میں درج کریں، صحیح صحیح درج کریں گے، ضعیف اور موضوع درج نہ کریں گے۔ سو اس بات کا ثابت ہونا تو معلوم، البتہ معاملہ برعکس ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رسالہ اُصولِ حدیث کے آخر میں جو مشکوٰۃ مطبوعہ مطبع دہلی کے اوّل میں لگا ہوا ہے، یوں رقم فرماتے ہیں کہ شیخ جلال الدین سیوطی نے جمع الجوامع میں کوئی پچاس کتابوں سے زیادہ کتابوں کی حدیثیں جمع کی ہیں اور پھر اس میں صحیح حسن ضعیف ہر قسم کی حدیث لائے ہیں، اسی پر اور کتابوں کو بھی قیاس کر لیجئے "مشتے نمونہ خروارے" ع "قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

الغرض ان کتابوں کے مصنفوں نے یہ التزام نہیں کیا کہ ان میں بجز صحاح کے ضعیف حدیثیں داخل نہ کریں گے اور یہ بات ویسے بھی تو ظاہر ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کو بھی بمنزلہ صحاح ستہ سمجھتے اور صحاح میں داخل رکھتے اور اگر فرض کیجئے کہ ان کے مصنفوں نے اپنی طرف سے التزام ہی کیا تھا کہ بجز صحیح اور کسی قسم کی روایت ان میں درج نہ کریں گے، تب بھی اطمینان کے قابل نہیں

کیونکہ اہل سنت کے نزدیک صحت وضعف حدیث کے باب میں ایک آدھ کا کہا نہیں چلتا کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غلطی کھا جاتا ہے، اس لیے ان امور میں ضروری ہے کہ اگر سب محدثین کا اتفاق بھی نہ ہو تو اکثر تو اس کی صحت کے یا ضعف کے قائل ہوں۔

اور یہ بات اوّل تو بشہادت عقل ضروری ہے، دوئم بہت سے شیعہ خبیث باطن نے بوجہ تقیہ متورع اور متقی بن کر اوّل تو اپنا اعتبار پیدا کیا اور پھر محدثین اہل سنت کی خدمت میں رہ کر ان سے صحیح حدیثیں روایت کیں اور انہیں سندوں سے اپنے مطلب کی باتیں بھی ان کے ساتھ رلا کر عالم میں پھیلا دیں اور بوجہ تقوائے ظاہر اور پردۂ تقیہ یہ پیچ ان کا چل گیا۔ اکثر ثقات نے بھی ان کو متورع اور متقی گمان کر کے ان کی روایتیں قبول کر لیں اور بوجہ حسن ظن استاد کو ثقہ سمجھا اور سوا اس کے اوپر کے اساتذہ کو آئمہ حدیث پایا، اس کی وجہ سے ان کی روایات کو من جملہ صحاح سمجھا اور اس دغا میں آ گئے۔

تقیہ کے پردہ میں اہل شیعہ کی خطرناک خیانت

گو متاخرین نے بامداد خداوندی اس دغا کو سمجھا اور ان حدیثوں کو موضوع قرار دیا اور مردود اور متروک ٹھہرایا۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب تحفہ میں باب مکاید میں مکاران شیعہ کی شان میں رقم فرماتے ہیں:

''کید شانز دہم آنکہ جماعت از علماء ایشان خود را از محدثین اہل سنت وانمودہ بعلم حدیث مشغول شدند، واز ثقات محدثین اہل سنت سماع حدیث حاصل کردند، واسانید صحیحہ آنرا یاد گرفتند، وبظاہر بحلیہ تقوے وورع متحلی گشتند تا طالبان را اعتقاد صادق در حق آنہا بہم رسید، واخذ علم حدیث ازانہا شروع نمودند، واحادیث صحاح وحسان روایت کردند، ودر اثناء روایت بہمان اسانید صحیحہ موضوعات را کہ مطابق مذہب ساختہ بودند، نیز در جملہ مرویات درج نمودند، این کید ایشان راہ بسیاری از خواص اہلسنت زدہ است چہ جائے عوام۔

زیرا کہ تمیز درمیان احادیث موضوعہ وصحیحہ برجال سند است، وچون رجال بسبب ایں دغل وتلبیس متحد شدند تمیز مشکل افتاد، ومابہ الامتیاز مفقود گشت، اماچوں عنایت الٰہی شامل علوم اہلسنت بودہ، آئمہ این فن بعداز تحقیق وتفتیش ایں دغل را دریافتند ومتنبہ شدند وبعداز انکشاف جلیہ حال طائفہ از ایشان بوضع اقرار نمودند وطائفہ صریح اقرار نہ نمودند لیکن امارات اقرار درانہا قائم شدہ وتاحال آں احادیث در معاجم مصنفات واجزاء دائر وسائر است، واکثر تفضیلیہ ومتشیعین بداں احادیث تمسک کنند،

اوّل کسیکہ ایں دغل راموجد شد جابر جعفی است کہ بعداز تحقیق حال او بخاری ومسلم بنابر احتیاط مطلق مرویات اوراز درجہ اعتبار ساقط ومطروح ساختند، وترمذی وابوداؤد ونسائی بامتابعات وشواہد قبول

کنند، وآنچہ او بدان متفرد است ردّ نمایند وابوالقاسم سعد بن عبداللہ ابی خلف قمی نیز دریں باب استادِ پُر کار ست، اکثر ناواقفانِ اہلسنّت بجہت تلبیس اسانید او گمان برند کہ از رجال معتبرین ماست، حالانکہ چنین نیست نجاشی کہ صاحب نقد رجال شیعہ است او را فقیہ طائفہ وجیہ طائفہ قرار دادہ انتہے بلفظہٖ“

ترجمہ:......”پندرھواں مکر یہ ہے کہ اہل شیعہ کے علماء میں سے ایک جماعت اپنے آپ کو محدثین اہل سنت ظاہر کر کے علم حدیث میں مشغول ہوئی اور ثقات محدثین اہل سنت سے سماع حدیث حاصل کیا اور ان کی اسانید صحیحہ کو یاد کر لیا اور بظاہر تقویٰ و پرہیز گاری سے آراستہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ طلباء علم کو ان کے بارے میں بچی عقیدت پیدا ہو گئی اور انہوں نے ان سے استفادۂ علمی شروع کر دیا اور صحیح اور حسن حدیثیں روایت کیں اور اثنائے روایت میں اسناد صحیحہ کے ساتھ اپنے مطلب کی وضع کی ہوئی روایات بھی درج کر دیں۔

علمائے شیعہ کے اس مکر نے بہت سے خواص اہلسنّت کا راستہ کاٹ دیا ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا، وجہ یہ کہ احادیث صحیحہ اور روایات موضوعہ میں امتیاز تو صرف رجال سند ہی سے ہو سکتا ہے۔ جب اس مکر و فریب سے رجال سند ہی گڈمڈ ہو گئے تو تمیز مشکل ہو گئی اور جس امر سے امتیاز حاصل ہوتا وہ مفقود ہو گیا۔ لیکن چونکہ تائید خداوندی اہل سنت کے علوم کو حاصل تھی۔ اس لیے آئمہ فن نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس فریب کو سمجھ لیا اور متنبہ ہو گئے۔ پھر حقیقت حال کے ظہور کے بعد علماء شیعہ کے ایک گروہ نے وضع احادیث کا اقرار کر لیا اور دوسرے نے صریح اقرار تو نہ کیا لیکن اُن روایات میں اقرار کی علامتیں قائم ہو گئیں اور اس وقت بھی وہ روایات معاجم، مصنفات و اجزاء میں دائر و سائر ہیں اور اکثر تفضیلیہ اور متشیعین ان سے تمسک کرتے ہیں۔

پہلا شخص جو اس فریب کا موجد ہے وہ جابر جعفی ہے کہ اس کی حقیقت کھل جانے کے بعد بخاری و مسلم نے احتیاطاً اس کی تمام مرویات کو ساقط الاعتبار اور مطروح قرار دیا اور ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی اس کی روایات کو شواہد اور متابعات ملنے پر قبول کرنے لگے اور جن روایات کے شواہد و متابعات نہیں ملے، ان کو مردود قرار دیا۔ نیز ابوالقاسم سعد بن عبداللہ ابی خلف قمی بھی اس فریب کاری میں استاذِ کار ہے۔ اکثر ناواقفانِ اہل سنت اسانید کی گڑبڑ کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے راویانِ موثقہ میں سے ہے حالانکہ یہ خیال خلاف واقعہ ہے۔ نجاشی جو ناقد رواۃِ شیعہ ہے۔ اس نے قمی کو فقیہ طائفہ اور وجیہ طائفہ قرار دیا ہے۔ انتہی ترجمہ از ناشر“

اب عرض یہ ہے کہ شاہ صاحب کا لکھنا تو آنکھوں کے دیکھے کے برابر ہے۔ شیعہ سنی سب ان

کے علم اور تاریخ دانی اور تبحر مذہب طرفین کے قائل ہیں حتیٰ کہ علم اہلسنت تو اپنا علم تھا، علم مذہب شیعہ بھی اس قدر رکھتے تھے کہ علماء شیعہ کو بھی میسر نہیں، چنانچہ تحفہ اثنا عشریہ اس کے لیے گواہ موجود ہے لیکن اگر شاہ صاحب نہ فرماتے، کوئی اور کہتا، تب بھی اس بات کا شیعوں کی نسبت یقین بے ساختہ ہو جاتا کیونکہ اس تقیہ کی بیچ پر جھوٹ کو ان کے لیے حلال طیب کیا واجب اور فرض تک کر دیا ہے۔

لسان المیزان میں چند فریب کاروں کی نشان دہی

لسان المیزان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بہت سے شیعان نابکار نے کیا ہے، منجملہ حارث بن غصین ہے جو اعمش سے روایت کرتا ہے، اور اسی قبیل سے حارث بن محمد معکوف ہے اور از ان جملہ حسن بن علی بن زکریا بن صالح ابوسعید عدوی مصری ہے جو ثقات کے نام سے جھوٹی باتیں روایت کرتا ہے، خیر کہاں تک بزرگواران شیعہ کی بزرگی کی تعریف اور مدح میں رطب اللسان رہیے کہ اس قسم کے مضمون بہت ہی تھوڑے ہیں۔

پر رفع استبعاد اور تسکین خاطر سادہ لوحان کے لیے یہ معروض ہے کہ آیت "فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا" سے جس کا یہ ترجمہ ہے کہ "ان سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جنہوں نے اللہ کے ذمہ بھی بہتان لگا دیئے۔" یوں معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ اُمت کے ذمہ طوفان جوڑ لیا کرتے ہیں اور کم عقلوں اور سادہ لوحوں کو بمنزلہ شیاطین، راہ سے بے راہ کر دیتے ہیں۔ سو (اس آیت میں) اس فن میں حضرات شیعہ سے زیادہ اور کوئی چالاک معلوم نہیں ہوتا اور کیوں نہ ہو، جھوٹ سے ان کے دین کا قوام ہے، اگر یہ جھوٹ نہ بولیں تو اور کون بولے۔ سو ان کی نسبت جتنا کچھ کہیے تھوڑا ہے، بالجملہ اگر کتب مذکورہ میں روایت دعوئ فدک ہو بھی؟ تو بوجہ حسن ظن علمائے اہل سنت اور تقیہ مکارانِ مذہب شیعہ اوّل وہ روایت سائر ہوگئی، پیچھے سے محققین نے گو اس کے بطلان کا اشتہار کر دیا لیکن تاہم کہاں تک؟ پھیلی ہوئی بات کا سمیٹنا چھوٹے ہوئے تیر کے ہٹانے کے برابر ہے۔

بہر حال وہ روایتیں مشہور ہوگئیں اور مغفلین کو سراسیمہ کر دیا اور متشیعین اور مردمان تفضیلی کے لیے سامان اضلال ہوگئیں، جیسا کہ توریت وانجیل کی تحریفات باعث ضلال واضلال عالم ہوگئیں، پر جیسے قرآن مجید نے توریت وانجیل کی غلطیوں کی اصلاح کر دی اور قسمت والوں کو ظلمات سے نکال کر نور میں پہنچا دیا، ایسے ہی روایات صحاح اور تحقیقات محققین اولوالابصار نے بھی ان تحریفات کا تدارک کر دیا اور جن کا مادہ قابل اصلاح تھا، ان کو ہدایت کر دی اور ضلالت سے نکال دیا۔ باقی مولوی عمار علی صاحب یا ان کے اقران وامثال کی اگر اصلاح نہ ہو تو کیا بعید ہے؟ جن کے دلوں پر مہر لگی ہوئی تھی ان کے لیے

قرآن جیسی حقانی کتاب سے اصلاح نہ ہوئی بلکہ تحریفات آبائی اور تبدیلات اسلاف کے پابند رہے۔
ایسے ہی مولوی عمار علی صاحب بھی اس بات میں انہیں کے قدم بقدم ہیں اور موافق نقل مشہور ہے:

کند ہم جنس باہم جنس پرواز   کبوتر با کبوتر زاغ با زاغ

کذابوں کی روایات پر جم گئے اور اہل صدق کی بات کو نہ مانا، سو وہ کیا کریں؟
"مَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ"

دعوئے فدک کی روایت اگر صحیح بھی ہو تو بھی کام نہیں چلتا

اور اگر ہم تسلیم کریں اور مناظرہ میں شیعوں سے نرمی ہی برتیں اور اس بات کے قائل ہوں کہ اس روایت میں کسی طرح کا قصور نہیں، باون تولہ پاؤ رتی ہے تب بھی شیعوں کی آنکھوں میں خاک ہی رہے گی کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو مشکوٰۃ کی روایت اصح ہے، اور یہ قوی ہے تو وہ روایت اقوی ہے، اس کو اس پر ترجیح نہیں ہو سکتی، وہی بہر طور مرجح رہے گی اور یہ بات کچھ ہمیں نہیں کرتے کہ اصح اور اقوی کو صحیح اور قوی پر مقدم رکھتے ہیں، تمام عالم ہی کرتا ہے، عقل اسی بات کی شاہد ہے، شیعہ ہر چند عقل سے کچھ غرض نہیں رکھتے۔ اسی طریق پر چلتے ہیں اور اگر یہ نہ کریں تو پھر دین سے دست بردار ہوں کیونکہ ان کے یہاں کے اختلاف کے برابر کسی مذہب میں اختلاف ہی نہیں، چنانچہ ناظران تحفہ اثنا عشریہ اور منتہی الکلام وغیرہ مصنفات مولانا حیدر علی پر پوشیدہ نہ رہے گا اور قدر قلیل کچھ اس کا پتہ اس رسالہ میں سے بھی ملے گا......اور دور کیوں جایئے، مولوی عمار علی صاحب تو یوں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سواء حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اور کوئی بیٹی ہی نہ تھی اور کلینی بصراحت اور نہج البلاغت بلکہ خود کلام ربانی تعدد بنات نبوی پر شاہد ہیں، چنانچہ اوپر مفصل مذکور ہوا۔

تو اب ہم مولوی صاحب سے استفسار کرتے ہیں کہ (آپ اگرچہ جھوٹے ہیں، پر بزعم خود تو سچے ہی ہیں اور معتقدوں کے نزدیک تو آپ کی بات سے پھرنا، خدا کی بات سے پھرنا ہے تو آپ کی روایت بھی خواہ مخواہ آپ کو صحیح ماننا پڑی اور کافی کلینی خود اصح الکتب ہے اور نہج البلاغت بمنزلہ وحی آسمانی اور قرآن خود وحی آسمانی ہے۔ پھر آپ نے بایں وجہ کہ خدا کے فرمودہ میں تو بدا کا احتمال ہے اور کافی اور نہج البلاغت میں آئمہ کا قول اس بات میں منقول ہے اور ان کے علوم، علم خداوندی اور علم نبی سے ماخوذ ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدا ہی سے لیتے ہیں تو اس صورت میں بھی ان کے اقوال میں بھی وہی احتمال رہا اور آپ کو نہ خدا سے واسطہ نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واسطہ) آپ نے جو اپنے ہذیان اور بکواس کو کافی کی روایت اور حضرت امیر اور خدا

کی شہادت سے اصح سمجھ کر مقدم رکھا، یہ ترجیح آپ کے نزدیک صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے تو فہو المراد، ورنہ ''چشم ماروشن دل ماشاد'' یہ بات تو آپ مانیں گے کہ ہاں میرا (یعنی مولوی عمار علی کا) یہ قول کہ ''سوائے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی بیٹی ہی نہیں'' غلط ہے۔ باقی اس ترجیح کو کہ صحیح اصح پر راجح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے ہم مرجوح کر دیں گے جو نہج البلاغت میں مندرج ہے۔

الزموا السَّوَاد الاعظم فَان يد الله على الجماعة وَاِيَّاكُمْ وَالْفرقةِ فَاِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاس لِلشَّيْطَانِ كَمَا اِنَّ الشَّاذَّ مِنَ الغَنَم

یعنی ''گروہ اعظم کے ساتھ رہو، اس لیے کہ اللہ کا ہاتھ بڑی جماعت کے سر پر ہے اور دیکھو مجمع سے الگ مت ہو، اس لیے کہ مجمع سے نکلا ہوا آدمی شیطان کے لیے ہے۔ جیسا کہ ریوڑ سے الگ رہی ہوئی بکری بھیڑیے کے لیے ہوتی ہے۔ فقط'' سو بالفرض بفرض محال مولوی صاحب کی جھوٹی بات یعنی فقط حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کا بیٹی ہونا اگر سچ بھی ہو تب مرتبہ صحت سے تو آگے چلنے ہی کی نہیں، پھر اس کو اصح اقوال پر ترجیح دینے میں تمام عالم سے علیحدہ ہونا ہے۔ سو اس وجہ سے شیطان کے زمرہ میں داخل ہونا مولوی صاحب کو مبارک سبحان اللہ۔

ہر یکے را بہر کارے ساختند   مہر او اندر دلش انداختند

شیعوں کو خداوند کریم نے غلطی ہی پر جمے رہنے کے لیے پیدا کیا ہے جو ایسے ایسے براہین قاطعہ سن کر بھی باز نہیں آتے اور جیسے اندھا دن کو بھی نور آفتاب سے فیضیاب نہیں ہوتا، یہ کوران دین بھی ان دلائل سے جو مثل آفتاب روشن ہیں، مستفیض نہیں ہوتے، الغرض روایت مشکوٰۃ کے مرجح ہونے میں وہی متردد ہو سکتا ہے جو دن کو آفتاب کے ہونے میں متردد ہوتا ہے۔

شیعوں کی پیش کردہ روایت سے بشرط صحت بھی ہبہ فدک ثابت نہیں ہوتا

لیکن ایسے حجتی لا اُمتیوں کی حجت جواب بھی نہ مانیں ہمیں بھی ختم کر دینی ہے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ سلمنا علماء شیعہ کی رائے غلط ہی صحیح سہی اور روایت مشکوٰۃ کو روایت مندرجہ صحیحہ مولوی صاحب پر ترجیح نہ سہی لیکن جھوٹی بات کسی طرح پاؤں نہیں چلتی، اب بھی شیعوں کی مطلب براری اس روایت سے نہیں ہو سکتی کیونکہ جو روایت اس مضمون کی شیعوں کی چالاکی سے بعض گمنام کمیاب سنیوں کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہے، تب اس میں ایسا لفظ کوئی نہیں جس سے ہبہ ثابت ہو جائے بلکہ لفظ ''اَعطٰی'' واقع ہے جو ہبہ اور عاریت دونوں میں

استعمال کرتے ہیں، دفع تردد کے لیے اس روایت ہی کو بعینہ نقل کیے دیتا ہوں۔

صواعق محرقہ میں جو درباب ردّ روافض تصنیف ہوئی ہے، ابن حجر مکی (فضائل میں ابوبکر صدیق کے) اس روایت سے اگرچہ شیعوں کی گھڑی ہوئی ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہی نکلتی ہے اور شیعوں نے ہر چند طعن کی بات گھڑی تھی پر خوبیٔ قسمت سے تعریف ہوگئی ہے گو مولوی صاحب اور ان کے اتباع کو وہ پھر بھی عیب ہی نظر آئے۔

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

خیر وہ روایت یہ ہے:

اخرج الحافظ ابن شیبة اِنَّ زَیْدًا ھذَ الامام الجلیل قِیْلَ لَهٗ اِنَّ اَبَا بَکْرٍ اِنْتَزَعَ مِنْ فَاطِمَةَ، فَقَالَ اِنَّهٗ کَانَ رَحِیْمًا وَکَانَ یَکْرَهُ اَنم یُغَیِّرَ شَیْئًا تَرَکَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَتْهُ فَاطِمَةُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا فَقَالَتْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَانِیْ فِدَکَ فَقَالَ هَلْ لَکِ شَاهِدٌ فَشَهِدَ لَهَا عَلِیٌّ وَاُمُّ اَیْمَنَ فَقَالَ لَهَا فَرَجُلٌ وَامْرَأَةٌ تَسْتَحِقِیْنَهَا ثُمَّ قَالَ وَاللّٰهِ لَوْ رَجَعَ الْاَمْرُ فِیْهَا اِلَیَّ لَقَضَیْتُ بِقَضَاءِ اَبِیْ بَکْرٍ۔

حاصل یہ ہے ’’حافظ عمر بن شیبہ نے کسی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت زید سے جو امام جلیل القدر ہیں، یعنی زید بن امام زین العابدین سے کسی نے کہا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فدک چھین لیا تھا، انہوں نے فرمایا کہ وہ بڑے رحم دل ہیں (یعنی ان سے ایسا کام کب ہوسکتا ہے یہ تو سنگ دلوں کا کام ہے وہ تو بڑے رحم دل تھے، پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی انداز کے بدلنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا اور اس کے بدلنے سے ان کو کراہت آتی تھی، سو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کے پاس تشریف لائیں اور یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو فدک دیا تھا، سو انہوں نے فرمایا کہ تمہارا کوئی گواہ ہے؟ اس پر حضرت علی اور حضرت اُم ایمن نے گواہی دی، انہوں نے فرمایا کہ ایک مرد اور ایک عورت سے تو حق ثابت نہیں ہوسکتا، اس کے بعد حضرت زید فرماتے ہیں کہ واللہ! اگر یہ مقدمہ میرے یہاں رجوع ہو، تو میں اس میں وہی حکم دوں جو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا۔ فقط‘‘

اب غور فرمائیے کہ یہ ہر چند افترا کردہ کذابان شیعہ ہے جو بظاہر بحیلہ تقیہ متقی اور بباطن بدکردار تھے لیکن موافق مثل مشہور ’’حق برزبان جاری شود‘‘ لفظ ’’وَهَبَهَا‘‘ جو صریح ہبہ اور تملیک پر دلالت کرتا تھا، واضعان روایت کو نہ سوجھا لیکن تعریف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صاف صاف کہنی پڑی اور یہ تعریف بھی

کیسی کچھ؟ اور وہ بھی امام زادہ سے، اور امام زادہ بھی کون؟ جو خود بھی جلیل القدر اور والد ماجد تو ہیں ہی۔

خیر منصفوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اگر یہ روایت جملہ عیوب قادح اعتبار سے مبرا ہو اور پھر ہم درجہ روایت مشکوٰۃ بھی ہو تب بھی اعطاء سے بدو وجہ ہبہ ثابت نہیں ہوتا۔ اوّل تو یہ کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ جواب از قبیل "مما شات مع الخصم" یعنی بطور تنزل اور تسلیم ہے، یعنی اگر تسلیم کیجئے کہ چھین ہی لیا تھا تو اس کی فلانی وجہ تھی، مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس روایت سے ہبہ کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ انکار نکلے گا۔

لفظ عطاء ہبہ اور عاریت میں مشترک ہے اس پر مسلمہ حدیث سے استدلال

دوسرے یہ کہ اُردو میں اعطاء کا ترجمہ دینا ہے۔ سو جیسے ہبہ میں دینا اور اعطاء بولتے ہیں ایسے ہی عاریت میں بھی یہ دونوں لفظ دونوں زبانوں میں مستعمل ہوتے ہیں اور سند اس کی حدیث صحیح مقبول الطرفین ہے، وہ حدیث یہ ہے: "اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَوْمَ خَیْبَرَ لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غداً رجلاً یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ الخ" مطلب یہ ہے کہ "غزوہ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جھنڈا عنایت کرنے سے ایک روز پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ کل کو لشکر کا جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبّ اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ہے۔ فقط" اب غور فرمائیے کہ اس حدیث میں بھی اعطاء کا مادہ موجود ہے، پر کسی نادان کو بھی یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ جھنڈا ہبہ کر دیا بلکہ جیسا دستور ہے کہ چپراس سپاہیوں کو اور قلمدان وزارت وزیروں کو اور خزانہ کی کنجیاں خزانچیوں کو دے دیا کرتے ہیں اور وہ دینا بطور امانت ہوتا ہے، اسی لیے جب ان کو معزول یا موقوف کر دیتے ہیں، تو یہ سب اشیاء چھین لیتے ہیں، ایسے ہی سپہ سالاران کو جھنڈے کا دے دینا بھی بوجہ دیانت ہوتا ہے، خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کہ اس زمانہ میں بلکہ اصحاب کرام کے زمانہ میں ہر مہم کیا ہر لڑائی کا ایک جدا ہی افسر ہوتا تھا، اور اس لڑائی میں تو خود سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات ہی سپہ سالار تھے، فقط لڑائی کے وقت حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کو اس قدر انبوہ کا افسر کر دیا تھا جو مقابلہ پر بھی بھیجے گئے تھے۔ الغرض جھنڈا عطا کرنا بطور امانت تھا۔

اور جب عطاء اور اعطاء امانت میں بھی مستعمل ہوا تو ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا "اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَانِیْ فِدَکَ" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو فدک عطا فرما دیا ہے۔ بایں معنی ہو کہ فدک مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے کھانے پینے کے لیے مستعار دے رکھا ہے اور محاصل اس کا میرے لیے معاف تھا۔ سو گو اس کو اپنا مملوک نہیں سمجھتی لیکن آخر تم کسی نہ کسی کو اس کو یا اس کے محصول کو دو گے ہی، سو مناسب یوں ہے کہ ہمارے ہی پاس رہے کیونکہ ہمارے پاس پہلے سے بھی ہے اور اس کے محصول کو ہم مدت سے کھاتے ہیں، تم اس کے محصول کو مثل محصولِ دیگر متروکہ نبی علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام کے فقراء اور مساکین اور ابن سبیل پر تقسیم نہ کرو۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہوں کا طلب کرنا (باوجود یہ کہ رحم دل تھے، چنانچہ حضرت زید نے فرمایا ہے اور رحم دلوں کا یہ کام نہیں کہ ایسی سنگدلی برتیں، اور وہ بھی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بنت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جن پر مکافات رحمت پدری تمام عالم کو رحم کرنا چاہیے۔ چہ جائیکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا بانیازِ رحم دل) اس وجہ سے تصور فرمانا چاہیے کہ مثلاً قریب وفات سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوٰۃ واکمل التسلیمات نے فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو برائے چندے مستعار عطا فرمایا ہو پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ قصہ معلوم نہ ہوا ہو بلکہ بایں نظر کہ بدام فدک میں تصرف مالکانہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم ہی کو کرتے ہوئے دیکھا تھا، بجائے خود یہ سمجھے ہوئے تھے کہ فدک بھی حسب ایما حدیث "مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" کے (جس کا مذکور عنقریب ہی آتا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ) وقف عام ہے۔ اس میں اچانک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے یہ بات سن کر اس وقت جانِ صدیق رضی اللہ عنہ عجب شکنجہ میں آ گئی کہ نہ اِدھر ہوئے بنے، نہ اُدھر ہوئے، رعایت رضا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک طرف اور پابندی اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کی طرف حضرت زید نے بایں لفظ اشارہ فرمایا "وَكَانَ يَكْرَهُ أَنْ يُغَيِّرَ الخ" ایک طرف اور دونوں جانبیں واجب الرعایت۔

مگر چونکہ رعایت جانب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بھی مبنی وجوب اتباع نبوی واقتداء مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر تھی اور پاسداریٔ قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت اور فرضیت ہر چند بمراتب موکد ہے لیکن لِم اسکی یہی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے "بمر گش گیر تا بہ تپ راضی شود" تو جیسا کہ آیت "لَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا" میں ممانعت تو بظاہر ہوں، کہنے اور جھڑکنے سے ہے لیکن مطلب یہ ہے کہ جب ہوں کہنے اور جھڑکنے سے رُکیں گے تو گالی گفتار اور جوتی پیزار بدرجہ اولیٰ نہ ہوگی تو ایسے ہی پاسداری قرابت سے بھی مقصود یہی ہے کہ جب اُمور دینی میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناخوشی گوارا نہ کریں گے تو اُمور اخرویہ میں تو بالا ولی مطیع و منقاد

رہیں گے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول کر کے بھیجنا اصل اُمورِ دینی کی اصلاح کے لیے ہے، خصوصاً حقوق مالی میں اور وہ بھی فدک کہ بشہادت دستور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کی حق تلفی کا فی الجملہ خلجان ساتھ لگا ہو کیونکہ تادم آخریں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ مصرف فدک رہے۔ مع ہذا اہل حق موقع رعایت میں رعایت والوں کو زیادہ دبایا کرتے ہیں، اس لیے انصاف والے اپنوں کی رعایت نہیں کیا کرتے تو ان وجوہ سے مرجح اور موجبہ بھی تھا کہ بحاصل فدک میں دستور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چہ بادا باد دستور العمل رکھے۔

لیکن بحکم "مَالاَ یُدْرَکُ کُلُّهٗ لاَ یُتْرَکُ کُلُّهٗ" کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بسبب کمال اخلاص اور نہایت پاس و نیاز کے اس بات کے جویا ہوئے کہ تامقدور دلداری حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی جائے اور جس قدر بن سکے خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا پر میل نہ آنے دیجئے۔ بایں ہمہ اپنی غلط فہمی کا جدا احتمال۔ اس لیے طالب شہود ہوئے تا کہ شاید کسی گواہ کی تقریر سے کوئی اشارہ نبوی اس بات کی طرف پایا جائے کہ گو تر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقف عام ہے لیکن پھر بھی مستعیر یا اقربا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اولیٰ اور اقدم ہیں چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بوجہ پاسداریٔ قرابت نبوی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے دوٹوک بات کہنے میں متامل اور متردد تھے اور اپنا مافی الضمیر (یہ بات کہ میں وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے) بلحاظ دل شکنی جگر گوشۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آشکارا نہیں کہہ سکتے تھے۔

تو خدا ساز غیب سے تدارک ہوا اور بحکم "وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا" یعنی "جو شخص خدا سے ڈرے، خدا اس کے لیے بلاؤں سے نکاسی کی صورت کر دے ہے۔" وہ لطیفہ غیبی پیدا ہوا کہ جس سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی رنجش کا کھٹکا بھی جاتا رہا، یعنی گواہ ملے تو ایک مرد اور ایک عورت ہی ملی، نصاب شہادت بھی پورا نہ ہوا، جو کسی کو کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہے بلکہ ایک عذر معقول ہاتھ آیا اور عذر معقول اہل عقل اور دین داروں کے نزدیک مقبول ہی ہوتا ہے۔ "وَالْعُذْرُ عِنْدَ کِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ" اس لیے ہم بالیقین جانتے ہیں کہ یہ بات موجب مزید اقتدار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہیں تو باعث رفع رنج قلب پاک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا تو ضرور ہی ہوئی ہوگی۔

چنانچہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے راضی ہو جانا جو شیعوں کی کتابوں کے حوالے سے عنقریب ان شاء اللہ مذکور ہوگا۔ اس بات پر شاہد ہے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ قول "وَاللّٰهِ لَوْ رَجَعَ الْاَمْرُ اِلَیَّ لَحَکَمْتُ فِیْهَا بِمَا حَکَمَ اَبُوْ بَکْرٍ"

یعنی واللہ! اگر یہ مقدمہ میرے پاس رجوع ہوتا تو میں وہی حکم کرتا جو ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا، بآواز بلند یہ کہتا ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو حضرت ابو بکر سے کچھ ملال نہ تھا اور تھا تو انجام کار باقی نہیں رہا بلکہ مبدل بخوشی ہو گیا تھا ورنہ اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس جہان سے ناخوش تشریف لے جاتیں تو اہل بیت میں سے ایک بھی ابو بکر کو بھلائی سے یاد نہ کرتا، چہ جائیکہ ایسی بڑھ کے تعریف؟ القصہ اگر علمائے شیعہ کو ہمارا یہ کہنا کہ یہ روایت موضوع ہے، مسلم ہو تو فبہا، ورنہ اس روایت میں کوئی بات خلاف اہل مذہب ثبوت کو نہیں پہنچتی جو علمائے شیعہ دہن دریدہ ہو کر زبان درازی کریں اور الزام اہلسنّت کے لیے اس روایت کو زبان پر لائیں، ہاں اگر توجیہ وجیہ جو مذکور ہوئی نہ بن پڑے تو البتہ شیعوں کی فی الجملہ کچھ بن پڑے۔

لفظ عطا کو بمعنی ہبہ بنانے کی ناکام کوشش

مگر شاید علماء شیعہ بعد تجسس بسیار وجد وجہد بے شمار یوں بات بنانے لگیں کہ ہر چند عاریت کے موقع میں اعطاء کا مستعمل ہونا مسلم لیکن یہ معنی حقیقی ہیں اور عاریت معنی مجازی، اس لیے استعمال میں جب تک کوئی قرینہ صارفہ معنی ہبہ سے نہ پایا جائے تب تک معنی عاریت مفہوم نہیں ہو سکتے۔ سو اوّل تو یہ بات ہی غیر مسلم، مستدل و مدعی کو لازم ہے کہ دعویٰ بے دلیل زبان پر نہ لائے ورنہ ایک حرف خفیف "لا نسلم" میں وہ دعویٰ مسترد ہو جائے گا۔

اور یہ بھی نہ سہی، جیسے علمائے شیعہ ایک دعویٰ بے دلیل پیش کر کے بزعم خود اہلسنّت کے سامنے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، ہم بھی ایک بے دلیل یوں دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ لفظ ان دونوں فردوں میں مشترک لغوی ہے، یا ان دونوں معنوں میں مشترک لفظی ہے اور یہ دعویٰ ایک وجہ سے بہ نسبت دعویٰ علمائے شیعہ معقول بھی ہے کیونکہ اصل یہی ہے کہ لفظ اپنے معنی موضوع لہ میں مستعمل ہو، سو اس صورت میں ہر ایک معنی کے لیے کوئی قرینہ چاہیے جو دوسرے معنی سے صارف ہو۔

تعین معانی کے لیے قرائن کی بحث

مع ہذا یہ کچھ ضرور نہیں کہ قرینہ مذکور لفظی ہی ہوا کرے اور وہ بھی لفظ کثیر المعنی کے پس و پیش ہی لگا ہوا ہو بلکہ قرینہ کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ مخاطب کو فہم مطلب میں غلطی نہ پڑے، سو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعد زیب دینے مسند خلافت اس بات کی تحقیق کی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ مملوکہ کیا گیا ہے، سو اس تحقیقات میں یہی تحقق

ہوگیا ہو کہ فدک تا دم باز پسیں مملوکہ مقبوضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی رہا بلکہ خود حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور دیگر اہل بیت کے اقراروں سے یہ بات ثابت ہوگئی ہو اور ظاہر بھی یہی ہے کیونکہ ایسی بات گھر ہی کے لوگ جانا کرتے ہیں۔

لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بطور خود اس کا بندوبست اور جمع خرچ کرنا چاہا، تب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بایں وجہ کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دے رکھا ہے، مزاحم حال ہوئی ہوں اور اس جہت سے یہ غرض ہو کہ گو فدک ہمارا مملوک نہیں لیکن اولیٰ یہ ہے کہ یہ ہمارے پاس ہی رہے اور اس کی آمدنی ہمارے ہی پاس آیا کرے، اب منصفان شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ بشہادت قواعد علم مناظرہ مدعی کے خصم کے لیے بھی تو احتمالات ممکنہ خلاف دعویٰ مدعی ہی کفایت کرتے ہیں۔ سو اس احتمال کے امکان میں اہل عقل تو کیا امکان ہے جو انکار کریں؟ اور ایسے ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ بعد وقوع اس ماجرا کے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ فرمانا کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، بجز عاریت اور کسی معنی پر محمول نہیں ہوسکتا اور باوجود مملوک نہ ہونے کے پھر اتنا تحکم بوجہ ناز اہل بیت و نیاز صدیق اکبر جو خصوصاً اس موقع میں کہ رعایت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے اور کہے کے بھروسے ہر صحابی خلفاء پر تحکم کر لیتا تھا، چہ جائیکہ اہل بیت؟ اور ان میں سے بھی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور وہ بھی حضرت صدیق اکبر پر، کہ نیاز مند خاص اہل بیت تھے، رضوان اللہ علیہم اجمعین

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بوجہ قرب مسجد حضرت عباس کے پرنالے کا توڑ ڈالنا اور ان کا یہ تحکم کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کا لگایا ہوا تھا، تم نے کیوں توڑا؟ اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس پرنالے کو اپنے ہاتھ سے درست کرنا کتابوں میں مذکور ہے لیکن۔ ع:...... "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد" حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ تحکم برسر، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بوجہ حدیث "مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ"، جس کا ذکر قریب ہی ان شاء اللہ تعالیٰ آتا ہے، مجبور تھے اور پھر گواہوں کی تقریر سے بھی کچھ عقدہ کشائی نہ ہوئی، کوئی اشارہ کسی قسم کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس رہنے دینے پر گواہوں کی تقریر سے ظاہر نہ ہوا۔

فدک کیلئے سیدہ کی شہادت بھی نامکمل تھی

مع ہذا گواہی بھی اپنی مقدار معین کو نہ پہنچی اور اوپر بشہادت دستور نبوی شرکت فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کی جس قسم اور جس مرتبہ کی کہی جائے، اس مال میں ثابت، القصہ روایت متنازعہ فیہا،

اگر بپاس خاطر شیعہ ہم تسلیم ہی کریں! تو کوئی بات خلاف مذہب اہلسنت اور مناقض حدیث مشکوٰۃ اس روایت سے نہیں نکلتی بلکہ اُلٹی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف نکلتی ہے۔ سو علمائے شیعہ اگر اس روایت کو موضوع سمجھیں تو فبہا ورنہ اگر تسلیم کریں تو بجمیع اجزائہا تسلیم کریں۔

حضرت زید کے بارے میں دریدہ دہنی اور اس کا جواب

اور اگر یہ عذر نامعقول پیش کریں کہ ہرچند یہ روایت صحیح ہے لیکن حضرت زید ہمارے عقیدہ کے موافق (نعوذ باللہ منہا) کافر مرے ہیں کیونکہ امامت حق حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا تھا کہ وہ امام وقت تھے اور امام ہر زمانہ میں ایک ہی ہوتا ہے۔ پھر جو انہوں نے جہاد کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے آپ کو امام سمجھتے تھے اور جو شخص کہ امام نہ ہو اور بایں ہمہ دعویٰ امامت کا کرے تو وہ بعینہٖ ایسا ہی ہے، جیسا کوئی نبی نہ ہو اور پھر دعویٰ نبوت کا کرے، سو جیسا وہ کافر ہے بلکہ کافروں میں بھی اشد، ایسا ہی یہ ہے۔ پھر ان کی بات کا اپنے مذہب کی تائید میں کیا اعتبار؟ ہاں ہبہ ہونا فدک کا جو مخالف مذہب حضرت زید یعنی مذہب اہل سنت ہے۔ البتہ مقبول ہوتا لیکن اس کو توجیہ عاریت نے نہ چلنے دیا تو اس کا جواب قاضی نور اللہ صاحب، سنیوں کی طرف سے آپ دے گئے ہیں، اس لیے ہم کو کیا ضرورت کہ حضرت زید کی بزرگی کے اثبات میں دردسر اُٹھائیں؟ ان کی روایت نقل کیے دیتا ہوں کہ ان کا لکھا شیعوں کے نزدیک وحی آسمانی سے بھی زیادہ ہے، مثل نوشتۂ تقدیر کوئی اس کو مٹا نہیں سکتا۔ قاضی نور اللہ صاحب مجالس المومنین میں فضیل بن یسار کے احوال میں امالی شیخ ابن بابویہ سے نقل کرکے بروایت فضیل بن یسار ہی رقم فرماتے ہیں کہ "گفت در محاربہ زید بن علی با طاغیان لشکر ہشام با او ہمراہ بودم، و چوں بعد از شہادت زید بمدینہ رفتم و بخدمت حضرت امام جعفر صادق رسیدم، آنحضرت از من پرسید کہ اے فضیل با عم من در قتال اہل شام حاضر بودی؟ گفتم بلے، انگاہ پرسید کہ چند کس را از ایشان کشتی؟ گفتم شش کس را، فرمود مبادا تراشکے در استحلال خون ایشان باشد؟ گفتم اگر شکے دران میداشتم چرا ایشانرا می کشتم آنگاہ شنیدم کہ آنحضرت گفت، "اَشْرَكَنِی اللّٰهُ فِیْ تِلْكَ الدِّمَاءِ وَاللّٰهِ زَیْدٌ عَمِّیْ هُوَ وَاَصْحَابُهٗ شُهَدَاءُ مِثْلَ مَا مَضٰی عَلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ وَاَصْحَابِهٖ "انتہی بلفظہ"

ترجمہ: از ناشر: "فضیل نے کہا کہ زید بن علی کی لڑائی جو طاغیان ہشام کے ساتھ ہوئی تھی میں اس میں شریک تھا۔ حضرت زید کی شہادت کے بعد جب مدینہ گیا اور حضرت امام جعفر صادق کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے مجھ سے پوچھا کہ اہل شام کے ساتھ جو میرے چچا نے قتال کیا تو اس میں حاضر تھا؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ اس وقت آپ نے پوچھا کہ تو نے کتنے شامی قتل کیے؟

میں نے عرض کیا چھ آدمی، فرمایا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں ان کا خون حلال ہونے میں شبہ ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اگر مجھے کوئی شک ہوتا تو میں ان کو قتل کیوں کرتا۔ اس وقت میں نے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ الخ"

فارسی کا ترجمہ تو اکثر جانتے ہی ہیں، پر عربی کا ترجمہ لکھنا پڑا۔ وہ یوں ہے "خدا مجھ کو ان خونوں کے ثواب میں شریک کرے، واللہ! حضرت زید میرے چچا اور ان کے اصحاب سب شہید ہیں اور یہ سب قصہ ایسا ہی ہے جیسا حضرت علی اور ان کے یاروں پر گزرا فقط" اب حضرت امام ناطق بحق امام جعفر صادق کی اس تمنا اور اس تشبیہ کو دیکھنا چاہیے! امام کے منہ سے جو لفظ نکلے تو سراسر صحیح ہے، سو اگر یہ تشبیہ صحیح ہو تو یہ معنی ہوں کہ حضرت زید کا حال حضرت امیر المؤمنین کے حال کے ہم پلہ تھا، تو اس صورت میں حضرت زید کا کافر ہونا تو غلط۔ البتہ زبدۂ اولیاء اور عمدہ اتقیاء میں سے ہوں گے ورنہ شہید ہونا کجا؟ اور پھر حضرت امیر کے حال کا ان کے حال سے مماثل ہونا تو محال ہی ہوگا؟ یہ بات جب ہی ہو سکتی ہے کہ عقیدۃً اور عملاً اور حالاً حضرت زید متبع اور مطابق حضرت امیر کے ہوں، فرق ہو تو مقدار ہی کا ہو، یعنی جیسے چھوٹی تصویر اپنے سے بڑی ذی تصویر کے ہر بات میں سوا مقدار کے مطابق ہے، حضرت زید بھی حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سوائے عظمت اور زیادتی مراتب کے ہر بات میں مطابق ہوں، سو یہ فرق اور آئمہ میں بھی ہے۔ حضرت امام باقر اور حضرت امام جعفر صادق وغیرہم بلکہ حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین درجہ میں کون سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برابر ہیں؟

فدک کے بارہ میں حضرت زید کا قول ہی صحیح ہے

بہر حال حضرت زید کی بات باون تولہ پاؤ رتی کی ہوگی۔ خصوصاً ایسی اختلافی بات کہ جس میں بے غور لب کشائی نہیں کی جاتی کیونکہ سنی شیعہ دونوں کے قول کے موافق بالاتفاق اس خلاف میں ایک طرف جنت اور ایک طرف جہنم ہے، بالجملہ روایت متنازعہ فیہا بالیقین موضوع ہے اور بایں ہمہ موضوعیت جو سنیوں کی بعضی کتابوں میں پائی جاتی ہے تو اوّل تو اس کا حال خوب مفصل معلوم ہو چکا۔

دوسرے اس روایت کو بغرض الزام شیعہ بھی درج کرتے ہیں کہ جو روایت تمہاری بنائی ہوئی اور تمہاری دستاویز اعتراض ہے، وہی روایت ہمارے مفید مطلب ہے، چنانچہ صواعق محرقہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل ہی میں اس کو لکھا ہے پر جو الٹی کے بھجن ہار ہیں، وہ الٹی ہی سمجھتے ہیں اور بے سوچے سمجھے ایسے ایسے مواقع میں سے بھی لوگوں کے دھوکا دینے کو (جیسا کہ مولوی صاحب نے کیا ہے) نقل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عمار علی صاحب نے ایسا ہی کیا ہے اور پھر ہرگز شرم وحیا پاس کو بھی نہیں پھٹکتی۔

شیعہ قرآن وحدیث کے کسی لفظ کے معنی متبادر مراد نہیں لے سکتے

اور اگر اس پر بھی علماء شیعہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئیں! اور شرم کی آنکھیں بند کر کے یوں فرمانے لگیں کہ گو اعطاء بمعنی عاریت بھی آتا ہے لیکن تاہم متبادر معنی ہبہ ہی ہیں، خصوصاً۔ اس روایت میں تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ متبادر ہونا ہبہ کا لفظ اعطی سے اس روایت میں مسلم، لیکن اوّل تو شیعہ ملفوظات آئمہ خصوصاً کلمات مرتضوی کے جو صحابہ کرام اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کی مدح میں صادر ہوئے ہیں اور ان میں سے کچھ اس رسالہ میں بھی منقول ہوئے ہیں، معنی متبادر ہی لے کر شیعہ ہونے سے دست بردار ہوں، اور ایسے ہی آیات قرآنی جو صحابہ کی مدح میں وارد ہوئی ہیں، ان کو اپنے معنی متبادر ہی پر رکھ کر بدل وجان معتقد ہو جائیں، اس وقت اگر ہم سے اس قسم کی درخواست کریں تو فی الجملہ بجا بھی ہے۔ اگر وہاں وہ مان جائیں تو خیر جوں توں یہاں ہم مان جائیں، دوسرے اگر معنی متبادر ہی ہر کلام کے لیے جایا کریں تو پھر یہ فرق باریک فہمی وغیرہ سراسر لغو ہو جائے اور اکثر غلط فہمیاں درست ہو جائیں کیونکہ بیشتر سبب غلط فہمی کا یہ تبادر فہم ہوتا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے۔

اور اختلافات آئمہ اہلسنّت اور ایسے ہی اختلافات باہمی مجتہدین شیعہ مبنی اس اصل پر ہیں، خاص کر اُصولیوں اور اخباریوں کا اختلاف جو شیعوں میں باہم پیدا ہوا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اخبار ظاہرہ پر عمل کرتے ہیں اور جو معنی متبادر ہوتے ہیں، اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اُصولی اپنے عندیہ میں غور کر کے معنی مقصود شارع پر عمل کرتے ہیں اور تبادر معانی ظاہر اخبار کا لحاظ نہیں کرتے، سو حضرت مولوی عمار علی صاحب اگر اس روایت میں بوجہ تبادر معنی ہبہ ہم سے اُلجھنے کو تیار ہوتے ہیں تو پہلے اپنے مذہب اُصولیین سے دست بردار ہو کر اخباری بن جائیں، پھر ہم سے دوچار ہوں، اس وقت ہم بھی ناچار بحکم "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" اس ردّ وکد سے (کہ عاقل کو ہر جگہ معنی متبادر ہی ملحوظ رکھنا چاہیے، جیسے عوام کا کام ہے؟ یا معنی محقق کی تحقیق ضروری ہے جیسے محققین کا شیوہ ہے؟) اعراض کر کے دوسری طرح مولوی صاحب کے کان کھولیں گے۔

روایت فدک منقطع ہے

اجی ہم نے مانا کہ لفظ اعطاء کے معنی روایت متنازعہ فیہا میں یہی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ہبہ ہی کر دیا تھا لیکن مولوی عمار علی صاحب بلکہ تمام علمائے شیعہ اس میں کیا ارشاد کریں گے کہ یہ روایت منقطع ہے۔ حضرت زید اس زمانہ میں کہاں

تھے؟ جب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے دعویٰ ہبہ فدک کیا؟ یہ بات اگر بالفرض واقع میں وقوع میں آئی ہے تو قریب وفات حضرت سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات والتسلیمات ظہور میں آئی ہے بلکہ متصل بعد وفات ہی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں۔ سو اس زمانہ کے وقائع کا مشاہدہ اور ان کی روایت اور شہادت بجز صحابہ اور کسی کا کام نہیں۔

القصہ حضرت زید کا یہ قول ایک قول بے سند ہے۔ کوئی بات بے سند متصل لائق اعتبار نہیں، ہاں اگر حضرت زید شیعوں کے امام ہوتے تو علم غیب کی وجہ سے سنیوں کو نہیں، تو شیعوں ہی کے نزدیک اُن کا قول حجت ہو جاتا؟ پر شیعوں کے نزدیک تو مؤمن بھی نہیں، چہ جائیکہ علم غیب اور امامت؟ ہاں منکر امامت امام وقت تھے جس سے ولی بھی کافر ہو جائے اور سنیوں کے نزدیک گو حضرت زید اکابر اولیاء میں سے ہوں لیکن تاہم آدمی ہیں۔ جب تک سند نہ ہو کیونکر معلوم ہو کہ انہوں نے جس سے یہ بات سنی ہے وہ معتبر ہے کہ نہیں؟ صحابہ کی ملاقات میں تو احتمال ہے، باقی رہے تابعین سو ان میں جھوٹے، سچے، نیک و بد سب طرح کے ہیں۔

اور اگر بالفرض کسی معمر صحابی سے ان کی ملاقات ہوئی بھی تو بھی کیا لازم ہے کہ وہ صحابی اس وقت حاضر ہی تھے؟ یا ان کو کسی دوسرے صحابی سے یہ بات پہنچی ہی تھی اور پھر حضرت زید نے بھی انہیں سے سنا ہو! احتمال ہے کہ جس صحابی سے ان کی ملاقات ہوئی، ان کو یہ بات معلوم نہ ہوئی ہو؟ اور اگر معلوم بھی ہو تو انہوں نے ان سے نہ سنا ہو بلکہ کسی تابعی سے سنا ہو؟ بلکہ زبان زد عوام ایک بات دیکھ کر اسی کے موافق نقل کر دیا ہو یا بطور تسلیم قول معترضین یہ بات فرمائی ہو؟ بہر حال احتمالات چند در چند قادح اعتبار روایت موجود ہیں، پھر با ایں ہمہ احتمالات کوئی کیونکر اس روایت کو دربارۂ دعویٰ ہبہ فدک قبول کر لے۔

مشکوٰۃ کی روایت مرفوع متصل ہے

خصوصاً درصورت یہ کہ آیت اور روایت صحیح متصل بلکہ مرفوع اعنی روایت مشکوٰۃ اس کے مخالف موجود ہو مگر شاید کوئی کم فہم اس کے وقوع ہونے میں اس وجہ سے کلام کرے کہ روایت مشکوٰۃ میں بھی عمر بن عبدالعزیز سے جو تابعی ہیں ایک روایت بے سند منقول ہے کیونکہ وہ بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ سو گو ہم کو بعد غیر معتبر ہو جانے روایت متنازعہ فیہا کے اس روایت کا غیر معتبر ہونا مضر نہیں لیکن تاہم بپاس خاطر شیعہ اس کسر کو بھی مٹائے دیتے ہیں۔
واضح رہے کہ یہ روایت مشکوٰۃ میں ہر چند حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی کا قول ہے لیکن اس قول کو

مغیرہ بن شعبہ جو صحابی ہیں، نقل کرتے ہیں اور صحابی کا ایسی بات کو بیان کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے، یا فرمایا ہے، حکماً مرفوع ہے۔ چنانچہ واقفانِ اُصول حدیث جانتے ہیں۔

مع ہذا قرینہ نقلیہ بھی اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ فرمانا صحیح ہو کیونکہ اس قول کو حجت (نہ لینے فدک کی) قرار دیتے ہیں، کوئی بات مفید مطلب اس سے ثابت نہیں کرتے اور نہ لینے کے لیے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک کا نہ دینا حجت ہو سکتا ہے، اس سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہبہ کر دینا ہو سکتا ہے۔ سو اگر یہ قضیہ ان کے نزدیک صحیح نہ ہوتا بلکہ اُلٹا ہبہ کا کرنا صحیح ہوتا تو ان کو کیا ضرورت تھی کہ نقصان دُنیا تو یوں کرتے کہ فدک کو دے دیا اور نقصان دین یوں کرتے کہ جھوٹ بولا، اور جھوٹ بھی کس پر؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر! جس کی سزا میں جہنمی ہونے کا وعدہ ہے اور وعدہ بھی متواتر، کیوں کہ حدیث **"مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"** جس کا ترجمہ یہ ہے "جو شخص جان بوجھ کر میرے ذمہ کوئی جھوٹ بات لگا دے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں کر لے۔" بالاتفاق محدثین کے نزدیک متواتر ہے بلکہ متواتر باللفظ اگر ہے تو یہی ہے۔ بہر حال اگر روایت حضرت زید بن علی بن الحسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تو ہم موضوع نہ کہیں اور چشم پوشی کر کے یوں تسلیم ہی کر لیں کہ واقعی یہ بات حضرت زید ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔ تب اس کے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مٹ گیا ہے۔

فدک تا دم آخر خاتم الانبیاء کے تصرف میں تھا

مع ہذا جیسے علاماتِ صحت روایت مشکوٰۃ ظاہر ہیں، چنانچہ مذکور ہو چکا، ایسے ہی روایت متنازعہ فیہا کے علاوہ بے سند ہونے کے امارات کذب بھی ظاہر و باہر ہیں کیونکہ باتفاق مؤرخین فدک تا دم باز پسیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں تھا اور بے قبض ہبہ موجب ملک موہوب لہ نہیں ہوتا، واہب ہی کی ملک میں رہتا ہے اور ملک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ بعد وفات وقف ہو جاتی ہے، پھر جو در بارۂ ہبہ گواہ طلب کیے تو یوں کہیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دُنیا کی ہوشیاری اور ان مسائل کی واقف کاری کے کہ جو اُمور دُنیا میں مفید پڑیں، شیعہ بھی معتقد ہیں، جب نہ دُنیا ہی ٹھہرا تو ایسی مشکل راہ کیوں چلے جس میں اندیشہ ہار جانے کا ہو؟

کیونکہ اگر گواہ اپنی مقدار معین کو پہنچ جاتے تو پھر یہ عذر بھی بے جا تھا کہ ہبہ بے قبض تمام نہیں ہوتا، ہر کوئی یوں جانتا کہ سارے نہ دینے کے بہانے ہیں، اگر یہ عذر قابل سماعت تھا، تو پہلے ہی کیوں نہ پیش کیا اور اگر گواہوں کے طلب کرنے کو شیعہ محمول تحقیق حق پر کرتے ہیں تو اس کے بعد

جو کچھ پیش آیا، وہ خواہ مخواہ عدل و انصاف ہوگا کیونکہ حکم خداوندی ہی کے موافق حکم کیا ہے، کوئی قاعدہ نہیں گھڑ لیا، باقی میں نے جو کچھ تقریر در بارۂ طلب گواہان لکھی ہے، اگر اس کو شیعہ تسلیم کر لیں تو ''چشم ماروشن و دل ما شاد'' ورنہ ان کی کوتاہ فہمی سے اُمید تو یہ نہیں۔

اگر فدک ورثہ تھا تو شخص واحد کا قبضہ بقیہ ورثاء پر ظلم تھا

علاوہ بریں جب بالاجماع یہ بات مقرر ہوئی کہ فدک تادم آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض میں رہا تو باتفاق شیعہ و سنی اگر آپ نے ہبہ کیا بھی تب بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ملک میں نہ آیا۔ پس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور ہمارے نزدیک محفوظ ہیں کہیں ایسا غلط دعویٰ کرتیں، جس میں بہر حال حق تلفی خلائق ہے؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی ہے تو وارثوں کی حق تلفی ظاہر ہے ورنہ فقراء اور مساکین کی حق تلفی، یہ بھی نہ سہی بلکہ آپ کا ترکہ وقف ٹھہرا، خلیفہ کو اختیار ہے جسے چاہے دے۔ پس اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ گیا تو اور بھی اچھا ہے لیکن اس طرح فن وفریب سے لینا فریب بازوں اور دُنیا سازوں کا کام ہے۔

بہر حال علامات صدق روایت مشکوٰۃ اور امارات کذب روایت متنازعہ فیہا اہل فہم کے نزدیک تو ایسی روشن ہیں، جیسے اہل نظر کے سامنے آفتاب اور یوں مولوی عمار علی صاحب یا ان کے اقران وامثال اگر نہ سمجھیں تو پھر ہمیں کوئی یوں نہ کہے کہ یہ کیا کہتا ہے، ان کے حسب حال پھر یہ شعر پڑھا جائے گا۔

گر نہ بیند بروز شپر چشم   چشمہ آفتاب راچہ گناہ

غرض روایت مشکوٰۃ کی وہ روایت ہم پلہ نہیں ہو سکتی جو اس کو چھوڑ کر اس روایت پر یقین کریں بلکہ موافق قواعد مرقومہ بالا کے لازم ہے کہ بسبب تعارض روایت مشکوٰۃ کے (کہ وہ در حقیقت روایت ابوداؤد ہے جو صحاح ستہ میں سے ہے اور صحاح ستہ کی روایات کی صحت اور قوت کو یہی بہت ہے کہ ان کا نام صحاح ہے) اس روایت کو جو حضرت زید کے نام لگا رکھی ہے، رد کریں۔

دعویٰ ہبہ بغیر قبض مسلم نہیں، علامہ حلی کا فرمان

اور سلمنا کہ روایت بھی صحیح اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ہبہ کا دعویٰ کرنا بھی درست لیکن اتنی بات سنی و شیعہ کے نزدیک بالاتفاق مسلم ہے کہ ہبہ بے قبض تمام نہیں ہوتا۔ تاوقتیکہ قبض و تصرف واہب کا رہے گا، اسی کی ملک بھی رہے گی۔ چنانچہ ارشاد علامہ حلی میں مطلب اوّل مقصد

دعویٰ میں مرقوم ہے "فَلا تُسْمَعُ دَعْوى الْهِبَةِ مُجَرَّدَةً عَنْ دعوى القبض"......"یعنی نہ سنا جائے گا دعویٰ ہبہ بے دعویٰ قبض کے" اور فدک بالا جماع تادم واپسیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبضہ میں تھا، آپ حین حیات تک فدک میں تصرف مالکانہ کرتے رہے۔ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا دخل آپ کی زندگی میں نہیں ہونے پایا، اس بات میں مؤرخین طرفین بلکہ محدثین فریقین متفق ہیں۔ مؤرخین کے اخبار کے لکھنے کی اوّل تو اس وجہ سے حاجت نہیں کہ کتب تواریخ پر ہر کسی کو عبور میسر آسکتا ہے، پر علم حدیث تک نوبت کسی کسی کی پہنچتی ہے، اکثروں کو مضامین احادیث کی اطلاع نہیں ہوتی، دوم تواریخ کی بات اعتبار میں احادیث کے ہم پلہ نہیں ہوسکتی۔

دعویٰ ہبہ فدک کے بطلان پر احادیث طرفین سے استدلال

اس لیے طرفین کی روایات احادیث ہی کی طرف اشارہ کیے جاتا ہوں، پہلے تو یہ وقف ہونے کے معنی میں ہی نہیں تراشے، سنیوں کی روایت لیجئے، اوّل تو وہی روایت مشکوۃ جو مرقوم ہو چکی، اس بات پر بتصریح شاہد ہے۔ دوسرے مشکوۃ ہی میں ابوداؤد کی حدیث بروایت مالک بن اوس بن الحدثان مرقوم ہے جس میں اس بات کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کے استدلال میں کہ مال فئے قابل تقسیم نہیں کچھ ایسا بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تین چیزیں جدا جدا مصرف کے لیے وقف رکھی تھیں۔ بنوالنضیر، خیبر، فدک، سو فدک کے مصرف کے بیان میں فرماتے ہیں "وَ اَمَّا فِدَکُ فَکَانَتْ حَبْسًا لِاَبْنَاءِ السَّبِیْلِ" یعنی "فدک مسافروں کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہے۔" اب بحکم قواعد مناظرہ تو ہمیں اپنی ہی کتابوں کا حوالہ بہت ہے کیوں کہ ورود اعتراض کے لیے ضروری ہے کہ ایسی بات ہو کہ جس پر وہ اعتراض ہو، اس کے مسلمات اور مانی ہوئی باتوں کے خلاف ہو اور درصورت یہ کہ اس کے مسلمات کے خلاف نہ ہو تو اعتراض اعتراض ہی نہیں۔ سو درصورت یہ کہ ہم نے اپنی کتابوں سے یہ ثابت کردیا کہ فدک تادم بازپسیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبضہ میں رہا اور پھر کتاب بھی ایسی معتبر کہ حجت، منجملہ صحاح ستہ ہے تو پھر از روئے دعویٰ ہبہ اعتراض ہی لغو ہوگیا کیوں کہ ہبہ بالاتفاق طرفین بے قبض موجب ملک ہی نہیں۔

لیکن معترض کا سکوت اور ہے اور اطمینان کچھ اور، اتنی بات سے شیعہ ساکت ہوجائیں گے لیکن بجائے خود سنیوں کی بات سے ان کا دل مطمئن نہیں ہوسکتا، اس لیے گزارش دیگر ہے، مجاج السالکین جو کتاب معتبر امامیہ ہے اور نیز دیگر کتب معتبر امامیہ میں روایت ہے جس کا اس جگہ مضمون ہی لکھے دیتا ہوں، عبارت بعینہا ان شاء اللہ آئندہ مرقوم ہوگی۔ اس کا مضمون یہ ہے:

"جب ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے دیکھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سے کھنچنے لگی اور ملنا ملانا چھوڑ دیا اور پھر فدک کے مقدمہ میں کچھ نہ بولیں تو یہ بات انہیں بڑی دُشوار معلوم ہوئی۔ اس لیے یوں چاہا کہ انہیں راضی کیجیے، سو ان کے پاس جا کر عرض کیا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی! آپ کا دعویٰ سچا ہے پر کیا کروں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ تمہارے خرچ کے موافق تمہیں دے کر اور عاملوں کی مزدوری دے کر جو کچھ بچتا تھا، اسے فقراء اور مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا تو اچھا اسی طرح کرتے رہو۔ جس طرح میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ لو میں قسم کھاتا ہوں کہ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے ویسے ہی کیے جاؤں گا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، کیا قسم بھی کھاتے ہو کہ اس طرح ہی کرو گے؟ آپ نے مکرر عرض کی کہ قسم خدا کی میں اسی طرح کروں گا، اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے یوں فرمایا کہ خدایا تو گواہ رہ، سو اس بات پر راضی ہو گئیں اور عہد لے لیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما ان کا خرچ دے کر باقی کو فقراء اور مساکین اور ابن سبیل کو دیدیا کرتے تھے۔ فقط"

سنئے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ عذر کرنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس لیے آپ کے حوالے کرنے میں معذور ہوں اور پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا اس میں کچھ انکار نہ کرنا بلکہ یوں فرمانا کہ اچھا یونہی کیے جاؤ اور پھر اس پر خوشی سے راضی ہو جانا، صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تادم بازپسیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قبض و تصرف تھا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔

پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے دعویٰ ہبہ میں تکذیب نہیں کی، تصدیق ہی کی لیکن قانون شرعی کے موافق عمل کیا تاکہ آپ ناحق دینے کے وبال سے اور حضرت فاطمہ ناحق لینے کے عذاب و نکال سے محفوظ رہیں اور بایں ہمہ جو گواہ طلب کیے تو اسی لیے طلب کیے ہوں کہ اگر گواہوں سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ واقعی فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تو گو بسبب عدم قبض کے اب تک ان کی ملک میں نہیں آیا لیکن پھر اولیٰ یہی ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالہ کیا جائے، پر اس کو کیا کیجیے کہ شہادت اپنے نصاب کو نہ پہنچی اور بجز دعویٰ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جو ان کے حوالہ نہ کیا تو اس کی وجہ ان شاء اللہ آگے مذکور کی جائے گی، اُمیدوار باید بود۔

مگر شاید کسی شیعی مذہب کو یہ خلجان ہو کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ احتیاط کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہبہ میں بھی (اور ہبہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے) وہی شرط قبض وتصرف ملحوظ رہی، کچھ دل کو نہیں لگتی بلکہ از قبیل دغا وفریب معلوم ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو اشارہ بھی کافی تھا، آپ کا اشارہ اور اوروں کا فعل تام بھی برابر نہیں ہوسکتا، سو اس وہم کو خدا ہی دل سے کھوئے تو کھوئے، یہ اسی قسم کا وہم ہے جو ہنود اور یہود اور نصاریٰ اور مجوس کے دل میں بہ نسبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خوارج کو بہ نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کھٹکتا ہے، ان مردودوں کو بھی یہی گمان ہے کہ یہ دعویٰ رسالت اور امامت جو ان دونوں صاحبوں سے منقول ہے۔ ایک دُنیا طلبی کا ڈھنگ تھا، کچھ دل کو نہیں لگتا بلکہ از قبیل دغا وفریب معلوم ہوتا ہے۔

ع...... "بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس"

دوستو! اہل عقل اور اہل انصاف سے بات کہہ کر ہر کسی کا دل شاد ہوتا ہے، پر جاہل نادان ناانصاف دریدہ دہان دراز زبان سے بات کہہ کر بجز اس کے کہ اپنا مغز خالی ہو اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، ان کا علاج تو دُرّہ ہے، یہاں حدیث وقرآن اور دلائل عقلیہ کا بیان نہیں چلتا، پر یوں سمجھ کر کہ جہاں چار نادان ہوتے ہیں، وہاں ایک عاقل بھی ہوتا ہے۔ مولوی صاحب سے اُمید فہم نہیں تو کیا سارے علماء شیعہ ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں؟ اپنا مافی الضمیر عرض کرتا ہوں۔

مسئلہ شہادت اور شاہدین کی تعداد پر محققانہ بحث

جناب من اگر یہ ماجرا اور یہ سرگذشت بلا کم وکاست اس طرح ہو جس طرح شیعہ گاتے پھرتے ہیں اور بفرض محال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گواہ طلب کیے ہی، تو اوّل تو اس کی وجہ کہ کیوں گواہ طلب کیے؟ مذکور بھی ہوئی ہے۔ دوم ان شاء اللہ اور وجہ بھی معلوم ہو جائے گی لیکن درصورت یہ کہ یہ مقدمہ کسی وجہ سے ہو۔ گواہ طلب کرنے کے قابل ہو تو بلاشبہ پھر گواہ گواہوں ہی کی طرح چاہیے۔ نہیں تو مفت کا دردسر تھا۔ سو علماء شیعہ ہی فرمادیں کہ گواہوں کی کیا مقدار کلام اللہ میں بیان فرمائی ہے؟ اور اس میں پھر کسی کی کچھ تخصیص بھی ہے کہ فلانی قسم کے آدمی ہوں؟ تو پھر کچھ اس عدد اور اس کیفیت کی ضرورت نہیں، مع ہذا صدقِ نیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر یہ بات گواہ ہے کہ ان کی خلافت میں جو حضرتؓ عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ بات کہی کہ میں نے مرض وفات میں سرور کائنات علیہ افضل الصلوات واکمل التحیات سے "حَکَمْ" کے بلوا لینے کی اجازت لے لی ہے تو انہوں نے ان سے بھی گواہ طلب کیا۔ اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو

معاذ اللہ کچھ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے بزعم شیعہ کاوش بھی تھی تو حضرت عثمان سے تو بزعم شیعہ وسنی محبت اور موافقت اور دوستی ہی تھی، پھر کچھ دینا بھی نہیں پڑتا تھا۔ شیعہ مذہب نہ تھے جو تقیہ کا احتمال ہو، پھر جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے انہوں نے گواہ طلب کیے تو کیوں کیے؟ یہ باتیں کمال دیانت اور استقامت پر دلالت کرتی ہیں۔

لیکن شیعہ اپنی عداوت سے ناچار ہیں۔ کینہ بیجا نے ان کا قلب تیرہ و تار کر دیا ہے، حق و باطل کی تمیز نہیں رہی، اچھی باتوں کو برا اور بری باتوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ سو اس کا جواب تو ہماری طرف سے چھ سو برس پہلے شیخ سعدی کہہ گئے ہیں:

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد — عیب نماید ہنرش در نظر

باقی یوں کہنا کہ گواہ ثبوت دعویٰ کے لیے ہوتے ہیں اور جب مدعی کی طرف سے خاطر جمع ہو کہ یہ جھوٹ نہیں بولتا، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ گواہ طلب کیے جائیں تو اس کی جواب دہی خدا کے ذمہ ہے کیونکہ خدا ہی نے علی الاطلاق یہ حکم دیدیا ہے کہ بدوں دو گواہ اعتبار نہ کیا کرو، یہ قانون سنیوں نے نہیں گھڑ لیا، بہرحال خداوند کریم نے اہل بیت یا اصحاب یا کسی ولی یا صالح کا استثناء نہیں کیا، سنیوں کو تو خدا کے اتباع سے کام ہے۔ شیعہ بھی اگر اتباع خداوندی کریں تو فبہا، نہیں تو اپنا سر کھائیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو سنی یہ حکم کاہے کو مانتے کہ ابر کے دن اگر کوئی شخص چاند دیکھے اور اس کی گواہی بسبب تنہائی یا اتہام فسق و فجور قاضی قبول نہ کرے تو لازم ہے کہ وہ سب کے شریک حال رہے اور روزہ رکھے یا گرد و غبار میں محاق کے دو روز کے اعتبار سے اگر کبھی انتیسویں کا چاند ہوتا تو انتیسویں کو افطار کر لیا کرتے۔ علیٰ ہذا القیاس صلحا اور علماء یا صالحات عورتوں کی گواہی میں یہ قید لغو ہو جاتی بلکہ جن کفار کا صدقِ مقال تجربہ معلوم ہو جاتا ہے اور بہت سے نام کے مسلمانوں سے زیادہ سچے نکلتے ہیں ان کا کہنا خواہ ایک ہو یا زیادہ قبول ہوا کرتا، بالجملہ اس بات میں اپنے اطمینان کا اعتبار نہیں، پابندی قوانین مدنظر ہے تا کہ امتحان عبودیت اور خودمختاری ہو جائے۔

ہاں حکمت اور مصلحت اس قانون میں البتہ یہی ہے کہ ثبوت حق ہو جایا کرے، سو اگر رائے پر حکام وقت کے چھوڑا جائے تو اوّل تو اندیشہ رو و رعایت، دوسرے ہر کسی کو یہ دعویٰ ہو سکتا ہے کہ میری بات قابل اطمینان ہے۔ بس جس صلح اور انتظام کے لیے حکام مقرر کیے جاتے ہیں، وہ صلح اور انتظام تو درکنار؟ البتہ فساد اور جنگ و جدال کی توقع ہے۔ اس لیے قانون کلی مقرر کر دیا جس میں اکثر مصلحت مذکورہ پائی جائے، سو برخلاف اس کے اگر کسی

صورت میں کبھی مصلحت مذکورہ نہ بھی پائی جائے گی تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

الغرض یہ وہم (کہ ہم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صدق مقال کے بالاتفاق شیعہ وسنی قائل ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہوئی کہ گواہ طلب کیے گئے؟ اس مطالبہ گواہان سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے بدگمانی ٹپکتی ہے، یا نادہندی کی بُو آتی ہے) بسبب کوتاہ فہمی کے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں فہم والوں سے کلام ہے، نادانوں سے کام نہیں۔

سیدہ تو ضابطۂ شہادت کی بہت زیادہ پابند ہوں گی

مع ہذا سب جانتے ہیں کہ مدار بزرگی اطاعت خداوندی پر ہے۔ چنانچہ کلام اللہ میں خود فرماتے ہیں "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" یعنی بیشک اللہ کے نزدیک زیادہ تعظیم تکریم اسی کی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو، تو اس صورت میں لازم پڑا کہ ان قوانین کی رعایت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو زیادہ تر ہو اور جو ان قوانین کی رعایت کرے وہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو زیادہ محبوب اور اس کی آپ کے دل میں زیادہ جگہ ہو۔ سو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گواہوں کا طلب کرنا بقرینہ آیت مذکورہ موجب نشاط خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہوا ہوگا، پھر نہ معلوم کہ شیعہ کیوں لڑتے مرتے ہیں، یہ وہی مثل ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ تو راضی ہو گئے، پر قاضی جی راضی نہیں ہوتے۔

اور اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ گواہوں کا جھوٹا جاننا کچھ اور ہے اور ان کی گواہی کے موافق حکم نہ دینا کچھ اور ہے؟ جب تک کہ شہادت اپنی مقدار کو نہ پہنچے، یعنی دو مرد عاقل بالغ یا ایک مرد اور دو عورتیں بایں صفت موصوف نہ ہوں، تب تک حاکم کو جائز نہیں کہ ان کے کہے کے موافق مدعی کی ڈگری کر دے۔ اگر چہ کیسے ہی معتبر کیوں نہ ہوں اور ان کے کہنے سے کتنی ہی تسلی کیوں نہ ہو جائے، سو اس حکم نہ دینے اور ڈگری نہ کرنے کو کوئی نادان ہی یوں سمجھے تو سمجھے کہ گواہوں کی تکذیب کی۔ ہاں درصورت یہ کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ایک مقدمہ میں موافق مدعی کے متفق اللفظ ایک بات کہیں تو پھر بجز عدم اعتبار گواہان کے کوئی صورت ڈگری نہ کرنے اور مدعا علیہ سے قسم لینے اور مدعی کے دعویٰ کے نہ سننے کی نہیں۔ سو شیعوں کے کہے موافق اگر اس روایت کو ہم تسلیم بھی کر لیں تب ظاہر ہے کہ حضرت علی اور حضرت اُم ایمن کی گواہی نصاب مذکور کو نہیں پہنچتی بلکہ حضرت حسنین کی گواہی مل کر بھی (جیسا کہ جناب دروغ مآب مولوی عمار علی صاحب پچر لگاتے ہیں) مقدار مذکور اور حد مسطور کو نہیں پہنچتی کیونکہ دونوں صاحبزادے اس زمانہ تک نابالغ تھے۔

سو اس گواہی کے موافق حکم نہ کرنے میں یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اور ان کے گواہوں یعنی حضرت علی اور حضرت اُم ایمن اور حسنین کو جھوٹا جانا، ہاں ان کی استقامت، شریعت اور سنت پر ثابت ہوتی ہے لیکن نقصان فہم کا کچھ علاج نہیں، بیوقوفوں کی اصلاح انبیاء سے بھی نہیں ہوتی، ہم تو کس شمار میں ہیں۔ شاہد اس کا یہ ہے کہ امام غزالی کی بعض کتابوں میں کچھا یسا لکھا ہے کہ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوہسار کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ کسی نے عرض کی، آپ ایسا افتاں خیزاں اس طرف کیوں جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک نادان آتا ہے، اس نے عرض کی کہ پھر آپ کو کیا اندیشہ؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بیوقوفی کا کچھ علاج نہیں وہ کسی کے فیض صحبت یا برکت سے زائل نہیں ہوتی، اُلٹے اسی کا اثر پڑ جائے تو پڑ جائے فقط، اور کسی نے سچ کہا ہے کہ:

لِكُلِّ دَاءٍ دَ وَاءٌ يُسْتَطَبُّ بِهٖ   اِلَّا الْحِمَاقَةَ دَاءٌ لَا دَوَاْ لَهَا

"یعنی ہر بیماری کا کچھ نہ کچھ علاج ہے جس سے اس کے زائل ہونے کی تدبیر کی جاتی ہے پر حماقت ایسی بیماری ہے کہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں۔"

منہج الکرامت کی روایت کے مطابق

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک سیدہ کو دے دیا تھا

اور اگر بایں ہمہ بیان واضح شیعوں کی دل کی گھٹ نہ کھلے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ جیسے صادق کی طرف گمان فاسد ہی رہے تو لیجئے اب تو زبان کو لگام دیجئے اور اپنا کام کیجئے، یہ روایت کتاب منہج الکرامت میں جو شیخ ابن مطہر حلی کی تصنیف ہے، موجود ہے۔ انہوں نے سنیوں کی طرف سے جواب شافی وکافی لکھ رکھا ہے۔ القصہ اہل سنت کو تخفیف تصدیع ہوئی اور انہیں کی لاٹھی انہیں کا سر۔

"وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزاً" وہ روایت یہ ہے "لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَةُ اَبَا بَكرٍ فِيْ فِدَكَ كَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَرَدَّهٗ عَلَيْهَا"

"یعنی جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو در بارہ فدک وعظ و پند کیا تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک کی جاگیر کا کاغذ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام لکھ کر فدک انہیں کو ہٹا دیا۔ فقط"

درصورت یہ کہ یہ روایت صحیح شیعوں کی ایسی معتبر کتاب میں جس کا نام منہج الکرامت اور پھر تصنیف ایسے علامہ کی جس کا نام ابن مطہر حلی ہو پائی جائے تو پھر سنیوں سے کیوں اُلجھتے پھرتے ہیں؟ اس روایت کے قربان جائیے، اس روایت نے تو شیعوں کو تین پانچ کے قابل نہیں رکھا، اب

تک مولوی صاحب نے ہبہ اور میراث ہی کا دعویٰ کیا تھا۔ وصیت یا بیع یا کسی عمل کی اُجرت کا احتمال باقی ہے۔ سو ہماری طرف سے اس کی بھی اجازت ہے کہ لگتے ہاتھ ان وجوہ سے بھی طعن کر لیں، کسر نہ چھوڑیں، سنیوں کا کچھ لحاظ نہ کریں، اوّل تو ان کو یہ روایت مل گئی ہے، دوسرے ان کی پشتی پر خدا ہے جہاں اس روایت کا پتہ لگا دیا، آگے بھی وہ کام چلا دے گا۔

اب سننے کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہر بات میں اپنی کتابوں سے جھوٹے ہوتے جاتے ہیں اور سنیوں کی کتابوں سے مات کھاتے جاتے ہیں یہاں تک تو ناظرین کو معلوم ہی ہو گیا اور آگے اور ان شاء اللہ معلوم ہو جائے گا، سوخن ہائے گزشتہ کے دروغ ہونے سے علاوہ اب جس بات کا جتلانا مدنظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اوّل تو مولوی صاحب کا یہ طوفان دیکھئے کہ حضرت علی اور اُم ایمن کی گواہی کا بیان لکھتے لکھتے یہ جولانیوں پر آئے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو بھی ساتھ سان لیا۔ یہ نہ شرمائے کہ الزام خصم کے لیے ضرور ہے کہ وہ بات لکھئے جو اس کے نزدیک بھی مسلم ہو۔ سو مسلم ہونا تو معلوم؟ جو روایت کہ سنیوں کے نام لگا رکھی ہے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا نام تو اس میں بھی نہیں، اور اگر اپنے بہتانوں اور اپنے کتب خانوں کے بھروسے سنیوں کو الزام دیتے ہیں تو یہ الزام تو مثل فوارہ انہیں کے سر پر پڑے گا ورنہ یوں تو پھر ہر ہر بات ہر ہر شخص سے ہاریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عمار علی کا بہتان

دوسرے مولوی صاحب کا یوں رقم فرمانا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو جاگیر نامہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے نام لکھ دیا تھا، پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھاڑ ڈالا، مولوی صاحب نے کیا سمجھ کر لکھا ہے؟ یا بے سمجھے ہی لڑنے کو دوڑتے ہیں، سنیوں کی کتابوں سے اگر لکھتے ہیں تو سنیوں کی کتابوں میں تو اس بات کا پتہ بھی نہیں اور اگر اپنی کتابوں کے بھروسے پر زبان درازیاں ہیں تو اس کا اوّل تو یہ جواب ہے کہ "جواب جاہلاں باشد خموشی" سبحان اللہ ایسا مناظرہ کسی نے نہ سنا ہوگا کہ اپنی کتابوں کے کیا بلکہ اپنے خوابوں کے بھروسے دوسروں کو الزام کا ارادہ رکھیں، دوسرے منہج الکرامت کون سی سنیوں کی کتاب؟ اور شیخ ابن مطہر حلی کون سے سنی؟ یا حضرت عمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کی خالہ کے بیٹے تھے؟ جو اتنا جملہ زائدہ یعنی پھاڑ ڈالنے کا قصہ ہضم کر گئے؟

مولوی صاحب تو نئے ہی مفتری ہیں، شیخ ابن مطہر حلی ان کے بھی پیشوا اور اُستاد ہیں اور حقدمین سابقین میں سے ہیں جو بات مولوی صاحب میں ماشہ بھر ہوگی۔ وہ ان میں من بھر سمجھنی چاہیے، اگر اس بات کا جھوٹا سچا کچھ بھی پتہ ہوتا تو وہ تو سوئی کو بھالا کر دکھاتے، ہاں مجھ سے غلطی

ہوئی، بہت سے شاگرد رشید اُستاد سے بڑھ جاتے ہیں، شیخ مطہر حلی میں ایک بڑا قصور رہ گیا تھا، وہ مایۂ عقل تو رکھتے تھے پر چشم بددور مولوی صاحب اس قصور سے بھی مبرا ہیں۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو بغیر شہادت کے مال دینے کے وجوہ

اب مولوی صاحب کی یہ شکایت باقی رہی کہ ابوبکر صدیق نے حضرت جابر رضی اللہ عنہما کی بات تو بے گواہوں کے مان لی، پر ستم تو یہ ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی بات باوجود ایسے معتبر گواہوں کے بھی نہ مانی، سواس کا اوّل جواب تو یہی ہے کہ یہ روایت اگر سنیوں کی کتابوں میں ہوتی تو البتہ اس شکایت کا کم فہموں کے نزدیک محل اور موقع تھا اس روایت کا سنیوں کی کتابوں میں ہونا نہ ہونا اور اس کا موضوع ہونا نہ ہونا دیکھنے والوں پر ان شاء اللہ بخوبی واضح ہو جائے گا اور بے اس کے کہ سنیوں کی کتابوں میں یہ روایت پائی جائے یہ شکایت کرنی اپنی فہم وفراست کی خوبی بیان کرنی ہے۔

اگر یہی الزام ہوا تو کل کو سنی پنڈتوں کی پوتھیوں اور سکھوں کی گرنتھ اور یہود ونصاریٰ کی توریت وانجیل محرف کے لکھے ہوئے سے ملزم ہو جائیں گے؟ اور ان کتابوں کی باتیں مان جائیں گے اور شیعوں کو تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کا سب طرف لیکھا ہے۔ ہندو یا سکھ بن جاتے ہیں تو انہیں کچھ نقصان نہیں اور یہود ونصاریٰ کے ہم مذہب ہو جاتے ہیں تو انہیں کچھ زیاں نہیں، اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا تو بتلا دیتا کہ شیعوں کو ان سب کے ساتھ ایسی نسبت ہے جیسے حیوان مشہور مسمی بہ اشتر گاؤ پلنگ کو اونٹ اور بیل اور چیتے سب کے ساتھ نسبت مشابہت ہے۔

اور سلمنا کہ یہ روایت سنیوں کی ان کتابوں میں جن کا حوالہ مولوی صاحب دیتے ہیں، کسی ایک دو نسخہ میں ہے بھی؟ تو اوّل تو وہ کتابیں غیر مشہور اور غیر معتبر، دوسرے وہ بھی شیعوں کا الحاق ہے۔ چنانچہ تحقیقات مسطورہ بالا کو دیکھ کر ناظرین کو ان شاء اللہ شبہ نہ رہے گا اور بایں ہمہ پھر بوجہ طلب گواہاں معلوم ہو چکی ہے، اس کے ملاحظہ سے آپ واضح ہو جائے گا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قصہ (یعنی ایسے مال کا بے شاہد دے دینا جو ایسوں ہی کے دینے کے لیے ہے اور قسم کا ہی اعتبار کر لینا، اس کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قصہ کے ساتھ (جس میں بے تحقیق دے دینے میں اندیشہ حق تلفی فقراء و مساکین وابن سبیل تھا) کچھ نسبت نہیں جو اس کو اس پر قیاس کیا جائے۔ مع ہذا گواہوں کا طلب کرنا قضیۂ فدک میں ہو سکتا ہے کہ بوجہ خیر خواہی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہو۔

تفصیل اس اجمال کی ہر چند معلوم ہو چکی، پر نا انصافوں سے کام پڑا ہے۔ اس لیے مکرر عرض ہے کہ باتفاق شیعہ وسنی اس میں تو کلام ہی نہیں کہ تادم بازپسیں فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض وتصرف میں رہا، پھر جب ابوبکر صدیق کو یہ بات معلوم ہو چکی ہو کہ متروکہ انبیاء وقف ہو جاتا ہے اور ہبہ بے قبض مفید ملک نہیں ہوتا تو اس میں تو کلام ہی نہ تھا کہ یہ چیز حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی ملک تو نہیں، پھر جو گواہ طلب کیے جائیں تو اس لیے تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تحقیق ملکیت مدنظر تھی جو کسی نادان کو یہ شبہ پڑے کہ ہائے افسوس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بات تو گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو اور جابر رضی اللہ عنہ کی خبر بے گواہوں کے سنی جائے اور بے تکرار مسلم ہو۔ بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں کہ شاید گواہوں کی تقریر سے کوئی اشارہ نبوی اس جانب پایا جائے کہ فدک کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہی کو دے دینا چاہیے، اب کوئی عاقل غور کر کے فرمائیں کہ یہ بات حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دوستی اور خیر خواہی کی بات ہے یا دشمنی اور بدخواہی کی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو نہ دینے میں خلاف وعدہ کا احتمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہوتا ہے

مگر مولوی صاحب کی عقل تو حاشیہ نشین لے اُڑے ہیں، وہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا اعتبار نہ ہوا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا اعتبار ہوا۔ مع ہذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے نہ دینے میں یہ احتمال تھا کہ ہر خبر جھوٹی تو ہوتی ہی نہیں۔ اگر واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے وعدہ کیا تھا اور پھر ان کو اس وعدہ کے موافق نہ دیا جائے گا تو ایک گونہ خلاف وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہوگا اور یہ خلاف وعدگی ہر چند بمجبوری تھی کیونکہ تادم آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال بحرین نہ آیا لیکن شان نبوت بہت رفیع ہے اور پھر نبوت بھی کس کی نبوت؟ اس مرتبہ رفیع پر اتنا قصور بھی نازیبا ہے خصوصاً جب یہ لحاظ کیا جائے کہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم روضۂ مبارک میں زندہ اور حضرت ابوبکر بمنزلہ داروغہ آپ کے کارکن اور مال بحرین موجود، اگر واقع میں وعدہ وقوع میں آیا ہے اور درصورت طلب گواہان حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس گواہ نہ نکلے؟ کیونکہ کچھ ضروری نہیں کہ کسی کے سامنے ہی وعدہ کیا ہو تو اس صورت میں لاریب عاقلوں کے نزدیک اخلاف وعدہ بجانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائد ہوگا۔

القصہ مقتضائے احتیاط ایسے امر میں یہی تھا کہ بے طلب گواہان کا مطالبہ پورا کیا جائے، اگر

وعدہ واقعی تھا تو فبہا ورنہ کچھ نقصان نہیں۔ آخر وہ مال صحابہ ہی پر تقسیم ہوا۔ بخلاف فدک کے کہ اس کے دینے میں لا ریب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نظر آتی تھی، بسبب قبضہ مستمرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ تا دم آخر فدک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا اور جب آپ کی وفات ہوئی تو وہ بمقتضائے حدیث "مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" کے جس کی تحقیق کا ہم وعدہ کرتے چلے آتے ہیں اور اب ان شاء اللہ تعالیٰ بہت ہی قریب اس کا ذکر آتا ہے، وہ وقف ہو چکا تھا، کسی بیٹا بیٹی یا بھائی برادر، بیوی، باندی کا اس میں حق نہ تھا۔ پھر اس کو کسی کے دعویٰ کے باعث دے دینا۔ اس حدیث کے موافق عمل نہ کرنا ہے مگر مولوی صاحب کے مذہب میں جو ارشادات نبوی پر چلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایفاء وعدہ اور اداء قرض کا بے وصیت خیال رکھے، اس سے برا کوئی نہیں، آپ عمل نہیں کرتے، پھر جو عمل کرے گا، وہ آپ برا لگے گا۔

اہل انصاف کے نزدیک تو اتنی بات بھی (کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور مال بحرین آیا تو انہوں نے یہ منادی کرادی کہ اگر کسی کا کچھ قرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ وعدہ کیا ہو تو وہ ہمارے پاس آئے، ہم اس کو بھگتا دیں گے اور پھر بے دستاویز، بے گواہ دینا شروع کیا۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اسی منادی کے باعث پندرہ سو کما لیے) اس بات کے لیے دلیل کامل ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حق تلفی اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خطرہ بھی نہیں گزرا۔ چہ جائیکہ کوئی چیز دبالیں، کسی عاقل کے تصور میں آسکتا ہے کہ جو شخص فقط اس خیال پر کہ مبادا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کسی کا قرض رہ جائے یا آپ کی بات میں فرق آ جائے، بے تحقیق تھیلیوں کا منہ کھول دے، ایسا کھلا ہوا حق پھر وہ بھی جگر گوشۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح سے دبا بیٹھے۔

علاوہ بریں نہ آپ کھایا نہ اپنوں کو کھلایا بلکہ بدستور قدیم اہل بیت اور مصارف مقررہ میں صرف کیا اور مفت دُنیا کی ملامتیں اور بار عذاب آخرت سر پر لیا، کوئی حضرات شیعہ سے پوچھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے ہوشیار کو کہ جس کی ہوشیاری کی قسم کھائی جائے، غصب کرنا بھی نہ آتا تھا اور ان سب کو جانے دیجئے۔ ایسا فرق لیجئے کہ اہل عقل حضرات ابوبکر کی فہم و عقل پر آفرین اور علماء شیعہ کی کج عقل اور بلادت طبع پر نفرین کریں۔ وہ فرق یہ ہے کہ دعویٰ ہبہ فدک جو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے بزعم شیعہ ظہور میں آیا تو سنیوں کے طور پر تو منشاء حدیث صحیح "مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" کے جس کا عنقریب ان شاء اللہ ذکر آتا ہے۔ معارض اور مخالف تھا اور شیعوں کے طور پر استحقاق

ورثہ نبوی کے مناقض اور دعویٰ جابر رضی اللہ عنہ کے کوئی استحقاق یا کوئی حدیث معارض اور مخالف نہ تھی کیونکہ جس مال میں سے ان کو دیا گیا، وہ مال کسی کے ترکہ کا نہ تھا اور نہ کوئی حدیث اور نہ آیت اس کے بیان تصرف کے لیے نازل یا وارد ہوئی تھی بلکہ وہ مال یا خمس یا عشر یا خراج کی قسم کا تھا۔ سو حضرت جابر رضی اللہ عنہ بہر طور اس کا استحقاق رکھتے تھے۔

اور یہ بھی اہل عقل پر ظاہر و باہر ہے کہ گواہ تعارض کے رفع کے لیے ہوتے ہیں اور ایک جانب راجح کر دیتے ہیں۔ اسی واسطے دو متخاصمین کے رفع مخاصمت کے لیے گواہوں کی ضرورت پڑی اور در صورت یہ کہ کوئی خبر یا دعویٰ بلا مزاحم عقلی یا نقلی، یا خبری یا عیانی کے پایا جائے اور مخبر اور مدعی بھی مومن مسلمان ہو تو پھر حکم نبوی یہ ہے کہ "ظُنُّوا الْمُؤْمِنِينَ خَيْرًا" اب التماس یہ ہے کہ حضرات شیعہ اگر دو چار گھڑی کے لیے کسی سے عقل مستعار لے کر اس فرق میں غور فرمائیں تو اس فرق کے مان جانے میں کچھ کلام نہیں ورنہ ایسے ہی عقل کے دشمنوں کے لیے کلام اللہ میں "اَفَلَا تَعْقِلُوْن" آیا ہے۔ اگر بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے یہ خطاب کان تک نہیں پہنچا تو یہ سفارت ہمیں کرتے ہیں۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو اب یہ اور التماس ہے کہ دقیقہ سنجان معانی رس پر تقریر سے واضح ہو گیا ہوگا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے گواہوں کا طلب نہ کرنا، چنانچہ روایات صحاح میں موجود ہے اور نیز حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے گواہوں کا طلب کرنا، اگر بالفرض و تقدیر بفرض محال جیسے حضرات شیعہ فرماتے ہیں، واقع میں وقوع میں آیا ہو؟ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کمال فہم اور نہایت اطاعت و اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا ہے، اگر یہ دونوں باتیں معیوب ہیں تو مولوی صاحب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر بایں وجہ طعن کرنے میں معذور ہیں اور لاجرم طاعنانِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مصیب بصواب اور ماجور ہیں لیکن اس صورت میں بڑی تعریف کی بات یہ ہوگی کہ فلانا بڑا گدھا ہے اور سرتاپا بیوقوف ہے، فسق و فجور میں یکتائے روزگار، دروغ و بے دماغی میں مشہور ہر کوچۂ بازار۔

سو اس صورت میں ہم کو مولوی صاحب کی تعریف کرنی لازم ہے مگر نظم تو سر دست بن نہیں پڑتی، ملازمان مولوی صاحب کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ آپ عنایت فرما کے یہ قدر قلیل نثر ہی قبول فرمائیں۔ سبحان اللہ اس فہم و فراست پر اصحاب کبار پر یہ زبان درازیاں؟ پھر اس پر یہ دھوکے بازیاں؟ کہ عوام کو ایک بار تو یہی یقین ہو جائے کہ مولوی صاحب کی بات سراسر بجا و درست۔ اعنی آپ میر نادر علی صاحب کو رقم فرماتے ہیں "اب فرمائیے یہ غصب نہیں تو کیا ہے؟ سو اس کے اور

غصب کس کو کہتے ہیں اور یہ عداوت ہے یا دوستی؟ اور مروت اور رعایت حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ اور حق اور سچ تو یہ ہے کہ اہل بیت کی دشمنی میں حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی رعایت نہ کی، آپ نے لکھا تھا مجھے غصب فدک کی کسی سے صحت نہیں ہوتی، اب آپ کو چاہیے کہ میری صحت علماء اہلسنّت سے کرائیے اور میری باتوں کا جواب لکھوا کر بھجوا دیئے کہ کیا سبب ہے کہ جابر کو سچا جانا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جھوٹا سمجھا؟ اور اس مظلومہ کے گواہوں کو بھی رڈ کیا، انتہی بلفظہٖ''۔ سو منصفان فہمیدہ اور فہیمان سنجیدہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مولوی صاحب کو میرے لکھے ہوئے جواب سمجھا کر یہ سمجھا دیں کہ دیکھو یوں جواب لکھا کرتے ہیں لیکن اس کا کچھ علاج نہیں کہ مولوی صاحب کی یہ درخواست ہے کہ میری صحت علماء سنت سے کرائیے۔ مولوی صاحب تو سراپا غلط ہیں، غلط کا صحیح کرنا اور صحیح کہنا سنیوں کو نہیں آتا، ہاں غلط کی جگہ صحیح بنا سکتے ہیں۔ اس لیے اتنا ہو سکتا ہے کہ ملازمان مولوی صاحب سے یہ کہا جاوے کہ مولوی صاحب غلط ہیں، جب ہی تو اپنی صحت کراتے ہیں، ظاہر و باطن سے صحیح علماء اہل سنت ہیں، اگر ہدایت منظور ہے تو غنیمت سمجھو۔

خیر یہ قصہ تو بہت دور دراز ہے، مولوی صاحب کی ہذیانات بے معنی کا جواب چاہیے اور ان کی حقیقت الامر کھول کر دکھلائیے تا کہ معلوم ہو جائے کہ مولوی صاحب اپنے ہوش میں نہیں۔ اس بیداری میں جو اوروں کے خواب سے بدتر ہے۔ مولوی صاحب بڑے بڑاتے ہیں ورنہ عقل کا کام نہیں کہ باوجود ایسے ایسے دلائل واضحہ کے جن کا مذکور ہو چکا، پھر بھی غصب فدک کا ان کے دل میں خیال آئے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے عادل متقی اور مطیع خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظالم ٹھہرائے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس اگر اور فضائل گونا گوں نہ ہوتے تو یہی حکایت ان کی فضیلت کے لیے بہت تھی کیونکہ عاقل سمجھتے ہیں کہ ملامت دُنیا خاص کر اہل عزت سے بے سبب نہیں اُٹھائی جاتی۔ دین دار دین کی عزت اور دُنیا دار دُنیا کی عزت کو جان و مال سے عزیز سمجھتے ہیں اور عزت بھی عزیز نہ ہو تو پھر کون سی چیز عزیز ہو گی، اسی کا عزیز ہوتا ہے کہ عورتیں باوجود یہ کہ مرد نہیں نامرد ہیں، غیرت کے پیچ جان کو تلف کر دیتی ہیں اور ڈوب مرتی ہیں، یا زہر کھا لیتی ہیں، مردوں کا تو کیا ذکر؟

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جان بوجھ کر ہدف تیر ہائے ملامت ناکساں ہونا کیونکہ ایسے مواقع میں ہر کوئی جانتا ہے کہ یہی انجام ہوتا ہے۔ بجز اس کے نہیں ہو سکتا ہے کہ پابندی خداوند علیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مجبور تھے ورنہ جو شخص نہ خود کھائے نہ اپنوں کو کھلائے، کاہے کے لیے کسی کی چیز دبائے؟ ایسا شخص اگر ایسے موقع میں ایسے شخصوں سے تو گواہ طلب کرے اور حضرت جابر

رضی اللہ عنہ سے طلب نہ کرے (قطع نظر وجوہ مذکورہ بالا کے) بجز اس کے اور کوئی احتمال نہیں ہو سکتا کہ انصاف اور اہل انصاف کو لازم ہی ہے کہ رو و رعایت کے موقع میں زیادہ تشدد اور سخت گیری سے پیش آیا کریں اور غیروں سے بہ نسبت اپنوں کے نرم رہا کریں اور ظاہر ہے کہ اپنے اقرباء کی رو رعایت نہ کرنے میں بوجہ محبت فقط اپنا دل ہی دُکھا کرتا ہے۔ کچھ اندیشہ ملامت نہیں ہوتا بلکہ اُمید کلمۃ الخیر ہوتی ہے اور اپنے پیرزادوں اور بزرگ زادوں کی رو رعایت نہ کرنے میں مریدان جان نثار کا بوجہ محبت دل جدا دکھا کرتا ہے اور بوجہ اندیشہ ملامت جان پر جدا ہی بنا کرتی ہے۔

سو جب اپنے قرابتیوں کی رو رعایت نہ کرنی اور غیروں سے نرمی برتنی محمود خلائق ہوئی تو پیرزادوں کی رو رعایت نہ کرنی اور بھی زیادہ سمجھنی چاہیے اور جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی پیرزادی ہو کہ نہ اس رُتبہ کا کوئی پیرزادہ ہوا ہے، نہ ہو اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا مرید ہو جس کی صدق و وفا اور جاں نثاری اور اُلفت اور محبت اور خدمت گزاری کے کلام اللہ اور اقوال عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، چنانچہ گزرا، دو گواہ عادل کیا بلکہ اس بات کے گواہ ہوں کہ ایسا یار وفادار نہ کوئی ہوا ہے نہ ہو کیونکہ ایسے رُتبہ والے ایسے ویسے کی ایسی تعریف نہیں کیا کرتے تو اس صورت میں حکم خداوندی پر قائم رہنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے مرد کا کام ہے، نہ وہ ہوں نہ اتنی دُشواری اور اس قدر ملامت عوام کالانعام اور دشنام ہائے خبیثان نافرجام اپنے سر پر اُٹھائیں، پر زوف ہے شیعوں کی عقل پر کہ ان کو خوبیاں بھی برائی ہی نظر آتی ہیں۔

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد   عیب نماید ہنرش در نظر

''مطیعان خدا پر طعن اور تشنیع کرتے ہیں، سمجھتے ہی نہیں یہ رافضی ان کو خدا سمجھے۔''

شیعوں کی اہل بیت سے اور نصاریٰ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک جیسی محبت ہے

طرفہ تماشا ہے کہ بیدین دینداروں پر بے دینی کی تہمت لگائیں اور مخلصانِ قدر شناس کو مقتدیانِ عبداللہ بن سبا یہودی دشمن اہل بیت بتائیں۔ اگر قدر شناسوں سے حد سے گزر جانے والے بڑھ جایا کریں اور قدر شناس دشمن سمجھے جایا کریں؟ تو نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے محب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دشمن ہونے چاہئیں۔ غور کر کے اگر دیکھیں، مفرط فی المحبت اس کا محب نہیں جس کی محبت کا مدعی ہوتا ہے بلکہ اپنی خیالی تصویر

کا محبّ ہوتا ہے۔ نصاریٰ جو دعویٰ محبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے ہیں تو حقیقت میں ان سے محبت نہیں کرتے کیونکہ دارومدار ان کی محبت کا خدا کے بیٹا ہونے پر ہے۔ سو یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تو معلوم؟ البتہ ان کے خیال میں تھی۔ اپنی تصویر خیالی کو پوجتے ہیں اور اسی سے محبت رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خداوند کریم نے ان کی واسطہ داری سے برطرف رکھا ہے۔

ایسے ہی شیعہ بھی اپنی خیالی تصویر سے محبت کرتے ہیں۔ آئمہ اہل بیت سے محبت نہیں کرتے، اس محبت پر محبان قدر شناس کو دشمن اہل بیت سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا نصاریٰ بزعم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اُمت کو دشمن عیسیٰ سمجھتے ہیں۔ دشمن اہل بیت تو اسے کہتے ہیں کہ حضرت رُقیہ اور حضرت اُم کلثوم دختران مطہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو آپ کی بیٹیاں ہی نہیں سمجھتے حالانکہ کلام اللہ اور احادیث کلینی وغیرہ اور اقوال حضرت امیر رضی اللہ عنہ اس بات پر شاہد ہیں اور حضرت عائشہ محبوبۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ ممدوحہ جناب کبریا کو جن کی طہارت اور بزرگی میں سورۂ نور میں آیات متعددہ موجود ہیں اور سوا ان کے اور بیبیوں کو جو بشہادت آیت کریمہ "وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ" تمام مؤمنین کی مائیں ہیں اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ عم بزرگوار سید الابرار صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ الجبار القہار کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو جو سوا اس کے اور بھی ناطے رکھتے ہیں اور حضرت سید الشہداء شہید کربلا رضی اللہ عنہ کے داماد مصعب بن زبیر اور حضرت عمر فاروق داماد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت زید شہید فرزند سعید حضرت امام ہمام زین العابد رضی اللہ عنہ اور سوا ان کے اور اقربا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولاد امجاد آئمہ اطہار کو جو بشہادت لفظ عترت اور اہل بیت میں داخل ہیں۔ شیعہ کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور دشنام ہائے نافرجام دیتے ہیں۔

چنانچہ کچھ کچھ اوپر گزرا، پھر ان بے حیاؤں کو غیرت نہیں آتی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو دشمن اہل بیت بتاتے ہیں۔ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے عداوت ہوتی تو اہل سنت میں سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی نام بھی نہ لیتا یا مثل خوارج کوئی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بتعظیم یاد بھی نہ کرتا بلکہ اُلٹی نعوذ باللہ جیسے شیعہ اصحاب کبار پر تبرا کرتے ہیں، تبرا کیا کرتے، اب مولوی صاحب کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ آپ کا یہ کہنا وائے بر دینداری اہلسنت الخ، انصاف فرمایئے صحیح ہے یا ہمارا یہ کہنا کہ وائے بر دینداری و عقل و ہوشیاری شیعہ خصوصاً مولوی عمار علی صاحب کہ صحابہ کی دشمنی میں حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی رعایت نہ کی بلکہ خدا کی شہادت اور آئمہ اطہار کی گواہی کو رد کیا، اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس کو یوں سمجھا

کہ اس کا گوشۂ عاطفت صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف مائل ہے اسی کو کافر اور مرتد جو چاہا سو کہا۔

اگر عذر نامعقول تقیہ نہ ہوتا تو حضرت علی اور حسنین اور امام زین العابدین اور امام محمد باقر اور امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی خیر نہ تھی کیونکہ ان بزرگواروں نے اصحاب کبار کی تعریف میں کیا کمی کی ہے؟ خصوصاً حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کہ ہمیشہ ممد اور معاون اور ہم نوالہ و ہم پیالہ اصحاب کبار خصوصاً اصحاب ثلثہ رہے۔ پھر ہم سے تو اس بات کا فرق پوچھتے ہیں کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تو گواہ طلب کیے اور جابر رضی اللہ عنہ سے کیوں نہ طلب کیے، اب ان سے کوئی پوچھے، کیا سبب ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و دیگر بعض آئمہ کی تعریفوں اور معاونتوں اور موافقتوں کو تو تقیہ پر محمول کرتے ہیں۔ حضرت عمر اور حضرت عباس وغیرہم کی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما کے ساتھ موافقتوں اور ان کے حق میں ان کی تعریفوں کو تقیہ پر کیوں نہیں محمول کرتے؟ یا مثل حضرت عباس اور حضرت عمر اور حضرت زید شہید حضرت علی رضی اللہ عنہم اور دیگر آئمہ اطہار کے اقوال اور احوال کو نفاق اور ریاء سے خالی کیوں نہیں سمجھتے؟

اگر اُم ایمن اور حضرت علی کی گواہی اتنی اہم ہے تو خدا اور رسول و قرآن و آئمہ اہل بیت کی گواہی صحابہ کے بارے میں کیوں کر اہم نہ ہوگی

اور نیز کوئی ان سے یہ سوال کرے کہ ہم نے مانا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت اُم ایمن وغیرہما کی گواہی کے موافق عمل نہ کیا لیکن وہ حکم خداوندی سے مجبور تھے۔ خداوند کریم کا حکم یہی ہے کہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہونی چاہئیں۔ حضرات شیعہ جو خدا کی اس شہادت کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ایک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی نہ تھی بلکہ آپ کی کئی بیٹیاں تھیں تسلیم نہیں کرتے اور علیٰ ہذا القیاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسی تعدد بنات میں ہم صفیر خداوندی ہونا جو شیعوں کے نزدیک سچا نہ ہوا اور ان کا کہا مقبول نہ پڑا تو کیا بلا پیش آئی؟ یہاں تو یہ عذر بھی نہ تھا خدا تعالیٰ اور حضرت علی دو اذن مل کر تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں سے زیادہ ہی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت علی اور اُم ایمن کی گواہی تو قابل سند ہو اور حضرت علی اور جناب پاک کبریائی کی قابل سند نہ ہو؟

اور اگر مولوی صاحب کی خاطر سے اس طوفان ہی کو تسلیم کریں کہ حضرت علی اور حضرت اُم ایمن اور حسنین رضی اللہ عنہما چاروں نے گواہی دی تھی؟ تب قطع نظر اس کے کہ اب بھی مقدار مقررہ شہادت کو یہ شہادت نہیں پہنچی اور شیعوں کو جائے دم زدن نہیں، شیعہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ

مدائح صحابہ سے کلام اللہ تو مشحون تھا ہی، اقوال عترت طاہرہ اور ملفوظات آئمہ اطہار بھی ان کی منت وثناء سے مملو ہیں اور اماموں میں سے بھی ایک آدھا نہیں بلکہ تین چار کے قول تو اس احقر نے بھی اس رسالہ میں نقل کیے ہیں۔

پھر باوجود یہ کہ اس گواہی میں عدد آئمہ اطہار ہی دو سے بڑھ گیا خدا تو درکنار؟ پھر کیوں اعتبار نہیں کرتے، اب ردّ شہادت اسے نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ وائے بر دینداریٔ۔ شیعہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عداوت میں نہ خدا کا اعتبار کیا نہ آئمہ اطہار کا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کا خیال کیا نہ بزرگواران مذکور کے افعال حمیدہ اور احوال پسندیدہ پر دھیان دیا۔ پھر اُلٹے چور کوتوال کو پکڑیں اور اُلٹے نکٹے ناک والوں کو ہنسیں؟ مولوی عمار علی اور ان کے ہم مذہب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن کریں جن کی بزرگی کا خدا بھی گواہ ہو اور آئمہ اطہار بھی اقرار کریں، کفر اسے نہیں کہتے تو اور کسے کہتے ہیں؟ اور دشمنیٔ اہل بیت یہ نہیں تو اور کیا ہے؟

تفصیل ان اُمور کی اور سندیں ان روایات کی سب اس رسالہ میں مندرج ہو چکی ہیں اس لیے ان کی تقریر میں تقصیر کی۔ ناظرین رسالہ ہٰذا بے دماغی نہ فرمائیں بلکہ پلٹ کر نہ دیکھیں کیا ستم ہے؟ کہ اگر ایک روایت موضوع بے سند میں جس کا اعتبار کسی طرح نہیں ہو سکتا اور نہ اہل سنت کی کسی معتبر کتاب میں اس کا نشان ہے۔ یہ دیکھ لیا ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہ طلب کیے اور ان کی بات بے گواہوں کے نہ مانی اور پھر گواہوں پر بھی ان کے دعویٰ کو مسترد کیا، تو ان سب خوان الشیاطین کا وظیفہ ہی یہ ہو گیا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ اور حضرت علی اور حضرت اُم ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جھوٹا جانا حالانکہ اس روایت میں تکذیب اور سوء ظن کی بُو تک نہیں آتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بسبب پابندیٔ قانونِ خداوندی حکم موافق مرضی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نہ دے سکے اور اپنے آپ آیات قرآنی اور شہادت آئمہ ربانی کو جو بطرق متواترہ یا اسانید معتبرہ ثابت ہوتی ہیں اور کسی طرح لائق اعتراض وانکار نہیں، بہر طور قابل اعتبار ہیں، ہضم کیے بیٹھے ہیں اور زبان تک نہیں لاتے حالانکہ اعتبار احادیث وآثار کے لیے باتفاق ایک زن معتبر بھی کفایت کرتی ہے۔ نصاب شہادت کی حاجت نہیں، چہ جائیکہ تواتر اور تکاثر؟

چونکہ یہ قضیہ بہت دور جا پڑا اور جس قدر لکھا گیا گو قلیل ہے لیکن اہل فہم کے لیے کثیر ہے۔ اس لیے عرض رسا ہوں کہ اگر بالفرض بفرض محال روایت ہبہ اور قضیہ طلب گواہان صحیح بھی ہو تب بھی دامنِ حال صدیق اکبر لوثِ خطا اور آلودگی جفا سے صاف مصفّٰی ہے۔ مع ہٰذا روایت منہج الکرامت

ابن مطہر حلی سے یہ بات تو صاف ہی معلوم ہوگئی کہ گناہِ حق تلفی فدک تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے سر نہیں لے گئے۔ باقی رہا اُن سے گواہوں کا مانگنا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے گواہوں کا نہ مانگنا تو اوّل تو وجوہ متعددہ اس کے مرقوم ہوچکیں۔ اہل فہم سمجھتے ہیں کہ وہ وجوہ کیسی برجستہ اور ایک سے ایک چڑھتی ہوئی ہیں۔

سیدہ سے گواہی طلب کرنا خطاءِ اجتہادی تھی جو باعثِ قدح نہیں

علاوہ بریں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ معصوم نہ تھے، ایک امام مجتہد تھے اور مجتہد سے اہل سنت کے نزدیک خطا بھی ہوجاتی ہے بلکہ مجتہد تو مجتہد انبیاء سے اجتہاد میں خطا ہوجاتی ہے اور یہ بات شیعوں کو بھی چار ناچار ماننی پڑے گی کیونکہ سورۂ انبیاء میں رکوع "وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ" کے شروع ہی میں ایک کھیتی کے تنازع میں جو مقدمہ حضرت داؤد کے دربار میں پیش ہوا تھا مذکور ہے۔ سو اس قصہ میں جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کی رائے مختلف ہوئی اور خدا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں "فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ" (یعنی ہم نے سمجھا دیا وہ فیصلہ سلیمان کو) تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤد سے جو بالاتفاق نبی ہیں اور معصوم ہیں، اجتہاد میں غلطی ہوئی۔ سو اسی طرح حضرات شیعہ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہ بعذر غلطی اجتہاد معذور رکھیں اور یوں سمجھیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے گواہوں کے نہ طلب کرنے میں غلطی کی یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گواہوں کے طلب کرنے میں غلطی کھائی تو کیا نقصان ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ جس کی خدا اور آئمہ تعریف کریں اس کے برا کہنے سے بچ گئے۔

اور اگر یوں بھی ناک سیدھی نہیں ہوتی تو نہ سہی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نعوذ باللہ اوّل مرتبہ میں نیت بد ہی تھی؟ اور اس سبب سے ٹالتے تھے کہیں گواہ طلب کیے کہیں جھوٹے خدا کہنے والوں کو پکڑے بنالیے تھے لیکن روایت منہج الکرامت ابن مطہر حلی اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے وعظ و پند سے انہوں نے فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کردیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس گناہ سے توبہ کی کیونکہ وعظ کے سبب جو کوئی کسی گناہ سے باز آئے تو وہ توبہ ہی ہوتی ہے۔ توبہ کے اور کچھ سر سینگ نہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ" یعنی توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے گناہ کا نہ کرنے والا یعنی جیسے وہ عذاب خداوندی سے ناجی ہے ایسے ہی یہ بھی ناجی ہے۔

حضرت سجاد اگر باوجود ابلیس کے کلی تصرف کے مؤمن ہیں تو ابوبکر بطریق اولیٰ ہیں

مع ہذا اگر توبہ نہ کرتے جب کچھ اندیشہ نہ تھا کیونکہ بشہادت آیات مذکورہ الصدر ان کے ساتھ خداوند صادق القول نے وعدہ مغفرت گناہان کر لیا ہے۔ سو سنیوں کو یہاں تک کچھ نہیں کیونکہ ان کی اصطلاح کے موافق ابوبکر صدیق ولی ہیں نبی نہیں جو معصوم ہونا ضروری ہو، پر مشکل تو شیعوں کو ہے شیعی اور اوراد خوان جس نے صحیفہ کاملہ حضرت سجاد زین العباد دیکھا ہے یا سنا ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت سجاد جو موافق عقیدہ شیعہ معصوم ہیں اور دست برد شیطان سے مطمئن، اپنے حق میں کیا فرماتے ہیں کہ "قَدْ مَلَکَ الشَّیْطَانُ عِنَانِیْ فِیْ سُوْءِ الظَّنِّ وَضُعْفِ الْیَقِیْنِ وَاِنِّیْ اَشْکُوْ سُوْءَ مُجَاوَرَتِہٖ لِیْ وَطَاعَۃِ نَفْسِیْ لَہٗ" یعنی شیطان نے میری باگ پکڑ لی ہے بدگمانی اور ضعف یقین میں اور مجھے شکایت ہے اُس کے برے پڑوس اور اپنے نفس کے مطیع شیطان ہو جانے کی۔ فقط

اب التماس یہ ہے کہ امام کی بات جھوٹی تو ہو ہی نہیں سکتی، خاص کر شیعوں کے نزدیک نہیں تو کافر ہو جائیں۔ پھر جو شیطان کی حضرت زین العباد پر یہ چیرہ دستی ہے تو اس کا کیا جواب ان کے لیے تو کلام اللہ میں کوئی ایسا وعدہ بھی نہیں جس کو سن کر اُن کے جنتی ہونے کا قطعی یقین ہو جائے اور کسی طرح کا احتمال باقی نہ رہے۔ گو شیعہ ان کو بجائے خود معصوم و مغفور اور ہم محفوظ و مغفور سمجھتے ہیں۔

مع ہذا لفظ سوء ظن اور ضعف یقین اور طاعت نفس ایسے الفاظ ہیں کہ خطائی الاجتہاد پر بھی منطبق نہیں ہو سکتے، علیٰ ہذا القیاس نہج البلاغت میں جو مجموعہ خطب حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ ہے اس میں بھی ایسے ایسے مضامین مندرج ہیں اور ان سے بڑھ کر یہ ہے کہ کلام اللہ میں بہت سے انبیاء کی نسبت تذکرہ خطا ہے۔ حضرت آدم اور حضرت یونس علیہم السلام کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ سو ان سب کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فقط ارادہ غصب، بہت ہی تھوڑا ہے کیونکہ وہ معصوم نہ تھے۔ اے پروردگار بے نیاز اس سراپا نیاز و اخلاص کی جان لے تو آگاہ ہے کہ کس قدر میرے دل میں بہ نسبت حضرت زین العباد و دیگر آئمہ اطہار و انبیاء کبار اخلاص اور اعتقاد اور محبت اور نیاز ہے۔ یہ جو کچھ لکھا جاتا ہے بایں نظر "نقل کفر کفر نباشد" حضرات شیعہ کی کفریات کے مقابلہ میں لکھا جاتا ہے۔

فصل ...... حدیث ما ترکناہ صدقۃ کی تحقیق انیق

اب آگے سنئے مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں: "اب اور سننا

چاہیے کہ جب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جانا کہ ابو بکر نے مجھے ہبہ فدک میں جھوٹا سمجھا تو اس معصومہ نے دعویٰ وراثت کا کیا اور ابو بکر سے کہا کہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہوں مجھے اُن حضرات کا مال ارث میں پہنچتا ہے اور فدک میرے باپ کا مال ہے مجھے دے دے اس وقت ابو بکر نے ایک جھوٹی روایت قرآن کے خلاف بنا کر کہا کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، وہ حضرت فرماتے تھے کہ انبیاء کا مال سب صدقہ ہے کسی کو ان کے وارثوں میں سے نہیں پہنچتا۔

اوّل تو یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں نہ بیٹی سے نہ اپنی بیبیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے ان کو نہیں پہنچتا تم دعویٰ نہ کرنا اور حکم خدا کا جو ان کے واسطے تھا، اس کو ان سے چھپا رکھا اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا دخل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں نہ تھا، اس کے کان میں کہہ دیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔ انتہی بلفظہٖ"

مولوی صاحب تو فرما چکے۔ اب ہماری بھی سنئے قدماء فریب بازان شیعہ بوجہ وراثت فدک کے نہ دینے میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن کیا کرتے تھے۔ جب اہل سنت سے جوابات معقول اس اعتراض کے ان نامعقولوں نے سنے اور مجال دم زدن باقی نہ رہی تو ان کے لواحق نے روایات ہبہ تراش کر برنگ دیگر طعن شروع کیا اور اس دعویٰ کے ثبوت تک پہنچانے کے بہت سے چلے کیے۔ یہاں تک کہ بعض کتب غیر مشہورۂ اہل سنت میں بھی الحاق کیا اور سنی بن کر طالب علمان اہل سنت کو دھوکا دیا اور اس روایت کو روایت کیا۔ لیکن یہ فریب بھی نہ چلا اور بہ سبب وضوح امارات کذب روایات مذکورہ اور کھل جانے جعل راویان روایت۔ اور غیر معتبرہ اور غیر مشہور ہونے ان کتب کے۔ جن میں یہ روایت پائی جاتی ہے۔ اوّل تو یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہوگئی۔ دوئم خدا ساز دروغ واصفان روایت کام آیا اور بمقتضائے مثل مشہور "دروغ گورا حافظہ نباشد" روایت تو بنائی پر بنائی نہ آئی۔ یہ بھول گئے کہ ہبہ بے قبض موہوب لہ مفید ملک نہیں اور نیز ایک مرد اور ایک عورت یا دو لڑکوں سے مدعا ثابت نہیں ہوسکتا۔

گواہوں کی شرعی تعداد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تا دم آخر قبضۂ فدک، صدیق کی صفائی کا مضبوط سامان ہے

بہر حال انہوں نے اپنی طرف سے کمی نہیں کی لیکن قربان جائیے خداوند عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر شناسی اور طرفداری کے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طعن سے بری کرنے کی

پہلے ہی وہ تدبیریں کر گئے۔ جس کے سبب شیعوں کو طعن کر کے بجز غوغا سگانہ اور شور غرابانہ اور کچھ حاصل نہ ہو۔ خداوند کریم نے تو گواہی کے اعتبار کے لیے دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی قید لگادی اور جناب سرورِ کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات والتسلیمات نے تادم آخر اپنا تصرف رکھا۔ اس لیے ناچار ہو کر شیعیان خراب طینت کو مکرر اپنی عاقبت کے خراب کرنے کا فکر ہوا۔ وصیت کی روایت تراشی مگر پھر وہی بات ہے کہ جھوٹی بات کے پاؤں نہیں چلتے یہ نہ سمجھے کہ وصیت تو اسی مال میں جاری ہو سکتی ہے جس میں میراث جاری ہو، جب میراث جاری ہی نہیں تو وصیت کے کیا معنی۔

القصہ جب اس طرف سے بھی قافیہ تنگ ہوا تو علماء شیعہ کو سخت دشواری پیش آئی کہ نہ طعن کیے بن پڑے اور نہ چپ رہے سے کام چلے ہے۔ اگر طعن کریں تو کس منہ سے کریں؟ اور خاموش بیٹھیں اور مذہب سے دست بردار ہوں تو عوام شیعہ کو کیا منہ دکھلائیں؟ اور نذر و نیاز کس سے لیں؟ اور اموال اموات کو کیونکر ہضم کریں؟ تو باقی ماندگان شیعہ نے اپنے متقدمین کے انہیں گوزہائے شتر مذکورۃ الصدر کو کمی بیشی کر کے زبان پر رکھا اور پھر زبان درازیاں شروع کیں۔

سو مولوی عمار علی صاحب نے بھی اپنے رقیمہ کریمہ امی میر نادر علی صاحب میں ایسا ہی کیا لیکن بحکم مثل مشہور ''عیب کرنے کو ہنر چاہیے'' ان کا یہ حوصلہ نظر نہیں آتا کہ مضامین مندرجہ رقیمہ کو جو فی الجملہ بطرز جدید ہیں۔ اپنے آپ تراشے ہوں، یہ بات کہ کہیں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قبضہ کی پچر لگائی، کہیں حضرت علی اور حضرت اُم ایمن کی گواہی کے ساتھ حسنین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی گواہی بڑھائی، کہیں ہبہ اور میراث دونوں کی نسبت بہ ترتیب مذکور دعویٰ کرنے کا دعویٰ کیا، کہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کاغذ پھاڑ ڈالنے کا بزعم خود الزام دیا، کسی بڑے مکار یکتائے روزگار کی چالاکی نظر آتی ہے۔ پر مولوی صاحب بحکم میلان طبیعت حیلہ دوست اور نیز بغرض فروغ مذہب سراسر دروغ ان بہتانوں کو نقل کر کے تنہائی میں جامہ سے باہر نکل پڑتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آج تک کسی سنی واقف کار کی کوئی بات نہیں سنی، نہیں تو یہ سب پوچھک بھول جاتے، انہوں نے شاید یہ سمجھا ہو کہ بہت سی چھینا جھپٹی میں فدک میں سے کچھ تو ہاتھ آئے گا، اور بہت سے جھوٹ مل کر ایک سچ کے برابر تو ہو جائیں گے۔

لیکن بفضلہٖ تعالیٰ مذہب اہل سنت میں یہ قوت ہے اور کیوں نہ ہو۔ سچی بات پکی ہی ہوتی ہے کہ علماء تو ایک طرف امثال احقر ہیچمدان بھی جوابات دندان شکن سے شیعوں کے دانت توڑنے کو بہت ہیں۔ چنانچہ اعتراض سابق کا جو کچھ خاکہ اڑا ہے وہ تو ناظرین کو معلوم ہی ہو چکا۔ اسی پر

اعتراض کو بھی قیاس کر لیجئے۔......ع......''قیاس کن زگلستان من بہار مرا''......اور اگر بے جواب کے اس اعتراض کا دل سے کھٹکا نہیں جاتا تو لیجئے۔ مولوی صاحب یوں رقم فرماتے ہیں:''کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعویٰ میراث کیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک جھوٹی حدیث خلاف کلام اللہ کے بنا کر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی بات کو رلا دیا۔''

مخدوم من سچا آدمی سچی بات کو مان لیا کرتا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے دعویٰ میراث کیا، اگر ہم کو ہٹ دھرمی مدنظر ہوتی تو اس روایت کو کتابوں میں سے بھی حذف کر دیتے۔ فقط انکار تو در کنار کوئی موضوع روایت تو تھی ہی نہیں جو بعذر عدم اعتبار پیچھا چھڑا لیتے اور اتنی ہی بات منصفوں کے نزدیک ہمارے اس دعوے کے معتبر ہونے کو کہ روایت ہبہ غیر معتبر ہی کفایت کرتی ہے۔ پر خداوند کریم ہم کو مولوی عمار علی صاحب کے ہمرنگ نہ کرے کہ نہج البلاغت اور کافی کلینی جیسی معتبر کتابوں میں حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں ہونا ثابت اور محقق ہو اور پھر ان کی بیٹیاں ہونے سے انکار کر جائیں اور اُلٹی اُلٹی حجتیں لائیں۔ چنانچہ مذکور ہوا۔

حدیث مذکور کلام اللہ کے عین مطابق ہے

مگر مولوی صاحب کا یہ فرمانا کہ''حدیث خلاف کلام اللہ کے بنائی'' خلاف واقع ہے۔ واقف کار تو اتنی بات سے سمجھ گئے ہوں گے کہ شیعوں کو کلام اللہ سے کیا سروکار؟ جس قوم میں کلام اللہ کا چرچا ہی نہ ہو وہ کلام اللہ کو کیا سمجھیں جو یہ سمجھیں کہ فلانی بات کلام اللہ کے موافق ہے فلانی مخالف۔ مگر علم الیقین عین الیقین کے برابر نہیں ہوتا اس لیے اتنی گزارش کرنی پڑی کہ علماء شیعہ خصوصاً مولوی صاحب اپنے قصور فہم سے ناچار ہیں ورنہ کلام اللہ اور حدیث معلوم۔ جس کی تحقیق کا ہم نے اوپر بھی وعدہ کیا ہے باہم مخالف نہیں بلکہ موافق کیا متعانق ہیں۔ مزید توضیح کے لیے اوّل سے تقریر مخالفت ایسی طرح بیان کیجئے جس سے شیعہ اور علماء شیعہ بھی ممنون احسان ہوں۔ بعد ازاں اثبات موافقت سے ان کو یہ شرمائیے کہ سر بگریباں ہوں۔ مخدوم من ظاہراً مولوی صاحب اوروں کے تیروں کے بھروسے لڑتے پھرتے ہیں جس قدر کہیں سے سن لی وہی کہہ دی ورنہ خیر و عافیت ہے جو یہ طرز نامعقول اختیار کیا کہ جو باتیں ان کے مفید مطلب تھیں وہی منہ پر مہر لگا کر بیٹھ رہے۔ ان کو لازم تھا کہ اوّل اثبات مخالفت کرتے جب کہیں کسی سے خواستگار جواب ہوتے۔ یہ کس نامعقول نے ان کو طرز مناظرہ سکھایا کہ دعویٰ بے دلیل پیش کرتے ہیں۔

انصاف کی رو سے تو اس کے جواب میں ہم کو فقط لانسلم کفایت کرتا ہے۔ یعنی اتنا بہت ہے کہ ہم

یوں کہہ دیں کہ ہم نہیں مانتے اور اگر ہم بھی بے دلیل ایسے ہی دعوے کرنے لگیں بلکہ تمام عقائد اہل سنت کو یوں ہی بے دلیل پیش کرنے لگیں تو کوئی پوچھے مولوی صاحب کے پاس کیا جواب ہے۔ مع ہذا ہم تو نہیں کہہ سکتے، پر اگر کوئی ناصبی یا خارجی بہ نسبت ان روایات کے جو فضائل آئمہ اور استحقاق امامت وغیرہ خصوصیات مذہب شیعہ حضرات شیعہ اماموں سے نقل کرتے ہیں۔ یوں کہنے لگے کہ اپنے مطلب کے لیے اماموں نے یا شیعوں نے خلاف قرآن یہ روایتیں گھڑ لیں تو پھر بجز اس کے کہ مولوی صاحب اپنی زبان کو منہ میں سمیٹ کر بیٹھ رہیں اور کیا کر سکیں گے لیکن ہمارے احسان کو دیکھئے کہ اوّل بمقدار رسائی ذہن شیعہ ہی بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر تقریر مخالفت تحریر میں لاتے ہیں۔

اہل شیعہ کا حدیث ماترکناہ صدقۃ پر اعتراض

واضح رہے کہ نہایت کوشش کر کے علماء شیعہ نے یہ بات نکالی ہے کہ حدیث ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جس کا یہ مضمون ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ہماری انبیاء کی جماعت کا کوئی وارث ہی نہیں، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ وقف ہے، باوجود یکہ اس کے راوی فقط ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ کلام اللہ کے مخالف ہے اور جو حدیث کلام اللہ کے مخالف ہو، اگر بالفرض اس کے راوی بہت سے بھی ہوں تب بھی غلط۔ چہ جائیکہ ایک راوی، بالخصوص اہل سنت و جماعت کے نزدیک کہ ان کے نزدیک کلام اللہ میزان صحت و ضعف و معیار صدق و کذب اخبار ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اوّل تو حدیث مذکور اس آیت کے مخالف ہے "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" جس سے بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا نکلتا ہے کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو پہلے سے کہے دیتا ہے کہ تمہاری اولاد میں لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر ملا کرے۔ سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اور احکام صوم صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ میں شریک ہیں ایسے ہی اس حکم میں بھی اُمت کے شریک رہیں گے۔

مع ہذا اس آیت میں نبی غیر نبی کی کچھ تخصیص نہیں۔ پھر یوں کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی وارث نہیں۔ اس آیت کی تکذیب کرنا ہے۔ دوسری اور آیت "وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَوَرِثَ دَاوٗدَ سُلَيْمٰنُ" کے (جیسے اور انبیاء کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا بھی نکلتا ہے) مخالف اور مناقض ہے کیونکہ دوسری کا ترجمہ تو یہ ہے "کہ وارث ہوئے حضرت سلیمان حضرت داؤد علیہم السلام کے۔" اور پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام جناب باری تعالیٰ سے یہ التجا کرتے ہیں "کہ الٰہی مجھ کو اپنے پاس سے

ایک ولی عہد عنایت فرما جو میرا بھی وارث ہو اور اولاد یعقوب علیہ السلام کا بھی وارث ہو۔ فقط“

سو دوسری آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام جو نبی تھے ان کے ترکہ میں میراث جاری ہوئی اور پہلی آیت سے گو یہ بات بتصریح نہیں نکلتی لیکن اوّل تو حضرت زکریا علیہ السلام سے جو مشہور نبی ہیں، ایسے قدیمی حکم کے خلاف طلب کرنا مستبعد ہے۔ تصور میں نہیں آتا کہ جو حکم حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر ان کے زمانہ تک برابر معمول بہ رہا ہو ان کو بڑھاپے تک معلوم نہ ہوا اور نہ اس باب میں کوئی وحی آئی۔ حالانکہ زمانہ پیری موت کا مقدمہ ہوتا ہے ایسے وقت میں لازم ہے کہ جو موت نبی کے متعلق مسائل ضروری ہوں ان کی اطلاع کی جائے تاکہ اس کے موافق وصیت کر جائے ورنہ جو بات نبی ہی کو معلوم نہ ہو تو پھر اُمتیوں کے معلوم ہونے کی کیا اُمید ہے۔

بایں ہمہ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی نجات کی دُعا کے جواب میں بطور تنبیہ و عتاب ”اِنِّیْ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْن“ فرمایا اور اس سے معلوم ہوا کہ یہ دُعا خلاف مرضی جناب باری تعالیٰ تھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی اس التجا کے جواب میں بشارت قبول دُعا پہنچائی گئی۔ کچھ تنبیہ و عتاب نہیں کیا۔ اس بات کا وہم جاتا کہ یہ عتاب اسی سبب سے ہوا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے وراثت کا کیوں نام لیا۔ بہر حال ان آیات سے اتنا ثابت ہوا کہ انبیاء کے مال میں بھی میراث جاری ہوتی ہے۔

پھر یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی العموم سب انبیاء کو شامل کر کے فرماتے ہیں کہ ہمارے گروہ کے گروہ کا کوئی وارث نہیں ہوتا کیونکر صحیح ہو بلکہ ان دونوں آیتوں سے تو یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ جو بعضے روایات حدیث مذکور میں لفظ ”لَا نَوِثُ“ بھی آیا ہے یعنی ہم بھی کسی کے وارث نہیں ہوتے، یہ بھی غلط ہے کیونکہ حضرت یحییٰ اور حضرت سلیمان علیہم السلام بھی بالاتفاق نبی ہیں۔ جب وہ دونوں اپنے اپنے والد کے وارث ہوئے تو یہ بات کہ کوئی نبی کسی کا وارث ہی نہیں ہوتا سراسر غلط نکلی۔ یہ ہے تقریر مخالفت کلام اللہ و حدیث مذکور۔ اس سے بہتر شاید شیعہ بھی تقریر نہ کر سکیں۔

اعتراض کا جواب

اب ہماری بھی تحقیق صحیح اور تنقیح فصیح کے ترانہ عقل آشیانہ کی طرف متوجہ ہو جئے کہ ماشاء اللہ کیا دلکشا اور راحت افزا ہے۔ جس سے کان میں پڑتے ہی اطمینان ہو جائے۔ ظاہر کی مخالفت کا خلجان ان شاء اللہ تعالیٰ ایسی طرح دور ہو کہ پھر کبھی بھی دھیان نہ آئے۔ بہ ترتیب آیات موافقت کی بات تحریر میں آتی ہے لیکن چونکہ باریک مضامین بے تمہید کے ادا نہیں ہو سکتے، اس لیے اوّل یہ گزارش ہے کہ

ہر چند کلام اللہ من اولہ الیٰ آخرہ حرفاً حرفاً خدا ہی کا تصنیف ہے اور اسی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہتے ہیں۔
لیکن مراسلات اور خطوط بنی آدم کلام ربانی بھی دو قسم پر ہے۔ ایک تو جیسے کوئی منشی اپنی طرف سے کسی کو خط لکھے یا کوئی شخص کسی قاصد کو پیام دے کر بھیجے تو اس صورت میں وہ عبارت بھی اسی منشی اور اُسی شخص کی ہوتی ہے اور وہ خط اور وہ پیام بھی اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔ خط رساں اور پیام برفقط شل ہوا ہوتے ہیں کہ ایک کے منہ کی آواز دوسرے کے کان تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی قسم کا تو اکثر کلام اللہ ہے مثال کے لکھنے کی کچھ حاجت نہیں۔ یعنی جیسے خدا کا تصنیف ہے، ویسے ہی خدا کی طرف سے اُمت کو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا دونوں کو یا کسی خاص قوم کو خطاب ہے۔ سو اکثر تو عبارات ایسی ہی ہیں نشان دہی اور تحریر مثال کی کچھ ضرورت نہیں۔
پر شاید شیعہ بے لکھے نہ سمجھیں اس لیے یہ ایک دو مثال کافی ووافی مرقوم ہیں۔ "یَا عِبَادِ فَاتَّقُوْن یَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ. یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ الخ. یَاَیُّھَا النَّبِیُّ الخ" پہلی آیت میں بے تخصیص کسی نیک و بد کے سب بندوں کو یہ حکم ہے کہ اے میرے بندو! مجھ سے ڈرو۔ دوسری آیت میں بنی اسرائیل کو سنایا جاتا ہے کہ اے گروہ بنی اسرائیل میری فلانی نعمت یاد کرو اور دو آیتیں باقی ان میں خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو خطاب ہے۔ بہر حال جیسے یہ عبارات خدا کی تصنیف کی ہوئی ہیں، ایسے ہی ان کے مضامین بھی خدا ہی کی طرف سے ہیں، کسی اور کا پیام سلام نقل نہیں فرماتے۔

دوسری یہ صورت ہے کہ جیسے لکھنا پڑھنا جاننے والے کسی ایسے جاہل کا خط جسے فارسی نہ آتی ہو، فارسی میں لکھ دیا کرتے ہیں تو عبارت گو اس منشی ہی کی ہوتی ہے، کوئی نادان بھی یوں نہیں کہہ سکتا کہ یہ عبارت اس مرد جاہل کی ہے پر مضمون اس جاہل ہی کا ہوتا ہے اور خط بھی اسی کا گنا جاتا ہے یا جیسے کسی کو کوئی شخص کچھ تلقین کرے کہ تو اپنے فلانے مطلب کے لیے فلانے سے یوں کہیو، جیسے مختاروں اور وکیلوں سے لوگ مسودہ کرا لیا کرتے ہیں۔ تو گو عبارت تلقین کرنے والے ہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہے، پر اس کا مضمون کہنے والے یا عرضی والے ہی کا سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی کلام اللہ میں بعض بعض عبارات ایسی ہیں کہ گو وہ بھی خدا ہی کی بنائی ہوئی ہیں لیکن اُن کے مضامین بندوں کی طرف سے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے "قل یاَیّھا الکافرون اور قُلْ ھُوَ اللّٰہ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" اور سوا اس کے جہاں لفظ قل یا تو لو اوّل میں ہے اور پھر بعد میں ایسے الفاظ ہیں کہ جس کے ملاحظہ سے یوں معلوم ہو کہ متکلم مخاطب ہیں۔ مثلاً قل اعوذ کے یہ معنی ہیں کہ کہہ اے محمد! میں پناہ

مانگتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متکلم جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو بعد قل کے جتنی عبارت ہے اس سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے سمجھنی چاہیے۔

لیکن جیسے زبانی تلقین میں تو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ تلقین کرنے والا یوں کہے کہ تو یوں کہیو۔ عرض کے مسودہ میں اس کی ضرورت نہیں کہ اس کے اوّل میں یوں لکھ دیں کہ تو یوں کہیو بلکہ مسودہ کر کے یوں ہی حوالہ کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی کلام پاک خداوند کریم میں بھی بعضی عبارتیں ایسی ہیں کہ وہ بندوں کی طرف سے علی العموم فقط۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہیں لیکن اس کے اوّل میں قل یا قولوا نہیں بلکہ بمنزلہ مسودہ وکلاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یا سب کی طرف سے تصنیف کر کے ان کے حوالہ کر دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ اسی قسم کی ہے۔ خاص کر "ایّاک نعبد" سے لے کر آخر تک جس کا یہ مضمون ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، ہمیں سیدھی راہ چلا الخ۔ ظاہر ہے کہ یہ عبارت خداوند کریم نے بندوں کی طرف سے بنا کر ان کے حوالے کر دی ہے تا کہ وقت حضور دربار خداوندی یعنی وقت نماز کے اس طور پر خداوند کریم سے عرض معروض کیا کریں ورنہ اگر خدا کی طرف سے کہیے تو خداوند تعالیٰ شانہ سے زیادہ کون ہے جو خداوند کریم اس کی عبادت کرے اور اس سے مدد کا خواستگار ہو؟ اور پھر کون سے جناب باری تعالیٰ بے راہی پر ہیں جو سیدھی راہ کی تمنا اور آرزو ہے؟

"یُوْصِیْکُمُ اللّٰہ" سے آنحضرت مستثنیٰ ہیں اس کے دلائل

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اب متوجہ ہو کر سنئے کہ آیت "یوصیکم اللّٰہ" بلکہ ابتداء سورۂ نساء سے لے کر یہاں تک بلکہ عجب نہیں تمام سورۃ کی سورۃ بمنزلہ سورۂ فاتحہ جناب باری تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصنیف کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرما دی ہے تا کہ آپ بجائے خود لوگوں کو اس طرح سے سمجھا دیں۔ دلیل اس بات کی کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصنیف کی گئی ہے خدا کی طرف سے نہیں۔ یہ ہے کہ "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہ" فرمایا اور "یَا عِبَادِ اُوْصِیْکُمْ" مثلاً نہ فرمایا اگر خدا ہی کی طرف سے بندوں کے خطاب میں یہ آیت ہوتی تو لازم تھا کہ "یَا عِبَادِ اُوْصِیْکُمْ" مثلاً فرماتے۔ یہ عبارت جوابً موجود ہے صاف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ متکلم اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور مخاطب اُمتی۔ آپ اپنی طرف سے ان الفاظ کے پیرایہ میں خداوند کریم کا حوالہ دے کر احکام میراث تعلیم فرماتے ہیں کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ پہلے سے تمہیں خدا تعالیٰ نے آگہی دی ہے کہ تمہاری اولاد میں بیٹوں کو دو بیٹیوں کے برابر ملا کرے۔

یہ ایسی بات ہے کہ جیسے سررشتہ دار جج یا کلکٹر کا حکم اہل مقدمہ کے سناتے وقت کہا کرتے ہیں کہ صاحب تمہاری نسبت یہ حکم دیتے ہیں اور اگر حاکم خود کلام کیا کرتا ہے تو اہل مقدمہ کو اس کے نام یا لقب سے جیسے چودھری یا شیخ جی مثلاً پکار کر کہا کرتا ہے کہ ہم تمہیں یوں حکم دیتے ہیں یا ہمارا تمہارے لیے یہ حکم ہے۔ مثلاً نہ یہ کہ اپنا نام لے کر یوں کہیں کہ تمہیں فلاں شخص یوں کہتا ہے۔ پس درصورت یہ کہ "یَا عِبَادِ اُوْصِیْکُمْ" نہ فرمایا جس کا یہ مطلب ہوتا کہ اے میرے بندو! میں تمہیں کہے دیتا ہوں بلکہ یوں ارشاد ہوا کہ اللہ تمہیں یوں کہتا ہے تو بالیقین معلوم ہوگیا کہ جیسے سورۂ فاتحہ سب کی طرف سے بنادی ہے ایسے ہی یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بنادی ہے تا کہ اُمت سے اس طرح سے باتیں کریں اور ظاہر ہے کہ جب سررشتہ دار کسی اہل مقدمہ کو کوئی حکم سنایا کرتا ہے تو اس حکم سے اپنے آپ خارج ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سواء سررشتہ دار جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں، اگر اُس وقت موجود ہوں اور یہ بھی کہ یوں کہے کہ حاکم تمہارے لیے یوں فرماتے ہیں۔ تب بھی اُس وقت کی گفتگو سے کوئی یوں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سررشتہ دار بھی اس حکم میں داخل ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جو اس حکم کے سنانے میں احکم الحاکمین کے سامنے بہ نسبت ہمارے بمنزلہ سررشتہ دار کے ہیں، اس حکم سے خارج سمجھنا چاہیے اور یوں سمجھنا چاہیے کہ حکم فقط اُمتیوں ہی کے لیے ہے اور حدیث "لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" اس دقیقۂ مخفی کے سمجھا دینے کے لیے۔ اس آیت کی تفسیر ہے۔ پر شیعہ بسبب اپنی کم فہمی اور نہایت کجی طبیعت کے باعث تفسیر کو تبدیل اور تغیر سمجھتے ہیں اور حدیث و آیت میں تخالف جانتے ہیں۔ قصور تو اپنا اور طعن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذمہ۔ اس تقریر کے بعد تو یقین یوں ہے شیعہ اپنے دل میں پشیمان ہو کر مومن خان کا یہ مصرع پڑھیں۔ ع...... "میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

الغرض ذرّہ برابر حدیث مذکور اور آیت معلوم میں تخالف نہیں بلکہ حدیث مذکور آیت معلوم کی تفسیر ہے اور سنیوں کی سب حدیثیں کلام اللہ کی تفسیر ہیں۔ اہل فہم سمجھتے ہیں اور کم فہم نہ سمجھیں تو اپنا سر کھائیں اور اس حکم سے اور سوا اس کے جو حکم کہ ایسی ہی عبارات میں مندرج ہیں۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خارج ہیں جیسے کبھی سررشتہ دار اہل مقدمہ یا رعیت حاکم کو حاکم کا کوئی حکم سناتا ہے اور حاکم کے دل میں سررشتہ دار کی نسبت بھی وہی حکم مکنون خاطر ہوتا ہے۔ تو آگے پیچھے اس کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ تمہارے لیے بھی یہی حکم ہے۔ مثلاً کسی ضلع میں کوئی کلکٹر ہو اور اسی ضلع کا رہنے والا کوئی مال گزار اس کی کچہری کا سررشتہ دار ہو اور بہ نسبت مال گزاروں کے کوئی حکم صادر ہو اور وہ سررشتہ دار مال گزاروں کو

یوں حکم سنائے کہ تمہارے لیے یہ حکم ہوا ہے۔ تو گوان الفاظ سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی کہ سرشتہ دار کے لیے بھی یہی حکم ہے لیکن بایں وجہ کہ سابقاً خلوت جلوت میں اس کو یہ بات متحقق ہو چکی کہ سب مال گزاروں کے لیے ایک ہی حکم ہے۔ وہ سرشتہ دار بھی وقت تعمیل حکم اسی حکم کا پابندر ہے گا۔

سو اگر بعض احکام میں مثل صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوں اور پھر بالفرض وہ بھی ایسے ہی الفاظ سے کلام اللہ میں وارد ہوئے ہیں کہ موافق تقریر مسطور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس حکم سے خارج ہونے چاہئیں تو کسی اور قرینہ یا خطاب پنہانی سے آپ کو اپنا شمول اس حکم میں ثابت ہوا ہو مگر چونکہ اس حکم میں یہ متحقق ہو گیا ہو کہ میں اس میراث سے خارج ہوں بلکہ بالخصوص اس بات میں میرے لیے اور حکم ہے تو بایں نظر کہ مبادا صوم و صلوٰۃ کا اشتراک دیکھ کر باقی ماندگان یہ سمجھ جائیں کہ گو اس آیت سے آپ کا شمول اس حکم میں معلوم نہیں ہوتا لیکن کیا عجب کہ مثل صوم و صلوٰۃ اس حکم میں بھی کبھی وحی جدید کے باعث آپ شریک ہو گئے ہوں اور یہ سمجھ کر اموال متروکہ کو جو بضرورت اخراجات روزمرہ کسی کو دیا نہیں گیا تھا تقسیم کرلیں اور تصرف غیر واجبی سے انجام کار دین و دُنیا کی خرابی اُٹھائیں۔ "لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" فرمایا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استثناء کی دیگر نظیریں

اور یہ تخصیص کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مال بعد وفات میراث میں نہیں آسکتا کچھ نئی تخصیص نہیں۔ بہت سے حکم ایسے ہیں جس میں اُمت کے لیے کچھ حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ اور حکم تھا۔ بشہادت شروع سورۂ مزمل اور آیت "وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ"، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر باتفاق اکثر آپ پر فرض تھا اور باقی تمام اُمت پر فرض نہیں، صوم وصال آپ کے حق میں موجب ثواب تھا باقی تمام اُمت کے لیے ممنوع۔ اگر کوئی عورت اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیتی تو آپ کو وہ حلال تھی اوروں کے لیے حلال نہیں۔ آپ کے ذمہ مہر اور عورتوں کے حق میں عدل یعنی سونے لیٹنے میں برابری نبھانی فرض نہ تھی۔ گو آپ نے تمام عمر عدل ہی سے گزاری اور مہر بھی دیا اور باقی تمام اُمت پر یہ دونوں باتیں ضروری ہیں، سب اُمت کے لیے چار عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ اسی سورت کے شروع میں اس تعداد کا ذکر ہے اور باتفاق امامیہ اثنا عشریہ بلکہ اکثر فرق ہائے شیعہ و سنی اُس کے یہی معنی ہیں کہ چار تک اجازت ہے آگے نہیں حالانکہ جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات واکمل التسلیمات اس حکم سے خارج ہیں۔ آپ کے حق میں سب جانتے ہیں یہ قید نہ تھی۔

اور اس حکم سے آپ کے خارج ہونے کی وجہ بھی یہی نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نہیں بلکہ بمنزلہ آیت "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ" وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہے جیسے کچہری کے عرضی نویس کسی کو عرضی لکھ دیتے ہیں اور وہ عرضی لکھوانے والے ہی کی سمجھی جاتی ہے۔ عرضی نویس کی کوئی نہیں کہتا، ایسے ہی اس حساب سے ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم احکام یعنی وعظ و پند سمجھنا چاہیے کیونکہ اس تعداد کے ذکر سے کچھ ہی پہلے شروع میں اس صورت کے اس طرح سے خطاب ہے "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ" یعنی "اے لوگو! ڈرو تم اپنے رب سے جس نے تمہیں ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا۔ فقط" سو یہ کلام اور یہ خطاب ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے تو بندوں کو ہو ہی نہیں سکتا ورنہ یوں فرماتے "یا یھا النّاس اتقونی فانی ربکم الذی خلقکم" یعنی "اے لوگو! مجھ سے ڈرو اس لیے کہ میں تمہارا وہ رب ہوں جس نے تمہیں پیدا کیا ایک جان سے۔ فقط"

اب ہو نہ ہو یہ کلام اور یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور مخاطب اس پند کے اُمتی ہیں تو لاجرم یہ احکام بھی بہ نسبت اُمتیوں ہی کے ہوں گے، تیماردار جو بحکم حکیم حاذق بیمار کو نصیحت کرتے ہیں کہ تو دوا پی لے اور بد پرہیزی مت کر، تو کسی کے نزدیک (نہ بیمار کے نہ غیر کے) یہ لازم نہیں کہ تیماردار خود بھی دوا پئے اور پرہیز کرے بلکہ سب کے نزدیک تیماردار ان احکام سے خارج ہے۔ ایسے ہی جناب سرور کائنات علیہ السلام جو ہم بیماروں کے لیے بمنزلہ تیماردار کے ہیں بحکم حکیم مطلق یہ احکام مندرجہ ذیل "یَا اَیُّھَا النَّاس اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الٰی" آخر السورۃ سب اُمتیوں کو سناتے ہیں تو لاجرم آپ ان احکام سے خارج ہیں۔

اور اگر کسی حکم میں شریک بھی ہیں تو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اُس تیماردار کو بھی حفظ صحت کے لئے یا کسی اور مصلحت کی رعایت کے لیے وہ حکیم کوئی دوا یا کوئی پرہیز ہی بتلا دے جو اُس بیمار کے نسخہ اور پرہیز میں داخل ہے اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ تمام سورۃ خاص کر شروع سے لے کر آخر رکوع "یو صیکم اللّٰہ" تک جتنے احکام مذکور ہیں وہ سب بہ نسبت اُمتیوں کے صادر ہوئے ہیں۔ اس میں سے اگر کسی حکم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک اُمت ہیں بھی؟ تو کسی اور اشارہ کنایہ وحی وغیرہ کے سبب ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ تمام سورۃ نہیں تو آخر رکوع مذکور تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے عبارت بنائی گئی ہے۔ بالجملہ جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات اکثر احکام سے مستثنٰی ہیں۔

اور مردمان فہمیدہ سواء امثلہ مذکورہ کے دُنیا کے کاروبار میں سے اور اس کی بہت سی مثالیں نکال سکتے ہیں۔ مثلاً افسر بہ نسبت عوام ملازموں کے بہت سے احکام میں مستثنٰی ہوتا ہے اور بہت سے احکام اُسی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔

پہرہ سپاہی دیتے ہیں افسروں سے معاف ہوتا ہے۔ پہرہ بدلنا اور حکم بولنا اور انتظام کرنا اور موجودات لینی اور امور ضروری کی حکام بالا دست کو اطلاع کرنی افسروں کے ذمہ ہوتی ہے۔ الحاصل حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مثل حکم تعداد منکوحات اس حکم سے بھی خارج ہیں اور جب خارج ہوئے تو یہ آیت اور وہ حدیث باہم مخالف نہ ہوئی موافق اور متعانق ہی نکلی ہاں مخالفت اسے کہتے ہیں کہ شیعہ اپنے اماموں سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد کے بعض وارثوں کو بعضے ترکہ کا حصہ نہیں دیا بلکہ خود اپنے آپ سب نے لیا ہے جیسے شمشیر اور مصحف اور انگشتری اور پوشاک بدنی۔ سو جن رواجتوں کی سند سے اماموں نے اوروں کو حصہ نہیں دیا اوّل تو وہ فقط انہیں کی روایت ہے اور کوئی اس کا راوی نہیں۔ دوسرے یہ بات آیت "یوصیکم اللّٰہ" کے ہر طور مخالف ہے تطبیق کی کوئی صورت نہیں۔

اب اگر بالفرض یہ حدیث غلط بھی ہو اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی نے بنالی ہو تب مضمون صحیح ہی نکلا۔ حکم بہر حال یہی ہے کہ فدک وغیرہ متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں میراث جاری ہونے کا حکم نہیں اور اس لیے اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ اس حدیث کی صحت کے دلائل جمع کر کے پیش کریں یا کوئی اور وجہ دربارہ تطبیق حدیث مذکور اور آیت "یوُصیکم اللّٰہ" بیان کریں یا اس حدیث میں اور روایات باقیہ میں موافقت ثابت کر کے شبہ تخالف کو دُور کریں کیونکہ کلام فدک میں میراث جاری ہونے میں تھی۔ سو اس کی طرف سے اطمینان ہی ہوگیا لیکن تاہم بایں نظر کہ اولیائے کرام اور مقربان درگاہ خداوندی کی طرف داری اور اُن کے بدگویوں کی دندان شکنی میں اُمید نظر عنایت خداوند تعالیٰ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور توقع دُعاء و شفاعت اولیاء و مقربان خدا ہے جس میں سے خاص ابوبکر صدیق کہ سرافسر مقربان اور سرلشکر اولیاء ہیں۔ اس لیے اس آیت سے مطابقت کی بھی ایک اور وجہ مرقوم ہے اور تطبیق آیات باقیہ بھی معروض خدمت اہل انصاف ہے۔ ازاں بعد بطور شیعہ وسنی کچھ بیانِ صحت وعلامات صحت حدیث مذکور بھی ان شاء اللہ کیا جائے گا۔

حدیث معاشر الانبیاء مخصص آیہ توریث ہے نہ کہ معارض

سو اوّل آیت "یوصیکم اللّٰہ" کے ساتھ مطابقت کی ایک اور وجہ لیجئے۔ اگر بطور مذکور جس سے جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مستثنٰی ہونا اس حکم سے معلوم ہو جائے یہ حکم بیان نہ ہوتا بلکہ ایسے الفاظ

ہوتے کہ جن سے باعتبار الفاظ عموم خطاب ہی سمجھا جاتا یا کوئی عقل کا اندھا نہیں الفاظ کو یوں کہنے لگے کہ عموم پر دلالت کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم میں بہر نہج شامل ہی ہیں۔ تب برتقدیر صحت حدیث مذکور کوئی دشوار ہی نہیں بہت سے بہت ہوگا تو آیت مذکور کی تخصیص لازم آئے گی، مخالفت پھر بھی نہیں، مخالفت تو تعارض اور تناقض کو کہتے ہیں۔ تخصیص کی صورت میں استثناء کی صورت ہوجائے گی۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ میرے پاس سب آئے مگر زید نہیں آیا تو اس کلام کے اوّل اور آخر میں کوئی نادان بھی تعارض نہیں سمجھتا حالانکہ یوں کہنا کہ سب آئے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زید بھی آیا۔ یہ کہنا کہ زید نہیں آیا اس کے مخالف ہے۔ سو اس کی لم یہی ہے کہ آخر کا کلام اوّل کا مخصص ہوگیا۔

باقی کوئی یوں کہے کہ اس مثال پر تو جب قیاس کیا جائے کہ جیسے اس کلام میں جملہ مخصصہ ساتھ لگا ہوا ہے ایسے ہی مضمون حدیث کا کوئی لفظ اس آیت کے متصل آگے پیچھے لگا ہوتا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ مخصص کا لفظوں میں اور متصل ہی ہونا کچھ ضرور نہیں۔ اسی کلام میں کہ سب آئے مگر زید نہیں آیا ایک زید کی تخصیص تو لفظی ہے۔ باقی اور جو لاکھوں تخصیصیں اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں وہ لفظوں میں کہاں ہیں؟ توضیح اس کی یہ ہے کہ اس قسم کے کلام کا کبھی کو اتفاق پڑتا ہے اور بایں ہمہ تمام مخلوقات بلکہ سب بنی آدم اور سارے روئے زمین کے رہنے والوں کا آنا بھی مثلاً مقصود نہیں ہوتا۔ ایک بستی کے یا ایک گروہ کے یا ایک ذیل خاص کے آدمی مراد ہوتے ہیں۔ سو یہ تخصیص کون سے لفظ سے نکل آئی اور اس پر تسکین نہ ہو تو اب کے ایسی مثال لیجئے کہ پھر کسی کو مجال دم زدن نہ رہے۔

جیسے آنحضرت فَانكِحُوا مَا طَابَ سے مستثنیٰ ہیں ایسے ہی يوصيكم الله سے ہیں

اوّل میں اسی سورت کے یہ حکم ہے "فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ" یعنی "نکاح کرو عورتوں سے جس قدر تمہاری مرضی ہو، دو دو، تین تین، چار چار، فقط"۔ اب عرض یہ ہے کہ باتفاق سنی و شیعہ خصوصاً امامی و اثنا عشری اس کے معنی یہی ہیں کہ چار نہایت درجہ ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ سو اگر "یوصیکم اللہ" عام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر کو سب کو شامل ہے تو "فانکحوا ما طاب لکم" بھی عام ہے اور سب کو شامل ہے۔ کوئی لفظ ایسا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے مستثنیٰ ہونا ثابت ہو، اس کے پس و پیش میں نہیں۔ پھر جیسے کسی کلام منفصل سے اس آیت کو تخصیص کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کرلیا ہے ایسے ہی

حدیث مذکور سے آیت "یوصیکم اللّٰہ" کو مخصوص کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کرلیا۔

اور اگر یوں کہیے کہ آیت "فانکحوا" کی تخصیص تو دوسری آیت ہی سے کی گئی سورۂ احزاب کی یہ آیت "یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ سے مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ" تک اس پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے کیوں کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ:

"کہ اے نبی ہم نے حلال رکھیں تیرے لیے تیری عورتیں جن کے تو مہر دے چکا اور جو باندیاں تیری ملک میں آ گئی ہیں اس لوٹ میں سے جو اللہ نے دلوادی ہے اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے وطن چھوڑ دیا تیرے ساتھ میں اور جو کوئی عورت ہو مسلمان اگر بخشے اپنی جان نبی کو اور نبی چاہے کہ اس کو نکاح میں لے آئے نری تجھ ہی کو سواء اور مسلمانوں کے۔ فقط"

سو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ کی اجازت نہیں تھی تو اتنی کیوں گنا دیے۔ سو جیسے آیت "فانکحوا" کی تخصیص اس آیت سے ہوگئی، ایسے ہی کوئی آیت بتلاؤ جو آیت "یوصیکم اللّٰہ" کی تخصیص اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستثنیٰ ہونے پر دلالت کرے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تحکم بے جا کس سے روا ہوگیا؟ کہ کلام مخصص بھی ہو تو آیت ہی ہو؟ عقل سلیم کو آیت اور غیر آیت اس بات میں دونوں یکساں نظر آتے ہیں اور عقل کے سلیم نہ ہونے کے عذر سے یہ جواب مسلم نہیں تو ہم کہتے ہیں کہ اوّل تو آیت "فانکحوا" کا مخصوص ہونا آیت "انا احللنا" سے مسلم نہیں ہے کیونکہ مقام دعویٰ میں لازم ہے کہ ایسی دلیل پیش کی جائے جس میں خلاف دعویٰ کا احتمال نہ ہو اور اس آیت میں احتمال ہے کہ بمنزلہ "وَاُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ" اس امر کے بیان کے واسطے نازل ہوئی کہ تمہارے لیے اس قسم کی عورتیں حلال ہیں، نہ یہ کہ جتنی چاہو نکاح کرلو۔ جیسے "واحل لکم ما وراء ذلکم" کے یہ معنی ہیں کہ تمہارے سواء محرمات مذکورہ کے سب قسم کی عورتیں حلال ہیں۔ بشرطیکہ مہروں سے ان کے ساتھ نکاح کرلو۔ سو اس سے یہ نہیں نکلتا کہ سواء محرمات مذکورہ جس قدر چاہو ان سے نکاح کرلو اور مؤید اس احتمال کی یہ بات ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ نساء سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

چنانچہ تفسیر اتقان میں نوع اوّل میں ترتیب نزول سورت ہائے قرآنی میں ایک حدیث متصل نقل کی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ سو اب تک آیت "فانکحوا" نازل ہوئی ہی نہ تھی جو

آیت "انا احللنا" نازل ہولی اور جب تک آیت "فانکحوا" نازل نہیں ہوئی تھی تب تک نکاح کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص؟ کسی کو بھی کوئی قید عدد نہ تھی۔ پھر کیا ضرورت تھی جو اس آیت کو نازل کر کے یہ اطلاع کی گئی کہ تمہارے لیے جتنے نکاح کرو درست ہیں؟ اس صورت میں لاجرم یوں ہی کہا جائے گا کہ آیت "فانکحوا" کی تخصیص کسی اور ہی وجہ سے ہوئی اور اگر یوں کہئے کہ ترتیب مذکور باعتبار فواتح سور ہو، یہ کیا لازم ہے کہ سورۂ احزاب کی تمام آیتیں سورۂ نساء کی تمام آیتوں سے پہلے ہی نازل ہولیں؟ چنانچہ حدیث مشار الیہ سے کچھ ایسا ہی واضح ہوتا ہے۔ سو ہر چند یہ احتمال ہمیں ساکت نہیں کر سکتا، اسی لیے کہ مدافعت ان احتمالات کی ہمارے ذمہ نہیں، ہم کس بات کے مدعی ہیں جو احتمالات مخالفت کو رفع کریں؟ ہاں اس احتمال کا دفعیہ کہ شاید ساری ہی احزاب یا فقط آیت "اِنَّا احللنا" ساری سورۂ نساء یا فقط آیت "فانکحوا" اس سے پہلے نازل ہولی ہو۔ ان کو ضروری ہے تاکہ ان کا دعویٰ تخصیص ثابت ہو۔

"یُوصیکم اللّٰہ" کی مخصص دوسری آیت بھی ہے

مع ہذا ہماری چشم پوشی دیکھئے کہ ہم اس سے بھی درگزر کر کے آیت "یوصیکم اللّٰہ" کی مخصص بھی آیت ہی بتلاتے ہیں۔ سورۂ حشر جو باشارۂ حدیث مشار الیہ سورۂ نساء سے بعد میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں یہ آیت موجود ہے "ما افاء اللّٰہ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْلَا یَکُوْنَ دَوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ" مطلب یہ ہے کہ "جو مال بطور فئی کے خداوند کریم نے اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دلوا دیا۔ بستیوں والوں سے (یعنی بے لڑے بصلح فتح ہوگئی) تو وہ اللہ کے واسطے اور رسول کے اور ناطے والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے لیے ہے تاکہ نہ آوے لینے دینے میں دولت مندوں کے تم میں سے۔ فقط"

اب علماء اہل سنت اور مصنفان علماء شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ مال فئی کی تقسیم جناب باری تعالیٰ نے چھ حصوں پر کی۔ سو بعض علماء کا تو یہی قول ہے کہ چھ حصوں پر تقسیم کر کے خدا کا حصہ بیت اللہ اور مساجد کی تعمیر میں خرچ کیا جائے۔ پر اکثر اُمت کا مذہب یہ ہے کہ مال فئی کے پانچ ہی حصہ ہیں لیکن چونکہ عبارت "فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ الخ" جو یہاں ہو بہو وہی عبارت ہے جو پارہ دہم کے شروع میں مصرف خمس کے بیان کے لیے وارد ہوئی ہے اور شیعوں کا اس جگہ پانچ حصوں پر تقسیم کرنا بالیقین معلوم ہے تو بالیقین معلوم ہوا کہ یہاں بھی شیعوں کے نزدیک وہی تقسیم ہوگی۔ سو اس

مذہب کے موافق ذکر خدا کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ جو چیز خداوند کریم کے ارشاد کے باعث اس کی رضا کے موافق خرچ کی جاتی ہے تو اُس کو خدا کے ساتھ اور نیز اُن کے ساتھ جو موافق ارشاد خداوندی اس کے مصرف مقرر ہوئے ہیں، ایک نسبت حاصل ہو جاتی ہے۔

خدا کے ساتھ تو یہ نسبت کہ اس کی راہ میں خرچ ہوئی اور اہل مصرف کے ساتھ یہ نسبت کہ ان کے لیے مقرر ہوئی تو اس کو خدا کے واسطے بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ عرف ہی یہ ہو گیا ہے کہ جو چیز بہ نیت ثواب دیا کرتے ہیں، اس کو خدا کے واسطے کہا کرتے ہیں اور اہل مصرف کے واسطے بھی۔ چنانچہ عرف میں ان کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں اور بولا کرتے کہ فلانی چیز فقیروں کے یا مسکینوں کے واسطے ہے۔ مثلاً تو اس صورت میں حاصل یہ ہوا کہ مال فئی خدا کے واسطے ہے اور فلانی فلانی قسم کے آدمیوں کے واسطے۔ یعنی خدا کی رضا مندی کے لیے اُن کو دیا جائے اور ضرورت اس کہنے کی یہ ہوئی کہ مال فئی تو اُسے کہتے ہیں کہ جو کفار کے پنجوں میں سے بے لڑے بھڑے بسبب رعب لشکر اسلام کے یا بطور صلح اہل اسلام کے قبضہ میں آجائے۔ سو یہ مال حقیقت میں تو جناب باری تعالیٰ نے اپنے فضل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں داخل کر دیا۔

لیکن چونکہ بظاہر اس کا باعث رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوا ہے اور رعب میں فی الجملہ جمعیت لشکر کو مداخلت ہے تو لشکریوں کو اس میں طمع ہو سکتی تھی۔ اس لیے یوں ارشاد ہوا کہ جو مال بے لڑے بھڑے ہم نے اپنے رسول کو دلوا دیا ہے اس میں تمہیں جاں فشانی کی نوبت نہیں آئی کہ کسی قسم کی مشقت تم پر نہیں پڑی۔ سو مناسب یوں ہے کہ اس کو خدا کے واسطے چھوڑ دو تا کہ مصارف مذکورہ میں صرف ہووے لیکن پہلی آیت میں جو یہ جملہ ہے "فَمَا اَوْ جَفْتُمْ" سے لے کر "قَدِیْرٌ" تک اس جملہ کے مناسب یوں ہے کہ یوں کہئے کہ جب خداوند کریم نے تمہاری بے سعی و کوشش کے یہ مال اپنے رسول کو دلوا دیا تو اس میں تمہارا کچھ حق نہیں۔ جیسا مال غنیمت بسبب اس کے کہ بظاہر تمہاری جانفشانیوں کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آیا تھا، تم پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی جو مال فقط خدا کی عنایت سے ہاتھ آئے وہ خدا کا ہونا چاہیے اور جو لوگ اللہ والے ہیں اور خدا کے نام پر بیٹھے ہیں یہ خدا کے نام کا مال اُن کو ملنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فدک کے مالک نہ تھے متولی تھے

بہر حال لفظ "علی رسولہ" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبض و تصرف ثابت ہوا لیکن جیسا لفظ علی رسولہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبض و تصرف ثابت ہوا ویسا ہی لفظ "فللّٰہ" سے یہ بھی

ثابت ہوا کہ وہ قبض و تصرف مالکانہ نہیں بلکہ متولیانہ ہے۔ یعنی آپ خازن اور امین ہیں مالک نہیں ورنہ اس مصرف کے مقرر کرنے کے کیا معنی؟ مالک کو اپنی چیز کا اختیار ہوتا ہے؟ اور اگر بالفرض والتقدیر یہ مال فئی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو اور ایک قدر معین کے لیے ذوی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور ابن سبیل کو مقرر کر دینا ایسا ہی ہو جیسا زکوٰۃ کے لیے (جو ایک حصہ معین ہے) فقراء اور مساکین وغیرہما کو مقرر کر دیا ہے تو قطع نظر اس کے کہ یہ بات بشہادت عبارت آیت ظاہر البطلان ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ (نعوذ باللہ) سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات والتسلیمات جو باتفاق سراسر معصوم ہیں۔ اس جہان سے بار حقوق مندرجۂ آیت اپنے سر پر لے گئے، سو اس کے قائل ہونے کی جرأت شیعوں ہی میں نظر آتی ہے اہل سنت کو ایسی بات کہہ کر اپنا ٹھکانا نظر نہیں آتا۔

باقی رہا فئی کے اندر فئی کا مصارف مذکورہ میں خرچ کرنا۔ سو اس صورت میں اس سے کام نہیں چلتا کیونکہ لفظ "افاء اللّٰہ" اس صورت میں صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذوی القربیٰ اور یتامیٰ وغیرہ کو اصل زمین بانٹ کر دینی چاہیے۔ الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ پھر نہ معلوم کہ کس وجہ سے روایت ہبہ فدک کو علمائے شیعہ صحیح سمجھتے ہیں یا فدک کو بتمامہ حق وارثان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم؟ بلکہ فقط حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق خاص قرار دے کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بلکہ تمام اکابر صحابہ خصوصاً خلفائے ثلثہ پر زبان طعن دراز کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ اگر پہلے سے عذر جہل تھا تو البتہ یہ عذر معقول ہے لیکن بعد استماع ان کلمات طیبات اور مضمون آیت سراپا ہدایت کے توبہ واستغفار میں کیا توقف ہے؟

ہاں اگر قریۂ فدک بطور فئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض و تصرف میں نہ آیا ہوتا یا بعد ادائے قدر ماوجب من جملہ اراضی وسیعہ اور قریات کثیرہ قریہ فدک خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہ جاتا تو البتہ در صورت احتمال مفروض فی الجملہ جائے گرفت تھی لیکن شیعی ہی فرمائیں کہ فدک کا فئی ہونا اور پھر غیر مقسوم ہونا کس کے نزدیک مسلم نہیں؟ بلکہ انصاف سے دیکھیے تو اس قسم کی تقسیم بھی مفید مطلب شیعہ نہیں کیونکہ اگر بالفرض قریات تقسیم ہوئی تھیں تو ہر ہر قریہ والوں سے جدا جدا صلح واقع ہوئی تھی کسی ایک کی سلطنت ہی نہ تھی جو فقط اُسی سے صلح کرنی کافی اور مکتفی ہو جاتی۔ سو اس صورت میں لازم تھا کہ ہر قریہ میں سے تقسیم کر کے حقوق واجبہ کو ادا کرتے کیونکہ لفظ "ما جو افاء اللّٰہ" میں ہے عموم اور شمول افرادی پر دلالت کرتا ہے۔ مثل غنیمت ہر فئی کو جداگانہ تقسیم کرنا چاہیے تھا۔

اور اگر کوئی عقل کا اندھا اور تعصب کا پورا سنیوں سے دامن چھڑانے کے لیے فدک کو کسی

غنیمت کا حصہ خمس کہہ کر سنیوں کے سامنے آنکھیں کرنے کا ارادہ کرے، تب بھی موافق مثل مشہور ع ..... ''بسہر کجا کہ رسیدیم آسمان پیداست'' وہی خرابی کی خرابی برسر رہے گی کیونکہ جن الفاظ اور جس عبارت سے مال فئی میں سواء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصناف اربعہ ذی القربیٰ وغیرہ کے حقوق کا تعلق ثابت ہوتا ہے۔ وہی الفاظ بعینہا خمس کے مصرف کے بیان کے لیے جناب باری تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ اگر علماء شیعہ کو بوجہ یاد نہ ہونے کلام اللہ کے بحکم ''المرء یقیس علی نفسہ'' اس گفتار میں میری طرف دروغ کا احتمال ہو تو کلام اللہ تو ہر جا موجود ہے۔ سیپارہ دہم کی پہلی آیت کو مطالعہ کر دیکھیں۔

مع ہذا خمس تو مال غنیمت میں سے ملتا ہے۔ سو اگر بالفرض فدک جنگ وجدال سے فتح ہوا ہوتا تو چار خمس تو پھر بھی غانمین کے ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس سوائے اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اگر کہیے تو جو حال اور مجاہدین کا ہے وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ سو کسی طرح سارے فدک کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بھی احتمال نہیں کہ فدک کسی قریہ کے اس حصہ معین کا نام ہے جو بعد ادائے حقوق واجبہ رہ گیا تھا کیونکہ بالاتفاق اہل لغت صاحب قاموس وغیرہ اس بات پر متفق ہیں کہ فدک ایک قریہ کا نام ہے۔ علماء شیعہ کو بھی اس میں کلام نہیں اور جاہلوں سے اپنی کلام نہیں۔ بہر حال قبل اس بات کے کہ بعد تقسیم اراضی کثیرہ فدک خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہ گیا تھا۔ یہ احتمال باطل ہے کہ اراضی فئی بلکہ اراضی خمس بھی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں) مثل خیال محال مجانین پریشان ہی رہے گا۔

آیت کے ہر لفظ سے فدک کا مملوک نہ ہونا ظاہر ہے

مگر شاید کسی عقل کے دشمن کو اس احتمال کے بطلان کی حقیقت میں خلجان رہے۔ اس لیے ہم کو بھی لازم ہے کہ اس احتمال کے بطلان کے وجوہ جن سے مال فئی بھی ثابت ہو جائے۔ بیان کر کے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی براۃ بلکہ حقانیت اور علماء شیعہ کی خوش فہمی کو آشکارا کر دکھلائیں۔ سو اوّل تو اس احتمال کے بطلان کے لیے کہ فدک جو من جملہ اراضی فئی ہے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا (اوران مصارف معلومہ کا مقرر کر دینا بعینہ ایسا ہے جیسا اموال مملوکہ میں قدر زکوۃ کے لیے فقراء اور مساکین وغیرہم کو مقرر فرما دیا ہے) قطع نظر اس کے کہ ادنیٰ سے عربی داں کو بھی یہ وہم نہیں گزر سکتا۔ چنانچہ ظاہر ہے یہی ایک لفظ ''فللّٰہ'' کافی ہے کیونکہ مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا اموال فئی کا اس لفظ سے ظاہر و باہر ہے۔ چنانچہ مطالعہ کنان تقریر مسطور بالا پر ان شاء اللہ مخفی نہ رہے گا۔

دوسرے اگر لفظ "مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ" تملیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرتا تو پھر "فَلِلرَّسُوْلِ" کہنے کی کیا حاجت تھی؟ بلکہ مثل "وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ الخ" یہاں بھی جس قدر خداوند کریم کو مدنظر ہوتا کہ اس کی راہ میں خرچ کیا جائے اس کی تعیین فرما کر "فَلِلّٰهِ" کے بعد "وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی الخ" فرما دیتے "فَلِلرَّسُوْلِ" نہ فرماتے۔ اور اگر یوں کہئے کہ لفظ "مَا اَفَاءَ اللّٰهُ" سے تو تملیک نہیں ثابت ہوئی پر "فَلِلرَّسُوْلِ" تملیک پر دلالت کرتا ہے تو البتہ یہ بات نادانوں کے نزدیک داناؤں کی سی بات ہے لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اگر "فَلِلرَّسُوْلِ" میں لام تملیک کے لیے ہو تو لاجرم "فَلِلّٰهِ وَلِذِی الْقُرْبٰی" کا لام بھی تملیک ہی کے لیے ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس جگہ تملیک بے اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ جس جس کی ملک کیا گیا ہے پہلے سے اس کی ملک میں نہ ہو بلکہ بعد افاءۃ یعنی مسلط کردینے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اصناف مندرجہ آیت مال فئی کے مالک ہوئے ہوں کیونکہ اوّل تو بات ظاہر ہے قبل افاءۃ اموال فئی میں کفار کے سب تصرفات مثل بیع شراء ہبہ وغیرہ کے سب کے نزدیک صحیح ہیں۔ مع ہذا اگر وہ قبل افاءۃ مسلمان ہو جائیں یا جزیہ قبول کرلیں تو بہ نسبت اموال کوئی ان کا مزاحم حال نہ ہو، یعنی اس سے معلوم ہوا کہ قبل افاءۃ کفار ہی مالک تھے۔

لام تملیک کیلئے ہو تو اموال فئی غیر مملوکہ خدا ہوں گے

دوسرے فاء تعقیب خود اس بات پر شاہد ہے کہ اگر لام "لِلرَّسُوْلِ" وغیرہ سے ملکیت ثابت ہوتی، تب اس کا خداوند مالک الملک خالق ارض وسما کا پہلے سے مالک نہ ہونا شیعوں ہی کے نزدیک ہو سکے تو ہو سکے؟ کیونکہ پہلے سے مالک نہ ہونے کی وجہ اگر ہو تو یہ ہو کہ اموال فئی قبل اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر قابض ہوں، کفار کے مملوک تھے اور ایک شے کے بتمامہا ایک وقت میں دو مالک نہیں ہو سکتے۔ پھر خداوند کریم کو بھی کس طرح مالک کہہ دیجئے لیکن یہ استبعاد جب ہی ہو سکے ہے کہ ملک خداوند کریم ہم پلہ ملک کفار ہو سو شیعہ برنگ معتزلہ جیسے بندۂ مخلوق کو کہ افعال اختیاریہ کا خالق قرار دے کر خالق حقیقی کے برابر سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی اگر ملک میں بھی خالق اور مخلوق کو برابر سمجھنے لگیں تو کون روکتا ہے، عقیدۂ غلط سے بجز عقل کے اور کوئی نہیں روک سکتا۔ سو وہ پہلے ہی نصیب دشمناں ہوئی اور اہل سنت جو بندوں کے ملک کو مالک الملک کے ملک کے سامنے بمنزلہ قبضۂ خزانچی بلکہ مستعیر مالک اصلی کے ملک کے سامنے سمجھتے ہیں تو اُن کو مالک الملک کے ملک اور بندوں کے (خصوصاً کفار کے) ملک کے اجتماع میں کوئی محال نظر نہیں آتا۔

آیت کا مقصد بیان تملیک نہیں ہے

اور سلمنا کہ تملیک بمعنی مذکور نہ ہو بلکہ مقصود فقط بیان ملک ہو اور موافق عقیدۂ اہل سنت "فللّٰہ وللرّسُوْلِ" کے یہ معنی ہوں کہ مالک حقیقی خداوند مالک الملک ہے اور مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن "لذی القربیٰ الخ" کے لام سے جو ذی القربیٰ و یتامیٰ وغیرہ کی ملکیت ثابت ہوتی ہے اس کا کیا جواب؟

مع ہذا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذی القربیٰ وغیرہ ہر ایک ہر ایک کو مثل خداوند مالک الملک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اموال فئی کا مالک کہئے۔ چنانچہ بظاہر "للرّسول" اور "لذی القربیٰ" کا عطف "لِلّٰہ" ہی پر ہے اور وہ اسی بات کو مقتضی ہے۔ تب تو اس کے محال ہونے میں کلام ہی نہیں اور اگر یوں کہئے کہ "لذی القربیٰ" کا عطف "للرسول" پر ہے اور یہ دونوں معطوف معطوف علیہ مل کر "للّٰہ" پر معطوف ہیں۔ تب اس سے بھی کیا کم کہئے کہ اموال فئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصناف باقیہ میں اور خدا میں مشترک ہوں۔

سو یہ بات اوّل تو یوں کسی مسلمان کے دھیان میں نہیں آسکتی کیونکہ اس صورت میں لازم تھا کہ جیسے غنیمت غانمین پر تقسیم کی جاتی تھی، اموال فئی اصناف معلومہ پر تقسیم کیے جاتے تاکہ ہر کوئی اپنے حسب دلخواہ اس میں تصرف کرتا۔ ضرورت ہوتی تو کسی کے ہاتھ بیچ دیتا نہیں تو آپ رکھتا یا کسی کو دے دیتا۔ سو یہ وبال کس کی گردن پر رہا کہ مالکان اشیاء کو دخل نہ ملا؟

سو اہل سنت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو درکنار اُن کے خدام کی طرف بھی یہ وہم نہیں آسکتا کہ ایسے ظلم عظیم کے مرتکب ہوئے ہوں۔ ہاں شیعی کہیں تو اُن سے کچھ دور بھی نہیں۔ اُن کی اور خرافات کو اگر ٹٹولئے تو اس سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ دوسرے اگر تقسیم بھی وقوع میں آتی تب یہ بات تصور میں نہیں آسکتی کہ شرکاء غیر معین میں ایک چیز مشترک ہو۔ غانمین کی تو ایک تعداد معین ہوتی ہے ان کو غنیمت میں شریک کہئے تو زیبا ہے۔ ذی القربیٰ اور یتامیٰ وغیرہ کا کوئی عدد معین کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا اور معلوم بھی ہو تو سب کو اُن کا حق پہنچانا بندوں سے محال ہے۔ مع ہذا اصل زمین کا دینا تو ایک طرف اراضی فئی کی آمدنی بھی تمام ذی القربیٰ اور تمام جہان کے یتامیٰ اور مساکین اور ابن سبیل کو نہیں پہنچی نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے۔ اور اگر ان اصناف اربعہ کو اہل اسلام ہی میں منحصر رکھ کر کلام کیجئے تب بھی شیعوں کا قافیہ تنگ ہی رہے گا۔

اور اگر بالفرض بفرض محال مقصود جناب باری تعالیٰ "فللّٰہ" سے تو یہ ہو کہ مالک حقیقی جناب باری

تعالیٰ ہے اور "فللرسول" سے یہ مطلب ہو کہ مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور "لذی القربیٰ الخ" بیان مصرف کے لیے ہو تو اہل سنت کو سوائے اس کے کہ اس صورت میں خدا کی طرف حرف عائد ہوگا۔ چنانچہ معلوم ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی تسلیم میں کچھ دشواری نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک جو اس صورت میں فقط برائے نام ہی ہوگی۔ اگر بالفرض بطور وراثت وارثوں کی طرف منتقل بھی ہو جائے گی تو استحقاق اصناف باقیہ تو کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں کی طرف منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اصل کا یا آمدنی کا خرچ کرنا ضروری تھا، بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح بدستور رہے گا۔

اور اگر بفرض محال منتقل بھی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اصناف اربعہ کے وارثوں کی طرف منتقل ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں سے کچھ تعلق نہیں۔ سو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا تو لم اُس کی یہی ہے کہ ان کی طلب گاری سے یہی بات ٹپکتی تھی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک کو جو بطور فیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض وتصرف میں آیا تھا مثل اور املاک ہر قسم کے تصرف فیٔ قابل سمجھ کر فقط اپنی گذران کے لیے طلب کرتی تھیں بطور تولیت نہیں مانگتی تھیں ورنہ دعویٰ ہبہ اور دعویٰ میراث کے کیا معنی؟ مع ہذا روایت محجاج السالکین جس کا ترجمہ تو مذکور ہو چکا اور عبارت بھی ان شاء اللہ قریب ہی مذکور ہوگی اس دعویٰ کے لیے دلیل کامل ہے۔ اہل فہم اس روایت سے آپ سمجھ جائیں گے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہ دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا فدک کو اپنے صرف کے لیے طلب فرماتی تھیں ورنہ اگر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بھی اس لیے طلب فرماتیں کہ مصرف مذکور میں صرف کریں تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یوں کیوں عذر کرتے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مصرف میں صرف کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مگر چونکہ اہل حق بعد ظہور حق کے مان لیا کرتے ہیں جب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی فہم مبارک میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بات آ گئی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اسم بامسمیٰ صدیق صادق پایا، یہ گمان خود پہلے سے نہ تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ خورد برد کر لیں گے۔ اس کام کے اپنے سر رکھنے میں خلجان دیکھا تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عذر قبول فرمایا اور ان کا قول مسلم رکھا اور فدک کی آمدنی کے صرف کا انتظام اور اہتمام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے سر ڈالا اور راضی ہو گئیں۔ چنانچہ ناظران روایت مذکور پر مخفی نہ رہے گا۔

اس پر بھی شیعہ نہ مانیں تو اور کیا کہا جائے کہ ان نااہلوں کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے اتباع سے غرض نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عداوت کے لیے اہل بیت کے نام کو آڑ کر رکھا ہے۔

آیت میں لام کے مختلف معنی مراد لینے پر مفاسد

الحاصل اگر بفرض محال "فللّٰہ" سے تو یہ مراد ہو کہ مالک حقیقی خداوند کریم ہے اور "فللرّسول" کا یہ مطلب کہ مالک مجازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور "لذی القربٰی الخ" کے یہ معنی ہوں کہ ان مصارف میں صرف کیا جائے تو اہل سنت کو تو اس کی تسلیم میں کچھ دُشواری نہیں، مالک فدک بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور وراثت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی سہی لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے خرچ کرنے کے داروغہ تھے۔ برضائے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا فدک کی آمدنی کو مصارف معلومہ میں صرف کرتے تھے۔ پر سنیوں کی اس طفل تسلی سے شیعوں کے کیا ہاتھ آئے گا۔ اُلٹا بیس طرح کی خرابیاں اور جوابدہی سردھرنی پڑے گی۔

اوّل تو نعوذ باللہ یہ لازم آئے گا کہ خداوند کریم نے بایں ہمہ عنایت اس تملیک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقرب اور محبوب کے ساتھ وہ معاملہ کیا جیسے کہا کرتے ہیں "گھر بار سب تیرا ہے پر کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا" سبحان اللہ جو بات مخلوق کے حق میں بھی معیوب ہو، وہ شیعوں کو اس صورت میں جناب باری تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنی پڑے گی۔ دوسرے یہ کہ قرآن شریف کے اعجاز کا شہرہ اور بوجہ فصاحت وبلاغت اور خوبی عبارت ومضامین جناب باری تعالیٰ کا یوں دعویٰ کرنا "فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" یعنی ایسی کوئی ایک سورت ہی لے آؤ زیادہ نہیں تو "اِنَّآ اَعْطَيْنٰا" ہی کے برابر سہی۔ اس صورت میں محض بے جا اور بے موقع ہو جائے گا۔ مضمون ایسا کچھ کہ مالک تو کر دیا پر اختیار ذرّہ برابر نہ دیا اور عبارت ایسی کچھ کہ معنی مقصود سے کچھ لگاؤ نہیں۔ اگر اس وجہ سے اس موقع میں یوں کہا جائے کہ "المعنی فی بطن الشاعر" تو بے موقع نہ ہو۔

بلکہ انصاف سے دیکھئے تو خلاف مقصود پر البتہ دلالت موجود ہے قرینہ عطف سے "للرّسول ولذی القربٰی" سے ایک طرح کا استحقاق ثابت ہوتا ہے۔ ہاں اگر کوئی اور قرینہ اس سے اقویٰ اس کے معارض ہو جاتا جیسے "للّٰہ" میں موجود ہے تو کچھ مضائقہ بھی نہ تھا۔ اس لیے سوا اس کے کہ بطور احوال میری زبان پر آ گیا، آج تک کسی نے اس کا یہ مطلب ہی نہ سمجھا اور بایں ہمہ قرآن قرآن مبین بھی رہا۔ تیسرے "للّٰہ" کے لام کو اگر تملیک کے لیے اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ تملیک

وہاں ہوا کرتی ہے جہاں پہلے سے ملک نہ ہو تو یہ مسلم۔ لیکن "للذی القربیٰ الخ" کے لام کے یہ معنی کیوں نہیں؟ ذی القربیٰ وغیرہ تو کچھ ہم پایہ خدا اور شریک موجودات نہیں جو مالک حقیقی اور مالک قدیمی ان کو کہا جائے؟ اور تملیک بمعنی مذکور کے گنجائش نہ ہو۔

چوتھے یہ کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک مثل ملک جملہ بنی آدم ہے اور آپ اس قسم کی ملک کے قابل ہیں تو قرینہ عطف یوں تقاضا کرتا ہے کہ جو بات "لِلرَّسُوْل" کے لام سے ثابت ہو وہی "للذی القربیٰ" کے لام سے ثابت ہو ورنہ ترجیح بلا مرجح ہے اور اگر مثل ملک خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک بھی عوام کی ملک سے ممتاز ہے اور ایک نوع جداگانہ ہے تو ہم یوں کہتے ہیں کہ جیسے باری تعالیٰ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک میں بھی وراثت جاری نہیں ہو سکتی۔

آپ کی ملک میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ زندہ ہیں

اور یہ بات دو وجہ سے قرین قیاس بھی ہے۔ اوّل تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء بالیقین قبر میں زندہ ہیں تو اس صورت میں آپ کی ملک زائل ہونے ہی نہیں پائی جو وارثوں کی ملک اس کے قائم مقام ہو بلکہ جیسے ہم تم کہیں چلے جائیں یا چندے کسی گوشہ میں بیٹھ رہیں اور ہمارے لواحق وغیرہ ہماری اشیاء کو برتیں تو اس سے ہماری ملک زائل نہیں ہوتی اور برتنے والے وارث مالک نہیں ہو جاتے۔ ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی گوشۂ قبر میں پنہاں ہو گئے ہیں اور آپ بدستور اپنی اشیاء اموال کے مالک ہیں، کوئی اور مالک نہیں ہو گیا اور حدیث "لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ" جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس حدیث کی "لِمْ" بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اب تک بقید حیات ہیں۔ پر شیعہ نہ سمجھیں تو کیا کیجئے؟

خدا کی مالکانہ شان آپ کو اتنی مشاہد تھی کہ اپنی ہر چیز کو عاریت یقین کرتے تھے

اور اگر شیعی یا کوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ ہونے کو نہ مانے تو دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیاء خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسبب کمال درجہ کی حقیقت شناسی کے ہر دم و ہر لحظہ خداوند کریم مالک الملک کی ملکیت کو دیکھتے ہیں اور اس کا مالک ہونا ہر وقت ان کے پیش نظر ہے۔ اس لیے اپنی ملک کو ملک ہی نہیں سمجھتے بلکہ جیسے کوئی کسی کے گھر دعوت کھانے جاتا ہے اور اس کے کھانے کو بمنزلہ اور اثاث البیت کھانا کھلانے والے ہی کی مِلک سمجھتا ہے۔ پر خاص اس

کھانے کی نسبت جو اُس کے سامنے رکھا جاتا ہے فقط کھا لینے کی اجازت سمجھتا ہے۔ نہ یہ کہ اپنا سمجھ کر کسی کو دے دے یا بیچ ڈالے یا اپنے لواحق کے لیے لیجائے بلکہ اپنے لیے لیجانا بھی ممنوع جانتا ہے۔ نہیں تو عرف وشرع میں اس بات کو کوئی معیوب نہ سمجھتا۔

ایسا ہی انبیاء بھی ان اشیاء کو جو ان کے قبضہ میں بطور ملک ظاہر کے آجاتی ہیں اپنی مِلک نہیں سمجھتے بلکہ مِلک مالک الملک سمجھ کر بمنزلہ مہمان یا دعویٰ کہ جو کچھ اُس سے کھایا گیا کھایا گیا باقی مالک خانہ کا ہے جو کچھ اپنے کام آیا اپنے کام میں لائے، باقی کو خدا کی مِلک سمجھ کر اس دار دُنیا سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر جب ان کے نزدیک اُن کا ترکہ ان کی چیز ہی نہ ہوئی تو یہ قبض حین حیات اور استعمال بمنزلہ قبض طعام دعوت اور استعمال مال مستعار ہوگا اور ان کے عندیہ میں وارثوں کو اُس میں سے کچھ حق نہ پہنچے گا۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہو: "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ"

ایک شبہ کا ازالہ

اور یہ بات کہ اگر انبیاء کا مقبوضہ ان کی مِلک ہی نہیں تو اُن کی بیع وشرا بھی چاہیے کہ نافذ نہ ہوا کرے، کسی نادان ہی کے دل میں کھٹکے تو کھٹکے؟ کیونکہ جن سے محبت ہوتی ہے بسا اوقات اہل دُنیا بھی اُن کو اس بات کی اجازت دے دیا کرتے ہیں کہ وقت ضرورت ہماری چیز کو بیچ لینا خداوند کریم تو در کنار بلکہ یارانِ بے تکلف تو اجازت کے بھی محتاج نہیں ہوتے۔ دوستوں کی چیز میں اجازت ہی سمجھتے ہیں لیکن اس اجازت کو موجب ملک کوئی نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ اُس کے وارث بھی اُس کے مستحق ہو جائیں۔ الحاصل انبیاء کی حقیقت شناسی اسی بات کو مقتضی ہے کہ اپنے مقبوضہ کی نسبت اپنے آپ کو مالک نہ سمجھیں۔ ہاں اُس کو من جانب اللہ وقف سمجھ کر اور ملک خداوند کریم جان کر حسب ضرورت اپنے کام میں لاتے ہیں۔

باقی رہے عوام اور سوائے انبیاء کے اور لوگ ہر چند کتنے ہی با کمال کیوں نہ ہوں بمنزلہ عوام ہی کے ہیں، سو ان کو انبیاء کے مقابلہ میں بمنزلہ اطفال اور مجانین کے بڑوں بوڑھوں، عقل مندوں کے مقابلہ میں سمجھنا چاہیے، یعنی جیسے اطفال بے تمیز اور مجنونانِ اطفال سیرت دعوت یا غیر کی کسی قسم کی چیز کو اگر اُن کے پلے پڑ جائے، اپنی سمجھ کر اگر مالک بھی اُن سے لینے لگے تو غل مچا دیتے ہیں اور رونے دھونے لگتے ہیں اور مالکانِ سیر چشم چشم پوشی کر کے چپ ہو رہتے ہیں اور اُس کھانے کو انہیں کو لیجانے دیتے ہیں اور اُن اشیاء کو اُنہیں کے پاس چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ایسے ہی عوام بھی اس متاع دُنیا کو جو حقیقت میں ملک مالک الملک۔ مالک حقیقی کی ہے اُن کے پاس مستعار ہے۔ گو

زبان سے خدا کی کہے جائیں پر دل سے اپنی ہی سمجھتے ہیں اور اگر کسی ایک آدمی نے اُس کو دل سے بھی خدا ہی کی سمجھا تو اوّل تو پورا پورا سمجھنا کہاں؟ دوسرے کسی کو کیا معلوم؟ دل کی بات سوا خدا کے کون جانتا ہے؟ جو اُن کے مال میں وراثت جاری نہ کی جاوے۔ مثل نبوت اگر ان کے اندر بھی اس کی کوئی علامت ہوتی تو یوں بھی ہوتا، اس لیے خداوند اکرم الاکرمین نے براہ چشم پوشی اُن کے متروکہ کو انہیں کی ملک قرار دے کر بقدر مناسب اُن کے پس ماندوں کو تقسیم کر دیا۔

القصہ ان وجوہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملک انبیاء برنگ ملک خدا قابل وراثت نہیں اور اگر براہِ تعصب ان وجوہ کو کوئی تعصب سمجھے تو یہ احتمال تو کہیں نہیں جائے گا کہ ملک انبیاء شاید قابل وراثت نہ ہو۔ یہ وجوہ غلط ہیں تو ہوا کریں، شاید کوئی اور ہی وجہ ہو۔ مدعیان وراثت کو جب بھی مشکل ہی رہے گی۔ القصہ "لِلرَّسُوْل" سے ایسی ملک کو ثابت کرنا جو برائے نام ہو، اہل سنت کو تو کچھ معتر نہیں۔ پر شیعی اتنا تو سمجھ لیں کہ کوئی اجنبی ایسی نامعقول باتوں پر کیا کہے گا؟ القصہ اہل دانش و ہم کے نزدیک لام "للرّسول ولذی القربیٰ" سے ملکیت اور استحقاق اصناف مندرجہ آیت مثل لام "للذکر مثل حظ الانثیین" یا لام "لکم رؤس اموالکم" جو پہلا ملکیت اور دوسرا استحقاق پر دلالت کرتا ہے ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا۔

آیت میں لام بیان مصارف کیلئے ہے

ہاں اگر مثل لام "انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ" بیان مصرف کے لیے کہا جائے تو البتہ قرین عقل اور شیعوں کے نزدیک بھی واجب التسلیم معلوم ہوتا ہے کیونکہ اوّل تو اس میں کچھ خرابی نہیں، بے غل و غش عقل اسے مسلم رکھتی ہے اور بوجہ بے عقلی اگر عقل کی بات کے تسلیم کرنے میں شیعوں کو کچھ عذر ہو تو آیت "واعلموا انما غنتم من شیءٍ فان للّٰہ خمسہ" میں جو بعینہا آیت "ما افاء اللّٰہ" کے مطابق ہے۔ اتفاقات سے شیعوں کے نزدیک بھی لام بیان مصرف ہی کے لیے ہے۔ چنانچہ ابوالقاسم صاحب شرائع الاحکام نے جو ملقب بمحقق ہے اور سوا اُس کے اور علماء امامیہ نے اس بات کو بتصریح کہا ہے بلکہ اس مذہب کے اماموں سے بھی بہ سند بیان کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو کوئی کسی چیز کا مصرف ہوتا ہے، اگر مالک مال اُس کو نہ دے تو اہل مصرف اس کے دادخواہ نہیں ہوسکتے۔ بالجملہ اہل مصرف قبل عطاء مالک نہیں ہوتے۔ اس لیے فقراء وغیرہ کو زکوٰۃ اور صدقات کا قبل از عطا کوئی مالک نہیں سمجھتا تو اس صورت میں اس آیت میں بھی لام ملکیت اور استحقاق پر دلالت نہ کرے گا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک وغیرہ اراضی فئی کا تقسیم کرنا

ضروری نہ سمجھا بلکہ آمدنی کو ہمیشہ تقسیم فرماتے رہے۔ اگر لام "للرّسول" وغیرہ ملکیت اور استحقاق پر دلالت کرتے تو قرینہ لفظ "افاء اللّٰہ" کا اس بات کو مقتضی تھا کہ اصل زمین کو بانٹ کر مستحقوں کو حوالہ فرماتے کیونکہ اصل زمین مصداق "ما افاء اللّٰہ" ہوسکتی ہے نہ کہ آمدنی۔ چنانچہ ظاہر ہے۔

اہل شیعہ کا اعتراض کہ ما افاء اللّٰہ کا مقتضیٰ زمین کی تقسیم تھا اور آپ آمدنی تقسیم فرماتے رہے؟

یہاں اگر شاید کسی عقل کے دشمن کو یہ شبہ حیران کرے کہ ہم نے مانا یہاں مصرف سے ملکیت اور استحقاق ثابت نہیں ہوتا تاوقتیکہ اہل مصرف کو کچھ عطا نہ کیا جائے، ان کی ملک میں نہیں آتا لیکن لفظ "ما افاء اللّٰہ" اس بات کو تقاضا کرتا ہے کہ اصناف مندرجہ آیت مصرف اہل زمین ہوں تو اس صورت میں لازم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصل زمین کو تقسیم فرماتے، آمدنی کا تقسیم کرنا بظاہر خلاف آیت ہے۔ سو اس خاکپائے علماء کی گزارش یہ ہے کہ اس قسم کے شبہ کا جواب اہل سنت تو ان شاءاللہ بطور معقول دے نکلیں گے لیکن شیعی اتنا تو سمجھیں کہ یہ اعتراض اہل سنت پر نہیں بلکہ صاحب سنت سرورِ کائنات خلاصۂ موجودات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات والتسلیمات پر ہے۔ سو اس صورت میں اپنے مذہب کی بھی خیر نہیں، ایسے شبہ کا جواب ہماری طرف سے تو وہی شعر مشہور بہت ہے۔

شادم کہ از رقیبان دامن کشاں گذشتی ۔۔۔ گو مشت خاک ماہم برباد رفتہ شد

بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدک کو تقسیم کر کے نہ دینا ہمیں تو ایمان کے لیے کچھ اور افعال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم نہیں۔ ہم تو بے دلیل اس کو صحیح سمجھتے ہیں لیکن درصورت یہ کہ ابوبکر صدیق وغیرہ اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف داری میں ہم کو اتنا بکھیڑا کرنا پڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف داری اور حمایت کیونکر نہ کریں گے۔ اگر شیعوں کو خلفاء کے بغض اور حسد کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اس بات کا طعن ہے کہ آیت سے تو آمدنی کا مصارف مندرجہ آیت میں صرف کرنا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اہل مصرف کا دینا اس آیت سے نکلتا بھی ہے تو اصل زمین کا نکلتا ہے۔ پھر آپ نے اصل زمین ہی کیوں نہ تقسیم فرمائی؟ تا کہ سب نہیں تو کچھ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ پر آتا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا بہ نسبت فدک دعویٰ وراثت صحیح ہو جاتا اور یہ طعن جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر (بوجہ نہ دینے میراث کے) ہم کرتے تھے، حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا پر حسب مزعوم شیعہ پلٹ کر نہ آتا

کیونکہ وہ معصوم تھیں اور معصوم سے یہ بات کہ جو اپنے مورث کی چیز ہی نہ ہو، اس میں دعویٰ وراثت کرے (اس اہتمام سے کہ شیعوں سے سب ہی نے سنا ہوگا) ہرگز تصور میں نہیں آ سکتا۔

اور ایک شے اگر مالک اہل مصرف میں سے کسی ایک کو اس غرض سے عطاء کرے کہ اس قدر اوروں کو دے کر باقی جو بچے اس کو اپنے آپ رکھ لے تو اور دینا لینا تاوقتیکہ جس کو وکیل تقسیم بنایا ہے تقسیم نہ کرے، اُس قدر میں کہ جس قدر بعد تقسیم اس کے پاس باقی رہ جائے گا اس کے لیے موجب ملک نہیں ہوسکتا اور وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ ہبہ اشیائے مشترکہ میں باتفاق فریقین بے قبض موجب ملک نہیں ہوسکتا اور قبض بے تقسیم متصور نہیں تو اس صورت میں یوں بھی نہیں کہہ سکتے کہ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابض تو تھے ہی، اگر اور کوئی اصناف مندرجہ آیت میں سے بایں وجہ مالک نہیں ہوسکتا کہ اہل مصرف قبل عطاء اور قبل قبض مالک نہیں ہوا کرتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سب ہی پر قابض تھے اپنا حصہ بھی اس میں آ گیا۔

بہرحال کوئی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مالک ہونے کی نہیں نکلتی جو دعویٰ وراثت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صحیح ہو۔ بالجملہ ان مقامات میں تصدق اور انفاق ہے اور موصوف بصدق اور انفاق (یعنی اموال) کا لحاظ شیعوں کے اطوار سے یوں ٹپکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تقسیم نہ کرنے میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دو وجہ سے حرف ہو۔ ایک تو یہ کہ بظاہر خلاف آیت کیا۔ دوسرے اس تقسیم نہ کرنے کی بدولت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی معصومیت بالکل ہی تھامنی مشکل پڑ گئی۔ اس لیے ہمیں بھی اپنا مافی الضمیر ضرور عرض کرنا پڑا تا کہ بسبب طرف داریٔ جناب رسالت مآب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دامانِ رحمت خداوندی میں ہمیں بھی جگہ ملے اور شیعی جواب دندان شکن سن کر اپنے کردار کو پہنچیں۔

اعتراض کا جواب کہ اموال فئی وقف ہیں نہ کہ ملکیت

جناب من شیعوں کا ایسے مقامات میں لڑنا (قطع نظر اس کے کہ اہل سنت پر کیا اعتراض کرتے ہیں، اپنے مذہب پر کرتے ہیں) اس مثل مشہور کا مصداق ہو جاتا ہے۔ ع...... "سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست" کیونکہ "ما افاء اللّٰہ الخ" جملہ اسمیہ ہے اور جملہ اسمیہ کلام بلغاء اور فصحاء میں موجب دوام وثبوت ہوتا ہے اور کوئی بشر بمقتضائے بشریت اس قاعدہ کی رعایت میں چوک جائے تو چوک جائے۔ خداوند علیم چوک نہیں سکتا، مگر اس صورت میں لازم ہے کہ "اللّٰہ" اور "للرّسول" اور "لذی القربیٰ" ہونے کی صفت "ما افاء اللّٰہ" سے زائل اور منفک نہ ہو اور بایں صفت موصوف ہونے سے

اس کی ذات میں کچھ انکار نہ ہو، سو یہ بات جبھی بن پڑتی ہے کہ اموال فئی کو، چنانچہ مرقوم ہو چکا وقف کہا جائے کیونکہ وقف کو "دائما للّٰہ" بھی کہہ سکتے ہیں اور اہل مصرف کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔

فئی اور صدقات کا ایک لطیف فرق

باقی رہا جملہ "انما الصدقات للفقراء الخ" ہر چند وہ بھی جملہ اسمیہ ہی ہے لیکن اہل دانش و فہم پر مخفی نہ ہوگا کہ صدقہ ہونا کسی چیز کا خود ایک آنی بات ہے یعنی کبھی آنِ واحد کے لیے اس صفت کو اپنے موصوف سے ارتباط پیدا ہوتا ہے اور پھر مثل حرکات کہ سریع الزوال ہوتی ہیں، اپنے موصوف سے جدا ہو جاتی ہیں کیونکہ اس صفت کے وجود کے یہی معنی ہیں کہ قدر مقرر اس کی کسی کو دیدیجئے ورنہ قبل دینے کے صدقہ نہیں۔ والا تمام احکام صدقات مثل اداء فرض اور حصول ثواب اور اطفاء غضب رب وغیرہ بے دیئے اس پر مرتب ہوا کریں اور جب دے چکے جب ہی وہ صفت صدقہ ہونے کی اس سے زائل ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی محتاج فقیر مسکین مال زکوۃ کسی اہل نصاب سے لے کر اپنی طرف سے کسی غنی یا ہاشمی وغیرہ کو دینے لگے تو کچھ ممنوع نہیں۔ بالجملہ صدقہ ہونے کی صفت کا وقت فقط عطاً اور قبض ہی ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ ایک آن کی بات ہے۔ سو اُس آن تک اس کا "للفقراء" ہونا کہیں نہیں گیا۔ بعد میں اگر فقراء وغیرہ اُس کو کسی کو ہبہ کر دیں یا بیچ ڈالیں تو وہ صدقہ ہی نہیں جو پھر بھی فقراء کا استحقاق باقی رہے۔

القصہ یہ قضیہ بھی دوام ہی پر دلالت کرتا ہے اور اُس کے دائمہ ہونے سے ہمیں کیا انکار ہے، پر اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ دوام کے یہ معنی ہیں کہ محمول وقت وجود موضوع حقیقی تک اس کے ساتھ مربوط رہے مگر موضوع حقیقی کا پہچاننا ہر کسی کا کام نہیں۔ ان باتوں کے لیے حقائق شناس معانی سنج چاہیے جس کو خداوند علیم اس قدر بصیرت عنایت فرمائے کہ مناطِ حکم اور مدار ارتباطِ موضوع و محمول اور سیاق کلام کو دریافت کر سکے۔ اُس کا یہ کام ہے۔ سو جملہ "ما افاء اللّٰہ" میں موضوع حقیقی مصداق مَا ہے اور اس سے مراد خود اراضی فئی ہیں اور صفت افاءۃ فقط تعیین اور تفہیم اور رفع ابہام کے لیے ہے۔ اس لیے "للّٰہ" وغیرہ ہونا جو مضمون خبر ہے اُس کی ذات کے ساتھ دائم رہے گا اور موافق اصطلاح اہل منطق یہ قضیہ دائمہ ہوگا۔

اور جملہ "انما الصدقات" وغیرہ میں موضوع حقیقی صفت تصدق ہے ذات اموال نہیں۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ یہ جملے اگرچہ خبریہ ہیں اہل فہم کے نزدیک انشائیہ ہیں۔ مطمح نظر ان مقامات میں تصدق اور انفاق ہے اور موصوف بتصدق اور انفاق (یعنی اموال کا لحاظ) فقط اس لیے ہے کہ یہ صفت

بغیر اس موصوف کے متحقق نہیں ہوسکتی۔ سو اس جملہ میں دوام محمول تا دوام وصفِ تصدق چاہیے اور موافق اصطلاح اہلِ منطق اس کو عرفیہ عامہ سمجھئے اور قضیہ "ما افاء اللہ" اگرچہ انشائیہ ہے پر اس قضیہ میں صفت افاءۃ مطمحِ نظر نہیں ورنہ جیسے جملہ "انما الصّدقات" یا جملہ "ما انفقتم" کا ماحصل "تصدّقوا" اور "انفقوا" ہے اس جملہ کا خلاصہ "افیئوا" ہوتا۔ اس تقریر کو سن کر اہل فہم کو تامل نہ رہے گا کہ فعل جناب سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات میں مطابق آیت ہے۔

معصوم سے خطاء سرزد ہونا محال نہیں

باقی رہا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا معصوم ہو کر ایسی غلطی کرنا سو اوّل تو اہل سنت کے نزدیک سوائے انبیاء کسی کی معصومیت مسلم ہی نہیں۔ دوسرے کسی مقدمۂ خاص میں معصوم سے غلطی فہم ہونا اور غیر معصوم سے نہ ہونا کچھ محال نہیں۔ چنانچہ مضامین متعلقہ آیت محمد رسول اللہ کی تفسیر میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے اور بیسیوں نظیریں اس کی کلام اللہ اور احادیث میں موجود ہیں۔ من جملہ اس کے کھیتی کے قضیہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا غلطی کھانا حالانکہ نبی ہو چکے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حق بات کا سمجھ جانا حالانکہ جب تک نہ نبی ہوئے تھے نہ موافق اصطلاح شیعہ امام تھے، اس دعویٰ کے لیے دلیل کافی ہے مگر شیعوں کو کلام اللہ یاد نہ ہو یا معنی "فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ" کا فہم نہ ہو تو اہل سنت کا کیا قصور؟ اس جگہ سے ہر کوئی سمجھ گیا ہوگا کہ شیعوں کا اہل سنت پر یہ طعن کرنا کہ وہ ایسے اماموں کی تقلید اور اتباع کرتے ہیں جو انہیں کے اقرار موافق غلطی کر سکتے ہیں۔ ایسا ہی ہے جیسا اندھا آفتاب کو بے نور بتلائے اور جیسے اندھا آفتاب کو بے نور نہیں کہتا اپنی آنکھوں کو بے نور کہتا ہے، شیعی بھی اہل سنت کا قصور نہیں بتلاتے اپنی عقل کے قصور کی گواہی دیتے ہیں۔

اموال فئی آپ کی ملک نہ تھے اس کی تیسری دلیل

اب تیسری دلیل بھی اس احتمال کے بطلان کی کہ اموال فئی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھے اور یہ مصارف معلومہ کا مقرر کرنا ایسا ہی ہے جیسا زکوۃ کے لیے فقراء و مساکین وغیرہ کا مصرف بنا دینا، پھر دلیل بھی ایسی کچھ کہ احتمال مذکور تو باطل ہو ہی جائے یہ شبہ بھی مرتفع ہو جائے کہ "ما افاء اللہ" تو تقسیم اصل زمین کو مقتضی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل کی جائے آمدنی کو کیوں تقسیم کیا؟ صورت اس کی یہ ہے کہ زمین باغ کی آمدنی بھی اثمار اور کھیتی کی پیداوار ہے لیکن بسبب اس کے کہ پھل اور کھیتی اشجار اور زمین کے توابع اور لوازم میں سے ہیں تو پھل کے توڑنے سے پہلے مجموعۂ

درخت اور پھل کو درخت اور کھیتی کاٹنے سے اوّل کھیتی سمیت زمین کو زمین کہا کرتے ہیں، اس وجہ سے آمدنی بھی "ما افاء اللہ" ہی میں داخل ہے لیکن جیسے کھیتی میں جو مجموعۂ اناج اور بھس کا ہوتا ہے آدمی اور گائے بیل حسب لیاقت شریک ہیں۔ اناج آدمیوں کے لیے اور بھس گائے بیل کے لیے تو ایسے ہی اس شرکت خدا اور بندگانِ خدا میں بھی جو "فللّٰہ وللرّسول ولذی القربٰی الخ" میں مذکور ہے خدائے تعالیٰ اور بندگانِ خدائے تعالیٰ کو حسب لیاقت وقابلیت شریک سمجھنا چاہیے۔

مصارف مندرجہ آیت کی تعیین واستحقاق کی باریک حکمت

لیکن خداوند کریم خورد ونوش سے غنی ہے اور بندے خورد ونوش اور نان ونفقہ کے محتاج۔ یہاں تک کہ اُن کے شریک کرنے کی وجہ بھی اُن کی احتیاج ہوئی ہے۔ چنانچہ لفظ فقراء اور مساکین میں اہل فہم کے لیے اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اسی لیے کہ فقیر اور مسکین تو وہی ہوتا ہے جس کے یہاں قوت یعنی رزق نان نفقہ کی کوتاہی اور کمی ہو۔ چنانچہ زبان دانانِ عربی اور واقفانِ اقوال علماء فقہ پر مخفی نہ ہوگا بلکہ لفظ رسول بھی اگر غور سے دیکھیے تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاج اور فقر پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے اس لفظ سے بے تامل ہر کوئی یوں سمجھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مایحتاج کے بہم پہنچانے کی فرصت نہ ملتی تھی کیونکہ جب آپ پیغام رسانِ خداوندی اور قاصد جناب باری ٹھہرے تو تاوقتیکہ آپ اس مشغلہ میں مشغول رہیں اور کار کی فرصت کہاں بلکہ مثل قاصدانِ پیغام رسانانِ دُنیاوی کہ تاوقتیکہ پیغام پہنچا کر اپنے گھر پر نہیں پہنچ لیتے۔ اپنے کاروبار نہیں سنبھال سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تاوقتیکہ پیغامِ خداوندی سے فارغ نہ ہولیں۔ اپنے کاروبار کی طرف متوجہ نہ ہوسکتے تھے مگر جب فارغ ہولئے تو وطن اصلی کو تشریف لے گئے۔ اس وطن کے کاروبار ہی نہ رہے جو بطور خود کچھ کھانے پینے کا فکر کرتے۔

مصارف فئی کی ترتیب لفظی کی حکیمانہ تشریح

غرض بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سروسامانی خود اس لفظ رسول ہی سے ظاہر ہے۔ اتنا فرق ہے کہ اور اصناف مندرجہ آیت کی بے سروسامانی کسی وجہ دُنیاوی کے باعث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سروسامانی بہ سبب مشغولی کارِ خداوندی ہو۔ اِسی لیے آپ کو مقدم رکھا۔ غرض ان الفاظ سے خود اہل فہم پر واضح ہے کہ خداوند کریم نے جو ان اصناف کو اموال فئی میں شریک کیا ہے تو بوجہ احتیاج اصناف مذکورہ شریک کیا ہے تو اس صورت میں شرکت اور تقسیم حسب لیاقت یوں ہوسکتی ہے کہ

مجموعۂ اشجار و اثمار اور مجموعۂ زمین اور پیداوار میں جو بہیئت مجموعی عرف میں اور دیکھنے میں ایک شئے واحد گنی جاتی ہے اور ایک نظر آتی ہے اور مجموعہ کو "ما افاء اللّٰہ" کہہ سکتے ہیں، ملکیت جو ملزوم غنیٰ ہے خدا کے لیے رہے اور پیداوار جو رفع احتیاج کے لیے ہے بندوں کے واسطے تجویز کی جائے۔

اب دیکھئے کہ اس تقریر سے وہ احتمال بھی باطل ہو گیا کہ مال فئی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور مصرف بطور مصرف زکوٰۃ ہو اور وہ شبہ بھی مرتفع ہو گیا کہ چاہیے تھا اصل زمین کا تقسیم کرنا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تو تقسیم نہ کیا اور آمدنی کو تقسیم فرمایا۔

اموال فئی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک نہ ہونے کی چوتھی دلیل

اب چوتھی دلیل کے سننے کے لیے بھی تیار ہونا چاہیے تاکہ کثرت دلائل کے زور سے احتمال مذکور دل سے بالکل محو ہو جائے۔ جناب من خبر پر فاء کے داخل ہونے کے قرینہ سے اور نیز بشہادت وجدان صاف ظاہر ہے کہ مبتداء یعنی "ما افاء اللّٰہ" متضمن معنی شرط ہے تو اس صورت میں "لِلّٰہ" وغیرہ ہونے کا ترتب اور توقف افاءۃ اور تسلیط پر ضروری ہے اور درصورت یہ کہ اراضی فئی کو مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیئے تو یہ ترتب اور توقف تو درکنار وجود خبر بھی اپنی ذات سے ضروری نہ ہوگا۔ گو بوجہ معصومیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اُمور میں جن کے آپ مامور تھے، تصور ممکن نہ ہو، ہاں اگر مصرف کہیئے تو پھر یہ ترتب اور توقف اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ توجیہات ذکر اللہ سے جو مذکور ہو چکی ہیں آپ عیاں ہے۔

مع ہذا اگر مقصود شارع یہی ہوتا کہ اراضی فئی مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور "لِلّٰہ" اور "للذی القربٰی" بایں غرض فرمایا ہے کہ خدا کے واسطے ذی القربیٰ وغیرہ کو دینا چاہیے تو لاجرم "فللرّسول وللّٰہ ولذی القربٰی الخ" فرماتے۔ اس صورت میں گو یہ آیت مصداق "المعنی فی بطن الشاعر" تو رہتی لیکن بلا سے یہ ترتب اور توقف تو جو مدلول فاء ہے درست ہو جاتا اور معنی گو کسی کی سمجھ میں نہ آتے فی حد ذاتہ تو صحیح ہو جاتے۔ فصاحت و بلاغت بلکہ باعتبار قواعد زبان دانی صحت عبارت بھی نہ سہی لیکن اتنی غلطی تو نہ ہوتی کہ عبارت برعکس معنی مقصود دلالت کرے۔

اموال فئی کے غیر مملوکہ ہونے کی پانچویں دلیل

پانچویں وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ ضمیر "کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً" بجانب "ما افاء اللّٰہ" راجع ہے اور "کیلا یکون علۃ" تعین مصرف مذکور ہے۔ سو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے

کہ یہ مصرف اس اندیشہ کے لیے مقرر کیا گیا ہے کہ مبادا اراضی فئی تحت تصرف اغنیاء آ جائیں مگر اس اندیشہ سے جب ہی تک بچاؤ ہو سکتا ہے کہ اراضی فئی کو مد و خرچ اصناف معلومہ کہا جائے ورنہ اگر مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا مملوک کس دیگر ہوں تو ایک نہ ایک روز یہ خرابی بالضرور پیش آئے گی۔ اصناف مندرجہ آیت اگر خود اغنیاء نہیں تو خداوند بے نیاز کی بھی عادت یہ ہے کہ دولت و فقر کو فقط ایک ہی خاندان میں دائم و قائم نہیں رہنے دیتا۔ بسا اوقات اولاد اغنیاء فقیر اور پس ماندگان فقراء امیر ہو جاتے ہیں۔ سو بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پس از انتقال ذوی القربیٰ وغیرہم اگر حسب مزعوم شیعہ اراضی فئی میں وراثت جاری ہو گی تو بیشک اس سلسلہ میں میراث میں بہت سے اغنیاء بھی نکلیں گے اور وہ خرابی جس کے بچاؤ کے لیے یہ مصرف مقرر کیا تھا بحالِ خود رہے گی۔

اور یوں کہنا کہ اغنیاء سے مراد فقط حکام یا اغنیائے لشکر ہی ہیں محض تعصب ہے۔ لفظ عام سے بے قرینہ معنی خاص مراد لے لینا عوام کا بھی کام نہیں۔ چہ جائیکہ علماء جو خواص اُمت ہیں، ہاں اگر قطع طمع اغنیاء لشکر افسران فوج کے لیے یہ آیت نازل ہوئی ہو، یا حکام جاہلیت اس قسم کی اراضی کو خاص اپنے لیے رکھتے ہوں اور اس قانونِ نامعقول کے موقوف کرنے کے لیے یہ مصرف مقرر فرمایا ہو تو درصورت فرضِ وقوعِ امورِ مذکورہ بیش برین نیست کہ حکم عام کے لیے شان نزول خاص ہو۔ سو یہ بات کچھ اسی جگہ خاص نہیں۔ بیسیوں آیات اور سینکڑوں احادیث کی شانِ نزول خاص اور حکم عام ہے اور اس کا عموم بالعموم مسلم ہے۔ خاص کر کتب علم اُصول میں بتصریح صحت و امکان خصوص شان اور عموم احکام مذکور ہے۔

اموال فئی کے غیر مملوکہ ہونے کی چھٹی دلیل

چھٹی وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ اراضی فئی کے لیے جن اشخاص اور اصناف کو مقرر فرمایا ہے تو اُن کو اُن کے اوصاف سے تعبیر فرمایا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بصفت رسول اس جگہ ذکر فرمایا اور یتامیٰ اور مساکین اور ابن سبیل کو بوصف یتیم اور مسکنہ اور مسافرت یاد فرمایا اور ان کے حسب و نسب وغیرہ تشخصات اور تعینات کو ذکر نہ کیا اور پھر اس کے بعد "للفقراء المهاجرين الخ" اور "والذين تَبَوَّؤُا الدّار الخ" اور "والذين جاء و امن بعدهم الخ" کو "لذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل" سے بدل ہے ماقبل کا ضمیمہ کیا۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان اوصاف کو اراضی فئی کے مصرف ہونے میں دخل اور اُن اراضی کا مصرف ہونا ان اوصاف پر موقوف ہے اور چونکہ زمین باغ ملک، مثل منافع اکل و شرب مثل روٹی پانی وغیرہ جن سے انتفاع ان کے ہلاک ہونے پر موقوف ہے نہیں ہیں بلکہ وقت انتفاع بدستور

ل قدیم قائم رہتے ہیں تو "دائما الی یوم القیمة" اراضی فئی سے انتفاع انہیں اشخاص کو جائز
ہ جو موصوف باوصاف مذکورہ ہوں ورنہ دوام وثبوت جو مدلول جملہ اسمیہ ہے باطل ہو جائے گا۔
مگر یہ بات جب ہی بن پڑتی ہے کہ اراضی کو بمعنی وقف کہا جائے اور مصارف مذکورہ میں اصل
زمین کو تقسیم نہ کریں اور اصناف مندرجہ کو اس کا مالک نہ کردیں ورنہ بالفعل نہیں تو بعد انتقال مالکان
ول یا بعد بیع وشراء کے غیر مصرف میں اس کا صرف ہونا لازم آئے گا اور لحاظ اوصاف ہی کی وجہ سے
معلوم ہوتا ہے کہ محققین کے نزدیک اس زمانہ کے خمس اور فئی سے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
ت کے خمس اور فئے میں سے بھی سہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساقط ہو گیا۔ بعد وفات رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم وصفِ رسالت مثل اوصاف مسکنت اور مسافرت وغیرہ کسی میں باقی نہیں رہا۔
باقی رہی زکوٰۃ اور صدقات واجبہ ان کے مصرف ہونے کے لیے بھی تحقیق اوصاف فقر و مسکنت
وغیرہا جس کی طرف آیت "انما الصّدقات" مشیر ہے، ضروری ہے مگر چونکہ وصف تصدق کو بجز
آنِ واحد قیام نہیں، چنانچہ ابھی مرقوم ہوا ہے تو وقت تصدق تحقیق اور وجود اوصاف معلومہ ضروری
ہوا کیونکہ فقراء وغیر ہم کو آیت "انما الصّدقات" میں فقط اُن اموال کا مصرف مقرر کیا ہے جو
موصوف بصدقہ ہوں۔ اس لیے بلفظ صدقات تعبیر فرمایا اور اگر قطع نظر اس وصف کے فقراء وغیر ہم کو
نفس مال کا مصرف مقرر فرماتے تو مثل "انما المخرج من الاموال بنية الصدقة" یا سوا اس
کے اور کوئی ایسی عبارت جس سے مطلق مال کے لیے فقراء وغیر ہم کا مصرف ہونا ثابت ہونا بیان
فرماتے۔ الحاصل آیت "انما الصدقات" میں اُسناد کو دونوں طرف میں اوصاف ہی سے ارتباط
ہے اور آیت "ما افاء اللّٰه" میں ایک طرف ذات اور دوسری طرف اوصاف ہیں، اس لیے زکوٰۃ
میں دونوں اوصاف کو اور فئے میں فقط ایک جانب میں اوصاف کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اموال فئے کے غیر مملوک ہونے کی ساتویں دلیل

ساتویں وجہ احتمال مذکور کے بطلان کی یہ ہے کہ مالک حقیقی تمام مخلوقات اور موجودات کا
بالاتفاق اور بالبداہت مالک الملک خداوند کریم ہے اور باوجود اس کے پھر ہمارا تمہارا مالک ہونا
ایک معنی مجازی ہیں جیسے کوئی شخص اپنے چند مکان چند آدمیوں کو مستعار یا کرایہ پر رہنے کو دے اور
وہ چند اشخاص اپنے اپنے رہنے کے مکان کو محاورۃً اپنا گھر کہہ دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ سب جانتے
ہیں۔ ایسے ہی ہمیں بھی مالک حقیقی نے ہماری اشیاء مقبوضہ کو انتفاع کے لیے دے رکھی ہیں اور ہم
اُن کو اپنے محاورات میں اپنا کہنے لگے ہیں لیکن جیسے مکانات کا مستعیر یا کرایہ دار ہونا عاریۃً لینے

اور کرایہ لینے پر منحصر اور موقوف ہے۔ فقط مالک مکان کی ملکیت کفایت نہیں کرتی بلکہ اگر عقد کرایہ اور عاریت ظہور میں نہ آئے تو پھر مالک اصلی ہی کی طرف آرہے گی۔ ایسے ہی ہمارے مالک ہونے کے لیے بھی اسباب تملیک ظاہری مثل بیع وشراء، ہبہ وصیت وغیر ہا ضروری ہوئے ورنہ تمام موجودات پھر خدا ہی کی طرف مملوک ہونے میں منسوب رہیں گے۔

مگر چونکہ اموال فئے مشار الیہا بلفظ "ما افاء اللّٰہ" میں ان اسباب میں سے فقط غنیمت ہونے کا توہم ہوسکتا تھا اور اس کو جناب باری نے "فما او جفتم" سے دفع کر دیا تو یہ اموال سوائے خداوند کریم مالک الملک کے اور کسی کی طرف بطور ملکیت منسوب نہیں ہو سکتے۔ پھر اس صورت میں "للرّسول ولذی القربیٰ" کے معنی بجز بیانِ مصرف اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ سو یہی ہمارا مطلب تھا بالجملہ ان سات وجوہ سے اراضی فئے کا مد وخرچ بیچ اقسام معلومہ ہونا مثل مدلولات حواس ہر کس وناکس پر واضح اور لائح ہوگیا اور باوجود مد وخرچ ہونے کے وجہ طلب کرنے (حضرت خیر النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کی اوّل تو یہ ہے کہ جناب سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا معصوم نہیں اور معصوم بھی ہوں تو معصوم سے غلط فہمی محال نہیں۔

چنانچہ معلوم ہو چکا اور وجہ غلط فہمی کی یہاں ظاہر بھی ہے کیونکہ جناب سیدۃ النساء فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے ہمیشہ اراضی فئے پر قبض وتصرف حضرت خلاصۂ موجودات سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات والتسلیمات کا دیکھا تھا اور اس بات کی تحقیق کہ یہ از قسم غنیمت ہے یا از جنس فئی ہے۔ زنان خانہ نشین اور وہ بھی ایسی زاہدہ کہ سامان دُنیا ومافیہا سے کچھ غرض نہ ہو، بہت دُشوار ہے۔ خاص کر خیبر اور قریٰ خیبر کی نسبت کہ فدک بھی انہیں میں سے ہے۔

کیونکہ بعض قریٰ خیبر عنوۃً یعنی جنگ وجدال اور بعضے قریٰ جیسے فدک صلحاً مفتوح ہوئے ہیں۔ اس لیے بہ نسبت خاص خیبر کے مابین علماء اختلاف بھی ہے کہ آیا خیبر عنوۃً فتح ہوا ہے یا صلحاً اراضی فئے کا مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا اہل انصاف پر روشن ہوگیا۔ اگر چہ اہل فہم کو پہلے بھی اس میں تامل نہ تھا کیونکہ باوجود یقین مصارفِ معلومہ اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مملوک ہونے کی کوئی صورت بھی تھی تو یہی تھی کہ اُن اوصاف کا مقرر فرمانا ایسا ہو جیسا کہ زکوٰۃ اموال مملوکہ اغنیاء کے لیے فقراء وغیرہم کا مقرر کرنا۔ سو یہ باگ گونی حد ذاتہ ممکن تھی لیکن قرینہ عطف "للرّسول" اور "لذی القربیٰ" اس بات کو مقتضی تھا کہ جیسے ذوی القربیٰ وغیرہم بالاتفاق مالک اراضی فئے نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مالک نہیں۔

ذوی القربیٰ کو اگر فئے کا مالک مانیں تو دو خرابیاں موجود ہیں

اور اگر قطع نظر اتفاق اُمت کے ذوی القربیٰ وغیرہم کو مالک کہا جائے تو بہت سے بہت ہوگا تو اراضی فئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصناف باقیہ میں مشترک ہوں لیکن دو خرابیاں اور موجود ہیں۔ایک تو شرکاء غیر محدود کا شریک ہونا کیونکہ ذوی القربیٰ وغیرہم کا کوئی حد و پایاں نہیں۔ ہر روز کمی وبیشی رہتی ہے۔خاص کر "والذین جاؤا من بعدھم" نے تو دائرہ اہل مصرف کو اتنا فراخ کر دیا ہے کہ قیامت تک کے مومنین کو گھیر لیا ہے۔ دوسرے قبل عطاء مال غنیمت بلکہ دین بھی ملک میں نہیں آ سکتا۔اراضی فئے جو کسی طرح اس کے حصول میں اہل مصرف کی سعی و کوشش یا کسی کے فعل کو دخل نہیں۔محض فضل خداوندی سے ہاتھ لگ گیا ہے کیونکہ قبل عطاء اور قبل قبض کسی کا مملوک ہو سکے۔

الحاصل اہل عقل پر بادی النظر میں اس عبارت سے اراضی فئے کا غیر مملوک ہونا عیاں تھا اور اب سب پر واضح ہو گیا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا کہ جیسے اس آیت سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے۔امکان ملکیت بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا محال ہونا ثابت ہوتا ہے اور اسی لیے مجھ کو بھی اتنی تطویل کی ضرورت پڑی ورنہ عدم ثبوت ملکیت خود ظاہر تھا۔البتہ بایں نظر کہ کم فہموں سے مقابلہ ہے۔عدم ثبوت ملکیت میں گفتگو کرنی ضروری تھی۔

مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ سے دعوائے وقف پر اشکال

مگر اتنی بات باقی رہی کہ لفظ ما "افاء اللّٰہ" عام ہے اشیاء منقولہ وغیر منقولہ کو برابر شامل ہے۔ پس اگر ما افاء اللہ بوجوہ مذکورہ وقف ہے تو لا جرم اسباب منقولہ بھی وقف ہوں گے۔سو اس صورت میں دو خرابیاں لازم آئیں گی۔ اوّل تو یہ کہ حنفیوں کے نزدیک اشیاء منقولہ کا وقف ہونا ہی صحیح نہیں۔دوسرے یہ کہ اموال فئے میں سے بہ نسبت اموال منقولہ کے وقف ہونا کسی سے منقول اور مروی نہیں بلکہ اگر تعامل سلف و خلف پر نظر کیجئے تو عیاں ہے کہ من جملہ اموال فئے اسباب منقولہ میں تصرفات مالکانہ کرتے تھے۔ بیع و شراء وغیرہ آثار ملکیت جو وقف نہ ہونے پر دلیل کامل ہیں، برابر بے تکرار اور انکار مروج رہے ہیں۔ چنانچہ بنی النضیر کے ہتھیار وغیرہ اموال منقولہ جو ہاتھ آئے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تقسیم فرما دیئے تھے اور صراحۃً نہ کنایۃً یوں نہ فرمایا کہ یہ اشیاء وقف ہیں۔ان میں تصرفات مالکانہ مت **کیجیو**۔

اور یہ بھی نہ سہی کلام اللہ سے زیادہ تو کوئی حجت نہیں، کلام اللہ میں خود موجود ہے "ما ملکت

یمینک مما افاء اللہ علیک" مطلب یہ ہے کہ "اے نبی ہم نے حلال کیں تیرے لیے وہ باندیاں جن کا تو مالک ہوا ہے اموال فئے میں سے" اس آیت سے صریح ثابت ہے کہ فئے کے غلام باندی مملوک ہو سکتے ہیں وقف نہ تھے۔ جب ایک چیز کا بھی اموال فئے میں سے مملوک ہونا ثابت ہوا تو "فللہ" وغیرہ الفاظ آیت "ما افاء اللہ" اور الفاظ سیاق وسباق آیت مذکورہ کے اور جن کے وسیلہ سے وقف ہونا اراضی فئے کا ثابت کیا گیا ہے وہ معنی نہ ہوں گے جو وقف ہونے پر دلالت کریں اور نہ کلیتہً قضیہ "ما افاء اللہ" اس بات کو مقتضی ہے کہ تمام افراد ماافاء اللہ کا ایک حکم ہو۔ خواہ اسباب منقولہ ہوں خواہ غیر منقولہ وقف ہوں تو دونوں ہوں، وقف نہ ہوں تب دونوں نہ ہوں۔

اشکال مذکور کا جواب

اس لیے ہمیں بھی اس خلجان کو رفع کرنا ضرور پڑا۔ سو اہل انصاف کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ واقعی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اشیاء منقولہ وقف نہیں ہو سکتی لیکن خداوند کریم وعلیم وحکیم کچھ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مقلد نہیں جو اس کے ذمہ اتباع رائے ابوحنیفہ ضروری ہو اور اگر اتفاقات سے کوئی بات بظاہر خلاف مذہب حنفی صادر ہو جائے تو اس کی جواب دہی اُس کے ذمہ پر لازم ہو۔ بیش بریں نیست کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے خطا ہوئی ہو لیکن شیعی ہی یہ فرمائیں کہ اہل سنت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو معصوم ہی کب سمجھتے ہیں جو یہ خرابی اُن کے سر پڑے بلکہ اہل سنت کا یہ مقولہ ضرب المثل ہو گیا ہے۔ "المجتھد یخطی و یصیب" یعنی مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صحیح کہتا ہے۔ ہاں اتنی بات مسلم کہ مرتبہ اجتہاد کو یہ لازم ہے کہ اکثر صحیح کہا کرے۔ سو اس بات میں ان سے غلطی ہو گئی ہو تو کیا حرج ہے؟

ان کے صاحبین وغیرہ کی رائے تو آخر یہی ہے کہ اشیاء منقولہ بھی وقف ہو سکتی ہیں وہ بھی اہل سنت ہی کے پیشوا ہیں، شیعوں کے نہیں اور اگر شیعی ان کو اپنا پیشوا بنالیں اور طوسی ورضی شریف مرتضیٰ و ابوالقاسم محقق وغیرہم کا اتباع چھوڑ دیں تو زہے نصیب اُن کے۔ پھر کچھ تکرار نہیں۔ مع ہذا یہ آیت کچھ معارض اور مناقض رائے ابوحنیفہ رحمہ اللہ نہیں بلکہ موافق ہی ہو تو کچھ عجب نہیں۔ اگر اس معما کی شرح مطلوب ہے تو کان دھر کر سنئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف مد نظر ہو اور میری ہیچمدانی پر نظر نہ ہو، ماسبق اس آیت کا "ھو الذی اخرج الذین کفروا" سے لے کر "لیخزی الفاسقین" تک اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ما افاء اللہ سے مراد فقط مکانات سکنیٰ اور اراضی صحرائی ہیں تو اب اس صورت میں بجز اموال غیر منقولہ اراضی وباغات ما افاء اللہ سے مراد نہ ہوں گے اور باعتبار خصوص ماسبق کے لفظ ما کا باوجود عموم ذاتی کے مخصوص ہو جانا ایسا شائع وذائع ہے کہ ہر ادنیٰ واعلیٰ جانتے ہیں۔

اطفال کافیہ خوان بھی سمجھتے ہیں کہ "الاسم مادل علٰے معنًی" میں ما سے مراد کلمہ ہے۔ اس لیے مولانا جامی شرح ملا میں کلمہ ما کی شرح میں کلمہ ہی لکھتے ہیں۔ القصہ ما افاء اللّٰہ سے علی العموم اموال منقولہ غیر منقولہ سب مراد نہیں فقط اموال غیر منقولہ مراد ہیں۔ چنانچہ جملہ "کَیْ لا یکون دولۃً" بھی اسی طرف فی الجملہ کھینچتا ہے۔ اس لیے کہ تداول اور دولت کے تو یہ معنی ہیں کہ ایک شئی بحال خود باقی رہے اور بایں ہمہ کسی کسی کے پاس منتقل ہوتی رہے۔ سو یہ بات بجز اموال غیر منقولہ اور کسی میں بطور کمال متصور نہیں۔ اقسام غذا اور اقسام لباس اور اقسام مرکب سب کے سب بسبب استعمال فناء ہو جاتے ہیں یا فنا ہونے لگتے ہیں۔ اگر چندے کوئی چیز قائم رہی تو کیا قائم رہی؟ یوں تو کچھ نہ کچھ سب اشیاء کو قیام ہے روٹی سالن بھی تھوڑی دیر تو ٹھہرے ہی رہتے ہیں خاص کر اس جگہ اتنے قیام سے کیا کام چلتا ہے۔ یہاں تو بشہادت "والذین جاؤا من بعدھم" قیامت تک کا حساب کتاب ہے۔ بہرحال ما افاء اللّٰہ میں اموال غیر منقولہ داخل ہی نہیں جو اعتراض معترض واقع ہو اور ہمیں فکر جواب دہی ہو۔

وقف کا معنی کیا ہے اور وقف کے قابل کونسی چیزیں ہیں؟

ہاں اتنی بات البتہ قابل لحاظ ہے کہ ہم نے مانا اموال منقولہ ما افاء اللّٰہ میں داخل ہی نہیں لیکن اموال منقولہ کا جو بطور فئے حاصل ہوتے ہیں کیا حکم ہے؟ مثل اموال غیر منقولہ وقف بمعنی مذکور سمجھنا چاہیے یا مثل غنیمت مملوک ہو سکتے ہیں؟ سو اپنے فہم نارسا میں یوں آتا ہے کہ وہ قابل ملک وعطاء ہیں۔ اگر اہل فہم بھی اسی جانب ہوں تو فبہا ورنہ ہمارا کیا نقصان ہے؟ ہم اس کے وقف ہونے کو اگر ثابت ہو جائے تو اپنی کہی ہوئی بات یعنی وقف نہ ہونے سے بھی زیادہ خوش ہو کر تسلیم کریں۔ اگر وہ بھی وقف ہو جائے تو کچھ اعتراض ہی باقی نہ رہے۔ خیر اب اپنے خیالات کو عرض کرتا ہوں بگوش ہوش وچشم انصاف غور سے سنئے اور ملاحظہ فرمائیے، وقف ایسی چیز ہونی چاہیے کہ بحال خود باقی رہے اور پھر کام آ سکے۔ چنانچہ وقف کے معنی بھی یہی ہیں کہ اصل محبوس اور موقوف رہے اور منافع مصارف وقف میں صرف کیے جائیں۔

اشیائے منقولہ میں سے پھل اور غذا وقف کے قابل نہیں

مع ہذا فئے کے وقف بمعنی مذکور ہونے میں اس تغایر ذات اور منافع کی خواہ مخواہ ضرورت ہے کیونکہ للہ اور "للرّسول ولذی القربٰی" وغیرہم ہونا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اصل اللّٰہ تعالیٰ کے لیے رہے اور منافع اوروں کے لیے، چنانچہ مذکور ہو چکا۔ سو یہ بات وہاں ہو سکتی ہے جہاں وہ

بِمینک مِمّا افاء اللّٰہ علیک" مطلب یہ ہے کہ "اے نبی ہم نے حلال کیں تیرے لیے وہ باندیاں جن کا تو مالک ہوا ہے اموال فئے میں سے" اس آیت سے صریح ثابت ہے کہ فئے کے غلام باندی مملوک ہو سکتے ہیں وقف نہ تھے۔ جب ایک چیز کا بھی اموال فئے میں سے مملوک ہونا ثابت ہوا تو "فللّٰہ" وغیرہ الفاظ آیت "ما افاء اللّٰہ" اور الفاظ سیاق و سباق آیت مذکورہ کے اور جن کے وسیلہ سے وقف ہونا اراضی فئے کا ثابت کیا گیا ہے وہ معنی نہ ہوں گے جو وقف ہونے پر دلالت کریں اور نہ کلیتہً قضیہ "ما افاء اللّٰہ" اس بات کو مقتضی ہے کہ تمام افراد ماافاء اللہ کا ایک حکم ہو۔ خواہ اسباب منقولہ ہوں خواہ غیر منقولہ وقف ہوں تو دونوں ہوں، وقف نہ ہوں تب دونوں نہ ہوں۔

اشکال مذکور کا جواب

اس لیے ہمیں بھی اس خلجان کو رفع کرنا ضرور پڑا۔ سو اہل انصاف کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ واقعی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اشیاء منقولہ وقف نہیں ہو سکتی لیکن خداوند کریم و علیم و حکیم کچھ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مقلد نہیں جو اس کے ذمہ اتباع رائے ابوحنیفہ ضروری ہو اور اگر اتفاقات سے کوئی بات بظاہر خلاف مذہب حنفی صادر ہو جائے تو اس کی جواب دہی اُس کے ذمہ پر لازم ہو۔ بیش بریں نیست کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے خطا ہوئی ہو لیکن شیعی ہی یہ فرمائیں کہ اہل سنت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو معصوم ہی کب سمجھتے ہیں جو یہ خرابی اُن کے سر پڑے بلکہ اہل سنت کا یہ مقولہ ضرب المثل ہو گیا ہے۔ "المجتهد يخطى و يصيب" یعنی مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صحیح کہتا ہے۔ ہاں اتنی بات مسلم کہ مرتبہ اجتہاد کو یہ لازم ہے کہ اکثر صحیح کہا کرے۔ سو اس بات میں ان سے غلطی ہو گئی ہو تو کیا حرج ہے؟ ان کے صاحبین وغیرہ کی رائے تو آخر یہی ہے کہ اشیاء منقولہ بھی وقف ہو سکتی ہیں وہ بھی اہل سنت ہی کے پیشوا ہیں، شیعوں کے نہیں اور اگر شیعی ان کو اپنا پیشوا بنا لیں اور طوسی و رضی شریف مرتضیٰ و ابوالقاسم محقق وغیرہم کا اتباع چھوڑ دیں تو زہے نصیب اُن کے۔ پھر کچھ تکرار نہیں۔ مع ہذا یہ آیت کچھ معارض اور مناقض رائے ابوحنیفہ رحمہ اللہ نہیں بلکہ موافق ہی ہو تو کچھ عجب نہیں۔ اگر اس معما کی شرح مطلوب ہے تو کان دھر کر سنئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف مدنظر ہو اور میری ہیچمدانی پر نظر نہ ہو، ماسبق اس آیت کا "هو الذى اخرج الذين كفروا" سے لے کر "ليخزى الفاسقين" تک اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ما افاء اللہ سے مراد فقط مکانات سکنی اور اراضی صحرائی ہیں تو اب اس صورت میں بجز اموال غیر منقولہ اراضی و باغات ما افاء اللہ سے مراد نہ ہوں گے اور باعتبار خصوص ماسبق کے لفظ ما کا باوجود عموم ذاتی کے مخصوص ہو جانا ایسا شائع و ذائع ہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ جانتے ہیں۔

اطفال کافیہ خوان بھی سمجھتے ہیں کہ "الاسم مادل علی معنی" میں ما سے مراد کلمہ ہے۔ اس لیے مولانا جامی شرح ملا میں کلمہ ما کی شرح میں کلمہ ہی لکھتے ہیں۔ القصہ ما افاء اللہ سے علی العموم اموال منقولہ غیر منقولہ سب مراد نہیں فقط اموال غیر منقولہ مراد ہیں۔ چنانچہ جملہ "کَیْ لا یکون دولۃ" بھی اسی طرف فی الجملہ کھینچتا ہے۔ اس لیے کہ تداول اور دولت کے تو یہ معنی ہیں کہ ایک شئی بحال خود باقی رہے اور بایں ہمہ کسی کسی کے پاس منتقل ہوتی رہے۔ سو یہ بات بجز اموال غیر منقولہ اور کسی میں بطور کمال متصور نہیں۔ اقسام غذا اور اقسام لباس اور اقسام مرکب سب کے سب بسبب استعمال فناء ہو جاتے ہیں یا فنا ہونے لگتے ہیں۔ اگر چندے کوئی چیز قائم رہی تو کیا قائم رہی؟ یوں تو کچھ نہ کچھ سب اشیاء کو قیام ہے روٹی سالن بھی تھوڑی دیر تو ٹھہرے ہی رہتے ہیں خاص کر اس جگہ اتنے قیام سے کیا کام چلتا ہے۔ یہاں تو بشہادت "والذین جاؤا من بعدھم" قیامت تک کا حساب کتاب ہے۔ بہر حال ما افاء اللہ میں اموال غیر منقولہ داخل ہی نہیں جو اعتراض معترض واقع ہو اور ہمیں فکر جواب دہی ہو۔

وقف کا معنی کیا ہے اور وقف کے قابل کونسی چیزیں ہیں؟

ہاں اتنی بات البتہ قابل لحاظ ہے کہ ہم نے مانا اموال منقولہ ما افاء اللہ میں داخل ہی نہیں لیکن اموال منقولہ کا جو بطور فئے حاصل ہوتے ہیں کیا حکم ہے؟ مثل اموال غیر منقولہ وقف بمعنی مذکور سمجھنا چاہیے یا مثل غنیمت مملوک ہو سکتے ہیں؟ سو اپنے فہم نارسا میں یوں آتا ہے کہ وہ قابل ملک وعطاء ہیں۔ اگر اہل فہم بھی اسی جانب ہوں تو فبہا ورنہ ہمارا کیا نقصان ہے؟ ہم اس کے وقف ہونے کو اگر ثابت ہو جائے تو اپنی کہی ہوئی بات یعنی وقف نہ ہونے سے بھی زیادہ خوش ہو کر تسلیم کریں۔ اگر وہ بھی وقف ہو جائے تو کچھ اعتراض ہی باقی نہ رہے۔ خیر اب اپنے خیالات کو عرض کرتا ہوں بگوش ہوش و چشم انصاف غور سے سنئے اور ملاحظہ فرمائیے، وقف ایسی چیز ہونی چاہیے کہ بحال خود باقی رہے اور پھر کام آسکے۔ چنانچہ وقف کے معنی بھی یہی ہیں کہ اصل محبوس اور موقوف رہے اور منافع مصارف وقف میں صرف کیے جائیں۔

اشیائے منقولہ میں سے پھل اور غذا وقف کے قابل نہیں

مع ہذا فئے کے وقف بمعنی مذکور ہونے میں اس تغایر ذات اور منافع کی خواہ مخواہ ضرورت ہے کیونکہ للہ اور "للرّسول ولذی القربٰی" وغیر ہم ہونا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اصل اللہ تعالیٰ کے لیے رہے اور منافع اوروں کے لیے، چنانچہ مذکور ہو چکا۔ سو یہ بات وہاں ہو سکتی ہے جہاں وہ

چیز اور ہو اس کے منافع اور ورنہ خود منافع میں یہ قابلیت نہیں، سو اموال منقولہ میں سے اقسام غذا کا تو من جملہ منافع ہونا ظاہر ہی ہے کیونکہ منافع کے معنی اس جگہ فقط اتنے ہی ہیں کہ استعمال کامل کے بعد پھر قابل استعمال باقی نہ رہے بلکہ استعمال ہی میں فنا ہو جائے۔ سو اقسام غذا کا منافع ہونا تو ظاہر ہے ماسوا اس کے اور اسباب منقولہ مثل اقسام لباس و سواری وغیرہا اور ضروریات انسانی۔ کہ اگر چہ ایک وجہ سے مثل اشیاء غیر منقولہ خود اور ہیں اور ان کے منافع اور کیونکہ گھوڑا اور چیز ہے اور اس کی منفعت اور فائدہ یعنی سواری اور تخفیف مشقت سفر اور شے۔ علیٰ ہذا القیاس کپڑا اور شے ہے اور اس کا فائدہ یعنی پہننا اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچنا اور زیب و زینت اور شئے۔

لیکن غور کیجئے تو اس قدر فرق سے کوئی چیز اشیاء ضروریہ انسانی میں سے خالی نہیں۔ اقسام غذا میں بھی یہ بات موجود ہے کہ روٹی مثلاً اور شئے ہے اور اس کے منافع یعنی کھانا اور مزہ آنا اور قوت کا پیدا ہونا اور شے۔ لیکن اس قدر فرق سے قابلیت واقفیت پیدا نہیں ہوتی ورنہ جیسے زمین کا وقف ہونا مسلم الثبوت ہے، اناج غلہ بھی وقف ہوا کرتے حالانکہ اس کے وقف ہونے کے عقل کے نزدیک کوئی معنی نہیں۔ وقف ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اصل محبوس اور موقوف رہے اور منافع مصرف میں صرف ہوں اور یہاں اصل۔ منافع کے ساتھ ہی فنا ہوتی ہے۔ نقل مشہور ہے "جیسی اصل ویسی نقل"، بایں ہمہ اگر غلہ بھی وقف ہونے کے قابل ہے تو اراضی وقف کا غلہ بلاشبہ وقف ہو۔ پھر نہ اہل مصرف کو اس کی بیع درست ہو نہ ہبہ، نہ اس میں میراث جاری نہ وصیت۔ حالانکہ جہان میں اس کا کوئی منکر ہی نہیں تو معلوم ہوا کہ غلہ کو من جمیع الوجوہ منافع ہی مقرر رکھا ہے۔ سو منافع وقف اہل مصرف کے حق میں صدقہ ہوتے ہیں اور صدقہ جس کو کر دیا جائے اس کا مملوک ہو جاتا ہے تو اب اس کی بیع و شراء وغیرہ میں کچھ دشواری نہ ہوگی اور کسی کے نزدیک غلہ وقف بھی ہو سکے تو ہوا کرے۔ یہاں تو کلام اراضی فئے کے غلہ میں ہے جن کو ہم نے وقفِ خداوند کریم کہا ہے۔ سو اراضی فئے کا غلہ باتفاق وقف نہیں ہوتا اسی واسطے مملوک اہل مصرف ہو جاتا ہے۔

سواریاں اور کپڑے بھی وقف کے قابل نہیں

بالجملہ پیداوار زمین اور علیٰ ہذا القیاس اثمار و اشجار فئے کا وقف نہ ہونا تو ظاہر ہو گیا۔ باقی رہے انواع مراکب اور اقسام لباس وغیرہ ان میں بہ نسبت غذا کے کوئی فرق نکالے تو یہ نکالے کہ غذا استعمال کے ساتھ ہی فنا ہوتی ہے اسی لیے وقف نہیں ہو سکتی بخلاف سواری، لباس کے یہ چڑھنے پہننے وغیرہ سے فنا نہیں ہوتی لیکن بعد غور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرق بعینہ ایسا ہے کہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ

کر کھا لیجئے اور باقی کو چھوڑ دیجئے۔ سو ماحصل اس کا یہ ہوا کہ بقدر استعمال فنا ہوگئی۔ سو کپڑے سواری وغیرہ میں بھی یہ بات موجود ہے کیونکہ گھوڑا وغیرہ جو جانور سواری میں رہتے ہیں۔ بہ نسبت ان جانوروں کے جو اُن کے برابر کھائیں پر سواری میں نہ رہیں دُبلے اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

اور اگر چندے بسبب امداد بدل ما یتحلل باقی بھی معلوم ہوں تو اوّل تو بدل ما یتحلل ہی یوں کہے ہے کہ اصل باقی نہیں اور اگر ایسے مواقع میں اسی کو بقائے اصل کہئے تو وہ بقا، کہاں؟ جو بے کسی استعمال کے ہو اور یہی دو چیزیں جانور کی (زور اور بدن) استعمال میں آتی ہیں جان استعمال میں نہیں آتی۔ چنانچہ ضعیفی میں جو قابل استعمال نہیں رہتا تو یہی دو باتیں گھٹ جاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کپڑا بھی استعمال سے پتلا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ بیدار مغزوں پر مخفی نہ ہوگا اور اس کے تار کمزور ہو جاتے ہیں اور انہیں دو چیزوں پر مدار کار استعمال کا تھا۔ اسی واسطے رفتہ رفتہ بہت استعمال کے باعث قابل استعمال نہیں رہتا۔ سو یہاں بھی وہی حاصل نکلا کہ منافع بقدر استعمال فنا ہو گئے۔ غائب ما فی الباب کہیں نقصان ایک طرف سے ہوا کہیں چاروں طرف سے کہیں شکل بنی رہی کہیں بگڑ گئی لیکن استعمال ہونے کا مضمون دونوں جا برابر ہے۔ باقی مشکل صورت کو لے کر کیا چاٹئے۔ اس کو استعمال میں کچھ دخل ہی نہیں۔ عکس آئینہ میں شکل و صورت موجود ہے مگر چونکہ جسمیت اور زور و طاقت نہیں کوئی صورت استعمال کی نظر نہیں آتی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اشیاء منقولہ کو نا قابل وقف کہنے کی وجہ

بالجملہ جن چیزوں سے منافع کا تعلق ہے وہ چیزیں بقدر استعمال فنا ہو جاتی ہیں اور جو چیزیں بحال خود باقی ہیں اُن سے منافع کو کچھ تعلق نہیں۔ یہ بات اگر ہے تو زمین یا سوائے اس کے اور اشیاء غیر منقولہ ہی میں ہے کہ استعمال میں منافع ہی فنا ہوں اور اصل باقی رہے استعمال کی وجہ سے اصل میں کچھ نقصان نہ آئے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اشیاء منقولہ کو قابل وقف ہی نہ سمجھا اور صاحبین یا کسی اور نے اگر بلحاظ بقائے صورت بعض اشیاء منقولہ اُن کو قابل وقف سمجھا تو ان کی صورت کو اصل منافع اور بقائے صورت کو بمنزلہ بقائے اصل منافع سمجھ کر اس کے وقف ہونے کے قائل ہو گئے ہیں لیکن بعد اس تحقیق کے اہل حق سے توقع یوں ہے کہ رائے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہی کو ترجیح دیں۔

صاحبین کا اشیائے منقولہ کو قابل وقف کہنے کے وجوہ

ہاں اس سے قطع نظر کیجئے تو مذہب صاحبین بظاہر حق معلوم ہوتا ہے کیونکہ بایں خیال کہ اوّل تو

منافع مرکب ولباس وغیرہ اشیاء ضرور یہ دُنیاوی عرف میں مرکب اور لباس ہی کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور وہ تاوقتیکہ صورت اور جان باقی ہے قوت اور بدن کی طرف منسوب نہیں ہوتے جو یوں کہیے کہ استعمال میں فنا ہوتے جاتے ہیں۔

دوسرے منافع مرکب ولباس وغیرہ منافع کلیہ ہیں کہ اوقاف مختلفہ میں اُن کے افراد ظہور میں آتے ہیں اور جیسے ہر ہر فرد بشر انسانِ کامل ہے جزء انسان نہیں ایسے ہی منافع اشیاء مذکور بھی جو اوقاتِ مختلفہ میں حاصل ہوتے ہیں منافع تامہ ہیں، اجزائے منافع نہیں اور ظاہر ہے کہ بعض افراد کے فنا ہو جانے سے نوع فنا نہیں ہوتی بلکہ جب تک ایک فرد بھی باقی ہے تو تمام نوع باقی ہے تو اس صورت میں معلوم ہوا کہ بعض اوقات کے انتفاع سے اصل منافع فنا نہیں ہوتے، پھر وقف کیوں نہ ہو سکے گا؟ کیونکہ بقائے منافع دلیل بقائے اصل ہے۔ بخلاف منافع اقسام غذا کے کہ وہ منافع جزئیہ ہیں جو نفع کہ ایک روٹی سے حاصل ہوتا ہے۔ آدھی سے اس کا آدھا حاصل ہوتا ہے پورا باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ظاہر ہے۔ ہاں اگر اصل باقی رہتی تو منافع بھی بوجہ کمال باقی رہتے۔ خیر اگر مذہب ابوحنیفہ رحمہ اللہ حق ہے تو اموال منقولہ کا منجملہ اموال فئے وقف نہ ہونا تو درکنار قابل وقف نہ ہونا ظاہر ہو گیا۔

صاحبین کی رائے بھی مقصود کے موافق ہے

اور اگر رائے صاحبین صحیح ہے تب بھی مطلب ہاتھ سے نہیں گیا وجہ اس کی یہ ہے کہ تمام ضروریات بشری میں سے احتیاج غذا منجملہ ضروریات اصلیہ ہے اور باقی اموال منقولہ بتمامہا ضرورات فرعیہ میں داخل ہیں، اگر غذا کی ضرورت نہ ہوتی تو نوکریوں کی تلاش کے لیے سواری کی ضرورت مثلاً نہ ہوتی تو معلوم ہوا کہ سواری کی ضرورت غذا کی ضرورت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر سواری کی ضرورت سے مثلاً گھاس دانہ کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جہاں تک یہ سلسلہ ضرورتوں کا چلے گا تو مابعد ماقبل کی فرع ہو گا اور حقیقت میں ضرورت اصلی ایک ضرورت غذا ہی نکلے گی اور باقی اشیاء کی احتیاج گو کہنے کو ان اشیاء کی احتیاج ہے لیکن حقیقت میں غذا کی احتیاج ہے تو اس صورت میں بایں خیال کہ وقف رفع ضرورت کے لیے ہوتا ہے اور حقیقت میں ضرورت اگر ہے تو ضرورت غذا ہی ہے تو مصرف وقف میں اس ضرورت کا ہونا ضروری ہوا۔

اور کسی اور وقف میں نہیں تو وقف فئے میں تو رفع احتیاج غذا ہی مقصود ہے۔ چنانچہ جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بھی لفظ رسول اور مساکین اور فقراء اور ابن السبیل میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس لیے کہ فقیر اور مسکین کے معنوں میں رزق کی کمی اور کوتاہی معتبر ہے بلکہ لفظ رسول یتامیٰ اور ابن

السبیل بھی اسی طرف مشیر ہیں۔ چونکہ لفظ رسول تو اس بات کی طرف مشیر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بایں وجہ کہ رسول ہیں۔ یعنی خدا کے بھیجے ہوئے ہیں خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنی فرصت ہی نہیں کہ حسب دلخواہ کمائیں اور فراغت سے بیٹھ کر کھائیں اور جب کمانے کی فرصت نہ ہونے کی یہ وجہ ہوئی کہ خدا کے کام میں لگے ہوئے ہیں تو لاجرم بمقتضائے قدرشناسی خداوندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نان ونفقہ بھی خدا ہی کے ذمہ ہونا چاہیے۔ اس کی بہتر صورت اس سے کیا ہوگی کہ جو مال خاص خدا کا ہو اور بے منت غیر حاصل ہوا ہو، اس میں سے کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تجویز کیا جائے۔ یتیم اور ابن السبیل کا مورد رحم ہونا بھی تو باعتبار اکثر کے بسبب انقطاع اسباب رزق ہو جاتا ہے اور نہ سہی لفظ فقراء میں تو بیشک قوت کے نہ ہونے پر دلالت ہے۔ سو وہ بوجہ ارتباط بدلیت سب کو شامل ہے اور اسی لیے سب ہی میں فقر کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوا۔ خواہ ذوی القربیٰ ہوں خواہ اقسام باقیہ۔ بالجملہ مصرف وقف میں احتیاج غذا کا ہونا ضروری ہوا۔

اشیائے منقولہ کا وقف فقراء و مساکین کو مفید ہی نہیں

سوا گران کو اموال منقولہ دیے جائیں تو دو طرح سے رفع احتیاج مذکور میں کام آسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بطور مذکور اُن کو سلسلۂ اسباب تحصیل غذا میں داخل کیا جائے۔ مثلاً سواری پر چڑھ کر نوکری وغیرہ کے لیے سفر کیا جائے تا کہ کچھ کما کر غذا بہم پہنچائے۔ یا مثلاً ہنڈیا یا رکابی چمچہ کھانے پکانے کے لیے رکھا جاوے تا کہ بایں وسیلہ کھائے پکائے۔ دوسرے یہ کہ اشیائے مذکورہ کو بیچ کر کھا جائے لیکن اگر اتفاق سے پیٹ کو ایسی لگی ہو کہ جان پر بنی ہوئی ہو تو اس صورت میں بیع کی اجازت نہ دینی جیسا وقف میں ہوتا ہے، رفع احتیاج کے بدلے اور احتیاج کا پابند کر دینا اور آسائش کے بدلے جو رفع احتیاج اس کے لیے ہوتی ہے، دونا تکلیف میں ڈال دینا ہے کیونکہ اس سے زیادہ اور کیا تکلیف ہوگی کہ چیز پاس ہو اور پھر اس سے منتفع نہ ہو سکے۔ شعر

خرابی دل پروانہ زیں بتر چہ بود — کہ شمع را بنما یند و سوختن ند ہند

اور اس قسم کی احتیاج کا ہونا فقراء و مساکین کے تو مفہوم میں داخل ہے۔ پر یتامیٰ اور ابناء سبیل میں بھی کثیر الوقوع ہے اور چونکہ سبب اس قسم کی احتیاج کا فقراء اور مساکین اور یتامیٰ اور ابناء سبیل کے حق میں بے سروسامانی معلوم ہوتی ہے تو پھر اس کا ارتفاع بجز اس کے متصور نہیں کہ اور کچھ عطا کیا جائے تا کہ اگر غذا ہو تو خود اس سے ورنہ اُسے بیچ کر اپنا پیٹ پالیں۔ سو در صورت یہ کہ عطا میں اُن کو یہ اختیار ہی نہ ہو تو ان کی طرف سے بھاڑ میں پڑے۔ ہاں اگر اُن کے منافع مثل

پیداوار زمین وا ثمار واشجار اقسام غذا میں سے ہوتے تو پھر اُس کا بیچنا تو درکنار متولی وقف کو ان کا دینا ہی کیا ضروری ہوتا۔ بہرحال اموال منقولہ کا وقف ہونا فقراء اور مساکین وغیرہم کو مفید نہیں۔ یہ دوسری وجہ ہے جس سے تدبر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ موجہ معلوم ہوتا ہے۔

بعض اشیائے غیر منقولہ جو حاجت برآری نہیں کرتیں مگر ان میں قابلیت ہے

باقی رہے چاہ یا مکانات سوان کا وقف ہونا بھی بظاہر رافع احتیاج فقراء اور مساکین وغیرہم نہیں ہوسکتا لیکن ان میں اور اموال منقولہ میں دو فرق ہیں جن کے سبب ان کو اموال منقولہ پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ ایک تو اموال منقولہ معدنِ رزق ہی نہیں جو مخرج قوت ہوسکیں۔ بخلاف مکانات کے کہ ان کی زمین بہرحال قابل پیداوار ہے اور چونکہ مدار وقفیت کا اسی قابلیت پر ہے، پیداوار کا ہونا کچھ ضرور نہیں ورنہ زمین وقف اگر مزروعہ ہو اور ایک سال یا چند سال کسی سبب سے افتادہ رہے تو اس کی وقفیت باطل ہو جایا کرے، اس لیے مکانات وقف کی زمین بھی قابل وقف ہی رہے گی۔ حاصل یہ ہے کہ اگر غرض اصلی کسی شے کی کسی وجہ خارجی کے باعث مسدود و مفقود ہو جائے تو جو حکم اس غرض کی وجہ سے اُس پر متفرع اور مترتب ہوا تھا وہ حکم موقوف نہ ہو جائے گا، ویرانوں کی مسجدوں میں گویا بالفعل نماز نہیں پڑھی جاتی۔ پر چونکہ قابلیت نماز بدستور باقی ہے تو حکم وقفیت بھی باقی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ گو ضرورت غذا ضرورت اصلی ہے لیکن ضرورت مکان اور ضرورت آب بھی ضرورت اصلی ہے کسی اور ضرورت کی ضرورت سے ان کی ضرورت نہیں، چنانچہ ظاہر ہے اور پھر یہ دونوں بھی مثل غذا زمین سے حاصل ہوتے ہیں تو زمین کے وقف کرنے میں ان تینوں ہی کا لحاظ چاہیے۔ ان تینوں میں سے کوئی شے سہی کچھ غذا ہی کی خصوصیت نہیں پر چونکہ پانی اوّل تو اکثر بے دام و درم کے میسر آتا ہے، دوسرے بیشتر پیاس غذا کے کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس وجہ سے گویا پانی کی ضرورت غذا ہی کی ضرورت پر موقوف ہوئی۔ غایت مافی الباب اور ضرورتیں من جملہ سلسلہ اسباب غذا ہوں اور یہ داخل مسببات غذا تیسرے اکثر غذاؤں کا قیام اور قوام بھی پانی ہی سے ہے تو اس وجہ سے پانی بھی منجملہ اسباب غذا اور مثل اور ضرورات فرعیہ کے فرع غذا ٹھہرا۔

تو پانی کی ضرورت کے ارتفاع کی طرف تو ضرورت نہ ہوئی اس لیے نہ آیت ما افاء اللہ میں نہ اُس کے صلہ میں اس کی طرف کچھ اشارہ فرمایا مگر ضرورت مکانات من کل الوجوہ ضرورت اصلی ہے اور پھر بجز مال کثیر کے اس کے ارتفاع اور اندفاع کی کچھ صورت نہ تھی۔ اس لیے اس کے رفع دفع کی ضرورت پڑی۔ سو میں جانتا ہوں لفظ "اخرجوا من دیارھم" میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے لیکن اموال

خولہ میں سے کسی میں یہ قابلیت نہیں کہ بالذات ان ضرورتوں کو رفع کر سکے۔ البتہ ان ضروریات مثلاً شہ
ل تحصیل کے سامان ہیں، خواہ بطور سببیت کے جیسے ہنڈیا رکابی وغیرہ سے پکانا کھانا اور گھوڑے پر چڑھ
کر نوکری کے لیے جانا یا بطور بدلیت کے یعنی اموال منقولہ کو بیچ کر روٹی مکان پانی بہم پہنچانا لیکن چونکہ
ایسی ضرورت جس میں گھوڑے لباس وغیرہما کے بیچنے کی نوبت پہنچے۔ بہ نسبت اُس ضرورت کے کہ یہ
اس کے حق میں منجملہ اسباب ہوں شدید ہے اور پھر بایں ہمہ اہل مصرف میں موجود ورنہ مصرف ہی کیوں
ہوتے تو اموال منقولہ میں اس کی رعایت کرنی ضرور پڑی۔ یعنی مثل پیداوار زمین اموال منقولہ میں بھی
بعد عطاء کے اہل مصرف کو اختیار ملے تا کہ بیچ کھوچ کر رفع ضرورت کریں۔ بالجملہ اموال منقولہ مثل
پیداوار کہ وہ بھی منقولات میں سے ہے ملک میں اہل مصرف کے کر دینے چاہئیں۔

مَامَلَکَتْ یَمِیْنُکَ کے لفظی فوائد

اب سب کو معلوم ہو گیا کہ آیت "ما ملکت یمینک ممّا افاء اللّٰہ علیک" کچھ
ہمارے معتر نہیں بلکہ اُلٹی موید ہے کیونکہ بظاہر "مِنْ جو مِمَّا" میں ہے تبعیضیہ ہے۔ سو اس سورت
میں "ما ملکت یمینک" سے دو باتیں معلوم ہو جائیں گی ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم تمام اموال فئے کے مالک نہ تھے۔ دوسرے جس قدر کے مالک ہوئے وہ بجز د مسلط ہو جانے
کے مالک نہیں ہوئے تھے ورنہ بھی کے مالک ہوتے کیونکہ سبب ملکیت اس صورت میں تسلط ہی
ہوگا سو وہ سب ہی میں پایا جاتا ہے۔ تو اب لاجرم کسی اور سبب سے مالک ہوئے ہوں گے اور
بظاہر بجز اس کے کہ بعد تقسیم آپ کے قبضہ میں آ گیا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ لفظ
"یمینک" خود قبضہ پر دلالت کرتا ہے ورنہ اگر قبض کی ضرورت نہ ہوتی فقط "ملکت" بصیغہ
خطاب فرما دیتے لفظ "یمینک" کی کچھ حاجت نہ تھی۔

اموال فئے میں آنحضرت کے حصہ کی نوعیت

باقی کلام رہی اس میں کہ قبل قبض مالک تو نہ تھے، پر جیسے قرض خواہ مال مدیون میں اور غانمین
مال غنیمت میں مستحق ہوتے ہیں اور بوجہ اس استحقاق کے مدعی بن سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم بھی مال فئے میں مستحق تھے؟ یا مثل فقراء اور مساکین کہ ان کو مال اغنیاء مالکان زکوٰۃ میں
اس قسم کا استحقاق نہیں ہوتا کہ مدعی ہو سکیں بلکہ قابل اعطاء اور مصرف عطاء ہوتے ہیں۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم بھی فقط منجملہ مصارف تھے۔ اس لیے اس کی تحقیق بقدر فہم نارسا گزارش ہے۔

جناب من استحقاق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک استحقاق قوی اور اس کو ہم استحقاق فعلی اور استحقاق شخصی اور استحقاق حقیقی بھی کہتے ہیں۔ دوسرا استحقاق ضعیف اور اس کو ہم استحقاق انفعالی اور استحقاق نوعی اور استحقاق مجازی بھی کہتے ہیں اور وجہ تسمیہ بیان معنی سے ان شاء اللہ ظاہر ہو جاوے گی۔ استحقاق قوی میں مستحق کی جانب کوئی امر وجودی ہونا چاہیے جو منشاء استحقاق اور مبداء دعویٰ بن سکے ورنہ مستحق حقیقت میں مستحق نہ ہوگا غیر مزاحم ہوگا۔

سو یہ بات دین کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے، غنیمت میں بھی مخفی نہیں کیونکہ جہاد امر وجودی ہے اور یہی "لِمَ" معلوم ہوتی ہے کہ مال غنیمت کی تحصیل کو بندوں کی طرف منسوب فرمایا اور یوں فرمایا "وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ" ورنہ حقیقت میں سب چیزیں خدا ہی کی دی ہوئی ہیں اور استحقاق ضعیف میں فقط مفلسی اور ناداری جو امر عدمی ہے کفایت کرتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عدم مثبت وجود نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حق جو امر وجودی ہے، ناداری سے جو امر عدمی ہے ثابت نہ ہوگا۔ اسی واسطے اگر کوئی کسی مفلس کو کچھ نہ دے تو بہ نسبت اُس مفلس کے ظالم نہ گنا جائے گا اور نہ مفلس اس کی نالش و فریاد کر سکے گا۔ ہاں اگر حقوق واجبہ کسی مفلس کو بھی نہ دے تو عند اللہ گنہگار ہوگا کیونکہ مفلس کا حق نہیں تو خدا کا تو ہے۔ بالجملہ ناداری اور مفلسی مثبت حق نہیں فقط موجب قابلیت ہے اور یہ قابلیت تمام نوع مفلسین میں برابر ہے تو جس کسی کو دے دے گا، کام چل جائے گا۔ اسی واسطے محققین کے نزدیک جملہ مصارف مندرجہ آیت "انما الصّدقات" کا احاطہ اور استیعاب ضروری نہیں، یعنی یہ لازم نہیں کہ سب ہی اصناف کو دے کیوں کہ یہاں مدارِ کار امر عدمی پر ہے جو ناداری ہے اور وہ سب میں برابر ہے اور یہ مابعد آیت مسلم ہے کہ سب اشخاص اصناف مذکورہ کا دینا لازم نہیں۔

مصارف کے مقرر کرنے کی وجہ اہل مصارف کی ناداری ہے

سو اگر بالفرض بوجہ مفلسی دینا ضروری ہوتا تو سب کو دینا ضروری ہوتا اور جب سب اشخاص کا دینا ضروری نہیں تو سب اصناف کا دینا بھی ضروری نہیں اور اس ناداری کی وجہ سے ان مصارف کا مقرر کرنا اکثر اصناف میں تو ظاہر ہی ہے، پر عاملین اور مؤلفہ القلوب میں ناداری کا ہونا ہی سرے سے ضروری نہیں۔ مدارِ استحقاق ہونا تو درکنار؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عاملین کا دینا تو وہ فقراء مساکین وغیرہم ہی کا دینا ہے کیونکہ یہ نہ ہوں تو صدقات کیونکر وصول ہوں؟ تو گویا یہ ان کے نوکر اور اجیر ہیں، ان کا دینا فقراء مساکین ہی کے کام میں خرچ کرنا ہے۔ گویا انہیں کیا دیا فقراء مساکین وغیرہم ہی کو دیا، باقی رہے مؤلفہ القلوب سو ان کا دینا بھی موجب تکثیر صدقات تھا کیونکہ

زکوٰۃ خوشی خاطر سے تو کوئی کوئی دیتا ہے۔ البتہ عامل کو اگر سلطان وقت کی پشتی ہو تو وصول ہو سکتی ہے۔ سو فتح مکہ سے پہلے پہلے بسبب قلت اہل اسلام کے مددگاروں کی حاجت تھی اور وقت فتح مکہ گو بظاہر ایک وجہ سے جماعت کثیر ہو گئی تھی لیکن حقیقت کو دیکھئے تو قصہ بدستور تھا کیونکہ مؤلفۃ القلوب بظاہر مسلمان تھے جب تک ایمان دل میں خوب نہ جما تھا مگر چونکہ داد و دہش میں اثر ہے کہ دینے والے کی محبت لینے والے کے جی میں پیدا کر دیتی ہے تو اس تدبیر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جو بیخ ایمان ہے اُن کے دل میں جمائی گئی۔

اور چونکہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان بکثرت ہو گئے۔ اس واسطے اب مؤلفۃ القلوب کا سہم ہی ساقط ہو گیا۔ الحاصل مؤلفۃ القلوب کا دینا بھی ایک وجہ سے فقراء مساکین وغیرہم ہی کا دینا تھا کیونکہ ان کا دینا اُن کے حق میں بمنزلہ تجارت تھا۔ اس واسطے جب اس تجارت میں کچھ نفع نہ رہا اس کو موقوف کر دیا۔ مع ہذا اس زمانہ کے فقراء اور مساکین اسلام کے فقر و مسکنت کی وجہ بھی کفار کی مخالفت ہوئی تھی۔ سو ان کو کچھ دے کر اپنا موافق دل کر لینا گویا فقراء اور مساکین ہی کو دینا ہے کیونکہ داد و دہش سے فقراء کا فقر رفع ہو جاتا ہے۔ سو وہی بات یہاں بھی نکلی، ان وجوہ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ "اَلْمُؤَلَّفَة" کا لام عہد کے لیے ہو۔ الغرض استحقاق ضعیف میں مصرف کی جانب فقط امر عدمی ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کی طرف سے دعویٰ اور طلب گاری نہیں ہو سکتی۔ ہاں خدا کی طرف سے حکم جو امر وجودی ہے، منشاء استحقاق ہوتا ہے۔ اس لیے خدا کی طرف سے مطالبہ اور مواخذہ رہتا ہے اور زکوٰۃ کو حق خداوندی کہتے ہیں گو فقراء مساکین کی طرف بھی مجازاً منسوب کر دیں۔

جب یہ بات متحقق ہو چکی تو اب سنئے کہ اموال فئے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کسی ایسے امر وجودی کا ہونا تو جو منشاء استحقاق ہو سکے۔ ظاہر البطلان ہے۔ قرض آپ کا کفار کی جانب نہ آتا تھا، وصیت کی کوئی صورت نہیں، ایک غنیمت ہونے کا احتمال تھا، سو اُس کو بھی جناب باری تعالیٰ نے "ممّا او جفتم" فرما کر رفع کر دیا تو اب بجز اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استحقاق از قسم استحقاق ضعیف ہو کوئی صورت بن نہیں پڑتی اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خداوند کریم نے مال فئے کی تحصیل کو بندوں کی طرف منسوب نہیں فرمایا بلکہ لفظ افاء اللہ میں اپنی ہی طرف نسبت کیا اور اسی لیے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا سہم ساقط ہو جائے۔ چنانچہ مذہب اکثر اہل حق یہی ہے اور شیعہ جو سہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام کے لیے تجویز کرتے ہیں تحکم محض ہے، آیت میں کوئی دلیل نہیں۔ سو جس صورت میں فقط افاء اللہ سے یعنی

خداوند کریم کے اس مال کو کفار کے قبضہ سے نکال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دینے سے ملکیت ثابت نہ ہوئی۔ چنانچہ بدلالۃ "ما ملکت یمینک" مذکور ہو چکا اور پھر ادھر کوئی صورت استحقاق کی بھی نہیں تو بجز اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منجملہ مصارف مال فئے ہوں کیا کہیے۔

مِمَّا اَفَاءَ اللّٰہ کے لغوی فوائد

بہر حال آیت "ما ملکت یمینک ممّا افاء اللّٰہ" میں اگر افاءۃ فئے یعنی اصطلاحی سے مشتق ہو تو درصورت یہ کہ "مِنْ مِمَّا" میں تبعیضیہ ہو، ہمارے مخالف نہیں بلکہ اور موید ہے اور اگر بخلاف ظاہر "مِنْ" کو بیانیہ کہیے تو پھر ما ممّا میں موصولہ نہ ہوگا جو عموم پر دلالت کرے اور تمام فئے مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو بلکہ موصوفہ ہوگا ورنہ لازم آئے کہ مال فئے "ما ملکت" میں منحصر ہو اور سواء "ما ملکت" اور کچھ نہ ہو۔ الغرض اگر من بیانیہ ہو تب بھی ہمارے مخالف نہیں۔ غایت مافی الباب ہمارے لیے دلیل بھی نہ ہو۔ یہ سارا جھگڑا تو اس صورت میں ہے کہ افاءۃ فئے بمعنی اصطلاحی سے مشتق ہو اور در صورت یہ کہ افاءۃ بمعنی اعادت اور ردّ کے ہو اور حاصل یہ ہو کہ خداوند کریم نے اپنے مال کو کفار سے ہٹا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ڈال دیا۔ تو پھر مستدل ملکیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس آیت میں کوئی دستاویز نہ ہوگی کیونکہ یہ معنی غنیمت اور فئے میں دونوں میں بن پڑتے ہیں۔

فئے کے معنی کی تعیین

اور حق دیکھیے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ منشاء اور مبدا اس اصطلاح کا اگر ہے تو آیت سورۂ حشر "اعنی ما افاء اللّٰہ علٰی رسولہ" ہے مگر سورۂ احزاب جس میں آیت "ما ملکت یمینک ممّا افاء اللّٰہ" ہے۔ سورۂ حشر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اتقان میں ابن خریس کی روایت جو در باب ترتیب نزول سورت ہائے قرآنی نقل کی ہے۔ اُس میں یہ ترتیب مصرح مذکور ہے۔ مع ہذا سورۂ حشر میں بھی خود افاءت بمعنی اصطلاحی نہیں بلکہ معنی لغوی مراد ہیں کیونکہ شرط فئے بمعنی اصطلاحی کی یہ ہے کہ جنگ و جدال کی نوبت نہ آئے۔ سو یہ بات کہ بے قتل و قتال اور بے جنگ و جدال مال ہاتھ آ جائے۔ یہ تو "فما او جفتم" سے ماخوذ ہے۔ اگر افاءت کے مفہوم میں یہ بات داخل ہوتی تو "فما او جفتم" کی کیا حاجت تھی۔ پر جب یہ لفظ کثیر الاستعمال ہوا ہو تو اختصار کے لیے سارے جملہ "ما افاء اللّٰہ علٰی رسولہ منھم فما او جفتم الخ" کے معنی ایک لفظ فئے میں بھر لیے جیسے جہاد میں تمام "جاھدوا باموالھم وانفسم فی سبیل اللّٰہ"

کے معنی داخل کر لیے ہیں۔ الغرض جب آیت سورۂ حشر میں جو ماخذ اصطلاح مذکور ہے خود افاءۃ بمعنی لغوی ہو تو جو آیت اس سے پہلے نازل ہو چکی اُس میں افاء بمعنی اصطلاحی کیونکر ہو گا۔

اب بفضلہ تعالیٰ جملہ مراتب متعلقہ آیت ما افاء اللہ سے فراغت پائی، اور ہر فہمیدہ غیر فہمیدہ کے نزدیک یہ بات محقق ہو گئی کہ فدک مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تھا، نہ اس میں ہبہ کی قابلیت اور نہ اس میں میراث جاری ہو سکے اور یہ بھی متیقن ہو گیا کہ روایت ہبہ فدک جو شیعوں کے نزدیک درباب غصب فدک دلیل کامل ہے محض افترا اور بہتان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تصور میں نہیں آ سکتا کہ مال غیر مملوک کو دیدہ و دانستہ کسی کو بطور ہبہ حوالہ کر دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فہم قرآن میں خطاء ناممکن تھی کیونکہ اصلاح کیلئے وحی جاری تھی

ہاں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ سمجھنے کا احتمال ہوتا تو یوں ممکن تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کلام اللہ اور کلام اللہ کے دقائق کو نہ سمجھیں تو پھر کون سمجھے؟ ہم جیسے ہیچمدان تو کلام اللہ کے اشارات سمجھ جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ سمجھیں؟ سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر شیعوں کے نزدیک یہ بات ہو تو ہو؟ یا یوں ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول نہ ہوتے کوئی اُمتی ہوتے تو یوں بھی کہہ سکتے کہ اجتہاد تھا کچھ وحی تو تھی ہی نہیں جو غلطی نہ ہو سکے۔ یہاں تو یہ صورت کہ اگر اجتہاد بھی ہو تب بھی یہ امر ممکن نہیں کہ آپ غلطی کریں اور پھر متنبہ نہ ہوئے ہوں۔

اس صورت میں اگر بالفرض والتقدیر بفرض محال نقل کفر کفر نباشد آپ کلام اللہ سے اس اشارہ کو کہ فدک جو منجملہ فئے ہے مملوک نہیں، نہ سمجھے ہوتے؟ اور اس وجہ سے براہِ غلطی ہبہ بھی کر دیتے تب لازم تھا کہ وحی ربانی سے اصلاح اور تصحیح ہو جاتی اور فدک کو مسترد فرماتے۔ سو اگر شیعہ اتنی گنجائش پا کر کہ سنیوں کے نزدیک ممکن ہے کہ نبی سے اجتہاد میں غلطی ہو جائے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے باوجود نبوت حکم میں غلطی ہوئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا باوجود نبی ہونے کے صحیح سمجھ جانا، چنانچہ سورۂ انبیاء میں آیت "داؤد و سلیمان اذ یحکمان فی الحرث الخ" میں مذکور ہے اس بات پر شاہد بھی ہے۔ اپنے مذہب سے دست بردار ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ضد میں یوں کہنے لگیں کہ فدک کا مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہونا بشہادت کلام اللہ مسلم۔ لیکن ہمیں اس میں بھی شک نہیں کہ فدک کو ہبہ بھی ضرور ہی کیا۔ بہت ہو تو یہ ہو کہ بوجہ غلطی اجتہاد کلام اللہ کا یہ اشارہ نہ سمجھا ہو۔

آیہ ما افاء اللہ، یوصیکم کی مخصص ہے

سواس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ اتنی دور جانے اور اس قدر تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے سہل ترکیب میں بتائے دیتا ہوں جس میں مذہب کو بھی آنچ نہ آئے اور بات کی بات بنی رہے۔ یعنی مناسب یوں ہے کہ یہ بات (نعوذ باللہ) خدا ہی کے ذمہ لگائیے اور اس بات میں بھی بدستور دیگر اغلاط خداوندی (نعوذ باللہ منہا) بدا کے قائل ہو جائیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لوث سے بچا لیجئے کیونکہ یہ بزرگی تو اسلاف شیعہ نے خدا ہی کے لیے تجویز کر رکھی ہے اور بایں ہمہ کچھ حاصل بھی نہیں۔ سنیوں کے نزدیک اگر نبی کی نسبت غلط فہمی کا امکان ہے اور ان کے نزدیک کیا وہ بھی خدا ہی کی کہیں ہیں تو وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ وحی سے اُس کی اصلاح ضروری ہے۔

بہر حال فدک کے ہبہ ہونے کی کوئی صورت نہیں جو روایت ہبہ کو مانئے اور اس وجہ سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو مالک جانئے۔ غرض ہبہ کا باطل ہونا روشن ہو گیا اور کیونکر روشن نہ ہو ہبہ کے لیے ملک واہب مقدم ہے۔ سو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ نسبت اراضی فئے جس میں سے فدک بھی ہے مالک نہ ہونا ثابت ہو گیا اور علیٰ ہذا القیاس فدک میں میراث کا جاری ہو سکنا نہ ہو سکنا بھی بخوبی واضح ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ اگر آیت "یوصیکم اللّٰہ"، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر شامل ہے اور خطاب عام ہے، خاص اُمت ہی کو نہیں۔ تب بھی بہ نسبت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کوئی حرف عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ آیت "ما افاء اللّٰہ"، منجملہ متروکہ نبوی بہ نسبت فدک وغیرہ اموال فئے کے مخصص ہے۔ چنانچہ واضح ہو گیا۔

یوصیکم اللّٰہ فدک کو شامل ہی نہیں

بلکہ غور سے دیکھئے تو تخصیص کے کہنے کی بھی کچھ حاجت نہیں۔ تخصیص ہو تو یہ معنی ہوں کہ آیت "یوصیکم اللّٰہ" سے بہ نسبت فدک بھی یہی حکم نکلتا تھا لیکن مثل استثناء آیت مذکور یا کسی مخصص نے فدک وغیرہ کا استثناء کر دیا ہے، سو یہ بات یہاں کوسوں پاس کو نہیں پھٹکتی کیوں کہ آیت "یوصیکم اللّٰہ" اگر متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شامل بھی ہو گی تو اُس متروکہ کو شامل ہو گی جو مملوک نبوی بھی ہو کیونکہ میراث تو اشیائے مملوک مورث میں جاری ہوتی ہے۔ فدک جب وقف ہوا تو مملوک ہی نہیں تو عموم آیت "یوصیکم اللّٰہ" میں داخل کیونکر ہو۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو البتہ درصورت تسلیم عموم خطاب اس کی ضرورت پڑتی کہ حدیث "مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" کو مخصص کہئے لیکن بحمد اللہ اس کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔

یُوْصِیْکُمُ اللّٰہ کی جیسے بہت سی احادیث مخصصہ ہیں، ایسے ہی ما ترکناہ ہے

لیکن تاہم تکثیر سواد وجوہ رفع مخالفت آیت مذکورہ وحدیث مسطور کے لیے ماسوا اس تقریر کے جو درباره تخصیص گزر چکی ہے، اس قدر اور مرقوم ہے کہ آیت "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہ" میں کچھ بھی تخصیص نہیں ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ باتفاق فریقین اور بہت سی تخصیص ہوئی ہیں۔ چنانچہ کافر وارث نہیں ہوتا، غلام وارث نہیں ہوتا، قاتل مورث وارث نہیں۔ بایں ہمہ ان تخصیصات پر کلام اللہ کا کوئی لفظ آیت مذکور سے متصل ہو یا منفصل دلالت نہیں کرتا۔ بجز اس کے نہیں کہہ سکتے کہ احادیث مخصص ہوئی ہوں۔ پھر اسی حدیث "مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَةٌ" نے کیا قصور کیا ہے کہ مخصص نہ ہو سکی۔ اگر یہ حدیث آیت مذکور کے بایں معنی مخالف کہتے ہو کہ مخصص ہے تو جو حدیثیں اور تخصیصوں پر دلالت کرتی ہیں۔ بدرجہ اولیٰ مخالف ہوں گی کیونکہ نہ کوئی لفظ اس آیت میں اُن کے مؤید ہے جیسا کہ قرینہ غیبت یوصی جو خصوص خطاب کم پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ مذکور ہوا مضمون حدیث "مَا تَرَکْنَاہُ" کے مؤید ہے اور نہ کوئی اور ہی آیت اُن احادیث کے ساعد ملتی ہے۔ جیسا کہ آیت "مَا اَفَاءَ اللّٰہُ" حدیث مذکور کے مساعد ہے۔

الحاصل اگر آیت ما افاء اللہ سے بھی قطع نظر کیجئے اور حدیث مذکور کو مبین خطاب اور مفسر مراد حدیث رکھئے تب بھی بیش برین نیست کہ حدیث مذکور آیت مسطور کے مخصص ہوگی، مخالفت کجا؟ اور اگر تخصیص بھی مخالفت کہلاتی ہے تو ایسی مخالفت شیعہ سنی سب کے نزدیک درست ہے، تکرار کی کیا بات ہے۔

بعض آیات اور روایات شیعہ میں کلی تضاد

ہاں مخالفت اسے کہتے ہیں کہ میت کے ماں باپ کے ہوتے اس کی اولاد کی اولاد کو میراث نہ دی جائے جیسے کہ شیعہ کہتے بھی ہیں اور کرتے بھی ہیں حالانکہ اولاد کی اولاد بلاشبہ اولاد ہی میں داخل ہے اور خود جناب باری تعالیٰ ہی فرماتے ہیں: "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ" یعنی اولاد کو میراث دلانے کے باب میں خود جناب باری تعالیٰ وصیت فرماتے ہیں۔ پھر جب اولاد کی اولاد بھی اولاد ہی ہوئی تو ان کی وراثت آپ ثابت ہوگئی اور اگر اولاد الاولاد کی اولاد ہونے میں بھی حضرات شیعہ کو سند ہی کی ضرورت ہے اور بے سند اور بے دلیل ایسے مضامین نہیں سمجھ سکتے تو لیجئے سند بھی موجود ہے۔ کلام اللہ میں اولاد کی اولاد ہی کو آیت مباہلہ یعنی "نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ" میں ابناء فرمایا اس لیے کہ باتفاق فریقین ابناءنا سے حضرات حسنین وغیرہما مراد ہیں

حالانکہ وہ دونوں صاحبزادے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ تھے، بیٹی کے بیٹے تھے۔

دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کی اولاد تھی ان کو خداوند کریم بار بار بنی اسرائیل کہتا ہے۔ حالانکہ بنی اسرائیل کے معنی بعینہ اولاد یعقوب علیہ السلام ہے۔ اس لیے کہ بنی اولاد اور اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور سب جانتے ہیں کہ اُس زمانہ کے بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے تو تھے ہی نہیں اولاد کی اولاد تھے وہ بھی کئی پشتوں بعد۔ علیٰ ہذا القیاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے آدمیوں کو خداوند کریم اس آیت میں "یَا بَنِیْ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطَانُ" اور نیز اور آیات میں بنی آدم فرماتا ہے حالانکہ حضرت کا ان میں سے کوئی بھی بیٹا نہ تھا، اگر تھے بھی تو کہیں اڑسنگ کے پڑسنگ جا کر اولاد کی اولاد ہوتے تھے۔

دوسرے مخالفت اسے کہتے ہیں کہ بیوی کو زمین اور زمین کی قیمت سے میراث نہیں دیتے اور علیٰ ہذا القیاس برادران اور ہمشیرگان مادری کو مقتول کی دیت میں سے میراث نہیں دیتے اور دین تو قاتل کو مقتول کے ترکہ اور دیت میں سے میراث دیں۔ بشرطیکہ خطاء سے یا شبہ خطاء سے قتل کیا ہو حالانکہ نصوص قرآنی زوجہ اور بہنوں اور بھائیوں کی سب کی توریث میں عام ہے۔ زمین کی اور اس کی قیمت اور دیت کی کچھ تخصیص نہیں اور اسی طرح جملہ "القاتل لا یوث" بھی جس سے قاتل کا محروم ہونا ثابت ہوتا ہے عام ہے۔ عمد اور خطاء کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔

بایں ہمہ اور بھی سب میت کے بڑے فرزند کو شمشیر اور مصحف اور انگوٹھی اور پوشاک (میت کی) بدون عوض دلا لیتے ہیں اور اس باب میں شیعہ بعض اپنے آئمہ سے بھی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ کے ترکہ میں ان اشیاء میں سے اور وارثوں کو حصہ نہیں دیا۔ بلا عوض سب کا سب آپ ہی رکھا اور پھر اس روایت کا راوی سوائے شیعہ اور کوئی نہیں۔ حالانکہ یہ روایت سراسر مخالف قرآن ہے اگر عذر عصمت آئمہ ہے اور یوں کہیئے کہ امام معصوم ہوتا ہے اور معصوم سے ظلم و ستم اور خطاء نہیں ہوتی جو کچھ انہوں نے کیا صحیح ہی کیا ہوگا، ہم نہ سمجھیں تو کیا ہوا؟ تو اوّل تو اہل سنت کسی کو سوا انبیاء معصوم ہی نہیں سمجھتے جو اُن کے سامنے یہ عذر چل سکے۔

قول قابل اتباع ہے اور فعل میں خصوصیت کے احتمال ہیں

اور سلمنا کہ فعل معصوم میں خطاء نہیں ہو سکتی لیکن بالاتفاق قول معصوم اتباع اور اقتداء میں فعل معصوم سے مقدم ہے کیونکہ افعال میں تو یہ بھی احتمال ہے کہ خاص اس کے لیے ہو آخر بیبیوں

احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھے۔ منجملہ ان کے دربارہ نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں چار کی قید نہ ہونی معلوم ہی ہو چکی، صوم وصال کا آپ کے لیے جائز ہونا اوروں کے لیے نہ ہونا سب کو معلوم۔ علیٰ ہذا القیاس اور بہت سے اُمور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص تھے اور کچھ کچھ ان کا مذکور بھی ہو چکا اور قول میں یہ احتمال نہیں ہوتا، اگر اس میں کسی وجہ سے کوئی تخصیص بھی ہوتی ہے تو کسی ایک آدھ ہی کی ہوتی ہے۔

بہر حال جب قول بعض آئمہ کہ وہ اگر بالفرض معصوم بھی ہیں تو کہیں اتنے ہیں؟ جتنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابل اقتداء واتباع ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے نزدیک علی العموم یہ حکم جاری ہے۔ ہر کس و ناکس کو یہ مقام حاصل ہے کہ مصحف وانگشتری وغیرہ ترکہ پدری میں سے بدون عوض لے لے تو قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی "لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَةٌ" بدرجہ اولیٰ لائق اتباع ہوا اور جب ان امور کو بھی لحاظ کیجئے کہ آئمہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہیں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی اور آج کل کے شیعہ جو روایت مذکور پر عمل کرتے ہیں انہیں سننا تو کہاں نصیب اُن کی زیارت بھی میسر نہیں آئی۔

حدیث لانورث مفسر ومبین آیت ہے اور روایت شیعہ مخالف

مع ہذا حدیث "لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَةٌ" ایک وجہ سے مبین خطاب بھی ہو سکتی ہے اس کا مخصص ہونا ایسا ظاہر نہیں کہ اس کے سوا احتمال ہی نہ ہو بلکہ قرین عقل بعد غور کے مفسر اور مبین ہونا ہی ہے بخلاف روایت شیعہ کے کہ وہ مخصص کیا مخالف ہے کیونکہ تخصیص کے لیے کوئی وجہ تو چاہیے۔ یہاں بجز دھینگا دھینگی کے اور کچھ نہیں۔ غرض ان امور کے لحاظ سے روایت شیعہ روایت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاسنگ بھی نہیں ہو سکتی۔ مع ہذا ہم پوچھتے ہیں کہ سند آئمہ دربارہ تخصیص کیا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل وقول ہے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قول سے یہ تخصیص کی تھی کہ فدک نہ دیا تو کچھ چنگیز خان اور قانون انگریزی کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ ہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جانب البتہ اتنا قصور ہے کہ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کوئی راوی بیچ میں نہ تھا۔

آئمہ نے روایت فدک اگر بلا علاقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان کی ہے تو دو خرابیاں لازم آئیں

اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ علاقہ نہیں تو دو خرابیاں لازم آئیں گی

اوّل تو معصوم ہو کر کلام اللہ کے مخالف کیا معصوم کے تو معنی تو یہی ہیں کہ احکام خداوندی کے خلاف اس سے نہ ہو سکے، دوسرے اس پر بھی اکتفاء نہ کیا اُمت کے لیے بھی یہی حکم مخالف رہا اور یہ دونوں خرابیاں پہلی شق پر بھی برابر وارد ہیں کیونکہ کلام اُس صورت پر ہے کہ تخصیص کو مخالف کہیے۔ سوا اس صورت میں مخالفت کہیں نہیں گئی۔ اس میں کوئی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یا کوئی اور، کلام اللہ کے مخالف تو کسی کی بات کیوں نہ ہو قابل شنوائی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور تخصیصات مسطورہ کو جو بحوالہ مذہب شیعہ مرقوم ہوئی ہیں اور واقع میں تخصیصات نہیں مخالفات ہیں، چنانچہ ظاہر ہے۔ ایک طرف دھریئے اور حدیث ابوبکر کو ایک طرف رکھئے اور بوجہ عقل اور نقل آیت "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ" سے اس کی چسپید گی اور مخالفات شیعہ کی منافرت کو ملحوظ کر کے دونوں کو تولئے اور پھر بولئے کہ کس طرف پلڑا جھکتا ہے؟

الحاصل ہر ہر سخن سے شیعوں کی سخن فہمی اور ہر ہر قدم پر اُن بزرگواروں کی عقل و نقل سے مناسبت معلوم ہوتی جاتی ہے۔ پر ہر بات پر گرفت کرنے میں بھی تھکا جاتا ہوں اور نیز شرم آتی ہے کہ ان بے حیاؤں کو الزام دے کر کہاں تک شرمایئے۔ اس لیے باقی اُمور کا جواب لکھنے سے جی رُکتا ہے اور یوں خیال آتا ہے کہ جب اس فرقہ کی خوش فہمی ہر ہر سطر پر معلوم ہو گئی تو اہل انصاف اسی سے سمجھ جائیں گے کہ اور بھی ایسے ہی گل کھلائے ہوں گے لیکن یقین سے اطمینان کا رُتبہ زیادہ ہوتا ہے۔ گو اتنی تقریروں سے جو مرقوم ہو چکیں، مولوی عمار علی صاحب کے خط معلوم کے امور باقیہ کا غلط ہونا بھی متیقن اور محقق ہو گیا لیکن شائقین کو یہ تردد ہوگا کہ دیکھئے اُن کے غلط ہونے کے کیا کیا وجوہ ہوں؟ اس لیے باوجود قلت فرصت اور کثرت ضروریات اور بھی حرکت کرنی پڑی۔ اس لیے بقدر مناسب دربارہ مخالفت حدیث "لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ" اور آیت "وَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ" اور آیت "وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ" کے اپنے مافی الضمیر کو قلم کے نیچے کھینچتا ہوں۔

اوّل قابل لحاظ یہ بات ہے کہ جب آیت "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ" میں خطاب مخصوص اُمت کے لیے ہوا تو اس حدیث ہی کی اہل سنت کو کچھ ضرورت نہ رہی اور کسی کے مال میں میراث جاری ہو کہ نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں تو وراثت جاری ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم میں داخل ہی نہیں۔ بایں ہمہ جب آیت ما افاء اللہ سے فدک کا غیر مملوک ہونا ثابت ہو گیا تو جھگڑا ہی تمام ہو گیا۔ اب اگر کوئی کہیں سے خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ترکہ میں میراث کا جاری ہونا ثابت بھی کرے تب بھی فدک میں تو میراث جاری ہو ہی نہیں سکتی۔

حدیث معاشر الانبیاء اگر غلط بھی ہو تو بھی فدک ہاتھ نہیں آتا

القصہ اگر بوجہ مخالفت ظاہری جو حدیث مذکور اور آیات باقیہ میں ظاہر بینوں کو معلوم ہوتی ہے۔ حدیث مذکور اگر غلط بھی ہو جائے تب بھی کچھ حرج نہیں۔ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باشارہ آیت "یُوْصِیْکم اللّٰہ" ہی اس آیت سے مستثنٰی ہیں۔ پھر اگر اور انبیاء کے ترکہ میں میراث جاری ہوئی بھی تو ہوا کرے۔ کلام تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں ہے غایت مافی الباب حدیث مذکور غلط ہو لیکن اس کے غلط ہونے سے فدک نہیں مل سکتا۔ ہاں آیت "یوصیکم اللّٰہ" اگر غلط ہو جائے تو البتہ شیعوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔

دوسرے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں بھی میراث جاری ہو؟ تب جس چیز میں تنازع ہے یعنی فدک میں بشہادت آیت ما افاء اللہ میراث جاری نہیں ہو سکتی۔ اب اگر مخالفت مابین حدیث وآیات کے ثابت بھی ہوگئی تو حدیث ہی غلط ہو جاوے، پر شیعوں کا مطلب تو ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر آیت ما افاء اللہ پر شیعہ خط لا کھینچ کر ایمان پر خط کھینچ جائیں تو کیوں نہیں؟ بہرحال بغرض اثبات برأت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یعنی بایں غرض کہ فدک کا نہ دینا موافق حکم نبوی تھا، ہمیں اس میں اس کی ضرورت نہیں کہ حدیث مذکور اور آیات مذکورہ میں موافقت ثابت کریں اور مخالفت جو بظاہر نظر آتی ہے اس کو باطل کر کے حدیث مذکور ثابت کریں۔ اس باب میں اشارہ "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہ" اور دلالت "ما افاء اللّٰہ" کافی ہے۔

فصل...... وراثت انبیاء پر بحث کہ وہ مالی ہے یا علمی؟

اور مالی مراد لینے پر خرابیاں

پر بغرض اثبات صدق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس باب میں بھی گفتگو کرنی ضروری ہوئی اس لیے نظر بر تقدم وتاخر آیات اوّل در باب مخالفت حدیث اور آیت "وَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ الخ" میں گفتگو چھیڑتا ہوں۔ پر شرط یہ ہے کہ بغور سنئے اگر وراثت سے اس آیت میں وراثت مالی مراد ہے اور اس وجہ سے حدیث کو اس آیت کے مخالف کہتے ہیں تو دو حال سے خالی نہیں۔ آل یعقوب سے یا تو خود ذات بابرکات حضرت یعقوب علیہ السلام مجازاً مراد ہو۔ چنانچہ محاورات عرب میں اکثر پایا جاتا ہے کہ آل فلاں بولتے ہیں اور اس سے خود وہی شخص مراد ہوتا ہے یا حقیقی معنی مقصود ہوں۔ یعنی آل یعقوب سے اولاد یعقوب مراد ہو۔ سو اوّل صورت میں تو لازم آئے گا کہ تادم دُعاء مذکور مال حضرت

یعقوب علیہ السلام جن کے انتقال کو 2 ہزار برس سے زیادہ ہو چکے تھے بجنسہ غیر منقسم رکھا ہوا ہو اور آگے حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ یقین ہوا کہ میری وفات سے پہلے بھی تقسیم ہولیا تھا۔

یا بعد اس دُعاء کے قبل وفات حضرت زکریا علیہ السلام کے تقسیم ہو جاتا تو پھر جملہ "یَرِثُ مِنْ الِ یَعْقُوْب" کے زیادہ کرانے کی کیا حاجت تھی؟ لفظ "یَرِثُنِیْ" بھی کافی تھا کیونکہ اس صورت میں وہ مال حضرت زکریا علیہ السلام کا ہو چکا۔ اب حضرت یعقوب علیہ السلام کا نہ عرفاً رہا نہ شرعاً۔ حضرت یحیٰی علیہ السلام وارث ہوں تو ہر طرح سے حضرت زکریا علیہ السلام ہی کے وارث کہلائیں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے وارث نہ کہلائیں گے۔ اس صورت میں لاجرم جملہ "یَرِثُ مِنْ الِ یَعْقُوْب" غلط ہو جائے گا اور پھر لغو جدا رہے گا کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کی نسبت تو وراثت پر دلالت "یَرِثُنِیْ" میں موجود تھی۔ "یرث من ال یعقوب" کی کیا ضرورت تھی؟

بہر حال اس صورت میں اس وجہ سے یوں کہنا پڑے گا کہ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرا اور بایں ہمہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا مال غیر منقسم ہی رہا۔ سو ایسی بات دیوانوں کے سننے کی ہے، عاقلوں کے کانوں میں تو ایسی نامعقول باتوں کی سمائی نہیں۔ کون کہہ دے گا کہ دو ہزار سال سے زیادہ ایک شخص خاص کا مال باوجود اس کثرت اولاد کے کہ شاید کسی کی نہ ہوئی ہو غیر منقسم رکھا رہا ہو، اور اگر آل یعقوب سے معنی حقیقی مقصود ہوں اور اولاد یعقوب مراد ہو تو یہ معنی ہوں کہ حضرت یحیٰی علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کے وارث ہوں جو تعداد میں لکھوکھا سے متجاوز ہوں گے۔ اور پھر بایں ہمہ حضرت یحیٰی علیہ السلام تمام احیاء و اموات سے ایسا رشتہ و قرابت رکھتے ہوں جو موجب وراثت ہو سکے۔

مع ہذا یہ بھی ضرور ہو کہ اس زمانہ کے بنی اسرائیل میں جو جو زندہ ہوں وہ لاجرم حضرت یحیٰی علیہ السلام کے سامنے مر ہی جائیں تاکہ وارث جو حضرت زکریا علیہ السلام ہیں اور "یَرِثُ مِنْ الِ یَعْقُوْب" اس پر دلالت کرتا ہے ظہور میں آئے۔ سو یہ بات پہلی بات سے بھی کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ بجز اس کے کہ ان عبارات کے ایسے معنی لینے کو زبردستی اور بے ہودہ کہیے اور کیا کہیے؟ عالم و عاقل کے تو تصور میں یہ بات نہیں آسکتی کہ ایسے اُمور وجود میں آئیں اور پھر کوئی نادان ہی ایسی نامعقول تمنائیں کرے۔ چہ جائیکہ حضرت زکریا علیہ السلام انبیاء کی تیزیٔ ذہن اور سلامت عقل سب جانتے ہیں اور پھر بایں ہمہ کیا زیبا تھا کہ جناب باری تعالیٰ ایسی چہ پوز باتوں کو اپنے ایسے کلام پاک میں نقل فرماتا کہ جس کی بلاغت و متانت کا شہرہ آسمان سے زمین تک پہنچا۔

غایت ما فی الباب کوئی بات کو بنائے تو یوں بنائے کہ "من کل واحد من ال یعقوب" اگر

فرماتے تو یہ اعتراض ہو سکتا اور فقط "من ال یعقوب" سے تو سب بنی اسرائیل کے مال کی وراثت لازم نہیں آتی مگر اہل انصاف سمجھتے ہیں کہ اگر یہ معنی ہوں کہ بنی اسرائیل میں سے ہر فرد بشر کی وراثت مراد لینا ضروری نہیں۔ ایک دو کی وراثت بھی کافی ہے تو اتنی بات تو یرثنی میں موجود تھی۔ اس قدر عبارت بڑھانے سے کیا حاصل ہوا؟ مع ہذا ایسے مواقع میں بحکم محاورہ تمام افراد ہی مراد ہوتے ہیں۔

القصہ شیعوں کا اس آیت کو وراثت پانے پر محمول کر کے بوجہ مخالفت حدیث "ما تر کناہ صدقة" حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پیروانِ حضرت صدیق پر طعن کرنا بعینہ ایسا قصہ ہے۔ جیسا نکٹے ناک والوں پر ہنسیں جس فرقہ کے علماء کی فہم و فراست اور خوش فہمی اس درجہ کو ہو تو جاہلوں کو تو کچھ نہ پوچھیے۔ ان کی عقل سے تو بیشک بھینس ہی بڑی ہوگی۔ مع ہذا حضرت زکریا علیہ السلام نے مقام دُعاء میں دو لفظ فرمائے ہیں۔ ایک تو "وَلِیًّا" دوسرے "یَرِثُنِیْ" اگر ولی سے فرزند مطلوب ہے تب "یرثنی" بیکار اور لغو گفتار ہے بیٹا آپ وارث ہوا کرتا ہے۔ ایسا کون سا فرزند ہوتا ہے جو قابلیت وراثت نہ رکھتا ہو اور اگر "یَرِثُ" کی قید سے یہ غرض ہو کہ ایسے اوصاف اس میں پیدا نہ ہوں جو مانع وراثت ہوں۔ مثلاً کافر نہ ہو، یا میرا قاتل نہ ہو کیونکہ کافر اور قاتل میت کے وارث نہیں ہوتے تب بھی اس کی کچھ حاجت نہ تھی اس لیے کہ "وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا" آگے موجود ہے۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ ولی بھی دے تو ایسا دے جو تیری مرضی کے موافق ہو۔

باقی رہا یہ احتمال کہ "یَرِثُنِیْ" کی قید اس لیے بڑھائی کہ مبادا فرزند تو عطا ہو لیکن سامنے ہی مر جائے تو یہ احتمال اسی کو روا ہے جو نعوذ باللہ خداوند علیم کو فہیم نہ سمجھے۔ اسی دُعاء میں یہ الفاظ موجود ہیں "اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَائِیْ" جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجھے اپنے بعد کا اندیشہ ہے اُس اندیشہ کے سبب ولی طلب کرتا ہوں۔ سو اب اس دُعاء میں یہ بات صاف موجود ہے کہ ولی ملے تو ایسا ملے جو بعد تک زندہ رہے۔ مع ہذا لفظ ولی تو اُسے ہی کہیں گے جو ولی عہد اور خلیفہ ہو۔ اس مضمون کو حضرت زکریا علیہ السلام کے بعد تک زندہ رہنا آپ لازم ہے۔

اور ان سب خرابیوں سے قطع نظر کیجئے۔ وراثت مالی کے نہ ہونے کی ایک یہی وجہ بہت ہے کہ اس صورت میں حضرت زکریا علیہ السلام کے منصب نبوت کو بٹا لگتا ہے۔ مال کا اتنا خیال کہ جیتے جی تو تھا ہی۔ مرنے کے بعد کا بھی ابھی سے بندوبست ہے اور وہ بھی اس قدر کہ خدا سے بھی کچھ شرم نہیں۔ یہاں تک کہ خود جناب باری ہی سے یہ التجا ہے کہ اس کے برتنے کے لیے فرزند عنایت کر۔ پرلے درجہ کے دُنیا داروں اور محبان دُنیا کا کام ہے نہ کہ انبیاء کا اور ان میں

سے بھی حضرت زکریا علیہ السلام کا جو آزادگی اور وارستگی میں مشہور تھے۔ استغفر اللہ شیعہ بھی کس قدر بیہودہ ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ انبیاء کو بھی نہیں چھوڑتے۔ انبیاء کی یہ لوگ کیا قدر جانیں؟ ان کی ہمت بلند کے سامنے تو تمام متاع دُنیا مینگنی کے برابر ہے۔ پھر ان میں سے حضرت زکریا علیہ السلام جیسے بے تعلق، وہ ایک قدر قلیل متاع دُنیا کے لیے کیا اس قدر بندوبست کرتے؟ اور وہ بھی اتنا کچھ کہ خدا تک نوبت پہنچی اور وہ بھی اس اہتمام سے کہ اوّل تمام مراتب اپنے استحقاق کے جس سے خواہ مخواہ دُعا قبول ہی کرنی پڑے، بیان کیے جائیں۔

کیونکہ بعد تمہید مطلب ہے تو یہ ہے "انی خفت الموالی" جس سے اپنی کمال بے قراری اور بے تابی اور ضرورت فرزند ثابت ہو جائے تا کہ کچھ توقف نہ ہو۔ سبحان اللہ نبی نہ ہوئے دُنیا دار ہوئے۔ اتنی دور کی تو انہیں بھی نہیں سوجھتی جن کی رگ و پے میں محبت دُنیا رچی ہوئی ہے اور شب و روز اسی دھیان گیان میں رہتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ اندیشہ تھا کہ ان کے بنی اعمام ان کے مال کو اُن کے بعد بیجا اور بے موقع صرف نہ کریں تو اوّل تو یہ اندیشہ ہی بیجا کیونکہ نقل مشہور ہے آپ ہوئے جگ پرلوں مرے کے بعد کوئی سیاہ کرے یا سفید مردہ کو کیا اندیشہ؟ بعد مردن کوئی مواخذہ کی صورت ہی نہیں اور اس پر خدا سے عرض کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس اندیشہ کی تدبیر اور تدبیر بھی وہ عمدہ کہ درصورت قبولیت دُعا وہ بات ہرگز نہیں۔ خود ان کے ہاتھ میں موجود تھی، یعنی اپنے ہاتھ سے تمام اموال خدا کی راہ میں لُٹا جاتے جو اس خوف سے بھی نجات ہو جاتی اور ذریعہ مزید ترقی درجات آخرت بھی میسر آتا۔ فرزند اگر نیک بھی ہوا اور اس نے مال کو خدا کی راہ میں صرف بھی کیا تو مُردہ کیا؟ وہ مال اب فرزند کا ہو گیا ثواب دینے دلانے کا اس کو اختیار ہوگا۔

باقی رہی یہ بات کہ ایک دفعہ مال کے لُٹا دینے میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر بعد اتفاق حیات طویل باقی نکلی تو پھر اپنا گزارا مشکل ہے۔ سو اس کی یہ صورت ہے کہ اگر ایسی ہی بے صبری اور اس بات کی پابندی تھی اور باوجود نبوت تو کل دُشوار تھا تو انبیاء کو ان کی موت کی اطلاع ہو جاتی ہے۔ وقت اطلاع موت سب دے دلا جاتے اور وارثان بدوضع کے لیے کوڑی نہ چھوڑتے۔ القصہ نظر بر وجوہ مذکورہ "وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ" سے وراثت مالی مراد نہیں ہو سکتی۔

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ میں وراثت مالی مراد نہیں

علیٰ ہذا القیاس آیت "وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ" میں بھی بحکم قرائن عقلیہ ارادۂ وراثت مالی ممنوع ہے مگر شاید شیعوں کو یہ عذر ہو کہ یہاں عقل ہی ندارد ہے تو البتہ عذر معقول۔ خیر اگر شیعہ

انصاف کریں تو اس قدر اور معروض ہے کہ باتفاق مؤرخین اور اجماع اہل تواریخ حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس بیٹے تھے۔ ایک حضرت سلیمان علیہ السلام اور اٹھارہ دوسرے۔ پس اگر وارث ہوتے تو سب ہی ہوتے حالانکہ بطور خصوصیت جناب باری تعالیٰ کا یوں فرمانا کہ حضرت داؤد کے حضرت سلیمان علیہم السلام وارث ہوئے، اس بات کو مقتضی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث فقط حضرت سلیمان علیہ السلام ہی تھے اور بھائیوں کی شرکت نہ تھی اور نیز یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ سب بیٹے باپ کے مال کے وارث ہوا کرتے ہیں۔ پھر اس بات کے بیان کرنے سے کیا حاصل نکلا جو جناب باری تعالیٰ نے اس قصہ کو یاد فرمایا۔ ایسی لغو بیہودہ باتیں خداوند متین کے کلام میں نہیں ہوسکتیں۔

علاوہ بریں ایسی بات کے بیان کرنے میں جس میں تمام عالم نیک و بد شریک ہوں کیا بزرگی نکلی جو خداوند کریم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے فضائل و مناقب میں اس کو درج فرمایا اور مقام تعریف میں چنانچہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے ذکر کیا۔ القصہ بوجوہ مذکورہ یہاں بھی وراثت مالی مراد نہیں ہوسکتی۔ جب بدلائل واضحہ اس سے اطمینان ہوا کہ ہر چہ باداباد وراثت مالی تو مراد نہیں تو یہ تردد ہوا کہ پھر اور کون سی وراثت مراد ہوگی؟ اس بات کے اطمینان کے لیے اوّل تو حضرات آئمہ کی طرف رجوع کیا، ادھر سے یہ جواب ملا "اِنَّ سُلَیْمَانَ وَرِثَ دَاوُدَ وَاِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَرَثَ سُلَیْمَانَ" یعنی بیشک حضرت سلیمان حضرت داؤد علیہم السلام کے وارث ہوئے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔

وراثت سے مرادِ علمِ دین (بروایت آئمہ شیعہ)

چنانچہ یہ روایت حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے امام المحدثین شیعہ حضرت کلینی نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔ سنیوں کی کتابوں میں ایسی ویسی باتیں ہوتیں تو شیعوں کے لیے گنجائش انکار بھی تھی۔ بہر حال اس روایت سے عیاں ہے کہ آیت "وورث سلیمان" میں تو وراثت علمی و وراثت منصب نبوت مراد ہے۔ وراثت مالی مراد نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سلیمان علیہ السلام سے کیا قرابت تھی؟ کہ اس کے وسیلہ سے جو مال حضرت سلیمان کو حضرت داؤد علیہم السلام کے ترکہ میں سے ملا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میراث میں ملتا۔ مع ہذا مال ملا تو کب ملا؟ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایسی میراث جو حضرت داؤد سے حضرت سلیمان علیہم السلام کو پہنچی اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ بجز میراث نبوت اور میراث علم کے اور کچھ نہیں۔

سیاق وسباق آیت سے بھی وراثت علمی ظاہر ہے

علاوہ ازیں خود کلام ربانی میں کلام سابق اور کلام لاحق دونوں اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جملہ ورث سے میراث علمی مراد ہے میراث مالی مراد نہیں۔ چنانچہ حافظان عربی داں پر پوشیدہ نہیں۔ بایں ہمہ بندہ بھی ماقبل مابعد دونوں کو لکھ کر اطمینان کیے دیتا ہے۔ کلام سابق تو یہ ہے "ولقد اٰتینا داؤدَ وَسُلَيمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ" جس کے جملہ ورث سلیمان علیہ السلام سے مل کر یہ معنی ہوئے "کہ بیشک دیا ہم نے داؤد اور سلیمان علیہم السلام کو ایک علم اور کہا اُن دونوں نے شکر اُس اللہ کا جس نے فضیلت دی ہم کو اپنے بہت بندوں ایمان والوں پر اور وارث ہوئے سلیمان داؤد کے" اور کلام لاحق یہ ہے "وَقَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ الخ" اور مجموعہ کے مل کر یہ معنی ہوئے "کہ وارث ہوئے سلیمان داؤد علیہم السلام کے اور بولے وہ لوگو! ہم کو سکھائی ہے یعنی خدا نے گفتگو پرندوں کی فقط۔"

اب دیکھئے کہ جب جملہ "ورث" جملہ "وَلَقَدْ اٰتَيْنَا" پر معطوف ہو اور جملہ "وَقَالَ وَرِثَ" پر معطوف ہو اور پھر ان دونوں تینوں معطوف اور معطوف علیہ کے ایک دوسرے پر معطوف ہونے کو لحاظ کریں تو درصورت یہ کہ جملہ "وقال جملہ ورث" پر معطوف ہو تو اس ارتباط سے اب یہ بات نکلتی ہے کہ "وَرِثَ" میں وراثت علمی مراد ہے ورنہ بے علاقہ دو جملوں میں عطف کے کیا معنی؟ جس نے مختصر معانی اور مطول کی بحث فصل و وصل کو دیکھا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اگر وراثت سے وراثت علمی مراد نہ ہو بلکہ مالی ہو تو پھر عطف کے جواز کی کوئی صورت نہیں۔ چہ جائیکہ موجب فصاحت و بلاغت ہو اور ظاہر بھی تو ہے اس صورت میں ان دونوں تینوں جملوں میں عطف کا ہونا بعینہ ایسا ہے جیسا زاغ کے ساتھ طوطی کو ایک قفس میں بند کر دیجئے۔

اور جملہ ورث جو مابین اپنے ماقبل اور مابعد کے داخل ہے اس کی یہ صورت ہوگی جیسے کہا کرتے ہیں بیاہ میں بیچ کا لیکھا۔ ایسی غیر مربوط کلام دیوانوں کی ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ شانہ کی شانِ رفیع سے یہ بات محال ہے کہ ایسی ناموزوں گفتگو کرے۔ ہاں اگر ایسے مواقع میں محاورات عرب میں لفظ وراثت نہ بولا کرتے تو البتہ فی الجملہ جائے تامل تھی۔ خیر شیعوں کو شاید خبر نہ ہو، پر حافظان کلام ربانی کو معلوم ہے کہ محاورات ساکنان عرب تو درکنار خود کلام ربانی میں جو ارباب فصاحت و بلاغت کے نزدیک عربی زبان میں کوئی کتاب یا کوئی عبارت اُس کے ہم سنگ تو کیا پاسنگ بھی نہیں ہوسکتی۔ بہت مواقع میں وراثت سے وراثت علمی مراد ہے۔ یہاں تک کہ وراثت مالی کا احتمال بھی نہیں ہوسکتا۔

کلام اللہ میں وراثت کو صرف علم کیلئے کثرت سے استعمال کیا ہے

ایک جا فرماتے ہیں "ثُمَّ اورثنا الکتاب الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا" جس کا یہ مطلب ہے "کہ پھر ہم نے وارث کیا کتاب کا اپنے بندوں میں سے اُن لوگوں کو جن کو چھانٹ لیا۔" دوسری جا ارشاد ہے "فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتَابَ ط" اس سے بھی وہی وراثت کتاب یعنی علم کتاب مراد ہے مگر شاید خوش فہمان شیعہ کو یہاں یہ احتمال ہو کہ کتاب بھی تو مال ہے اور شاید وراثت مال ہی یہاں بھی مراد ہو تو گو اس احتمال کے دفع کے لیے کاغذ کے سیاہ کرنے میں اپنی ہنسی کا اندیشہ ہے۔ مگر بلحاظ قدر فہم شیعہ ناچار کچھ اشارہ ضروری ہوا۔

اس لیے معروض ہے کہ اوّل آیت میں تو بعد "عِبَادِنَا" کے "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ الخ" ہے اور دوسری آیت میں بعد کتاب کے "يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى" ہے۔ سو تفریع "فَمِنْهُمْ" سے تو یوں ظاہر ہے کہ عطاء کتاب کے بعد باعتبار عمل کے اُن کے تین حال ہو گئے، کوئی ظالم رہا، کوئی مقتصد، کوئی سابق۔ سو عمل علم پر متفرع ہو سکے ہے نہ کہ اوراق اور جلد کتاب پر اور "يَأْخُذُوْنَ" کا یہ مطلب ہے کہ ان کو کتاب کیا ملی دُنیا ہی کمانے لگے۔ یعنی رشوت لے کر امراء کی مرضی کے موافق مسئلے غلط بتانے لگے۔ چنانچہ قرینہ "اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتَابِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ط" اِس بات پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ رشوت لے کر غلط مسائل بتانے بے علم کے نہیں ہو سکتے۔ بہرحال اکثر مواقع میں لفظ وراثت سے وراثت علمی مراد ہے۔ سو اس استبعاد کی بھی گنجائش نہیں کہ میراث کو علم سے کیا علاقہ؟

کلام اللہ میں وارث بمعنی قائم مقام

ہاں شاید کسی عربی خواں عمامہ بند شیعی کے جی میں یہ کھٹکے کہ وراثت علمی وراثت مجازی ہے اور وراثت مالی وراثت حقیقی۔ پس وراثت کے معنی حقیقی چھوڑ کر بے ضرورت معنی مجازی لینے درست نہیں۔ البتہ اگر ضرورت ہوتی تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ اس لیے کہ گزارش یہ ہے کہ معنی معروف وراثت کے معنی حقیقی ہونا اور علم میں مجازاً مستعمل ہونا ہی اوّل تو مسلم نہیں، علم میں بھی مثل مالی وراثت! اپنے معنی حقیقی پر ہی رہتی ہے۔ الغرض وراثت کے معنی حقیقی دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس کے معنی قائم مقام ہونے کے قریب قریب ہیں بلکہ اگر بمعنی حاوی اور مسلط ہو جانے کے کہیے تو اور بھی انسب اور اولیٰ ہے۔ چنانچہ ظاہر ہو جائے گا، پر بسبب کثرت استعمال کے عرف فقہاء میں

معنی معروف میں خاص ہو گیا ہے ورنہ حقیقت وراثت کا اطلاق وراثت علم اور وراثت منصب دونوں پر ویسا ہی صحیح اور درست ہے جیسا کہ وراثت مالی پر۔

اور دلیل اس بات کی (کہ معنی خاص یعنی وراثت مال میں یہ لفظ معروف ہو گیا ہے اور اصلی معنی قریب قریب قائم مقام ہونے یا حاوی اور مسلط ہو جانے کے ہیں۔ عام ہے کہ بطور معروف ہو یا بطور دیگر) یہ ہے کہ بعض ایسے موقع میں کلام اللہ میں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے کہ نہ وہاں وراثت علمی ہو سکے کیونکہ جو چیز میراث میں ملی ہے وہ مال ہے اور نہ میراث بطور معروف ہو سکے اس لیے کہ جن سے میراث پہنچی ان سے رشتہ داری تو کیا قرابت دینی بھی نہ تھی بلکہ یہ مسلمان تو وہ کافر جن سے میراث بطور معروف پہنچی بھی نہ پہنچے۔ ہاں اگر بمعنی قائم مقام ہونے اور نیابت منصب کے کہا جائے تو البتہ معنی بن جائیں۔

دیکھیے فرماتے ہیں "وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا" جس کے معنی یہ ہیں "اور وارث کیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور تھے مشرق اور مغرب میں، اس زمین کا جس میں ہم نے برکت رکھی۔ فقط" اب سنئے اس قصہ میں جن کو زمین دلائی وہ بنی اسرائیل تھے اور جن سے دلائی وہ فرعون اور قوم فرعون تھی۔ ان میں قرابت نسبی تو کیا رشتہ داری اسلام و ایمان بھی نہ تھی بلکہ یہ مسلمان تھے تو وہ کافر۔ اگر بالفرض آپس میں ایسی رشتہ داری بھی ہوتی، تب ظاہر یہ ہے کہ اس شریعت میں بھی مسلمانوں کو کافروں کی میراث نہ پہنچتی ہوگی۔ بجز اس کے کہ میراث سے مراد قائم مقام ہونا اور وراثت منصب مراد ہو اور کوئی صورت نہیں۔ سو اس صورت میں نہ وراثت علمی ہے جو معنی مجازی کہیے اور یوں کہیے کہ معنی حقیقی وراثت مالی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وراثت میں جو چیز ملی وہ زمین ہے جو اصل مال ہے اور نہ یوں کہے بنے ہے کہ وراثت بمعنی معروف ہے۔

علیٰ ہذا القیاس "اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" میں بھی جس کے یہ معنی ہیں "کہ بیشک زمین اللہ کی ہے وارث کر دے ہے جسے چاہے اپنے بندوں میں سے اور آخر بھلا ڈرنے والوں ہی کا ہے۔" وہی وراثت بمعنی قائم مقام ہونے کے ہے۔

وارث بمعنی حادی و مسلط

الغرض ان مواقع میں تو وراثت ظاہر میں بمعنی قائم مقام ہونے کے ہے اور غور سے دیکھیے تو حاوی ہو جانا اور مسلط ہو جانا مراد ہے۔ کیونکہ آیت "وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ط" میں جس کے یہ معنی ہیں "کہ یہ وہ جنت ہے جو میراث دیں گے، ہم اپنے

بندوں میں سے اس کو جو پرہیزگار ہوگا۔فقط" بجز حاوی اور مسلط ہو جانے کے اور معنی مراد نہیں ہوسکتے کیونکہ یہاں قائم مقام ہونے کی بھی گنجائش نہیں۔اس لیے کہ جنت پہلے کسی اور کے قبضہ میں کب تھی جو پرہیزگاروں کو ان کے قائم مقام کیا؟ اور جنت کو ان سے چھین لیا۔

اور مجازاً میراث حضرت آدم علیہ السلام کہئے تو قطع نظر اس کے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجازی کیوں لیجئے؟ اس کا کیا جواب ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام تو خود جنت میں موجود ہوں گے۔سو باپ کے ہوتے اولاد کے وارث ہونے کے کیا معنی؟ بہر حال ایسے معنی عام جو تمام مواقع میں برابر صحیح ہو جائیں یہی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ وراثت سے حاوی ہو جانا اور مسلط ہو جانا مراد ہو اور جب ایک معنی عام حقیقی بن سکیں جو سب مواقع میں صحیح ہو جائیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس کے قائل ہوں کہ بعض مواقع میں معنی حقیقی کہئے اور بعض مواقع میں معنی مجازی؟ کیونکہ جیسا بے ضرورت معنی حقیقی چھوڑ کر معنی مجازی مراد لینے درست نہیں۔ایسا ہی بے ضرورت اس کا قائل ہونا کب درست ہے کہ ایک جا معنی حقیقی لیں اور ایک جا معنی مجازی؟

ہاں اگر معنی عام کے حقیقی ہونے کی کوئی صورت نہ ہو تو یوں بھی ہوتا۔مع ہذا قانون میراث لاریب قدیم سے قانون شریعت ہے کیونکہ ہر نبی کی شریعت میں کچھ کچھ اس کے قواعد ہیں۔اگر یہ بات رسوم دُنیا میں سے ہوتی تو یہ بات نہ ہوتی۔لہٰذا اس صورت میں میراثِ مالی معنی شرعی ہوئے اور وضع لغت اصطلاح شریعت سے ہر قرن میں مقدم سمجھی جاتی ہے۔خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہو، خواہ کسی اور نبی کا اور ظاہر ہے کہ اصطلاحات اقوام معنی حقیقی میں سے نہیں ہوتیں بلکہ اقسام منقولات میں سے ہوتی ہیں تو لاجرم معنی حقیقی اور ہی ہوں گے۔سو اگر وہی ہوں جو میں نے عرض کیے تو فبہا ورنہ جو کچھ ہوں وہی سہی، ہمارا تو اتنا مطلب ہے کہ وراثت بمعنی معروف معنی حقیقی نہیں بمعنی اصطلاحی ہے۔

اب سنئے کہ باوجود اصطلاح کے پھر اصطلاح بھی ایسی غالب نہیں کہ معنی حقیقی پر ترجیح ہو کیونکہ کلام اللہ میں اکثر مواقع میں معنی اصطلاحی کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا۔بہت ہی کم ایسے مواقع ہیں کہ بظاہر وہاں معنی اصطلاحی کا احتمال ہو اور تلاش کیجئے تو بجز ان آیتوں کے جو متمسک شیعہ ہیں اور کوئی آیت نہ نکلے اور یہ ظاہر ہے کہ اُن آیتوں میں بھی احتمال ہی احتمال ہے اور پھر احتمال بھی ایسا کہ غور سے دیکھئے تو وہ احتمال ہی محال ہے۔ چنانچہ بخوبی واضح ہو چکا، پھر کون سی ضرورت ہے کہ معنی حقیقی کو چھوڑ کر معنی منقول مراد لیجئے؟ ہاں اگر خدا تعالیٰ کی خود اصطلاح مقرر کی ہوئی ہوتی اور مثل صوم و صلوٰۃ معنی اصلی مراد ہی نہ ہوا کرتے تو ایک بات بھی تھی۔اس تقریر اخیر سے متحقق ہو گیا کہ وراثت علمی اور وراثت بمعنی معروف دونوں معنی مجازی ہیں یعنی معنی غیر حقیقی ہے۔

وراثت علمی اگر معنی مجازی ہی ہو تو مجاز متعارف ہے

اور سلمنا کہ وراثت بمعنی معروف وراثت حقیقی ہے اور وراثت علمی وراثت مجازی لیکن مجاز متعارف اور مجاز مشہور ہے۔ خصوصاً استعمالات قرآن میں یہاں تک کہ حقیقت اور معنی حقیقی کی برابری کرتا ہے۔ چنانچہ دو آیتیں اس بات کی شاہد مذکور بھی ہو چکی ہیں ایک تو "ثُمَّ اَوْرَثْنَا الکتاب الَّذِینَ الخ" دوسری "فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُو الْكِتَابَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى" اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں وراثت علمی پر بے تکلف دلالت کرتی ہیں۔ کچھ تامل اور توقف کی نوبت نہیں پیش آتی اور یہی مجاز متعارف کے معنی ہیں کہ ایسا مجاز حقیقت سے کم نہیں ہوتا جو یوں کہا جائے کہ بے ضرورت معنی مجازی مراد لینے درست نہیں اور ان سب سے قطع نظر کیجئے تب بھی بات ہاتھ سے کہیں نہیں گئی۔ اس لیے کہ اس میں تو کسی کو کلام نہیں باوجود قرائن کے معنی مجازی کے مراد لینے میں کچھ دشواری نہیں بلکہ وقت قرائن والا معنی حقیقی کا چھوڑ دینا اور معنی مجازی کا مراد لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ نہیں تو پھر معنی مجازی کے استعمال کی کوئی صورت نہ ہو۔

سو اوّل تو حدیث کلینی سے بڑھ کر اور کون سی دلیل معنی حقیقی کے چھوڑنے اور معنی مجازی کے مراد لینے کی ہوگی۔ علاوہ بریں اور بھی قرائن عقلیہ اور نقلیہ مذکور ہوئے، پھر اب بھی اگر معنی مجازی ضروری نہ ہوں تو پھر کب ہوں گے؟

کلینی کی ایک روایت جس میں وراثت علمی کی صراحت ہے

اور بایں ہمہ اور ایک ایسی دلیل ہے جس سے وراثت مالی کا آیت "وَرِثَ" میں بلکہ آیت "وَهَبْ لِیْ الخ" میں بھی مراد نہ ہونا اور وراثت علمی کا دونوں آیتوں میں مراد ہونا بتصریح ثابت ہو جائے اور شیعوں کو بھی اس کے انکار میں مجال دم زدن نہ ہو۔ ہمارے پاس موجود ہے اعنی سوائے آیت مذکور کے۔ ایک دوسری روایت کلینی ہی کی جس کو شیعوں کو بھی برسر وچشم ہی رکھنا پڑے اور در باب مطلب مذکور روایت سابق سے زیادہ کافی ووافی ہے۔ اپنے پیش نظر ہے بغرض دندان شکنی شیعہ اس روایت کو زیب اوراق کرتا ہوں۔

روی مُحَمَّد بْنِ يَعْقُوب الرَّازِیْ فِی الْکَافِیْ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ جَعْفِرُ ابْنِ مُحَمَّد الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَام اَنَّه قَالَ اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءَ وَذٰلِکَ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوْرِثُوْا وَفِیْ نُسْخَةٍ لَمْ يَرِثُوْا دِرْهَمًا وَلَا دِيْنَارًا وَاِنَّمَا اَوْرَثُوْ الاَحَادِيْثَ مِنْ

اَحَادِیْثِهِمْ فَمَنْ اَخَذَ بِشَیْءٍ مِنْهَا فَقَدْ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ.

مطلب یہ ہے کہ ''محمد بن یعقوب رازی اعنی علامہ کلینی کافی میں ابوالبختری کے واسطے سے امام جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ بیشک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور یہ اس سبب سے کہ انبیاء نے میراث میں نہیں چھوڑا اور ایک نسخہ میں یوں ہے کہ میراث میں نہیں پایا کوئی درہم اور نہ کوئی دینار، انہوں نے جو میراث میں چھوڑا ہے تو چند باتیں ہی اپنی باتوں میں سے چھوڑ آئے ہیں، سو جس نے کچھ باتوں میں سے لیا تو اس نے بڑا ہی کامل حصہ لیا۔ فقط''

اس روایت سے بتصریح معلوم ہوگیا کہ انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا ان کے علم کے البتہ علماء وارث ہوتے ہیں۔ سو بعینہ یہی مطلب اس حدیث کا ہے جو اہل سنت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اگر اس روایت کو مولوی عمار علی صاحب اور دیگر علماء شیعہ جھوٹا بتلاتے ہیں تو یہ روایت بدرجہ اولیٰ جھوٹی ہے مگر بایں لحاظ کہ وہ روایت صدیق ہے تو یہ روایت صادق ہے اور جھوٹوں کو سچوں کی بات کب پسند آتی ہے؟ اس روایت کو بھی جھوٹا بتلانے لگیں تو کیا عجب؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ حضرت امام جعفر صادق سے بھی برگشتہ ہوجائیں اور کلینی کو بھی تبرا کرکے اُن کے کردار کو پہنچائیں لیکن اس بات میں ان کو جب مشکل ہو کہ دین سے غرض ہو، اگر دین سے غرض ہوتی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی سے کیوں بگاڑتے؟ بہر حال وہ تسلیم کریں یا نہ کریں حضرت امام ہمام امام جعفر صادق کا قول ہمارے نزدیک صادق ہے اور ان کی بات ہمارے سر آنکھوں پر۔

الحاصل بشہادت کلمہ ''اِنَّمَا'' جو باقرار شیعہ بھی مفید حصر ہے۔ چنانچہ آیت ''اِنَّمَا ولیکم اللہ'' سے بزعم خود اسی بھروسے لڑتے ہیں۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء نے سوائے علم اور احادیث کے کوئی چیز میراث نہیں چھوڑی تو اس صورت میں لاجرم دونوں آیتوں میں میراث علمی ہی مراد ہوگی۔ باقی اس بات کا شیعوں کو اختیار ہے کہ اسے معنی حقیقی کہہ کر تعبیر کریں یا معنی مجازی اس کا نام رکھیں۔ اگر معنی حقیقی کہیں تو فبہا ورنہ مجاز کہیں اور مجاز بھی مجاز متعارف، تب بھی انہیں مرحبا اور اگر ہماری ضد میں مجاز غیر مشہور و غیر متعارف کے قائل ہوں تب بھی کچھ اندیشہ نہیں، چشم ما روشن دل ماشاد۔ اس لیے کہ باوجود اس قدر ہجوم قرائن صارفہ کے جو درباب مراد نہ ہونے وراثت مالی کے مذکور ہوئے اور باوصف اس قدر کثرت وجوہ ارادہ وراثت علمی کے جو مسطور ہوئیں۔ اگر وراثت علمی مراد ہو تو گو وہ وراثت مجازی ہی سہی تب بھی عین حق و صواب ہے۔

بلکہ اگر بالعکس ہو تو خطا فاحش اور غلط ہے اور قواعد دلالت کی رو سے غیر جائز۔ بہر حال آیت

"وَوَرِثَ" میں جیسے بقرائن و دلائل سابقہ وراثت مالی کا مراد نہ ہونا ثابت اور محقق ہوگیا تھا، ویسے ہی اب بوجوہ و دلائل مذکورہ یہ بھی تحقق ہوگیا کہ وراثت علمی مراد ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جیسے قرائن و دلائل مسطورہ بالا سے یہ متیقن ہوگیا تھا کہ آیت "وَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ط" میں وراثت مالی مراد نہیں۔ اب بشہادت روایت ثانی کلینی یہ تو ثابت ہوا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وراثت علمی مراد ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے اور بعد اداء شہادت اس روایت کے اس کی حاجت نہ رہی کہ کچھ قرائن اس بات کے بھی ذکر کیے جاویں کہ یہ آیت "وهب لی" میں بھی بدستور آیت "وَوَرِثَ" وراثت علمی ہی مراد ہے کیونکہ روایت مذکور سے بڑھ کر شیعوں کے حق میں اور کون سی دلیل دندان شکن ہوگی؟ اس روایت کے ذکر کرنے میں شیعوں کی وہی مثل ہوگئی جیسے کہا کرتے ہیں۔ اُنہیں کی جوتی اُنہیں کا سر۔

سورۂ مریم میں حضرت زکریا علیہ السلام صرف خلیفۂ نیک چاہتے تھے

مگر بنظر مزید تحقیق و خوشنودیٔ اہل سنت و پشیمانی شیعہ کچھ قدرے قلیل اور بھی چھیڑ چھاڑ سہی، اس لیے عرض ہے اگر لفظ ولی اور جملہ "وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآئِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا ط" کو جو آیت "فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ الخ" سے متصل ہی پہلے واقع ہے بنظر غور دیکھا جائے تو عیاں ہو جائے کہ مقصود حضرت زکریا علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام فقط طلب گاریٔ جانشین اور خواستگاری خلیفۂ نیک آئین تھی۔ اس دُعا کے وقت جس کا سورۂ مریم میں قصہ مذکور ہے۔ تمنائے عطائے فرزند نہ تھی گو کسی اور وقت میں یہ بھی دُعا مانگی ہو۔ اس لیے کہ لفظ "وَلِی" باتفاق اہل لغت بمعنی فرزند ہرگز نہیں آتا۔ البتہ بمعنی ولی عہد اور جانشین آتا ہے اور اس پر لفظ "مَوَالِیَ مِنْ وَّرَآئِیْ" کا قرینہ خود اسی پر دلالت کرتا ہے۔ کہ گو لفظ ولی مثل لفظ مولی بمعنی متعدد آتا ہو لیکن یہاں بھی معنی مراد نہیں کیونکہ "مَوَالِی" کے ساتھ لفظ "مِنْ وَرَآئِیْ" جو لگا ہوا ہے وہ بے اس کے کہ موالی سے معنی مذکور ہی مراد ہوں، صحیح نہیں ہوسکتا، اطمینان کے لیے ترجمہ مرقوم ہے۔

"یعنی اپنے بنی اعمام اور اقربا سے اندیشہ ہے یعنی یہ ڈر ہے کہ وہ لوگ منصف خلافت نبوت کے لائق نہیں، اگر وہ لوگ میرے جانشین ہوئے تو اُن سے حمایت احکام خداوندی تو معلوم۔ اُلٹی تبدیل اور تحریف کا کھٹکا ہے اور اپنی اولاد ہونے کی توقع نہیں جو یہی اُمید ہو کہ شاید کوئی فرزند لائق فائق پیدا ہو جائے کیونکہ میری عورت بانجھ ہے۔ اس لیے یہ عرض ہے کہ مجھے ایک ایسا جانشین عنایت فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو اور اس کو اپنی مرضی کے موافق کردے۔ فقط"

ظاہر ہے کہ سیاق میں موالی کے معنی بجز قائمان مقام اور خلفاء کے اور کچھ نہیں ہو سکتے تو لاجرم ولی بھی جو اُسی مادہ سے مشتق ہے بمعنی ولی عہد اور جانشین ہی ہوگا اور اگر بفرض محال ولی بمعنی فرزند بھی ہو تو موالی بھی بمعنی فرزندان ہی ہوگا اور ظاہر ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے اوّل تو کوئی فرزند تھا ہی نہیں۔ دوسرے اگر تھا بھی تو پھر تمنائے فرزند کس لیے تھی۔ وراثت کے قابل سب ہی فرزند ہوتے ہیں نیک ہوں یا بد۔

باقی رہا مضمون پسندیدہ الٰہی ہونے کا۔ اگر بالفرض بفرض محال کوئی فرزند بد اطوار ہی تھا؟ اور اسی لیے دوسرے فرزند نیک کی طلبگاری تھی تو اُسی کے حق میں یہ دُعا کیوں نہ فرمائی؟ اور موالی کے لیے جو دُعا نہ فرمائی تو یہ وجہ ہے کہ تمام برادری بلکہ تمام کنبہ کے ساتھ آدمی کو ایسی محبت نہیں ہوتی جو اُن کے لیے خواہ مخواہ دُعا ایسے تہہ دل سے نکلے۔ یہ معاملہ اگر ہوتا ہے تو اپنی ہی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے کہ اگر اُس کو بد اطوار دیکھے تو خواہ مخواہ جی تڑپ جائے اور اصلاح کی دُعا بے اختیار دل سے نکلے لیکن شیعوں کو بھی اتنا تو یقیناً معلوم ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی استدعا کے وقت تک کوئی فرزند نہ تھا نیک و بد تو معلوم ہوا کہ موالی سے وہی لوگ مراد ہیں کہ بظاہر اُن کے جانشین ہونے کا دھیان تھا کیونکہ یہ جملہ بظاہر غیر ہی کی طلب گاری کی علت ہے کیونکہ حاصل معنی بظاہر یہ ہیں کہ میرے تو فرزند ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کوئی جانشین ہی سہی اور جب جانشین کوئی غیر ہو تو پھر وراثت مندرجہ آیت بجز وراثت علمی اور وراثت منصبی کے صحیح نہ ہوگی۔

اور یہ بھی نہ سہی جب ولی بمعنی جانشین ہوا تو وراثت سے وراثت علمی ہی مراد ہوگی وہ اپنا ہو یا بیگانہ اور یہ دُعا کچھ مستبعد نہیں کیونکہ جیسے محبانِ دُنیا اور اہل دُنیا فرزند اور خلف رشید کے طلبگار ہوتے ہیں ایسے ہی ارباب علم و فضل اور مرشدان صاحب کمال کو خلیفہ راشد اور جانشین کامل کی تمنا ہوا کرتی ہے بلکہ ایسے لوگوں سے تمنائے فرزند البتہ مستبعد ہے اور یہ جو بعضے اور مواقع میں حضرت زکریا علیہ السلام سے دُعا میں بجائے ولی لفظ "ذُرِّيَّةً" جو باتفاق بمعنی اولاد ہے کلام اللہ میں منقول ہے تو اس سے یہ لازم نہیں کہ سورۂ مریم میں بھی اس دُعا سے اولاد ہی مطلوب ہو۔ اس لیے کہ مکرر سہ کرر دُعا کا اتفاق ہوا ہو۔

سورۂ مریم میں جس دُعا کا ذکر ہے اس دُعا کے وقت تک بسبب اس کے کہ اولاد کی طرف سے مایوس تھے، جانشین ہی کی تمنا ہو، مگر کچھ تو اس سبب سے کہ مایوس کو اسی چیز کی تمنا ہوتی ہے جس کی طرف سے مایوس ہو۔ نہیں تو مایوس ہی کیوں ہو، خداوند کریم ارحم الراحمین قاضی الحاجات مجیب الدعوات نے بوجہ خاطر داری حضرت زکریا علیہ السلام ساری تمنا پوری کر دی۔ کچھ اس وجہ سے مدنظر

رحمت وقدرت خداوندی عطائے فرزند ہوا ہو کہ اس دُعا کے بعد قبل قبولیت جب حضرت مریم علیہا السلام کو دیکھا ہو کہ بے موسم میوے خداوند کریم اُن کو پہنچاتا ہے تو ان کو بھی اُمید ہوئی ہو کہ مجھے بھی بے موسم فرزند عنایت ہو جائے تو ایسے ارحم الراحمین قدیر کی رحمت اور قدرت سے کیا بعید ہے؟ اس لیے اس وقت خاص فرزند ہی کی دُعا کی ہو اور خداوند مجیب الدعوات نے قبول فرمائی ہو۔ بہر حال مکرر دُعاؤں کا اتفاق ہوا ہو۔ اوّل (بسبب نہ ہونے سامان تولد کے) فقط جانشین ہی کی دُعا کی ہو۔ بعد میں یوں سمجھ کر کہ سامان کی خدا کو ضرورت نہیں اس بات کی دُعا کی ہو کہ جانشین بھی ملے تو فرزند ہی ملے۔

لیکن جس آیت میں کلام ہے اُس آیت میں ہم تسلیم نہیں کرتے کہ دُعاء فرزند ہی اس میں مقصود ہے اور بایں ہمہ جس جگہ لفظ ذریت ہے وہاں بھی اگر اولاد معنوی یعنی خلیفہ راشد اور مرید کامل اور شاگرد رشید مراد ہو تو کیا قباحت ہے؟ آخر شاگردوں اور مریدوں کو فرزند بول ہی دیا کرتے ہیں اور فرزند ناخلف کو کہا کرتے ہیں کہ یہ ہمارا بیٹا نہیں بلکہ خود خداوند کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو بوجہ ناخلفی یوں کہا کہ یہ تمہارا بیٹا نہیں اور وجہ ایسی بیان فرمائی یعنی بداطوار ہونا جس سے یوں معلوم ہو جائے کہ جو نیک اطوار ہیں سو وہ سب بمنزلہ برادر اور فرزند ہیں بلکہ سورۂ ہود میں جو حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے تو اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب متبعان نوح علیہ السلام کو اہل نوح فرمایا جس سے ایک دفعہ تو یوں سمجھ میں آئی کہ حضرت نوح علیہ السلام کے کنبہ کے لوگ مراد ہیں۔ اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو یہ حکم ہوا تھا کہ جب طوفان کی آمد ہو تو تم کشتی میں سب قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا چڑھا لیجیو اور اپنے اہل کو چڑھا لیجیو۔

اب ظاہر ہے کہ جانوروں کے اور اہل وعیال کے چڑھانے کو تو فرمایا اور سوا ان کے اور مسلمانوں کے چڑھانے کو نہ فرمایا اور یہ سب جانتے ہیں کہ خداوند کریم سے من جملہ محالات ہے کہ جانوروں کے بچاؤ کی تدبیر تو کی جائے اور مسلمانوں کے بچاؤ کا سامان نہ کیا جائے۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب مسلمانوں کو اہل وعیال نوح علیہ السلام ہی میں شمار کر لیا ہے۔ القصہ جب متبع اور مرید داخل اہل وعیال ہوئے اور فرزند ناخلف اہل وعیال سے خارج ہوئے تو ہو سکے ہے کہ ذریت سے مرید اور متبع ہی مراد ہو۔ چنانچہ عربیت کے محاورات میں اپنے زمرہ کے لوگوں کو آل اور ذریت کہہ دیا کرتے ہیں مگر انصاف یوں ہی ہے کہ سورۂ آل عمران میں جو دُعا زکریا علیہ السلام میں لفظ "ذُرِّيَّة" واقع ہے تو وہاں اولاد ہی مراد ہے پر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سورۂ مریم میں بھی لفظ ولی سے اولاد ہی مراد ہو۔ ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سوائے ایک بار کے اس باب

میں حضرت زکریا علیہ السلام نے دُعا ہی نہیں کی تو البتہ ٹھکانے کی بات ہے۔

پر مغایرۃ الفاظ یعنی یہاں اور الفاظ کا ہونا اور وہاں اور، اس بات پر شاہد ہے کہ چند بار دُعا کا اتفاق ہوا۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ولی کو فرزند پر محمول کیجئے۔ البتہ اگر بجز فرزند کے مراد لینے کے معنی صحیح نہ ہو سکیں تو ایک بات بھی ہے لیکن یہاں تو معاملہ بالعکس ہے۔ فرزند کے مراد لینے میں صحت معنی زائل ہو جائے تو عجب نہیں۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا کہ جملہ "کَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا ط" اسی طرف مشیر ہے اور اگر یوں کہئے کہ اس سیاق سے حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ غرض تھی کہ وجہ دُعا معلوم ہو جائے اور اس بات کی باز پرس کا اندیشہ نہ رہے کہ اولاد موجب فتنہ ہے۔ اس جلالت قدر پر کیا مناسب تھا کہ ایسی تمنائے نازیبا کو زبان پر لائے۔ دوئم جملہ "کانت امرتی عاقرا" سے مثل جملہ "وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا ط" جو اپنے بڑھاپے پر بھی دلالت کرتا ہے، اپنا عجز اور بے سروسامانی ثابت ہو جائے تاکہ باعث جوش رحمت اور موجب حرکت قدرت ہو، نہ یہ کہ بوجہ بے سروسامانی قطع اُمید مقصود ہے تو قطع نظر اس کے کہ ہم نے جو معنی بیان کیے ان معنی سے عمدہ نہیں تو کم تو کسی طرح نہیں اور ہم کو "لانسلم" کہنے کی اس سبب سے پھر بھی گنجائش ہے۔ اس سے تو بات ہاری ہی نہیں کہ ولی بمعنی فرزند تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ اس کا مصداق فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

غرض بہر حال یہ لفظ بمعنی ولی عہد اور جانشین ہے اور جب بمعنی ولی عہد اور جانشین ہوا تو وراثت سے وہی وراثت مقصود ہوگی جو ولی عہد اور جانشین کو سزاوار ہے تاکہ لفظ ولی کے اختیار کرنے کا بھی فائدہ معلوم ہو اور وہ ظاہر ہے کہ یہی وراثت منصب و وراثت علم ہے نہ وراثت مالی بطور معروف۔ جیسے بدلائل و قرائن مرقوم بالا آیت "فهب لی الخ" میں وراثت مالی کا مراد نہ ہونا معلوم ہو چکا تھا۔ اب بشہادت روایت کلینی و قرائن مذکورہ یہ بھی متحقق ہو گیا کہ وراثت علمی اور وراثت منصب ہی مقصود ہے اور وہ خلجان جو دربارۂ تخالف ہر دو آیت مشار الیہا و حدیث "ما ترکناہ صدقة" ظاہر بینان حدیث و کلام اللہ کے دِل میں کھٹکتا تھا بیخ و بنیاد سے اُکھڑ گیا اور بہر نہج اطمینان کامل ہو گیا کہ حدیث مذکور کسی آیت کے مخالف ہی نہیں جو اس وجہ سے اُس کو غلط کہا جائے اور دشمنان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بات بنے۔ گو در صورت غلط ہونے حدیث مذکور کے بھی شیعوں کا اہل سنت پر کچھ دباؤ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بحوالہ اشارہ آیت "یوصیکم اللہ" اور ہدایت آیت "ماافاء اللہ" مرقوم ہو چکا بلکہ اُلٹے شیعوں کو اپنے دن نظر آئے کہ اس حدیث کے مصدق ان کی حدیثیں بھی نکلیں۔

حدیث لَا نُوْرَثُ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کیلئے متواتر سے بھی بڑھ کر تھی

اور نیز اب اس کی کسی طرح حاجت نہیں کہ جیسے اس حدیث کا مخالف نہ ہونا ثابت ہوگیا۔ ویسے ہی (قطع نظر مخالف ہونے کے) فی حد ذاتہ اس کا صحیح ہونا بھی صحیح ہو جائے۔ مگر بنظر اثبات واظہار صدق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کچھ اس بات میں بھی رقم طرازی ضروری ہے اس لیے اوّل تو یہ معروض ہے کہ اس جگہ یہ عذر ہی بیجا ہے کہ اس حدیث کا راوی ایک ہی شخص ہے کیونکہ یہ بات تو وہاں دیکھی جاتی ہے کہ جہاں خود نہ سنا ہو اور در صورت یہ کہ کوئی شخص اپنے کانوں سے کوئی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لے تو اس کے لیے وہ ایک اپنا سننا لاکھوں کی خبر دینے سے زیادہ ہوگا کیونکہ راویوں کی کثرت کی جو روایات میں ضرورت ہوتی ہے تو اس لیے ہوتی ہے کہ جھوٹ ہونے کا وہم جاتا رہے اور جب اپنے کانوں سے سن لیا تو پھر جھوٹ کا احتمال ہی نہیں رہتا جو اس کے رفع دفع کی ضرورت ہو۔

بلکہ لاکھوں کے بیان سے گو یقین حاصل ہو جائے۔ پر ایسی تسلی اور اس قدر اطمینان نہیں ہوتا جس قدر دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کلکتہ، دلی، لندن، مکہ مدینہ کے ہونے میں گو ہمیں اس وجہ سے شبہ نہیں کہ ہزاروں لاکھوں بیان کرتے ہیں لیکن دیکھنے میں جو بات ہے وہ سننے میں نہیں۔ اس لیے مثل مشہور ہے کہ...... ع...... شنیدہ کے بود مانند دیدہ

جب دیکھنے کی چیزوں میں یہ حال ہے کہ اوروں کا کہا اگرچہ لکھو لکھا کیوں نہ ہوں۔ اپنے دیکھنے کے برابر نہیں تو سننے کی باتوں میں بھی یہی سمجھنا چاہیے کہ اوروں کی خبر اور روایت اگرچہ لکھو کھا کیوں نہ ہوں۔ اپنے کان کے سننے کے برابر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اظہر من الشمس ہے، پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے کان سے ایک حکم سن چکے ہوں تو ان پر یہ اعتراض کرنا کہ جس روایت پر انہوں نے عمل کیا بجز ان کے اس کا اور کوئی راوی نہیں۔ علماء شیعہ کی کمال سلامت عقل اور خوبیٔ فہم پر دلالت کرتا ہے۔ اتنی بات تو ہر ادنیٰ اعلیٰ جانتا ہے کہ حدیث نبوی اُس شخص کے حق میں جس نے بلا واسطہ اپنے آپ سنی ہو یقین بلکہ عین الیقین ہے۔ اُس کو اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے کسی دوسرے سے سنے یا نہ سنے۔

روایت کے درجات ان کیلئے ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع ورویت حاصل نہیں

اس لیے اجماع اُصولیین شیعہ وسنی اس بات پر ہے کہ خبر کا متواتر اور غیر متواتر اور واحد اور

مشہور وغیرہ ہونا بہ نسبت اُنہیں لوگوں کے ہے جنہوں نے نبی کو نہ دیکھا نہ اپنے آپ اُن کی بات سنی بلکہ اوروں کے واسطے سے اُن کی باتیں سنیں نہ کہ اُن کے حق میں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشم خود دیکھا اور بگوشِ خود اُن کے کلام سنے۔ ایسے لوگوں کے حق میں جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اپنے کانوں سن لی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات حدیث متواتر سے بڑھ کر ہے۔ سو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے سننے کے موافق آپ عمل کیا تھا کسی دوسرے کی گردن پر تو چھری نہیں رکھی۔ غرض یہ اعتراض تو بہر حال بے جا۔ ہاں بے اعتقادی کی وجہ سے اُن کی بات کا اعتبار نہ کرو تو یہ دوسری بات ہے۔ اُس کو اس اعتراض سے کیا علاقہ۔

روایت لانورث کے راوی دس بارہ صحابی ہیں

مع ہذا بحکم "کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" ہم بھی اُسی راہ چلتے ہیں جس راہ شیعہ چلیں۔ اگر راویوں کی کثرت ہی سے حدیث صحیح ہوتی ہے، اپنے سننے سے نہیں ہوتی تو سنئے جیسے روایات کے غلط ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اُس کے راوی کذاب و مفتری ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس کے معنی مخالف عقل یا معارض نقل صحیح ہوں۔ ایسے ہی صحت روایات کی بھی دو ہی صورتیں سمجھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے راوی صادق ثقہ دیندار ہوں۔ دوسرے یہ کہ قرآن یا احادیث صحیحہ اس کے معنوں کی موید ہوں اور عقل اس کے مدلول کے مساعد ہو۔ علیٰ ہذا القیاس جیسے راویوں کی قلت اور روایات صحیحہ کی مخالفت سے بقدر مخالفت اعتبار کی بھی قلت ہوتی ہے۔ چنانچہ سب جانتے ہیں ایسے ہی کثرت رواۃ و ناقلان اخبار اور موافقت اخبار و روایات صحیحہ سے بقدر موافقت اعتبار کو بھی ترقی اور زیادتی ہوتی ہے۔ اس لیے دونوں قسم کے وجوہِ صحت اور دونوں قسم کے وجوہِ اعتبار کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

راویوں کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ ایک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی اس کے راوی نہیں کوئی دس بارہ راوی ہیں اور وہ بھی ایسے ایسے کہ اُن کے ثانی آسمان و زمین نے بھی کمتر دیکھے سنے ہوں گے اور یہ جو علماء شیعہ فرماتے ہیں اور مولوی عمار علی صاحب بھی اُسے ہی گاتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک سے فقط ایسی روایت کو سنا کر جواب بتلایا کہ اس کا راوی ایک آدمی کے سوا یعنی اپنے آپ کے اور کوئی نہ تھا۔ دروغ محض اور سراسر بہتان ہے۔ اس لیے کہ اہل سنت کی کتابوں میں یہ حدیث بروایت زبیر بن العوام و حذیفہ بن الیمان و ابودرداء وابوہریرہ و عباس و علی و عثمان و عبدالرحمٰن بن عوف، و سعد بن ابی وقاص و عائشہ اُم المومنین و عمر بن الخطاب وابوبکر صدیق رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین صحیح و ثابت ہوئی ہے۔

اہل شیعہ کے نزدیک حضرت علی اور حذیفہ کا اعتبار لازمی ہے

اگر حضرت عائشہ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اس باب میں شیعوں کو اعتبار نہ تھا تو حضرت علی اور حضرت حذیفہ وغیرہم رضی اللہ عنہما نے کیا تقصیر کی ہے؟ جو ان کا بھی اعتبار جاتا رہا مگر شیعوں کے نزدیک اس سے زیادہ اور کیا خطا ہوگی کہ حق کہہ گزرے اور وہ بھی ایسے مقدمہ میں کہ جس میں کہنے سے مدعیان محبت شیعہ سراپا عداوت کی بات پھیکی پڑی ہے مگر بنظر خیر خواہی شیعہ باتباع آیت "کلا نمد ھؤلاءِ" علماء شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ سنیوں کی بدشگنی کے لیے اپنی ناک اپنے ہاتھ سے کیوں کاٹتے ہو۔ یہ بھی خبر ہے کہ معصوم کے قول کے نہ ماننے سے شیعہ بھی شیعہ نہیں رہتا بزعم خود کافر ہو جاتا ہے۔ درصورت یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس روایت میں نام آ گیا، پھر تو جی چاہے یا نہ چاہے ماننا ہی چاہیے۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بات سمجھئے کیونکہ اگر وہ معصوم نہ تھے تو در باب روایت معصوم ہی تھے۔ اس لیے کہ ملا عبداللہ شہیدی نے اظہار الحق میں انہیں حضرت حذیفہ کے حق میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان فرمائی ہے "مَا حَدَّثَکُمْ بِهٖ حُذَیْفَةُ فَصَدِّقُوْہ" یعنی جو کچھ حذیفہ تم سے کہا کرے اُسے سچ ہی سمجھو اور سچ ہی کہو۔

بخاری شریف میں حدیث لانورث بروایت حضرت امیر

اور اگر کسی کو یہ تامل ہو کہ اور ہوں تو ہوں حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے راوی نہ ہوں گے تو اپنی تصدیق کے لیے اصح الکتب اہل سنت سے وہ حدیث ناظرین کے پیش نظر کرتا ہوں جس سے بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بہ نسبت اس حدیث کے راوی ہونا ثابت ہو جائے۔

اخرج البخاری عن مالک بن اوس بن الحدثان النصری اِنَّ عُمر بن الخَطّاب قال بِمَحْضَرٍ مِنَ الصَّحَابَةِ فِیْهِمْ عَلِیٌّ وَالْعَبَّاس وَ عُثْمَان وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْف وَزُبیر بن العوام و سعد بن ابی وقاص اُنْشِدُکُمْ بِاللّٰهِ الَّذِیْ بِاِذْنِهٖ تَقُوْمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاهُ صَدَقَةٌ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلٰی عَلِیٍّ وَالْعَبَّاسِ فَقَالَ اُنْشِدُکُمَا بِاللّٰهِ هَلْ تَعْلَمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذٰلِکَ قَالَا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ.

"حاصل یہ ہے کہ امام بخاری نے مالک بن اوس بن الحدثان النصری کے واسطے سے روایت

کیا ہے کہ تحقیق حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مجمع میں جس میں حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عثمان اور عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص بھی تھے یوں فرمایا کہ میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں اور اس خدا کو یاد دلا کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے آسمان و مین قائم ہیں، کیا تم اس بات کو جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے، اُن سب نے کہا ہم خدا کے روبرو کہتے ہیں کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے، پھر حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ کہا کہ میں تم دونوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں اور خدا کو یاد دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے؟ اُن دونوں صاحبوں نے فرمایا کہ ہم خدا کے روبرو کہتے ہیں کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے۔فقط''

القصہ اس روایت سے صاف معلوم ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور وہ بھی یوں نہیں بقسم روایت کیا ہے۔ سو اگر اس روایت کی تسلیم میں یہ عذر تھا کہ اس حدیث کے ایک ہی راوی ہیں خود ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جس حدیث کا کل ایک ہی راوی ہو اور اس پر کلام اللہ کی بھی مخالفت ہو تو اس پر عمل کرنا ہرگز درست نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کلام اللہ کو چھوڑ کر ایک اپنی ہی روایت پر عمل کیا تو قطع نظر اس کے کہ جہاں علماء شیعہ مخالفت سمجھتے ہیں وہاں مخالفت نہیں موافقت ہے۔فقط اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ چنانچہ ظاہر ہو چکا اور پھر قطع نظر اس سے کہ یہ ایک کی روایت اور زیادہ کی روایت کا فرق وہاں ہے جہاں اس روایت کو مروی عنہ سے اپنے کانوں سے نہ سنا ہو اور در صورت یہ کہ اپنے کانوں سے سن لیا ہو، تو گو یہ سننے والا ایک ہی ہو پر لاکھوں کے بیان سے زیادہ ہے۔

بفضلہٖ تعالیٰ یہ عذر بھی مرتفع ہوگیا کیونکہ اس روایت کے اس قدر راوی ہیں کہ کمتر روایات کے اس قدر راوی ہوں گے اور پھر ان میں بھی اکثر وہ لوگ جو مبشر بالجنۃ ہیں اور پھر ان میں سے بھی ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ تو ایسے ہیں کہ اُن اکیلوں کی روایت لاکھوں کے برابر ہے، خصوصاً شیعوں کے نزدیک کہ اُن کے نزدیک اُن کی روایت کا غلط ہونا محال ہے۔ چہ جائیکہ موکد بالقسم ہو۔

بہر حال شیعوں کے طور پر تو اس روایت کی صحت اور اس روایت کا اعتبار کلام اللہ کی صحت اور اعتبار سے کم نہیں، پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کب ہو سکے ہے کہ ایسی روایت پر عمل نہ کریں؟

اور اس کا اعتبار نہ کریں اور اہل سنت کے طور پر خود ظاہر ہی ہے کہ اس کے سب راوی بڑے بڑے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ایک کا کہنا بھی ہزاروں کے کہنے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ روایت بھی اس درجہ کی صحیح اور معتبر ہے کہ قطعیت میں کلام اللہ کی برابری کرتی ہے۔

کیونکہ یہ جماعت کی جماعت جس کا مذکور ہوا قطع نظر اس کے کہ ایک جماعت کثیر ہے۔ ان میں ایک ایک ایسا ہے کہ اس کا کہا مفید یقین اور خبر متواتر کی برابری کرتا ہے۔ چہ جائیکہ جس کے مجموعہ کو لحاظ کیجئے۔ القصہ بوجہ کثرت رواۃ وصدق و دیانت راویان تو صحت و اعتبار حدیث "ما ترکناہ صدقۃ" کا یہ حال ہے کہ اوّل تو اس روایت کے اس قدر راوی ہیں کہ کمتر روایات کے اس قدر راوی ہوں گے اور پھر وہ بھی ایسے ایسے جلیل القدر صحابی اور اگر بوجہ موافقت آیات و احادیث دیکھئے تو آیات کا تو یہ حال ہے کہ خود آیت "یوصیکم اللّٰہ" ہی جس کی مخالفت کے بھروسے علمائے شیعہ بہت کودتے تھے۔ اس کے موافق ہے مخالف نہیں۔ چنانچہ اس طرح سے مرقوم ہو چکا کہ ناظرین کو ان شاء اللہ شبہ نہ رہے گا۔

احادیث و آیات میں کوئی تخالف نہیں بے عقلی سے کہیں وہم ہو جاتا ہے

اور اگر کسی کو اس پر بھی مخالفت معلوم ہوگی تو ایسے عقل کے اندھوں سے یہ ڈر ہے کہ جن احادیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ اور صدقات کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے اُن احادیث کو بدرجہ اولی آیت "انما الصدقات للفقراء والمساکین" کے مخالف سمجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس بات کا طعن کرنے لگیں کہ (نعوذ باللہ) خلاف کلام اللہ عمل کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر و فاقہ مشہور و معروف ہے اور تمہارا یہ دُعا کرنا کہ الٰہی مجھ کو جیتے جی اور مرتے دم تک مسکین ہی رکھ اور قیامت کو زمرۂ مساکین ہی میں اُٹھائیو۔ سب کو معلوم ہے اور جب آپ فقیر و مسکین بلکہ فخر الفقراء والمساکین ہوئے تو آپ کو زکوٰۃ و صدقات کا لینا بدرجہ اولی درست ہوا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت "انما الصدقات" میں کوئی اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کا نہیں پایا جاتا، بخلاف آیت "یوصیکم اللّٰہ" کے کہ اس میں خطاب کا اُمت کے ساتھ مخصوص ہونا جو بقرینہ غیبت صیغہ یوصی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہو چکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے مخصوص ہونے پر شاہد کامل ہے۔

اور جب باتفاق فریقین وہ احادیث جو زکوٰۃ و صدقات کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ آیت "انما الصدقات" کی مخالف نہ ہوئیں بلکہ موافق ہوئیں تو

حدیث "ما ترکناہ صدقۃ" بدرجۂ اولیٰ موافق ہوگی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم میراث سے مخصوص ہونا سیاق سورۃ اعنی شروع سورت سے تو معلوم ہوتا ہی تھا، چنانچہ مرقوم ہو چکا ہے۔ خود آیت "یوصیکم اللّٰہ" سے بھی مفہوم و معلوم ہوتا ہے۔ بخلاف آیت "انما الصدقات" کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس کے حکم سے مخصوص ہونا اگر معلوم ہو تو بتکلف "ومنھم من یلمزک فی الصدقات" سے جو انَّمَا الصَّدَقَات" سے بفاصلہ چند آیت مقدم ہے معلوم ہو کیونکہ ماحصل اس کا یہ ہے" کہ بعض منافقین میں سے وہ لوگ ہیں کہ اے پیغمبر تجھ پر زکوٰۃ بانٹنے میں طعن کرتے ہیں، اگر انہیں بھی مل جائے تو راضی ہو جائیں اور نہ ملے تو غصہ میں بھر جائیں۔" سو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب تقسیم زکوٰۃ تھا۔ پھر جو "انما الصّدقات" فرمایا تو معلوم ہوا کہ یہ حق فقراء و مساکین ہے۔ منافقین کے باپ کا اس میں اجارہ نہیں۔

القصہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب تقسیم اور فقراء اور مساکین کے مصرف ہونے اور منافقین کے مستحق نہ ہونے کو لحاظ کیا جائے تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم سے خارج ہیں اور یہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص کسی مسکین کو کچھ دے کر یوں کہے کہ اس کو مساکین پر تقسیم کر دینا اغنیاء کو نہ دینا تو گو وہ مسکین بھی جس کو وکیل تقسیم کیا ہے مسکین ہے لیکن بحکم شہادت فہم عرف وہ شخص اس حکم سے خارج ہے اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آیت "واعلموا انما غنمتم من شیء" میں اور آیت ما افاء اللہ میں "فللرّسول" شمول کہنے کی ضرورت ہوئی۔ القصہ آیت "اِنَّمَا الصَّدقات" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص ہونا فقط ایک آیت "ومنھم من یلمزک فی الصّدقات" سے جو جملہ منفصل اور قرینہ خارجی ہے بدقت اور بتکلف سمجھ میں آتا ہے اور آیت "یوصیکم اللّٰہ" سے آپ کا مخصوص ہونا بے تکلف قرینہ داخلی خارجی دونوں سے سمجھ میں آتا ہے۔

تو اگر وہ احادیث جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے آیت "انما الصدقات" کے مخالف نہیں موافق ہیں تو حدیث "ما ترکناہ صدقۃ" آیت "یوصیکم اللّٰہ" سے زیادہ تر موافق ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس آیت "وورث سلیمان داؤد" اور آیت "فھب لی من لّدنک" سے بھی حدیث "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" مخالف نہیں موافق ہے کیوں کہ ان آیات میں میراث علمی اور میراث منصبی مراد ہے، میراث مالی مراد نہیں۔ چنانچہ بدلائل واضحہ واضح ہو گیا اور حدیث "ما ترکناہ صدقۃ" میں میراث مالی مراد ہے میراث

علمی مراد نہیں۔ باقی رہی احادیث سے موافقت۔ سواس کا حال یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک تو یہ حدیث "ما ترکناہ صدقۃ" اس درجہ کو صحیح ہے کہ اس کی صحت کے دریافت کرنے کے لیے کسی اور حدیث صحیح کی موافقت کی ضرورت نہیں بلکہ اور حدیثوں کے صحت کی میزان اور معیار اس کو کہئے تو زیبا ہے۔ بایں ہمہ یہی حدیث کئی طریقوں سے یعنی سندوں سے مروی ہے اور وہ سب کی سب صحیح ہیں اور یہی معنی ہیں احادیث صحیحہ کے موافق ہونے کے۔

کیونکہ حدیث کی صحت باعتبار سند صحت کے ہوتی ہے اور حدیث کا تعدد باعتبار تعدد سند کے ہوتا ہے۔ اگر متن یعنی ایک عبارت کئی سندوں سے مروی ہو تو اس حدیث کو پھر ایک حدیث نہیں کہتے ہیں۔ اُس کی تعداد بمقدار تعداد اسانید ہوگی اور جب وہ ایک حدیث نہ ہوئی بلکہ متعدد ہوئیں تو بایں وجہ کہ متن ایک ہے ایک دوسرے کے موافق ہوگی اور چونکہ حدیث "ما ترکناہ صدقۃ" کا یہی حال ہے بلکہ بعض بعض الفاظ متن میں بھی فرق ہے گو معنی باہم موافق ہی ہوں تو بیشک اُن کو ایسی چند حدیثیں کہیں گے کہ ایک دوسرے کے موافق ہیں اور پھر جب سب سندیں صحیح ہوئیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث احادیث صحیحہ اہل سنت کے موافق ہے۔

روایات شیعہ سے لانورث کی تائید

مگر اس سے کام نہیں چلتا کیونکہ اس کی صحت میں اگر شک ہو تو شیعوں کو ہو۔ اس لیے لازم یوں ہے کہ احادیث صحیحہ اور روایات معتبرہ شیعہ اس کی صحت پر شاہد لائیے۔ لہٰذا معروض خدمت علمائے شیعہ بلکہ عوام وخواص امامیہ یہ عرض ہے کہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک کتاب کافی کلینی سے بڑھ کر کتب احادیث میں کوئی کتاب معتبر نہیں۔ سو وہ علامہ کلینی ہی کی روایت تھی جو بروایت ابوالبختری امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہوا ہے:

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ وَذٰلِکَ اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوْرِثُوْا وَفِیْ نُسْخَۃٍ لَمْ یَرِثُوْا دِرْھَمًا وَّلَا دِیْنَارًا وَاِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِیْثَ مِنْ اَحَادِیْثِھِمْ فَمَنْ اَخَذَ بِشَیْءٍ مِّنْھَا فَقَدْ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔

اور چونکہ ترجمہ اس کا مرقوم ہو چکا ہے تو مکرر ترجمہ کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پر اتنا لکھنا ضروری ہے کہ اس روایت میں بنسبت روایت صدیق کے کوئی بات کم نہیں بلکہ اتنی بات زیادہ ہے کہ اس روایت میں حضرت امام ہمام امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بنظر بدگمانی شیعہ اس کی وجہ بھی بیان فرما دی ہے کہ انبیاء کے علم کے تو وارث ہوتے ہیں اور ان کے مال کا کوئی وارث نہیں۔
سو درصورت یہ کہ نسخہ "لَمْ یَرِثُوْا" صحیح ہو تب تو مطلب ظاہر ہے کیونکہ حاصل یہ ہوگا کہ انبیاء

کے جو فقط علماء ہی وارث ہیں کوئی ان کے اموال متروکہ کا وارث نہیں ہوتا تو وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی تو کسی سے کچھ درہم و دینار میراث میں نہیں لیا اور اگر نسخہ "لَمْ یُوْرِثُوْا" صحیح ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ علماء کے وارث الانبیاء ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء نے درہم و دینار کچھ چھوڑا ہی نہیں جو اس میں میراث جاری ہو۔ انہوں نے فقط احادیث میراث میں چھوڑی ہیں۔ باقی رہا فدک وغیرہ سو فدک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک میں ہی نہ تھا جو یوں کہئے کہ فدک چھوڑ کر آپ اس جہان سے تشریف لے گئے۔ چنانچہ بشہادت آیت ما افاء اللہ بخوبی روشن ہو چکا ہے۔

وصال کے وقت کوئی چیز آپ کی ملکیت نہ تھی

اور سوائے اُس کے اور اشیاء مثل لباس مرکب مکان کے، سو مکان آپ کے پاس فقط حجر ہائے ازواج مطہرات تھے۔ سو گواہی کلام اللہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مملوک ازواج ہو چکے تھے۔ اس لیے کہ خداوند کریم یوں ارشاد فرماتا ہے "وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ" یعنی اے پیغمبر کی بی بیو اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور یوں نہیں فرمایا "وَقَرْنَ فِیْ بیوت النبی" یعنی نبی کے گھروں میں ٹھہری رہو تو معلوم ہوا کہ وہ حجرے ازواج کے ہو چکے تھے۔ بوجہ ہبہ مملوک ازواج ہوئے ہوں یا اور کسی وجہ سے اور یہ احتمال کہ سکونت کے گھر کو تمام عالم رہنے والوں کا گھر کہا کرتے ہیں۔ اگرچہ مالک اس کا کوئی اور ہو۔ ادھر کرایہ کے مکان کو بھی اپنا کہا کرتے ہیں قطع نظر اس کے کہ یہ مجاز ہو اور بے ضرورت مجازی معنی مراد لینے کی اجازت نہیں اور پھر اس سے قطع نظر کیجئے کہ خدا کو کیا ضرورت ہوئی کہ "فی بیوت النبی" نہ فرمایا؟ اور یہ فرمایا جو شیعوں کے لیے اور موجب دُشواری ہے امام کی بات غلط ہو جائے گی ہم کو تو ان معنی کی اپنے طور پر ضرورت نہیں کیونکہ تا حین حیات مملوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو بحکم حدیث لا نورث الخ وہ صدقہ ہو گئے۔ پھر ازواج کے تصرف میں ایسے تھے جیسے آمدنی فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے صرف میں آتی تھی ہم کو تو ان معنی کے کہنے میں فقط تصدیق حدیث حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نظر ہے۔

سو اگر آیت "وَقَرْنَ فی بیوتکنّ" کے وہ معنی نہیں جو ہم نے عرض کیے تو شیعوں ہی کو دُشواری ہے، ہمیں کیا غرض؟ مکانات بھی وقت وفات آپ کے نہ تھے۔ ہاں البتہ لباس اور مرکب کے باب میں کھٹکا باقی رہا مگر قوت ایمان کی بات تو یوں ہے کہ حضرت امام کے اس حصر کو کہ انبیاء نے بجز احادیث کے میراث میں کچھ چھوڑا ہی نہیں، صحیح سمجھ کر ہرگز متامل نہ ہوجے اور یوں سمجھئے کہ گو بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیاء مذکورہ کو دُنیا میں چھوڑا لیکن شاید کسی کو اپنے

جیتے جی دے گئے ہوں اور پھر جو ان کے پاس موجود تھیں تو بوجہ عاریت ہوں۔

القصہ اپنی سمجھ میں نہ آنے کے باعث حضرت امام کی بات کی تکذیب نہ کیجئے، ہاں اپنی سمجھ اور عقل کی تغلیط کیجئے لیکن اطمینان قلب مؤمنین کے لیے یہ اشارہ مرقوم ہے کہ "لَمْ یورثوا" کے یہ معنی نہیں کہ آپ دُنیا میں کچھ چھوڑ ہی کر نہیں گئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ میراث میں نہیں چھوڑ گئے۔ سو اس صورت میں بجز اس کے نہیں بن پڑتی کہ یہ روایت جس کے راوی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، یعنی حدیث "لَا نورث ما ترکناہ صدقۃ" صحیح ہو اور حضرت امام نے بوجہ واقفیت اس وصیت کو حصر کر کے یہ فرما دیا ہو کہ انبیاء نے بجز احادیث کے میراث میں کچھ نہیں چھوڑا۔ بہر حال روایت حضرت امام ہمام امام جعفر صادق روایت حضرت صدیق اکبر سے اس بات میں کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا کچھ کم نہیں بلکہ بہر نہج زیادہ ہے۔ اوّل تو آپ نے بطور حصر یوں فرما دیا کہ انبیاء نے بجز احادیث میراث کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔

صادق اور صدیق کی روایت کا فرق

حدیث ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ بات نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت امام کے حصر سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اوّل تو یہ کہ یا تو انبیاء علیہم السلام نے کچھ چھوڑا ہی نہیں یا چھوڑا ہے تو وہ میراث کے قابل نہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے میراث میں احادیث کو چھوڑا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت سے فقط اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اموال متروکہ انبیاء قابل میراث نہیں۔ مع ہذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس دعوے کے ساتھ کہ متروکہ انبیاء قابل میراث نہیں کوئی دلیل نہیں اور حضرت امام نے اس کی دلیل بھی فرما دی ہے اور اپنے دعویٰ کو موجہ کر دیا۔ سو سنیوں کی طرف سے تو آپ کو اطمینان ہی تھا۔ اس وجہ کا طرہ جو ساتھ لگایا تو اسی وجہ سے لگایا ہوگا کہ حضرات شیعہ کی طرف سے آپ کی خاطر جمع نہ تھی، ان کے نفاق سے عیاں تھا کہ میری بات سیدھی انگلیوں حضرات شیعہ ماننے والے معلوم نہیں ہوتے اس لیے اپنے دعوے کو موجہ کر کے بیان فرما دیا تھا۔

لیکن آفرین ہے شیعوں کو کہ حضرت امام کی بات کے نہ ماننے سے گو ایمان ہی خاک میں رُل گیا مگر کیا امکان جو ہیٹوں سے باز آ جائیں، اپنی وہی مرغی کی ایک ٹانگ گائے جاتے ہیں۔ خیر خداوند کریم ہی ان کو سمجھے کہ نہ یہ پیر کے نہ فقیر کے، نہ اصحاب کے، نہ اماموں کے...... بالجملہ جائے شرم ہے کہ جن کی آڑ میں یہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم پر طعن کرتے تھے۔ وہ خود ہم صفیر اصحاب ہیں۔ یہ وہی مثل ہے کہ "مدعی سست اور گواہ چست" وائے بر حال شیعہ کہ اصحاب کو برا کہہ کے تو نور

ایمان ہی کھویا تھا۔ پر آئمہ کی بات نہ ماننے سے ایمان ہی کھو دیا کیونکہ بزعم شیعہ منکر قول آئمہ کا کافر ہے۔ خصوصاً جب کہ ایسی معتبر کتابوں کے واسطے سے معلوم ہو جائے جن کا نام کافی کلینی، الفصہ حدیث ''ما ترکناہ'' بشہادت حدیث کلینی مذکور جو صحیح ہے اصح ہے۔

کلینی کی دوسری موید حدیث

مع ہذا ایک اور حدیث کلینی ہی اس کے موید ہے۔ چنانچہ وہ بھی مرقوم ہو چکی لیکن بنظر احتیاط اسے بھی مکرر لکھے دیتا ہوں۔ ''رَوَی الکلینی عَنْ اَبِیْ عَبْدَ اللّٰہ اِنَّ سُلَیْمَانَ وَرِثَ دَاوٗدَ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَرِثَ سُلَیْمَانَ'' ترجمہ اس کا مرقوم ہو چکا، اس لیے یہاں اسی قدر مرقوم ہونا مناسب ہے کہ اس سے اتنی بات معلوم ہوئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی میراث، میراث علم ہے، باقی رہا دلائل عقلیہ اور قرائن عقلیہ سے حدیث مذکور کا صحیح ہونا۔ سو اس کا بیان بھی اوپر ہو چکا ہے مگر بطور یاددہانی فقط اشارتاً یہ بات مرقوم ہے کہ اوّل تو انبیاء اپنی قبور میں زندہ موجود ہیں اور زندہ کے مال میں میراث جاری نہیں ہوتی۔ ہاں اگر وہ اشیاء ان کے کارآمد نہ رہیں اور اس لیے وہ ان اشیاء کو کسی موقع میں صرف کرنے کو کہیں تو ان کے خدام کو لازم ہے کہ ان اشیاء کو اُسی طرف صرف کر دیں۔ سو در صورت یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو باتفاق حیات النبی ہیں، گوشۂ قبر میں زندہ موجود ہیں۔

اور پھر دلائل بھی اس پر شاہد ہوں۔ چنانچہ اوراق سابقہ میں مذکور ہوئے تو میراث تو آپ کے متروکہ میں جاری نہ ہوگی لیکن آپ کے خلیفہ کے ذمہ جو بمنزلہ کارکن نبوی ہے کیونکہ خلیفہ اُسے ہی کہتے ہیں، یہ بات لازم ہوگی کہ درباب اموال نبوی جویائے اشارات نبوی رہے، سو چونکہ اشارہ نبوی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جو خلیفہ راشد تھے۔ اس باب میں بایں طور معلوم ہوا کہ ''ما ترکناہ صدقۃ'' ہے تو ان کے ذمہ اُس کی تعمیل لازم پڑی اور کوئی ناقدر شناس باوجود دلائل مسطورہ سابقہ حیات نبوی کو نہ مانے تو ان کے لیے دوسری ہدایت عقلی موجود ہے۔ اگر ہدایت پر آنا ان کو منظور ہو، وہ یہ ہے کہ انبیاء خدا کے سامنے اپنے آپ کو مالک ہی نہیں سمجھتے۔ پھر وہ کیونکر نہ کہیں کہ ہمارے متروکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی کیوں کہ وہ ہماری ملک ہی نہیں خدا کی ملک ہے، ہمارے پاس فقط مستعار تھا۔ جب ہم ہی نہ رہے تو عاریت کہاں رہی؟ اب لازم یوں ہے کہ جیسے یہ خدا کا مال ہے، خدا ہی کی راہ میں صرف ہونا چاہیے۔

مگر چونکہ یہ بات سابق میں مشروحاً بیان ہو چکی ہے تو یہاں اس قدر بھی بہت ہے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فدک نہ دینا بوجہ ظلم و عناد ہو یا بوجہ حقانیت مگر چونکہ حضرت

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی اس میں سے کچھ نہیں دیا اور علیٰ ہذا القیاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی نہیں دیا حالانکہ موافق قانون میراث یہ دونوں بیبیاں بھی وارث تھیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے تھیں، بلکہ ان سب میں معزز اور ممتاز تو معلوم ہوا کہ یہ نہ دُنیا محض باتباع امر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھا بوجہ عناد و ظلم و فساد نہ تھا ور نہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی پر ظلم کرتے تو کرتے اپنی بیٹیوں پر نہ کرتے۔

تارک الدنیا اور زاہد، غاصب نہیں ہوسکتا

مع ہذا جو لوگ غصب کرنے والے ہوتے ہیں وہ لوگ بندہ ہوا و ہوس ہوتے ہیں تارک الدنیا اور زاہد نہیں ہوتے جو لوگوں کے اموال چھین تو لیں پر بوجہ زہد و تقویٰ و ترک دُنیا اپنی خواہشات نفسانی کو مار کر بیٹھ رہیں اور اسے ہاتھ نہ لگائیں، پھر جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک کو نہ چھیڑا اور اسے ہاتھ نہ لگایا، نہ اپنے خرچ میں لائے، نہ اولاد کو نہ اہل و عیال کو دیا تو کیا وجہ پیش آئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فدک کا نہ دینا فقط اسی وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے باب میں ایک حکم ناطق سن چکے تھے اور ان سب کو جانے دیجئے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت تو شاید شیعان فریب باز بحکم المرء یقیس علی نفسہ فریب کا بھی احتمال کریں؟

ترکہ نبوی میں تمام اہل بیت کا عمل

حضرات آئمہ اور اہل بیت کی طرف تو یہ گمان نہ ہوگا۔ سو ان کا حال سنئے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے لے کر آخر تک سب اس بات میں شریک ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترک جب ان کے ہاتھوں پڑا تو حضرت عباس اور ان کی اولاد کو اس میں دخل نہ دیا، ان سب کو نکال باہر کیا اور ازواج مطہرات کا بھی حصہ نہ دیا حالانکہ نصف ترکہ کے یہ دونوں فریق مالک ہوتے تھے۔ پس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری ہوتی تھی تو بزرگان اہل بیت کیوں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی راہ ہو لئے؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اگر مرتکب ظلم شنیع اور جور قبیح ہوئے تھے تو چنداں مستبعد نہ تھا لیکن ان بزرگواروں کو جو شیعوں کے نزدیک معصوم اور اہل سنت کے نزدیک محفوظ ہیں، کیا بلا پیش آئی کہ سب کے سب ظلم عظیم کے روادار ہوئے۔

اس لیے کہ باجماع اہل سیر و تواریخ و باتفاق علماء حدیث ثابت اور محقق ہے کہ متروکہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم خیبر اور فدک وغیرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے قبضہ میں تھا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انجام کار حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قبضہ اُٹھا دیا، فقط انہیں کا قبضہ رہا، پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں رہا، ان کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں رہا۔ بعدازاں حضرت امام زین العابدین اور حضرت حسن بن حسن کے تحت تصرف رہا۔ دونوں اسے لیتے دیتے رہے، ان کے بعد حضرت زید بن حسن برادر حسن بن حسن کا اس پر تصرف ہو گیا، اس کے بعد مروان کے پنجوں میں پڑ گیا، پھر برابر مروانیوں کے قبضہ میں رہا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بادشاہت کی نوبت آئی چونکہ وہ خلیفہ عادل اور بادشاہ انصاف پرور تھے، انہوں نے کہا جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو مانگنے پر بھی نہ دی ہو، میرا اس میں کیوں کر حق ہو سکے۔ اس لیے انہوں (یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) نے پھر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کو اس کا متولی کر دیا۔

پس آئمہ معصومین اور بزرگان اہل بیت کے عمل درآمد سے عیاں ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ وہ وقف ہوتا ہے اس لیے اولاد آئمہ معصومین نے ان لوگوں کو دخل نہ دیا جو بقانون میراث وارث تھے اور بالیقین محقق ہو گیا کہ حدیث صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یعنی "لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" بلا غبار صحیح و درست ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو متروکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ دینا ایسا ہے جیسا کہ آئمہ اہل بیت نے ازواج مطہرات اور عم بزرگوار اور بنی عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیا بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جانب دلائل حق پرستی زیادہ تر ہیں کیونکہ آئمہ اہل بیت کی نسبت انواج مطہرات اور بنی عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ دینے میں ظاہر بینان کم فہم کو مثل خوارج یہ بھی شبہ ہو سکتا ہے کہ نفع کی چیز دیکھ کر نہ دیا کیونکہ فدک وغیرہ گو وقف تھا لیکن خرچ اہل بیت مقدم تھا۔ مع ہذا طعن و تشنیع کا بظاہر چنداں اندیشہ نہ تھا کیونکہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے وارثوں کے کچھ غیر نہ تھے، ایسی جگہ چیز کے پھنس جانے اور خرچ ہو جانے کو یونہی کہا کرتے ہیں کہ گھی کہاں گیا کھچڑی میں۔

لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جانب نفع کا تو یہ حال ہے کہ قاعدہ کی رو سے ایک حبہ کی توقع نہ تھی کیونکہ نہ وارث ہو سکتے تھے من جملہ مصارف مندرجہ آیت "ماافاء اللہ" تھے کیوں کہ آپ کچھ مسکین فقیر نہ تھے اور پھر ظاہر میں بھی باتفاق فریقین ایک حبہ تک کا تغلب اس میں نہیں کیا۔ آئندہ سوائے مردمان فہمیدہ اور عاقلان سنجیدہ کے کسی سے کلمہ خیر کی توقع نہ تھی، بلکہ اُلٹا عقل کے

دشمنوں سے یہ اندیشہ تھا کہ یوں کہیں گے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ہوتے ہی یہ آنکھیں بدل لیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بھی لحاظ نہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ دبا بیٹھے۔ چنانچہ بلاکم وکاست یہی ظہور میں آیا۔ غرض کہ کسی طرح کی منفعت کی اُمید نہ تھی۔ اگر تھی تو تمام عمر کی سوختگی کی اُمید تھی۔

القصہ گو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی وارثان نبوی کو متروکہ نبوی بوجہ تعمیل ایمائے نبوی نہیں دیا اور آئمہ اہل بیت نے بھی بوجہ مذکور متروکہ نبوی، وارثان نبوی کو نہیں دیا لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہ دینا ایک مجاہدہ عظیم تھا اور آئمہ اہل بیت کا نہ دینا فقط نہ دینا ہی تھا۔ خصوصاً جب کہ نیاز مندی و اخلاص و محبت صدیق اکبر اور حقوق اہل بیت خصوصاً حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو لحاظ کیجئے اور پھر اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ایک دفعہ بمقتضاء ئے بشریت ناخوش ہو جانے کو دیکھئے تو رموز شناسان طریقہ پر واضح ہو جائے گا کہ ایسے وقت میں پابند حکم نبوی رہنا ایسے ہی کامل الایمان، مستقیم العقل، سراپا اتباع نبوی کا کام ہے جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، لیکن شیعوں کی عقل کی آنکھ پھوٹ گئی ہے، حق و باطل کی تمیز کیونکر کریں گے مگر اس میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کیا قصور؟

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

جیسے اندھے کو اندھیرا تو اندھیرا نور بھی اندھیرا ہی نظر آتا ہے، ایسے ہی شیعوں کو بسبب عداوت کے اندھے ہو جانے کے باعث خوبیاں بھی برائیاں ہی نظر آتی ہیں۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد   عیب نماید ہنرش در نظر

الحاصل بقرائن عقلیہ واضح ولائح ہو گیا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نہ دینا فقط بوجہ اتباع امر نبوی تھا اور یہ حدیث یعنی "لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ" صحیح بلا غبار ہے۔ سوائے اتباع نبوی اور پیروئ حدیث مذکور کسی قسم کا احتمال ان کی جانب نہیں ہو سکتا اور سابقاً بجہت کثرت رواۃ اور صدق و دیانت جملہ راویان و ہجوم قرائن نقلیہ اس حدیث کا اعتبار اور اس کی صحت معلوم ہو چکی تھی تو اب کسی کو در بارہ صحت حدیث مذکور کسی وجہ سے مجال دم زدن باقی نہ رہی۔ اگر کسی کو کچھ حوصلہ ہو تو بسم اللہ، اور یہ بھی تحقق ہو گیا کہ مولوی عمار علی صاحب کا در باب صحت حدیث مذکور یوں رقم فرمانا کہ:

"اوّل تو یہ روایت خلاف قرآن ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں سے نہ بیٹی سے نہ اپنی بیبیوں سے کسی سے نہ کہا کہ میرا مال صدقہ ہے تم کو نہیں پہنچتا، تم دعویٰ نہ کرنا اور جو خدا کا حکم ان کے واسطے تھا، اس کو ان سے چھپا رکھا اور ایک اجنبی شخص سے کہ اس کو کسی طرح کا

دخل پیغمبر خدا کی وراثت میں نہ تھا، اس کے کان میں کہہ دیا اور کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا۔"

ایک سخن ابلہ فریب یا گفتگوئے ابلہانہ ہے کیوں کہ جسے وہ خلاف قرآن کہتے ہیں وہ حقیقت میں موافق قرآن ہے۔ چنانچہ مفصل معلوم ہو چکا پر سمجھ نہ ہو تو کسی کا کیا قصور؟

مصرع:............سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

اور جہاں وہ یوں کہتے ہیں "کسی دوسرے صحابی سے بھی نہ کہا" وہاں دس بارہ سے تو روایت موجود ہے، من جملہ رواۃ حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما بھی ہیں اور خدا جانے اور کتنوں نے سنا ہوگا؟ کہ ان کو روایت کا اتفاق ہی نہ ہوا لیکن مولوی صاحب کو خبر نہ ہو تو یہ ہمارا ذمہ نہیں کہ انہیں خبر کیوں نہ ہوئی، وہ یونہی بے خبری میں پڑے ہیں یا دیدہ و دانستہ فریب کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وارثوں میں سے کسی سے نہ کہا، اگر بسبب بے خبری کے لکھا ہے تب تو قابل تنبیہ ہے کہ کسی چیز کی اگر کسی کو خبر نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز واقع میں نہ ہوا کرے، مولوی صاحب کو موجودات اور واقعات میں سے کس کس کی خبر ہے۔ خصوصاً موجودات عالم غیب اور واقعات قرون گزشتہ کی ہرگز کچھ اطلاع نہیں، پر اس وجہ سے کہ وہ معلوم نہیں، غیر واقع نہیں کہلائی جاتیں۔

ہاں مولوی صاحب کے ذہن وذکاء سے البتہ اُمید ہے کہ دم "لَا وُجُوْدَ اِلَّا مَا شَاهَدْتُ" بھر اُٹھیں اور نشہ کی ترنگ میں یہ ترانہ زیب زبان ونقش وقرطاس ہوا ہے تو اس کا جواب دُکان بادہ فروشان پر ملے گا، ہاں اگر حضرت عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما وارث نہ ہوتے تو یوں بھی کہنا جائز تھا کہ اپنے وارثوں میں سے کسی سے نہ کہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر چند وارث نہ تھے لیکن اوّل تو وارثوں سے زیادہ مقرب تھے، دوسرے وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جو وارث تھیں، وارث تھے یعنی ان کے خبر گیران اور ان کی طرف سے لینے دینے والے ہی تھے۔ سو بہ نسبت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سنانے کے ان کا سنا دینا اور ان کا کہنا زیادہ تر مفید تھا، علاوہ بریں اس قسم کے مضمون جو موت کی خبر دیں اقربا کے حق میں موجب رنج ہوتے ہیں۔ خصوصاً بیٹی کہ اس کو بہ نسبت فرزند اور اکثر اور اقربا کے والدین کے ساتھ زیادہ محبت ہوتی ہے، تو اگر جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم موافق رائے ناقص مولوی عمار علی صاحب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے یہ مضمون فرماتے کہ تمہارے لیے حکم خداوندی یوں ہے کہ میری وفات کے بعد میرے ترکہ میں سے کچھ نہ لینا، تو کچھ فائدہ تو ہرگز نہ تھا۔

اس لیے کہ جو کچھ ان کے کہنے سے کام چلتا۔ اس سے زیادہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کہنے سے کام چلتا نظر آتا تھا اور ان سے کہہ ہی چکے تھے مگر چونکہ یہ مضمون متضمن خبر وحشت اثر وفات سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھا تو مفت موجب آزردگی خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ہوتا۔ سو ایسا کون سا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا آزردہ کرنا ثواب تھا یا جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے دشمن تھے کہ بے وجہ اور بے سبب ان کو سب سے پہلے رنج وغم میں ڈال دیتے۔ آپ خود جانتے تھے کہ اگر بالفرض والتقدیر میری وفات کے بعد حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بے اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوبکر صدیق سے، جو آپ کے نزدیک بالیقین خلیفہ ہونے والے تھے، طالب میراث ہوں گی۔ اوّل تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دین میں ایسے سست نہیں کہ کسی کے پاس لحاظ سے حق بات زبان پر نہ لائیں اور پھر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ایسی ناحق پرست نہیں کہ باوجود زبان صدیق صادق سے حدیث نبوی سن لینے کے ہٹ دھرمی کریں اور طلب میراث سے باز نہ آئیں۔

اور اگر بمقتضائے بشری (جیسے حضرت موسیٰ حضرت ہارون علیہم السلام پر بے خطا بوجہ غلط فہمی معترض ہوئے تھے اور ان کو قصوروار سمجھا تھا) مقدمہ میراث میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کچھ اعتراض ہوگا؟ اور ان کا یہ عذر کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ''لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ'' بوجہ غلط فہمی جو مرتبہ بشریت کو لازم ہے اور انبیاء بھی اس سے چھوٹے ہوئے نہیں، پایۂ اعتبار سے ساقط ہوگا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود ہیں وہ اس حدیث کو سنا دیں گے۔ القصہ مولوی صاحب کا یہ گانا کہ ''کسی سے اپنے وارثوں میں سے نہ کہا'' سراسر دروغ و بہتان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ کو یہ حدیث نہ بتائی کیونکہ وہ بزعم شیعہ علم غیب جانتی تھیں

اور یہ جو اپنے نزدیک اس نہ کہنے کو خدا کے حکم کا چھپانا سمجھتے ہیں اس کو بجز اس کے کہ دیوانوں کی بکواس کہیے اور کیا کہیے؟ اوّل تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے بظاہر چھپانے کی کوئی صورت ہی نہیں، اس لیے کہ وہ آئمہ اہل بیت سے کسی بات میں کم نہیں، جب آئمہ کو علم ما کان وعلم ما یکون ہو تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بدرجۂ اولیٰ ہوگا کیونکہ ان کا رتبہ اکثر آئمہ سے زیادہ ہے کم نہیں بلکہ یوں کہیے تو زیبا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہنے کی حاجت ہی نہ

بھی، کہئے تو اس سے چھپے بے کہ معلوم نہ ہو سکے اور اگر ما کان وما یکون میں سے احکام کو مستثنیٰ رکھئے یا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو در بارۂ علم آئمہ سے کم کہئے تو اسے چھپانا نہیں کہتے کہ ایک گروہ میں سے دو چار کو بتلا دیا اور باقیوں کو نہ بتلایا، سب جانتے ہیں کہ جب بات دو چار کے کانوں میں پڑتی ہے۔ پھر چھپی نہیں رہتی نقل مشہور ہے۔

ع:.........نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفل ھا

خاص کر علم دین کی باتیں کیونکہ در باب درس و تدریس و تبلیغ علم و احکام جو کچھ فضائل اور تاکیدیں منقول ہیں، سب کو معلوم ہیں۔ پھر کیا امکان جو ایسی بات چھپی رہے؟ آخر جو احکام خداوندی نازل ہوتے تھے۔ سرور کائنات علیہ افضل الصلوات وعلیٰ آلہ کون سے خانہ بخانہ ہر ہر فرد بشر کے کان میں کہتے پھرتے تھے؟ یہی ہوتا تھا کہ ایک دو سے آپ نے کہا۔ انہوں نے اوروں سے، اسی طرح آگے پیچھے سب کو خبر ہو جاتی تھی اور اب تک یونہی بتدریج امتیوں کو خبر ہوتی جاتی ہے۔

ہاں اگر آپ سب کو کہہ دیتے کہ دیکھو خبردار اور کسی کو اطلاع نہ ہو تو البتہ یوں کہہ سکتے کہ حکم خداوندی چھپا رکھا۔ علاوہ بریں عقل کی جو بات تھی وہ آپ کر گزرے، یعنی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جو کارکنِ خلافت تھے، یہ بات واشگاف فرما دی اور ظاہر ہے کہ دُنیا لینا دونوں ہی کا کام ہے، دینے والے کا بھی اور لینے والے کا بھی۔ اگر ان میں سے ایک بھی اپنے کام سے ہٹ بیٹھے تو دوسرے سے کیا ہو سکتا ہے، دینے والا اگر دے نہیں تو لینے والا کیوں کر لے اور لینے والا اگر لے نہیں تو دینے والا کس طرح دے۔ پھر لینے دینے والوں میں سے اگر ایک کو بھی روک دے تو جس چیز کا بدستور رکھنا منظور ہو وہ بدستور رہے گی۔ سو فقط ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دینے سے روک دینے میں مطلب حاصل تھا، اس لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہنے کی کچھ ضرورت نہ ہوئی۔

صرف صدیق رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کرنے کی حکمتیں

باقی رہی یہ بات کہ مطلب یوں بھی حاصل ہو سکتا تھا کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کو یہ حدیث سنا دیتے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے یہ بات نہ فرماتے بلکہ حصول مقصود اس صورت میں بوجہ احسن ہوتا کیونکہ اتنا جھگڑا ہی (جو اب ہوا) نہ ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی حصول مقصود کی ایک یہ بھی صورت تھی لیکن اس صورت میں جو اب ظہور میں آئی چند مصلحتیں ایسی ساتھ لگی ہوئی تھیں کہ در صورت مرقومہ ہرگز نہ تھیں۔

پہلی حکمت

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اوّل تو ایسی وصیتوں کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمانے میں صحت خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ مدنظر تھا تاکہ حاضرین محفل سمجھ جائیں کہ یہ وصیتیں جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کی جاتی ہیں تو انہیں اپنا جانشین کرنا اپنے مدنظر ہے۔ کسی مصلحت سے بتصریح نہیں فرماتے تو کیا ہوا اور یہ کچھ نیا ہی اشارہ نہیں، ایسے ایسے بلکہ اس سے بڑھ کر اور بہت سے اشارے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام بلکہ خود کلام ربانی میں پائے جاتے ہیں۔

اور اس سے مولوی عمار علی صاحب کے اس سخن نامعقول کا بھی جواب نکل آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اجنبی شخص سے کہ اسے کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں کچھ دخل نہ تھا۔ یہ فرمایا کہ "لا نورث ما ترکناه صدقة" اور حاصل جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ میرے بعد سررشتہ اختیار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس لیے جو اُمور ضرور یہ خلافت قابل وصیت ہیں، وہ انہیں سے کہنے چاہئیں تاکہ اس کے موافق کاربند ہوکر انداز خلافت کو ہم رنگ نبوت کردیں، دوسرے ایسی صورت میں فقط لینے والے کو منع کرنے میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ مبادا بطمع نفسانی حکم خداوندی کو چھپالے، گو بوجہ محفوظیت یا معصومیت حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے اس موقع خاص میں یہ ڈر نہ ہو مگر قواعد کلیہ شرعیہ میں خاص خاص اُمور کا اعتبار نہیں ہوتا، اسی واسطے اگر کسی قضیہ میں کوئی ولی کامل کہ اس کی ولایت اور صدق و دیانت پر تمام عالم متفق ہو، تن تنہا ثبوت دعوائے مدعی کی گواہی دے تو گو یہ یقین کامل ہے کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بولتا ہرگز قبول نہ ہوگی۔

اور اگر ایسے دو آدمی کہ بظاہر پیرایہ عدالت رکھتے ہوں۔ گو قاضی کے نزدیک بھی وہ دونوں مل کر صدق میں اس ایک کے برابر نہ ہوں، بلا تامل مقبول ہوگی۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ قواعد کلیہ شرعیہ کو بایں وجہ کہ جو ان قواعد کے لحاظ سے مقصود ہے کسی خاص موقع میں ان کے لحاظ نہ کرنے میں وہ مقصود بوجہ احسن اور بدرجہ اُتم حاصل ہوتا ہے نہیں چھوڑ سکتے۔ الحاصل گو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حدیث مذکور کے سنادینے میں بزعم شیعہ مقصود اصلی بہ نسبت اس کے زیادہ تر اچھی طرح سے حاصل ہو جاتا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فقط کہہ دیا لیکن قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ ایسے موقع میں دینے والے کو روکا جائے نہ لینے والے کو اور بایں ہمہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ حدیث سنا دیتے تو جھگڑا نہ ہوتا اور مقصود بوجہ احسن حاصل ہو جاتا کیونکہ اوّل تو

جھگڑے کا ہونا ہی مسلم نہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ معلوم ہو جائے گا، یہ فقط شیعوں کی شرارت ہے کہ افسانہائے بے اصل کو کوچہ و بازار میں گاتے پھرتے ہیں۔ حاشا وکلا جو یوں ہوا ہو۔

دوسری حکمت

دوسرے اگر کسی قسم کی فی الجملہ انبیاء میں شکر رنجی دو چار روز کے لیے ہو بھی گئی تو اسے جھگڑا نہیں کہتے۔ ایسے ایسے اُمور میں ہو ہی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا قصہ کس کس نے نہیں سنا۔ مع ہذا جو رنج کہ قریب ہی مبدل بصلح ہو جائے۔ اس کے ہونے کا کچھ اعتبار نہیں، اس کو عرف میں "كَاَنْ لَمْ يَكُنْ" سمجھتے ہیں، ایسے رنجوں کا اگر کھٹکا بھی ہوتا ہے تو پیش بندی نہیں کیا کرتے۔ سو بایں لحاظ گو نہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایسے ناقدر شناس ہیں کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے سامنے عذر معذرت نہ کریں گے، نہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ایسی کج طبع ہیں کہ ہرگز سیدھی ہی نہ ہوں گی۔ اس کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لحاظ نہ کیا ہو مگر الحمد للہ کہ اسی طرح ظہور میں آیا۔ چنانچہ روایت مجاج السالکین جو ان شاء اللہ اب قریب ہی مذکور ہوتی ہے۔ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عذر کیے اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے قبول فرمائے اور بدل و جان ان سے پھر بمنزلہ شیر و شکر مل گئیں۔

تیسری حکمت

تیسرے یوں کہنا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیتے تو جھگڑا نہ ہوتا۔ جب زیبا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب بھی ہوتے، بیسیوں آیات اس بات کی گواہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام موجودات میں سے کسی کو علم غیب نہیں، "قُلْ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ. قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ" اوّل آیت سے بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عالم الغیب نہ ہونا اور دوسری سے بالعموم ملائکہ اور انبیاء اور جن و بشر کا عالم الغیب نہ ہونا ثابت ہے۔ جسے شک ہو ترجمہ کے کلام اللہ بہت موجود نہیں، نویں سیپارہ کے نصف و ثلث کے مابین اور بیسیویں سیپارہ کے اوّل رکوع میں آیت مذکورہ کو تلاش کر کے اپنی تسلی کرے۔

اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے اُمور کا دھیان گمان بھی بسا اوقات نہیں آیا کرتا جو یوں کہیے کہ عقل سے معلوم کر کے پیش بندی کرنی تھی۔ ہاں جون سی مصلحتیں بیان کیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ کروں گا، وہ البتہ لحاظ عقلی کے قابل ہیں۔ چنانچہ عاقل سمجھتے ہیں اور جو لایعقل نہ سمجھیں تو کیا کیجیے۔

چوتھی حکمت

چوتھی مصلحت یہ ہے کہ جب یوں سمجھ کر کہ جتنا دونوں کے کہنے سے کام چلتا ہے اتنا ہی ایک کے بھی، ایک ہی کے سنادینے کی تجویز ٹھہری تو پھر مناسب یوں ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کو روکئے کیونکہ فعل عطا انہیں سے ظہور میں آتا۔ باقی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا لینے والی تھیں اور ظاہر ہے کہ دُنیا لینے کی فرع ہے اور دُنیا اصل ہے اور اصل کے اُکھاڑ دینے میں جو کچھ قلع وقمع فساد ہوتا ہے، وہ فرع اور شاخ کے قطع کرنے میں نہیں ہوتا۔

الحاصل جس فساد کی پیش بندی کے لیے اس حدیث کا سنا دینا مدنظر تھا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کہنے میں تو اس کی بیخ و بنیاد کا اکھاڑ دینا تھا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے کہہ دینے میں گویا شاخ کو قطع کر دیا یا یوں کہئے کہ پھل نہ لگا، سوائے اس کے اگر حسب گفتار سراپا نامعقول شیعہ کوئی اور فساد بیچ میں اتفاق سے کھڑا ہوتا نظر آئے تو اس کی مدافعت کے لیے اس کی مدافعت کو نہیں چھوڑا جاتا۔ یعنی اس بات کا لحاظ مقدم ہے کہ مملوکہ نبوی دست بردوارثان نہ ہو جائے۔ اس میں بلا سے کسی قسم کا تنازع ہی کیوں نہ پیش آ جائے۔

بہرحال قطع نظر اس کے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے کہنے میں سردست آزار خاطر مبارک حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نظر آتا تھا اور مطلب ان کے نہ کہنے میں بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ اقتضاء اصلی بھی یہی تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نہ کہئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کے گوش گزار کر دیجئے کیونکہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو پھر سررشتہ اختیار انہیں کے ہاتھ ہوگا۔ جب وہ متروکہ نبوی وارثوں کو نہ دیں گے تو حضرت فاطمہ یا اور کسی وارث کے پاس آپ نہ جائے گا جو وہ اس کو اپنا مملوک سمجھ کر تصرف ناجائز کر بیٹھیں اور اس وجہ سے ان کو اطلاع کرنے کی ضرورت ہوتی۔

باقی رہی فقط طلب گاری تو اس میں تاوقتیکہ اِس بات کی اطلاع نہ ہو کہ ہمارا حق نہیں کچھ گناہ نہیں جو اس پیش بندی کی ضرورت ہو۔ مع ہذا حضرت عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دینا کفایت کرتا تھا۔ اس لیے کہ اگر میراث تقسیم ہوتی تو یہ دونوں صاحب بھی کچھ کم نصف کے مالک ہوتے۔ سو اگر میراث تقسیم ہوتی تو سب ہی کو برابر تقسیم ہوتی۔ پس لاجرم ان کو بھی اطلاع ہوتی۔ سو اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پہلے سے معلوم نہ ہوتا اور نہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خبر ہوتی، تب بھی ان دونوں کا سننا کافی تھا۔ وقت ضرورت بیشک حال معلوم ہو جاتا اور ان سب کو جانے دو، نہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر کرو اور نہ حضرت عائشہ اور حضرت

عباس رضی اللہ عنہما کے معلوم ہونے کا کچھ خیال کرو، فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمادیتا ایسا ہی تھا، جیسا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے فرمادیا کیونکہ ان کی طرف سے کارکن اور خبر گیران جب تک وہی تھے، دونوں صاحبزادے جب تک صغیر السن ہی تھے۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اوّل تو میراث کا لینا کچھ کلھیا میں گڑ پھوڑنا نہیں ہے۔ جو چپ چپاتے ہو جائے۔ پھر وہ بھی اس قدر تنگی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے میراث لینے کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی خبر نہ ہو بلکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اگر بالفرض کچھ لیا بھی جائے گا تو گو مطالبہ کرنے والی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہوں گی۔ پر لینے والے اور قبضہ کرنے والے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہوں گے۔ ادھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی بہ نسبت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے کوئی غیر نہ تھے۔ ایک بجائے والدہ دوسرا بجائے دادا اور ظاہر ہے کہ ایسی قرابتوں میں بیشتر اتفاق ملاقات رہتا ہے اور اس سبب سے ایک دوسرے کو اس کے نفع و نقصان کی اگر کچھ اطلاع ہوتی ہے تو اطلاع کر دیتا ہے۔ خصوصاً امر دینی کے نفع و نقصان کی باتیں اور وہ بھی ایسے لوگوں سے جو دُنیا کو طلاق دیئے بیٹھے ہوں، ایسے مواقع میں تو اگر بمقتضائے بشری کوئی رنج بھی فی مابین واقع ہو جاتا ہے۔ تب بھی اس کے نفع و نقصان کی اطلاع کر دیا کرتے ہیں۔

کیونکہ ایسے مواقع اگر کچھ رنج بھی ہو جاتا ہے تو بوجہ محبت ہوتا ہے بوجہ عناد و بغض نہیں ہوتا جو دوسرے کے نقصان کا روادار ہو۔ چونکہ رنج کے دو طرح کے ہونے کی تحقیق آیت "**محمد رسول اللّٰہ و الّذین معه اشداء**" کے ذیل میں گزر چکی۔ اس لیے فقط اسی پر اکتفا کر کے معروض کرتا ہوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سنا دینے میں بھی یہ نظر آتا تھا کہ لاجرم ان کے وسیلہ سے فاطمہ رضی اللہ عنہا اور نیز اور وارثوں کو یعنی ازواج باقیہ کو اطلاع ہو جائے گی۔ شروع میں نہیں تو وقت طلب یا وقت قبض و تصرف تو ضرور ہی یہ بات معلوم ہو جائے گی کیونکہ ایسی باتیں کچھ راز کی تو ہیں ہی نہیں جو کسی کو اطلاع نہ ہو۔ الحاصل اسے چھپانا نہیں کہتے کہ دس بارہ بلکہ شاید زیادہ کے سامنے ایک بات فرمادیں اور وہ بات بھی اس قسم کی کہ اس کی تعمیل اگر ہو سکے تو جب تک طشت از بام افتادہ کا قصہ نہ ہو تب تک نہ ہو سکے۔ منجملہ اسرار کے نہیں جو چھپائی جائے۔ خاص کر حضرت علی اور حضرت عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما سے کہ دو تو ان میں سے وارث ہیں اور ایک وارث کے وارث۔ یعنی ان کے خبر گیران پھر یوں کہنا کہ حکم خدا کو جو بہ نسبت وارثانِ نبوی تھا، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وارثوں سے چھپا رکھا، جھک مارنا ہے کہ نہیں۔

حسب روایت شیعہ خدا کا حکم چھپانے کی ایک مثال

ہاں چھپا رکھنا اسے کہتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین نے حسب روایات کاذبہ شیعہ فرزند ارجمند خویش حضرت زید شہید سے حکم امامت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے چھپا رکھا اور پھر حیف یہ ہے کہ حکم بھی ایسا کہ جیسا اس کے نہ ماننے سے کفر عائد ہوتا ہے، ویسا ہی اس کے نہ جاننے سے آدمی کافر رہتا ہے۔ چنانچہ بدستاویز حدیث "مَنْ لَمْ یَعْرِف اِمَامَ زَمَانِهٖ فَقَدْ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً" شیعوں کا یہی عقیدہ ہے اس لیے کہ اس کے معنی شیعوں کے طور پر یہی ہو سکتے ہیں کہ جو امام وقت کو (دوازدہ آئمہ میں سے) نہ جانے، یعنی اس کی امامت کی اسے خبر نہ ہو تو وہ جاہلیت کا سا مرنا مرے گا۔ یعنی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے پہلے اکثر جزیرہ عرب کے لوگ بسبب جہالت کے عقائد باطلہ اس جہان سے لے گئے اور اس سبب سے جہنم رسید ہوئے۔ ایسے ہی امامت امام وقت سے جو جاہل رہے گا، وہ بھی اسی شمار قطار میں داخل ہوگا۔ الحاصل حضرت امام زین العابدین نے حضرت زید شہید سے ایسا مسئلہ جو رکن دین و ایمان تھا چھپا رکھا تھا، سو چھپانا اسے کہتے ہیں نہ کہ اس کو کہ ہر ہر وارث کے کان میں "لا نُورث ما ترکناہ صدقۃ" کہا اور اگر سند مطلوب ہے تو لیجیے کلینی کی روایت موجود ہے۔ کسی ایسے ویسے رند بازاری کی نہیں۔

رَوَی الکلینی عَنْ اِبَانَ قَالَ اَخْبرنی الاَحْوَلُ اِنَّ زَیْد بْنِ عَلِیّ بَعَثَ اِلَیْهِ وَهُوَ مُخْتَفٍ قَالَ فَاَتَیْتُهٗ فَقَالَ یَا اَبَا جَعْفَر مَا تَقُوْلُ اِنْ طَرَقَکَ طَارِقٌ مِنَّا اَتَخْرُجُ مَعَهٗ قَالَ فَقُلْتُ لَهٗ اِنْ کَانَ هُوَ اَبَاکَ اَوْ اَخَاکَ خَرَجْتُ مَعَهٗ فَقَالَ لِیْ اُرِیْدُ اَنْ اَخْرُجَ فَاُجَاهِدُ هٰؤُلاءِ القوم فاخرج معی فقلت لا افعل جعلتُ فداک فَقَالَ اَتَرْغَبُ بِنَفْسِکَ عَنْ نَفْسِیْ فَقُلْتُ اِنَّمَا هِیَ نَفْسٌ وَاحِدَةٌ فَاِنْ کَانَ لِلّٰهِ فِی الْاَرْضِ حُجَّةٌ ط فَالْمُتَخَلِّفُ عَنْکَ وَالْخَارِجُ مَعَکَ سَوَاءٌ فَقَالَ یَا اَبَا جَعْفَر کُنْتُ اَجْلِسُ مَعَ اَبِیْ فِی الْخِوان فَیُلْقِمُنِی الْبِضْعَةَ السَّمِیْنَةَ وَیُبَرِّدُ لِیَ اللقمة حَتّٰی تَبْرُدَ شَفَقَةً عَلَیَّ وَلَمْ یَشْفَقْ عَلَیَّ حَرَّ النَّارِ اِذْ اَخْبَرَکَ وَلَمْ یُخْبِرْنِیْ قَالَ فَقُلْتُ خَافَ عَلَیْکَ اَنْ لَا تَقْبَلَ فَتَدْخُلَ النَّارَ وَاَخْبَرَنِیْ فَاِن قَبِلْتُ نَجَوْتُ وَاِنْ لَمْ اَقْبِلْ لَمْ یُبَالِ اَنْ اَدْخُلَ النَّارَ۔

"حاصل روایت یہ ہے کہ علامہ کلینی ابان سے یوں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ احول نے مجھ سے یوں نقل کیا کہ حضرت زید بن امام زین العابدین نے جس وقت کہ وہ مخفی تھے، کسی کو میرے پاس بلانے کو بھیجا تو انہوں نے کہا، اے ابو جعفر (یہ لقب ہے احول کا) تیری اس

میں کیا رائے ہے؟ اگر ہماری طرف سے اچانک کوئی بلانے والا تیرے پاس آئے۔(یعنی ہم اپنی مدد کے لیے تجھے بلوائیں) تو اس کے ساتھ ہمارے بلوانے سے ہو بھی لے گا کہ نہیں۔ احول نے کہا میں نے حضرت سے یوں عرض کیا کہ بلوانے والے تمہارے باپ یا تمہارے بھائی (یعنی امام محمد باقر) ہوتے تو مضائقہ نہ تھا، میں بھی ساتھ ہو لیتا، انہوں نے پھر فرمایا، میرا ارادہ یوں ہے کہ میں نکلوں اور اُن لوگوں سے یعنی مروانیوں سے جہاد کروں، سو تو بھی میرے ساتھ چل، میں نے عرض کی کہ میں آپ کے قربان جاؤں، مجھ سے ہرگز یہ کام نہ ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا تو اپنے آپ کو ہم سے علیحدہ ہو کر بچاتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اور تم تو ایک ہی ہیں، پر درصورت یہ کہ روئے زمین پر کوئی خدا کی طرف سے حجت یعنی امام موجود ہو تو تمہارے ساتھ سے رہ جانے والا اور تمہارے ساتھ جانے والا دونوں برابر ہیں۔ یعنی امام کے ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ جہاد میں جانے کا کچھ فائدہ نہیں، انہوں نے کہا کہ اے ابو جعفر میں اپنے باپ کے ساتھ خوان پر بیٹھا کرتا تھا وہ مجھے چھانٹ چھانٹ کر گوشت کی موٹی موٹی بوٹیاں دیتے تھے اور میرے لیے لقمے ٹھنڈے کرتے تھے، یہاں تک کہ خوب ٹھنڈا کھانے کے قابل ہو جائے، یہ سب قصہ محبت کے سبب سے تھا۔ سو بڑے تعجب اور کمال حیف کی بات ہے کہ یہاں کی آگ کا تو شفقت کرنے میں لحاظ کیا اور دوزخ کی آگ سے بچانے میں انہیں مجھ پر کچھ محبت نہ آئی جو تجھے امام محمد باقر کی امامت کی خبر کردی اور مجھے بالکل خبر نہ کی، احول کہتا ہے میں نے کہا تم سے یہ خوف ہوا کہ مبادا تم نہ مانو اور اس سبب سے دوزخ میں جاؤ اور مجھے یوں سمجھ کر خبر کردی کہ اگر میں نے قبول کیا تو فبہا نجات پائی، نہیں تو ان کی بلا سے دوزخ میں جاؤں گا تو میں جاؤں گا۔ انتہی"

ہر چند اس روایت سے بہت سے مضمون مفید طلب اہل سنت برآمد ہوتے ہیں لیکن اول تو اس مقام میں ان سب کا ذکر کرنا بے موقع ہے۔ دوسرے فرصت اتنی کہاں اس لیے فقط اتنی گزارش ہے کہ اس روایت سے بتصریح معلوم ہوا کہ حضرت امام زین العابدین نے دیدہ و دانستہ اپنے فرزند ارجمند زید شہید سے امامت حضرت امام محمد باقر کو چھپا لیا حالانکہ اس کا جاننا منجملہ ارکان ایمان تھا۔ چنانچہ اس روایت سے بھی ظاہر ہے، اب اہل انصاف سے یہ عرض ہے کہ فدک کو جو منجملہ متاع دنیوی تھا امامت امام وقت کے برابر رکھیے جس کا جاننا منجملہ ارکان ایمان ہے اور پھر حضرت امام زین العابدین کے دیدہ و دانستہ چھپا لینے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس بارہ آدمیوں کے سامنے بغرض تبلیغ کہہ دینے کے مقابل کیجیے اور پھر اس کا لحاظ کیجیے کہ بایں ہمہ حضرت امام زین العابدین نے جو حضرت امام محمد

باقر رضی اللہ عنہ کی امامت کی حضرت زید شہید کو اطلاع نہ کی تو اس میں کیا نقصان نکلا؟

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے یا کسی اور وارث سے حدیث "لا نُوْرَثُ ما ترکناہ صدقۃ" نہ کہا اور بزعم شیعہ فقط صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی سے کہا تو کیا ضرر پیش آیا؟ ظاہر ہے کہ بہ نسبت امامت امام محمد باقر حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے لب کشانہ ہونے میں انجام یہ نکلا کہ نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد، حضرت زید شہید بوجہ جہل رکن ایمان یعنی امامت امام وقت چنانچہ روایت مسطور سے ظاہر ہے، مستوجب دوام عذاب اور داخل زمرۂ کفار ہوئے۔ اگر بذاتِ خود امام زین العابدین فرزند ارجمند سے یہ بات فرما دیتے تو اُمید قوی تھی کہ حضرت زید تسلیم ہی کر لیتے۔ اشتباہ دروغ احول دروغ گو جوفی الحال رہزن ایمان ہوا۔ اس صورت میں بیچ میں سے اُٹھ جاتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی سے حدیث مذکور کو کہا تو کچھ خرابی نہ نکلی کیونکہ جو کچھ مقصود تھا، وہ حاصل ہی ہوگیا ترکہ نبوی صدقہ ہی رہا۔ بہرحال اس میں میراث جاری نہ ہونے پائی بلکہ اگر بالفرض والتقدیر سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات اس حدیث کو بوجہ فراموشی مثلاً کسی سے نہ فرماتے، نہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے نہ کسی اور سے، تب بھی بیش بریں نیست کہ نادانستگی میں وارثان نبوی ترکہ نبوی کو جوفی الحقیقت وقف تھا، خورد برد فرماتے۔ سو ہم علماء شیعہ ہی سے استفتا کرتے ہیں کہ اگر کوئی نادانستگی میں مال وقف کو اپنا مال سمجھ کر کھالے تو اس کے ذمہ کیا گناہ؟ بہرحال حضرت امام زین العابدین کے حکم خداوندی کے چھپا لینے سے جو کچھ نقصان نکلا، اس کو ایک طرف رکھئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نہ کہنے سے جو مطلب کے حصول میں کچھ خرچ نہ ہوا (اور درصورت اخفاء کلی جو کسی طرح کا وارثوں کا نقصان دینی یا دُنیوی نہ تھا) اس کو دوسری طرف دھریئے، القصہ ادھر کے تمام لوازم کو ادھر کے تمام لوازم سے تو لئے اور پھر بولئے کہ کس طرف پلہ جھکتا ہے؟ اور اخفاء حکم کس طرف ہے اور کس طرف نہیں؟

بہرحال ہر کس و ناکس پر ان تقریروں سے واضح ہوگیا کہ کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اخفاء حکم نہیں ہوا اور بزعم شیعہ قطعاً اور یقیناً حضرت امام زین العابدین نے اخفاء حکم خداوندی کیا لیکن آفرین ہے مولوی عمار علی صاحب کی فہم و فراست پر کہ اسے تو اخفاء سمجھتے ہیں اور اسے نہیں سمجھتے، بارخدایا انہیں کس نے کہا تھا کہ تم بھی دین مذہب کی باتوں میں دخل دیجیو۔ اتنی عقل و فہم پر اہل سنت سے اُلجھتے ہیں، کوئی مولوی صاحب سے پوچھے، آپ

نے کیوں اہل سنت سے دست وگریباں ہونے کا ارادہ کیا؟ شعر:

اُلجھنے کو بلا ہیں آپ تو کچھ خبر ہے صاحب لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلف پریشاں کو

علماء اہل سنت تو درکنار عوام اہلسنّت بھی بمنزلہ دلاوران عالی نظر میدان مناظرہ میں ایسی سمجھ والوں کو بمنزلہ زنان بے ہتھیار سمجھ کر کچھ معترض نہیں ہوا کرتے ہیں۔ہاں درصورت یہ کہ گریبان گیر ہی ہوجائیں۔تب بضرورت وناچاری ان کے ہاتھ پاؤں کی خبر لیتے ہیں۔

اس لیے اس ہیچمدان نے بھی جو کچھ کیا سو کیا، بہر حال معاف کیجئے گا لیکن سچ تو یوں ہے آپ کو بری تو لگے گی، جیسی آپ کی باتیں ہیں ایسے سخن ہائے بے معنی سے تو گوز شتر بے مہار ہی بہتر ہے، وہ اگر اتفاق سے ناک تک پہنچ بھی جائے تو بیش بریں نیست ناک ہی جلے گی۔دل تو کسی عاقل کا نہ جلے گا، پر آپ کے حرف بے معنی اور سخن نامعقول میں طرفہ ستم یہ ہیں کہ بحکم مصرع ''جواب جاہلاں باشد خموشی'' حقیقت میں قابل جواب تو ہوتے نہیں جو جواب دیا جائے۔البتہ خاموش ہوکر جی جلانا پڑتا ہے، پر اس ہیچمدان نے جب یہ جانا کہ جاہلوں کے جواب میں عالم البتہ نہیں بولا کرتے، مجھے اس ہیچمدانی پر کیا ہوا جو خاموش ہوکر بیٹھ رہوں، مع ہذا اب سر پر آبنی۔

دو چیز تیرۂ عقل است دم فرو بستن بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

اس لیے اس قدر اوراق کو سیاہ کیا اور آگے اور کرنے پڑے۔

سو منصفان بے روئے وریا اور بھی سنیں کہ بعد ازیں مولوی عمار علی صاحب کچھ ایسا رقم فرماتے ہیں جس سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا مکرر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جاکر میراث کا طلب کرنا اوران کا فدک کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام لکھ دینا اور پھر اتفاق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آجانا اوران کا اس کاغذ کو پھاڑ ڈالنا نکلتا ہے۔سو اس کا جواب بحکم مثل مشہور ع:

......دروغے اجزا باشد دروغے.....موافق نقل ہندی ''گوہ کی دار دسوت''

یوں چاہیے تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایک بار بھی میراث کی طلب کے لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک نہیں گئیں، چہ جائیکہ دوبارہ مطالبہ کی نوبت آئی ہو اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کے نام جاگیر کا کاغذ لکھ دیا ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پھاڑ ڈالا ہو، وہ شروع سے لب کشا ہی نہیں ہوئی تھیں مگر چونکہ جھوٹ پھر جھوٹ ہے، ابتداء ہو یا دروغ کی جزا میں، مع ہذا خداوند کریم جھوٹوں کو سینکڑوں طرح شرماتا ہے۔چنانچہ ابھی ان شاء اللہ تعالیٰ معلوم ہوا جاتا ہے، سچ ہی بولنا مناسب اور انسب نظر آیا، اس لیے گزارش یہ ہے، یاد رہے کہ یہ محض دروغ بے فروغ ہے، طومار بندیوں سے

سچوں کو جھوٹا نہیں کیا کرتے، اہلسنت کا قول محکم ایسی پوچ باتوں سے خلل پذیر نہیں ہوسکتا۔

باقی یہ حوالہ دینا کہ سبط بن جوزی نے اس روایت کو اپنی سیرت میں تحریر کیا اور واقدی محدث اہلسنت نے اور برہان الدین حلبی شافعی نے اپنی سیر میں لکھا ہے، محض ایک فن ابلہ فریب ہے، سادہ لوحانِ اہلسنت کے گمراہ کرنے کے لیے (بحکم اتباع پیشوایان خویش) مولوی صاحب بھی یہ چال چلتے ہیں چونکہ در باب تنقیح روایات مفید مطلب شیعہ ایک بحث طویل مرقوم ہو چکی ہے اور اس کے مکرر بیان کرنے میں بجز دردسر تازہ کچھ سود نہیں، اس لیے مکلّف ناظرین ہوں کہ چند اوراق پلٹ کر اس باب میں اپنی تسلی کر لیں۔

سیدہ رضی اللہ عنہا کے سمجھانے پر فدک صدیق رضی اللہ عنہ نے واپس کر دیا تھا

پر اتنا اشارہ یہاں بھی کیے دیتا ہوں کہ اوّل بڑی دلیل اس بات کی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مکر گئیں اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فدک کا جاگیر نامہ ان کے نام لکھ دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھاڑ ڈالا، سراسر دروغ اور بہتان بے اصل ہے۔ چنانچہ شیخ ابن مطہر حلی منہج الکرامت میں یوں رقم فرماتے ہیں: "لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَةَ اَبَا بکر فی فِدَکَ کَتَبَ لَهَا کِتَابًا وَرَدَّهَا عَلَيْهَا" یعنی "حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فدک کے مقدمہ میں وعظ و پند کیا تو ابوبکر نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام اسے لکھ دیا اور فدک کو ان کے حوالے کر دیا۔ انتہی" اور ظاہر ہے کہ شیخ مطہر دشمنی صدیق اکبر میں مولوی صاحب کے بھی افسر ہیں اور یارِ غار کی عداوت میں ان سے بھی اوّل ہیں، مولوی صاحب نے بھی اگر یہ باتیں سیکھی ہیں تو انہیں بزرگوں کے بہکانے سے سیکھی ہیں، اگر کچھ بھی اس کی اصل ہوتی، وہ سیر کی من کر دیتے اور سوئی کا بھالا بنا دیتے۔

آخر اتنا بھی تو اسی غرض سے لکھا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ (بوجہ دغابازی) فدک کو دبانا چاہتے تھے۔ پر وعظ و پند کے باعث آخر کار ہاتھ سے چھوڑا، اگر اپنی بات میں سچے ہوتے اور حدیث "لَا نُوْرِثُ ما ترکناه صدقَةٌ" صحیح ہوتی غلط نہ ہوتی تو وعظ سے متاثر ہونے کے کیا معنی تھے؟ اُلٹا وہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت کرتے۔ سو اگر پھاڑ ڈالنے کا قصہ کچھ بھی اصل رکھتا تو وہ کیا کیا زبان درازیاں نہ کرتے بلکہ شیخ ابن مطہر حلی نے تو اہل سنت کے لیے بہت تخفیف تصدیع کر دی۔ یہاں تک کہ اہل انصاف کے نزدیک تو شیعوں کو لازم یوں ہے کہ مثل حُر بن یزید ریاحی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بھی بدل و جان معتقد ہو جائیں کیونکہ "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ" خیر الحمد للہ کہ شیعوں کی ہی روایات سے دروغ (مولوی عمار علی صاحب) ثابت ہو گیا۔ "وَ کَفَی اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ"

بہر حال جو باتیں مولوی صاحب نے تراشی ہیں، مولوی صاحب کے بڑوں کو بھی نہ سوجھی تھیں۔ یہ تازہ الہام اب مولوی صاحب کو ہوا ہے، مع ہذا واقدی محدثین کے نزدیک من جملہ وضاعین ہے یعنی اس زمرہ میں معدود ہے جو جھوٹی حدیثیں بنا کر بیان کیا کرتے ہیں اور ابن جوزی کا حوالہ اس بات میں ہماری سر آنکھوں پر کیونکہ انہوں نے دھوکہ بازوں کے فریب سے بچانے کے لیے اُمت محمدی کے لیے ایک کتاب خاص اسی فن میں تصنیف کی ہے کہ فلانی فلانی حدیث موضوع ہے تا کہ کوئی دھوکہ نہ کھائے، سوان کی اس کتاب سے نقل کرنے میں اہل سنت کی بات کا اور پختہ کرنا ہے اور اگر بالفرض ایسے استدلال بھی مفید مطلب ہوا کریں اور اس پر نظر نہ ہو کہ خود مصنف کتاب اس بات کی نسبت جو اس کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے کیا کہتا ہے؟ تو کل کو ملحدان بے دین کی اس بات کا شیعہ کیا جواب دیں گے؟ کلام اللہ میں "اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ" موجود ہے، یعنی خدا محتاج ہے تو معلوم ہوا کہ خدا محتاج ہے۔

اور اگر یوں کہئے کہ خدا نے یہود کے اس قول کو بطور ردّ و تکذیب درج کلام اللہ کیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے تو یہی جواب سبط بن جوزی کی اس روایت کے درج کرنے کا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اس دغا بازی کا کیا ٹھکانا ہے کہ عوام اہلسنت کے سامنے یا تو ان کتابوں کا نام لیتے ہیں جو غیر مقبول اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں یا بوجہ شرارت وچالاکی ایسی کتابوں کا حوالہ دے جاتے ہیں کہ گو وہ کتابیں معتبر ہیں۔ پر اس روایت کو جس کا حوالہ دیتے ہیں، اس کتاب میں بنظر دفع شر دغا بازان لکھ کر موضوع لکھ دیا ہے، یہ فرقہ عوام کو دھوکہ دینے کے لیے انہیں روایات کو پیش نظر کر دیتے ہیں اور اکثر موقع میں اس سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں کہ ایک بات اپنے جی سے تراش کر کسی کتاب غیر مشہور کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اوّل تو یہ کتابیں کہاں؟ پھر اتنی وردسری کس کو ضرورت؟ بہر حال مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مکرر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس طلب میراث کے لیے گئیں، شاید بایں غرض ہو کہ مکرر سہ کرر جانے میں اور غلط صحیح غل شور مچانے میں کچھ تو ہاتھ پلے پڑ جائے گا۔ پھر مولوی صاحب کی ایک اور بیہودہ گفتار سنئے۔ مولوی صاحب کچھ ایسا رقم فرماتے ہیں:

"کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ ابو بکر کو اس بات میں سچا جانتے تھے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ سب صدقہ ہے تو پھر علی رضی اللہ عنہ اور عباس رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ثانی کی خلافت میں عمر رضی اللہ عنہ سے جا کر کیوں دعویٰ کیا؟ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے علی اور عباس رضی اللہ عنہما کو کہا کہ تم دونوں ابو بکر کو کاذب اور خائن اور غادر اور آثم جانتے تھے اور مجھے بھی تم دونوں کاذب اور

خائن اور غادر اور آثم جانتے ہو اور میں وہ ہی کروں گا جو کہ ابوبکر کرتا تھا، یہ روایت صحیح مسلم میں لکھی ہوئی ہے اور مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے کہ عثمان کی خلافت میں عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی دعویٰ کیا تھا۔ پس اگر ابوبکر ان کے نزدیک سچا ہوتا تو ان کے زمانہ میں دعویٰ ہرگز نہ کرتے، معلوم ہوا کہ ابوبکر اس روایت میں بالکل جھوٹا تھا، از راہِ عداوت روایت بنا کر فاطمہ کا حق غصب کیا اور عمر خود علی اور عباس رضی اللہ عنہما سے اقرار کرتا ہے کہ تم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کاذب اور خائن جانتے تھے اور مجھے بھی تم کاذب اور خائن جانتے ہو۔ پس جس وقت کہ علی رضی اللہ عنہ نے ان کو کاذب اور خائن جانا تو بیشک ہم بھی کاذب اور خائن ان کو جانیں گے۔ یہی مطلب غصب سے تھا۔"

یہاں تک مولوی صاحب کی خرافات لایعنی ہوئی۔ اس میں کوئی ایک دو لفظ کا فرق ہوگا، پر معنی میں تفاوت نہیں، اب ہماری بھی سنئے کہ اس عبارت سے مولوی صاحب کے دو مطلب ہیں، ایک تو یہ کہ اگر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما وغیرہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سچا جانتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دعویٰ نہ کرتے اور علیٰ ہذا القیاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دعویٰ نہ کرتے، دوسرا یہ ہے کہ جب باقرار حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کاذب، آثم، غادر، خائن جاننا صحیح ہوا تو ہم بھی باتباع مرتضوی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کاذب آثم غادر خائن سمجھیں گے۔

مسلم شریف کے حوالہ کی حقیقت

سو اوّل اعتراض کا تو جواب یہ ہے کہ یہ مولوی صاحب کی ایک نئی دغا بازی ہے، عوام کے بہکانے کے لیے ایسی ابلہ فریبیاں کرتے ہیں، پر حقیقت میں اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں، جو لوگ اصل روایات صحیح مسلم کو دیکھیں گے، وہ جان جائیں گے کہ قصہ دگرگوں ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جس محفل میں یہ نوبت آئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یوں کہا کہ تم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کاذب آثم خائن سمجھتے تھے، اس محفل میں بنسبت تولیت تکرار تھا، نہ بہ نسبت وراثت۔ چنانچہ اس حدیث سے بھی جس کا مضمون کچھ کچھ مولوی صاحب نے درج رقیمہ کیا اور بروایت مالک بن اوس مروی ہے اور نیز صحیح مسلم ہی کی اور حدیثوں سے یہ بات عیاں ہے لیکن مولوی صاحب نے یا تو بوجہ بلادت وغباوت نہ سمجھا ہو اور یا باتباع پیشوایان قدیم دوسروں کے مطلب کی بات ہضم کر کے جس قدر دھوکا دے سکیں، زیب قرطاس کیا ہے۔

ہر چند جی یوں چاہتا تھا کہ احادیث مشار الیہا کو بتمامہا لکھئے لیکن احادیث مشہار الیہا کے بتمامہا

لکھنے میں قصہ بہت دور پہنچتا ہے۔ خصوصاً حدیث مالک بن اوس مذکور کہ وہ ایک بہت ہی طویل و عریض ہے اور بایں ہمہ اکثر مواقع شرح طلب اور ادھر فرصت قلیل، اس میں سب میں سے مختصر سا قصہ استنباط کر کے اور دو چار جملے بجنسہا لکھ کر متردّدوں کا اطمینان کیے دیتا ہوں۔ حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو اس حدیث سے کچھ آگے صحیح مسلم میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں من جملہ ترکۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فقط اس زمین کا جو مدینہ کے رقبہ میں اور قرب و جوار میں تھی۔ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو متولی کر دیا تھا۔ خیبر اور فدک کو اپنی تولیت میں رکھا تھا۔ اس حدیث سے جس کا مولوی صاحب نے ذکر فرمایا، یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خدا کا واسطہ دے کر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے یہ عہد لے لیا تھا کہ اس میں وہی کام کیجیو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔

مگر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا مذکور سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قبضہ اُٹھا دیا تھا۔ چنانچہ حدیث مذکور کے یہ الفاظ اس پر شاہد ہیں: "فَاَمَّا صَدَقَتُهٗ بِالْمَدِيْنَةِ فَدَفَعَهَا عُمَرُ اِلٰى عَلِيٍّ وَعَبَّاس فَغَلَبَهٗ عَلَيْهَا عَلِيٌّ" جس کا یہ حاصل ہے "کہ مدینہ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ تھا اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے کر دیا، سو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو آباد کیا اور اپنا قبضہ کر لیا۔"

یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس تمام زمین پر جو دونوں کی تفویض اور سپردگی میں تھی، قابض ہو گئے تو آپس میں دونوں صاحبوں میں جھگڑا پڑا، اس کے رفع داد کے لیے یہ صورت پیش آئی کہ یہ دونوں صاحب خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام اور سعد بن ابی وقاص کو بھی کچھ پہلے ان کے پاس بھیجا تا کہ وہ بھی کچھ سہارا لگائیں اور خلیفہ سے کہہ سن کر کچھ کچھ صلح کرا دیں، اسی آنے کو مولوی صاحب دعویٰ میراث کے لیے آنا سمجھتے ہیں، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو یوں کہنا کہ تم ابوبکر کو کاذب وغیرہ سمجھتے تھے، اسی دفعہ میں پیش آیا ہے۔ چنانچہ ناظران حدیث مذکور پر پوشیدہ نہ رہے گا۔

الحاصل جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یہ چھیوں صاحب تشریف لائے اور یہ مذکور ہوا تو اوّل تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان چھیوں صاحبوں کو قسم دے کر یہ پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے "لا نورث ما ترکناہ صدقة" اور ان سب

صاحبوں نے اقرار کیا کہ بے شک فرمایا ہے، بعد ازاں بہت سی گفتگو کے بعد یہ فرمایا:

ثُمَّ جِئْتَنِیْ اَنْتَ وَهٰذَا وَاَنْتُمَا جَمِیْعٌ وَاَمْرُ كُمَا وَاحِدٌ فَقُلْتُمَا اِدْفَعْهَا اِلَیْنَا فَقُلْتُ اِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُهَا اِلَیْكُمْ عَلٰی اِنَّ عَلَیْكُمَا عَهْدَ اللّٰهِ اَنْ تَعْمَلَا فِیْهَا بِالَّذِیْ كَانَ یَعْمَلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاخذتماها بذالک قال اكذالک؟ قالا نعم قال ثم جئتمانی لاقْضِیَ بَیْنَكُمَا وَلَا وَاللّٰهِ لَا اَقْضِیْ بَیْنَكُمَا بِغَیْرِ ذَالِكَ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ فَاِنْ عَجزتُمَا عَنْهَا فَرُدَّاهَا اِلَیَّ.

”اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہو کر یہ فرمایا کہ پھر تم اور یہ دونوں میرے پاس آئے اور تم دونوں باہم متفق تھے اور تم دونوں کی بات ایک تھی، سو تم دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ترکہ ہمارے حوالہ کر دو، میں نے کہا تمہیں منظور ہو تو اس شرط پر دیتا ہوں کہ خدا سے عہد کر لو کہ اس میں وہی **کیجیو** جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ سو تم دونوں نے ترکہ مذکور کو اس شرط پر لیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یوں ہی بات ہے؟ ان دونوں صاحبوں نے کہا، اسی طرح ہے، بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے کہا، اب پھر تم دونوں میرے پاس آئے ہو کہ میں تمہارا فیصلہ کر دوں، یعنی زمین کو بانٹ کر تم دونوں کو جدا جدا متولی کر دوں، یوں نہیں کہ اللہ کی قسم اس کے سوا قیامت تک میں کچھ اور حکم نہ دوں گا، اگر تم سے تولیت کا سرانجام نہ ہو سکے تو لاؤ مجھے ہٹا دو۔“

یہاں تک حاصل مطلب تھا۔ اب غور فرمائیے کہ مولوی صاحب کے فہم کا قصور ہے یا کسی اور کا؟ اگر مشرح سننا منظور ہے تو سنئے کہ اگر حضرت علی اور حضرت عباس حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے طالب میراث ہوئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طلب کے موافق ترکہ نبوی کو ان کے حوالے کر دیا تو اس کی کیا وجہ ہوئی کہ باوجود معصوم ہونے کے حضرت علی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بھی حصہ دبا لیا۔ شیعوں کو یہ اعتقاد ہوگا کہ حضرت علی (نعوذ باللہ) ”نقل کفر کفر نباشد“ ایسے دغا باز ہیں کہ اپنا دیکھیں تھے نہ پرایا جو مل گیا سو ہضم کر لیا، یا شاید معصوم ہونے کے شیعوں کے نزدیک یہی معنی ہوں کہ کتنا ہی ظلم و ستم کر بیٹھیں ان کو سب مباح اور معاف ہے۔

امام کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بے دخل کر دینا عدم وراثت پر کھلی دلیل ہے

انصاف سے دیکھئے تو معتقدان مرتضوی کے لیے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبضہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اُٹھا دینا اس بات کے لیے گواہ عادل ہے کہ اس ترکہ میں کسی کو میراث نہیں پہنچتی

نمی اور وہ ترکہ وقف تھا۔ سو درصورت وقف ہونے کے اگر متولی ہوں اور ایک دوسرے کا قبضہ اُٹھا دیا تو اس پر کچھ ظلم نہیں بلکہ بسا اوقات قرین مصلحت یہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ زمین و باغ جب تک کسی ایک طور پر نہیں ہوتے تب تک تردد کامل نہیں ہوسکتا، یعنی ایسی صورت میں اکثر زمین افتادہ پڑی رہتی ہے۔ سو افتادہ پڑے رہنے میں بجز اس کے اور کیا خوبی ہے کہ مساکین وغیرہ اہل مصرف کا حق مارا گیا۔ بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی رائے درباب تردد کچھ مخالف ہوئی ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اوّل تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی رائے پر رہئے تو نقصان اہل مصرف ہے۔

مثلاً جس مزارع کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ دینا چاہتے ہوں، وہ بہ نسبت اس مزارع کے جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ دینا چاہتے ہوں، کم محصول اپنے ذمہ رکھتا ہو، یا نادہندہ، دغاباز ہو، دوم اس تخالف رائے میں بندوبست معلوم، اس لیے بطور خود اس ترکہ کو (برخلاف رائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ) کسی کے حوالے کردیا ہو اور یہ بات حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو گراں گزری ہو، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس بات کے خواستگار ہوئے ہوں کہ آدھوں آدھ بانٹ کر دونوں کو جدا جدا زمین کا متولی کردیں۔ مع ہذا جو عبارت عربی میں مرقوم ہوئی ہے وہ خود اسی بات پر شاہد ہے کہ یہ جھگڑا فقط تولیت کا تھا۔ اس لیے کہ اوّل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس بات پر عہد لے کر دینا کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے وہی **کیجیو**، خود اسی کی دلیل ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو متولی کرکے دیا تھا ورنہ اس شرط کے کیا معنی؟ اگر میراث میں دیا تھا تو میراث تو وارثوں کی ملک ہوتی ہے اور مالک کو اپنی چیز کا اختیار ہوتا ہے ورنہ ہر شخص سے بہ نسبت اراضی مملوکہ کے یہی عہد لیا جایا کرتا۔

دوئم پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یوں فرمانا کہ قیامت تک اس کے خلاف حکم نہ دوں گا، خود اسی بات کو ثابت کرتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ترکہ نبوی بطور تولیت حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے کر رکھا تھا، بطور میراث نہ دیا تھا اور نہ مقصود حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما فقط تقسیم کردینا تھا۔ سو اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا نقصان تھا کہ ایک شے مشترکہ کوئی مابین دو مالکوں کے تقسیم کردیں؟ اگر بخل کرتے تو دینے ہی میں کرتے، جب دے چکے پھر تقسیم میں کیا مشکل تھی۔ ہاں درصورت تولیت یہ اندیشہ تھا کہ ایک بیٹی اور ایک چچا کا میراث میں آدھوں آدھ کا ساجھا ہوتا ہے، سو اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے وکیل تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہ آدھوں آدھ بانٹ کر جدا جدا متولی کردیجئے تو مبادا

رفتہ رفتہ اگلے قرنوں میں اس تقسیم کو دیکھ کر دیکھنے برتنے والے یوں سمجھ جائیں کہ نصف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کا مملوک ہے اور نصف حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد کا مملوک ہے۔

حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما نے بقسم حدیث صدیق رضی اللہ عنہ کی تصدیق کی

علاوہ بریں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا قسم کھا کر اس بات کا اقرار کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیشک یوں ارشاد فرمایا ہے کہ "لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" اور پھر میراث کا طلب کرنا شیعوں ہی کی سمجھ میں آئے تو آئے اور ان سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ مولوی صاحب پہلے یوں رقم فرما چکے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے (بہ نسبت) فدک کے معافی کا کاغذ لکھ دیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھاڑ ڈالا، پر جب حضرت عمر ابوبکر رضی اللہ عنہما کی خلافت میں یوں ہوں تو اپنی خلافت میں تو بدرجہ اولیٰ حاوی ہونے چاہئیں۔ پھر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نادان تھے؟ نعوذ باللہ کہ باوجود اس قصہ کے معلوم ہونے کے مفت خفیف اور رسوا بننے کے لیے ایسی لغو حرکت اور نامعقول بات کرتے؟ اس سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض بفرض محال یہ بات وقوع میں آئی بھی ہے؟ تو اوّل بار ہی حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آنا جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ترکہ نبوی ان کے حوالے کیا تھا، محض طلبگاری تولیت کے لیے ہو، طلب گاری میراث کے لیے نہ ہو۔

کیونکہ جب یہ بات آنکھوں دیکھ چکے ہوں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا جو جگر گوشۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ایک شخص نے لحاظ نہ کیا، دوسروں کا لکھا لکھایا کاغذ پھاڑ ڈالا ہو، وہ ہمارا کیا لحاظ کریں گے؟ اور وہ بھی اپنی حکومت میں ہم تو دوسرے ہی درجہ میں ہیں، خیر یہ بات تو غلط ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کاغذ لکھ دیا ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھاڑ ڈالا، پر اتنی بات صحیح ہے کہ اوّل بار کا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا آنا بھی محض طلب گاری تولیت کے لیے تھا۔ چنانچہ لفظ "ادفعها الینا" سے یہ بات خود ظاہر ہے جو لوگ مذاق سخن شناسی رکھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں، باقی رہی یہ بات کہ طلب تولیت میں ان دونوں صاحبوں کو کیا فائدہ تھا جو خلجان اپنے سر دھرنا تجویز کیا تو اس کا جواب یہ ہے۔ واللہ اعلم بحقیقت الحال کہ وقف نبوی میں منجملہ مصارف حق اقربائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقدم ہے۔ اس سے بچے تو اور کہیں صرف کیا جائے، خاص کرنے میں تو اشارہ خداوندی بھی موجود ہے، چنانچہ اس لیے ذی القربیٰ کو اوروں سے مقدم ذکر فرمایا اور حدیثوں سے بھی اس قسم کے مضمون نکلتے ہیں۔

مگر خلیفہ کو اوّل تو تمام خلافت کا انتظام درپیش ہے۔ فقط اوقاف ہی کا انتظام ان کے ذمہ نہیں جو ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو کر تردد کامل کرائیں، مع ہذا جن کو کچھ اوقاف سے توقع ہو جس قدر ان کے جی کو لگی ہوئی ہوگی، وہ دوسرے کے دل کو کاہے کو لگی ہوئی ہوگی؟ اس لیے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما خواستگار تولیت ہوئے ہوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بلحاظ وجوہِ مذکورہ اور نیز یوں سمجھ کر کہ جو حال بنی ہاشم کہ فلانا محتاج ہے فلانا نہیں، فلانے کو اس قدر حاجت ہے فلانے کو اس قدر، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو معلوم ہوگا۔ وہ مجھے کاہے کو معلوم ہوگا اور یہ اندیشہ باقی ہی نہیں رہا کہ کوئی اس دینے کو میراث کا دینا سمجھے کیونکہ "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" کا گھر گھر غل پڑ گیا۔ یہ بات قبول فرمائی ہو اور بایں ہمہ بنظر احتیاط تقسیم نہ فرمایا تاکہ مبادا رفتہ رفتہ بہت زمانوں کے بعد کوئی جاہل یوں نہ سمجھ جائے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مالک سمجھا تھا، جب تقسیم کر دیا۔

مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بطور تولیت بھی کسی کو دینا گوارا نہ کیا کیونکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طلب میراث کا تازہ قصہ تھا، اس قصہ سے سب کے کان پُر تھے۔ اس وقت اگر بطور تولیت ہی دیتے، ہر کوئی اس دینے کو بطور میراث ہی سمجھتا۔ "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" اگر سنا بھی ہوتا تب کسے دھیان آتا؟

خائن وغادر مبالغۃً استعمال ہوئے جیسا کہ محاورہ ہے

اور یہی وجہ فی الجملہ موجب گرانی خاطر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما معلوم ہوتی ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ کے باعث بایں الفاظ تعبیر فرماتے ہیں کہ تم ابوبکر کو کاذب آثم غادر خائن سمجھتے تھے کیونکہ تمام جہان کا دستور ہے اور نیز کلام اللہ اور احادیث سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی سے کسی موقع میں معاملہ قلبی کے برخلاف کوئی بات ظہور میں آتی ہے تو بطور مبالغہ اس کے ساتھ معاملہ قلبی کی بھی نفی کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً فی مابین اقربا و احباب اگر کسی سے کسی قسم کی بے اعتنائی اور بے پروائی کسی وجہ خارجی کے باعث ظاہر ہوتی ہے تو مبالغۃً کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ ہمارے قریب یا دوست کیوں ہوئے تھے یا یہ ہم کو اپنا قریب اور دوست ہی نہیں سمجھتے۔

سو قرابت اور رشتہ داری نسبی کا حال تو ظاہر ہے کہ وہ تو کسی طرح زائل ہو ہی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ بے اعتنائی اور بے پرواہی سے اور دوستی کا حال بھی تو ظاہر ہے کیونکہ بے اعتنائی اور بے پروائی کی جو احباب کو شکایت ہوتی ہے تو بوجہ ثبوت محبت اور بقائے اُلفت ہوتی ہے ورنہ اجنبیوں

سے کون شکایت کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی جانب سے جو فی الجملہ کشیدگی اور گرانیٔ خاطر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے (جس کا ابھی بیان تھا) ظہور میں آئی تو یہ گرانیٔ خاطر اور یہ کشیدگی جو بظاہر فی الجملہ اطمینان قلبی اور اعتبار دلی کے مخالف تھی جو ان دونوں کو (بہ نسبت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حاصل تھی کیونکہ اس سے نظر عوام میں بے اعتباری کی بو آتی تھی۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس اعتبار کو جو ان کے دل میں مرکوز تھا، نفی کر کے مبالغۃً ان کی طرف بے اعتباری کو منسوب کیا اور دلیل اس بات کی کہ یہ کلمہ مبالغۃً فرمایا تھا بیان حقیقت مد نظر نہ تھا۔ خود ظاہر ہے کیونکہ حدیث "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" کے خود مقر تھے، نہیں تو یوں ہی کہتے کہ ان کے نزدیک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے متروکہ نبوی زبردستی سے دبا رکھا تھا اور ان کے عقیدہ کے موافق وہ غادر، خائن کاذب آثم تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ مبالغہ کی دلیل ہے

مع ہذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرینہ غضب خود اس کے ارادہ کے لیے مصحح ہے لیکن آفرین ہے مولوی عمار علی صاحب کے فہم پر اور جن سے انہوں نے ایسی تعلیم پائی، ان کے فہم پر کہ ایسی بات کو جو تمام عالم میں مروج ہو، اس زمانہ میں بھی کہ پیشوا شیعہ ہو گزرے نہیں سمجھتے، کوئی ان کا مداح بہت سے بہت توجیہ کرے تو یہ کرے کہ مولوی صاحب سمجھتے تو ہیں لیکن ابلیس لعین کی روح کو خوش کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ فریب سے تحریف معانی کرتے ہیں یہ سبب نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا تو انہیں یاد رہا کہ تم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب، آثم، غادر، خائن سمجھتے تھے اور یہ یاد نہ رہا کہ انہوں نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهٗ لَصَادِقٌ بَارٌّ رَاشِدٌ تَابِعُ الْحَقِّ" یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیشک سچے، نیک اطوار، ہدایت پر، حق کے تابع تھے۔ الحاصل مولوی صاحب کی کم فہمی یا فریب بازی ہے جو ایسی بیہودہ باتیں فرماتے ہیں کہ کہیں کا سر کہیں کا پاؤں ورنہ بمعنی مذکور عرف میں ایسے کلاموں کا مروج ہونا وہ لوگ بھی جانتے ہیں جن کو عقل نہیں، چہ جائیکہ اہل عقل۔

مبالغہ کلام اللہ میں بطور محاورہ

اور اگر اس پر بھی اس قسم کے محاورات کی تصحیح کے لیے کلام ربانی ہی کی سند مطلوب ہو تو اپنی بڑی کو ہم اس سے بھی در گزر نہیں کرتے۔ اس لیے یہ آیت "حَتّٰى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا

اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاءَ هُمْ نَصْرُنَا" جو سورۂ یوسف کے رکوع آخر میں موجود ہے، گوش گزار ہے۔ اس کے بظاہر یہ معنی ہیں "یہاں تک کہ جب رسولوں کو نا اُمیدی ہونے لگی اور وہ یوں خیال کرنے لگے کہ ان سے جو کچھ امداد کے باب میں خدا کی طرف سے وعدہ ووعید تھے، سب جھوٹ تھے، ہماری مددان کے لیے آ پہنچی۔ فقط" مگر سب اہل اسلام جانتے ہیں کہ انبیاء کی شان سے بہت بعید ہے کہ خدا سے نا اُمید ہوں اور کیوں کر نا اُمید ہوں۔ اس صورت میں اس رکوع سے پہلے رکوع میں یہ جملہ بھی موجود ہے "اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ" جس کا یہ مطلب ہے "بیشک نا اُمید نہیں، اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں" پھر کسی مسلمان کے خیال میں آسکتا ہے کہ رسول اور نا اُمید ہو جائیں؟ سو اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صدق روایات کے بھروسے باتباع مرتضوی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مولوی صاحب کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہیں تو خداوند کریم تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہی سچے ہیں، خدا کے فرمانے کی تصدیق کر کے رسولوں کو خدا کی امداد سے نا اُمید سمجھ کر حسب ایماء آیت "اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ الخ" (نعوذ باللہ) کافر سمجھنے لگیں۔

علیٰ ہذا القیاس رسولوں کی نسبت جو اسی آیت میں یہ مذکور ہے کہ دُعائے خداوندی میں ان کو خیال دروغ ہوا تو اس میں بھی لازم ہے کہ مولوی صاحب رسولوں کی اتباع میں کمر چست باندھیں۔ سو اوّل تو اکثر محاورات کلام اللہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خیال باطل جو کسی وجہ سے جی میں جم جایا کرتا ہے اور اس کا یقین ہو جاتا ہے، اس کو ظن کہا کرتے ہیں، چنانچہ سورہ جاثیہ میں کفار کے اس عقیدہ کی نسبت کہ مرنے کے بعد پھر کوئی اُٹھایا نہ جائے گا اور لوگوں کا مارنے والا زمانہ ہے۔ یوں ارشاد ہے کہ "اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ" یعنی وہ یونہی اٹکلوں کی باتیں کرتے ہیں۔ الغرض کفار کو اپنے اس عقیدہ میں شک نہ تھا مگر چونکہ ایک خیال غلط تھا، جناب باری نے اس کو بلفظ ظن تعبیر فرمایا، ایسے ہی اس مضمون میں سورۂ انشقت میں "اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ" فرمایا۔ سو اس محاورہ کے موافق اگر "ظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا" کے معنی لیجئے۔ تب تو مولوی صاحب کو لازم ہے کہ نعوذ باللہ بزعم خود باتباع پیغمبران برگزیدہ خداوند کریم کے وعدوں کو بالیقین جھوٹا سمجھیں اور اگر موافق مشہور ظن کے معنی گمان غالب یا شک سمجھتے، تب مناسب یوں ہے کہ رسولوں کو تو یوں سمجھیں کہ ان کو خدا کے کہے کا یقین نہ تھا اور اس وجہ سے نعوذ باللہ انہیں کافر سمجھیں اور اپنے آپ ان کا اتباع کر کے دین وایمان کو برباد کریں۔

اور اگر یوں تاویل کیجئے کہ رسولوں کو جو ظن دروغ تھا بہ نسبت خداوند صادق القول نہ تھا بلکہ نصرت کے دیر ہونے سے یوں سمجھے کہ اگر وعدہائے نصرت وعدہائے خداوندی ہوتے تو لاجرم ان

وعدوں کا ظہور ہو لیتا اتنی دیر نہ لگتی، ہو نہ ہو یہ وساوس شیطانی تھے، وعدہائے خداوندی نہ تھے، تو اس صورت میں اوّل تو ہمیں کچھ نقصان نہیں، جو کچھ بہ نسبت یاس مرقوم ہو چکا وہی کافی ہے، دوسرے ہم کہتے ہیں کہ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ انبیاء کو وحی پر اطمینان نہ ہو، نعوذ باللہ، سو یہ تو ہم جانتے ہیں، شیعہ بھی تسلیم نہ کریں کیونکہ جب انہیں ہی یقین نہیں تو پھر کس کو ہوگا؟ پھر چاہیے کہ ایمان ایک معنی بے مصداق ہو جائے کیونکہ ایمان کو یقین لازم ہے، پھر اگر اپنے اطمینان کے لیے معنی اس طرح کریں گے کہ ان کو بمقتضائے بشریت بے اختیار یہ خطرات دل میں گزرتے تھے۔ اس کو خداوند کریم نے بلفظ ظن (خواہ وہ اپنے معنی میں ہو یا بمعنی یقین) مبالغۃً تعبیر کر دیا ہے تو یہ وہی بات ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے۔ سو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کو بھی ایسا ہی سمجھیے۔

مگر ہاں اگر یوں کہیے کہ نعوذ باللہ خدا کی طرف بوجہ بدا کذب کا احتمال ہو سکتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ احتمال نہیں تو البتہ ہم کو مشکل ہے مگر اس کے لیے بدا کے ابطال کی تقریر کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ بہرحال انبیاء کی نسبت خداوند کریم کا یہ فرمانا کہ وہ مایوس ہو گئے یا ان کو خدا کی نسبت یا وحی کی نسبت احتمال دروغ ہوا۔ بجز اس کے صحیح نہیں ہو سکتا کہ موقع تعریض و عتاب میں مبالغۃً فرما دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبرت ہو اور آپ ایسے خیالات میں نہ پڑ جائیں یا کسی اور وجہ سے مبالغۃً فرما دیا ہے سو ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول مذکور کو بھی سمجھیے۔ بہرحال یہ آیت ہمارے مطلب کے لیے ثبوت کامل ہے اور اسی قسم کی اور بہت سی نظیریں اہل فہم کلام اللہ سے نکال سکتے ہیں کہ اگر معنی ظاہری مراد لیجیے اور قرائن صارفہ کا کچھ خیال نہ کیجیے تو دین ایمان کی خیر نہیں، سو اگر مولوی صاحب کو کچھ ایمان کا درد ہے تو پھر خواہ مخواہ معنی ظاہری پر جو بے لحاظ قرائن خارجیہ کے متبادر الی الفہم ہیں کچھ لحاظ نہ کریں بلکہ معنی مقصود ربانی پر نظر رکھیں۔

یعنی آیت "حتّی اذا استیئس الرسل" کے یہ معنی لیں کہ انبیاء کے تہ دل میں تو یقین ہی تھا کہ وعدہائے الٰہی صادق ہیں، ایک نہ ایک روز بیشک امداد الٰہی آنے والی ہے۔ غرض دل سے کوئی صورت انقطاع اُمید اور ظن دروغ کی نہ تھی، پر جیسے بمقتضائے بشریت ہمارے تمہارے دل میں خداوند اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خیالات فاسد اوپر کے دل میں آ جاتے ہیں اور اس سے اعتقاد قلبی میں کچھ فرق نہیں آتا، ایسے ہی انبیاء کے دل میں بھی بمقتضائے بشریت، بہ نسبت وعدہائے الٰہی خیالات فاسد بے اختیار گزر جاتے تھے اور خدانخواستہ اطمینان قلبی میں کچھ فتور نہ تھا، جو یوں کہیے کہ وہ واقعی نا اُمید ہو گئے تھے اور یقین ہو گیا تھا کہ وعدہائے الٰہی محض دروغ تھے یا ان

کے صدق کا یقین نہ رہا تھا مگر چونکہ اس قسم کے خیالات کی وجہ سے (گو تہ دل میں نہ ہوں، اور بے اختیار ہی آتے ہوں) ظاہر نظر میں یوں ہی کہتے ہیں کہ دل میں اعتقاد ہی نہیں، یہ بات بعد تامل ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فقط اوپر کے خیالات ہیں۔

تو خداوند کریم نے بھی برعایت ظاہر بطور مبالغہ متعارف ان خیالات کو بلفظ ظن اور بے قراری اور بیتابی بشری کو (جس کے لوازم میں سے یہ خیالات ہیں) بلفظ یاس تعبیر فرمایا لیکن اسی طرح اگر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کو کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اور مجھ کو کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہو، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی کشیدگی اور شکایت دلی پر (جو بمقتضائے بشریت برخلاف اعتقاد اور محبت قلبی کے جو تہ دل میں جمی ہوئی تھی، اوپر کے دل میں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی) محمول کریں تو اس سے زیادہ اور تو کچھ گناہ نہ ہوگا کہ کلام اللہ کی ایک روش اختیار کی اور یہ بات تو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے منہ سے نکالی بھی نہ تھی، احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی غلط سمجھ گئے ہوں کہ دونوں صاحب کچھ اس قسم کا خیال تہ دل میں یا اوپر کے دل میں رکھتے ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی الفاظ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے کہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی نسبت کہے

ہم تو اس کے یہی معنی سمجھتے ہیں جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بالمواجہ مجمع عام میں اسی جلسہ میں بعینہ یہی الفاظ کہے ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث میں جس کے حوالہ سے مولوی صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو یوں کہنا کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب اور خائن وغیرہ سمجھتے ہو ثابت کرتے ہیں، موجود ہے مگر اس کو کاہے کو نقل کرتے، یہ تو صدیق اکبر ہی سے ضد ہے۔ بہر حال سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ حق بات یہی ہے جو میں نے عرض کی ورنہ حاشا وکلا جو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے دل میں ذرہ برابر صدیق کی طرف سے بدگمانی ہو مگر افسوس یہ ہے کہ مولوی صاحب اپنی تیرہ درونی کے باعث (حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اگر بلحاظ ظاہر یوں فرمادیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کچھ فرق ہے) تو بے تحقیق اعتبار کرلیں اور حضرت خود اپنی زبان مبارک قسمیں کھا کھا کر ایسے کمالات جو لگ بھگ مرتبہ نبوت کے ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں بیان فرمائیں

اور علیٰ ہذا القیاس اور آئمہ نے چنانچہ سابقاً بحوالہ کتب معتبرہ شیعہ مفصلاً مرقوم ہو چکا ہے۔

لیکن اس پر بھی کیا امکان جو مولوی صاحب کے اور سوا ان کے اور شیعوں کے دل میں کفر ٹوٹے۔ سبحان اللہ! کیا سمجھ ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہجو کریں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی معتبر ہو جائیں اور تعریف ہو تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کہے جائیں، کوئی نہیں سنتا، کسی نے سچ کہا "کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ" ہم تو نہیں کہہ سکتے۔ پر شیعوں کے طور پر مولوی صاحب کی وہی مثل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں معجزوں پر بھی بنی اسرائیل سیدھے نہ ہوئے اور سامری کے ایک طلسم پر دین ایمان کھو بیٹھے۔ اس تقریر کے بعد مولوی صاحب کو اپنے اس چہ پوز اعتراض کی قلعی کھل گئی ہو گی اور اگر بایں ہمہ بوجہ بلادت نہ سمجھیں اور یہ دل نشین رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کہا وہ واقعی تھا، نہ اس میں کچھ غلطی ہے نہ اس کے سوائے ظاہری معنوں کے اور کوئی معنی۔

تو میری عرض یہ ہے کہ بیش بریں نیست حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے دل میں بھی بات ایک دفعہ کو جم گئی ہو کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خیانت کی اور جھوٹ بول دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" فرمایا ہے لیکن مولوی صاحب فرمائیں تو سہی کہ اتنی بات سے ان کے کیا ہاتھ لگا؟ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کے دست و گریبان ہونے کا قصہ مشہور و معروف ہے، اس کا سبب بجز اس کے اور بھی کچھ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بایں وجہ کہ ان کی یہ خلقی بات تھی کہ خلاف شریعت اور مخالف حکم الٰہی دیکھا نہیں اور ان کے تن بدن میں آگ لگی نہیں، ذرہ برابر اگر کہیں خدا کی نافرمانی نظر پڑ جاتی تھی تو پھر تھامے نہیں تھمتے تھے، طور سے لوٹ کر جب بچھڑے کی پوجا پاٹ دیکھی تو ایک دفعہ ہی یوں سمجھ گئے کہ بنی اسرائیل نے کیا تو کیا، حضرت ہارون علیہ السلام بھی ان کے شریک حال ہو گئے یا انہوں نے بنی اسرائیل کو نہ روکا جو یہ فساد پھیل گیا۔ بہر حال ان کو شریک حال سمجھا یا یوں سمجھا کہ انہوں نے کسی کو روکا نہیں لیکن اس سمجھنے میں اوّل تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ شک نہیں رہا تھا، نہیں تو نوبت یہاں تک نہ آتی کہ ان کے سر کے بال اور ڈاڑھی پکڑ کر اپنی طرف کو کھینچتے، فقط شک اور تردد میں اتنی پیش قدمی تو کم عقل بھی نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کا کمال عقل بالیقین معلوم ہے۔

حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما خطاءً بدگمان ہوئے

دوسرے یہ بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غلط فہمی تھی جو یوں سمجھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام اوّل تو نبی معصوم تھے ایسے اُمور میں شریک ہونا یا منع نہ کرنا، ان سے من جملہ

محالات ہے، دوسرے اگر معصوم نہ ہوتے تب واقع میں ان سے کچھ خطا نہ ہوئی تھی، بے تحقیق فقط ظاہر حال کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ حضرت ہارون علیہ السلام سے درباب نہی عن المنکر تقصیر ہوئی یا خود ان کے شریک حال ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے آپے سے باہر نکل گئے ورنہ حضرت ہارون علیہ السلام بہر طور بے خطا تھے، شریک حال ہونا تو کجا؟ منع اور زجر و توبیخ میں انہوں نے اپنی طرف سے کوتاہی ہی نہیں کی تھی، تقدیر سے بات راست نہ آئی۔

اب دیکھئے کہ جب ایک معصوم دوسرے معصوم سے اتنے بدظن ہو جاتے ہوں کہ نوبت بہشت مشت کی پہنچی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر فی الجملہ کچھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے بدگمان ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ اور اہل سنت کو اس کی تسلیم میں کیا دُشواری ہے۔ نہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک معصوم! جو ان کے کذب و خیانت کے منسوب ہونے میں کسی رُکن ایمان کا تھامنا مشکل پڑ جائے، نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے اعتقاد میں معصوم کہ ان کی طرف غلط فہمی کی نسبت کرتے کچھ جی ڈرے اور پھر بایں ہمہ ہنوز یہ بھی تحقق نہیں کہ بالیقین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جی میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کچھ گمان فاسد ہو، فقط حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عندیہ کے موافق وہ بھی مبالغۃً ایک بات کہہ دی ہے ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بہ نسبت حدیث "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" اقرار کرنا اور پھر حد سے بڑھ کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تعریفیں کرنا۔ چنانچہ سابقاً مرقوم ہو چکا ہے، خود اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ دل مرتضوی لبریز حسن اعتقاد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھا۔

اس پر بھی اگر مولوی صاحب (بزعم خود) باتباع حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب و خائن و غادر و آثم سمجھتے ہیں، تو بہ نسبت حضرت ہارون علیہ السلام تو دو قدم آگے بڑھ کر ان کے عصیان اور شراکت شرک کا چھاتی ٹھوک کر اقرار کریں گے کیونکہ اوّل تو حضرت موسیٰ علیہ السلام معصوم اور بزعم شیعہ معصوم غلط فہمی سے بھی معصوم ورنہ اہل سنت پر یہ طعن کیوں ہوتا کہ ان کے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ غلطی کھا سکتے ہیں۔ دوسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بہ نسبت حضرت ہارون علیہ السلام بالیقین خطا وار سمجھنا بالیقین معلوم ہے تو اس صورت میں کوئی صورت مولوی صاحب کو اس عقیدہ میں کمی کرنے کی نہیں۔

امام کی اتباع میں شیعہ اگر صدیق رضی اللہ عنہ کو برا کہیں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اتباع میں امام کو بھی کہیں

ادھر حضرت عباس حضرت علی رضی اللہ عنہما کے بھی بزرگ ہیں دین کے نہیں، نسب ہی کے سہی،

تھوڑا بہت کچھ ان کا بھی اتباع چاہیے۔ بہت نہیں، تھوڑا ہی سہی۔ مع ہذا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی۔ چنانچہ بحوالہ قاضی نور اللہ شوستری مرقوم ہو لیا ہے تو ان کی بات باون تولہ پاؤ رتی کی نہیں تو کچھ تو اعتبار رکھتی ہوگی، سو جس سند سے مولوی صاحب کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کاذب سمجھنا کچھ معلوم ہوا ہے۔ اسی روایت میں حضرت عباس کا حضرت علی مرتضیٰ کو بعینہ اسی طرح برا کہنا، اس سے بھی پہلے مذکور ہے۔ بلکہ شاید حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں کی بات سے سمجھا ہو کہ ایسے معاملات میں اتنے رنج میں ایک دوسرے کو کاذب وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اسی قیاس پر انہوں نے کہہ دیا کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ایسا سمجھتے ہو۔ سو بحکم محبوبیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگی حضرت علی حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا بھی اقتداء چاہیے۔ اگر عذر بے اعتقادی ہے تو بہت نہیں تھوڑا ہی سہی، واہ کیا دین و کیا آئین ہے؟ جس مذہب کے ایسے دلائل ہیں وہ خود مذہب کیا ہوگا؟

ع:...... قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اب ایک بات شرح طلب باقی رہی مگر اس کے بیان میں متردد ہوں۔ بایں خیال کہ وہ بات شاید کسی کے خیال میں آجائے تو یہ اندیشہ ہے کہ مبادا کسی متردد کو تردد پیدا ہو یا کسی متعصب کو جائے انگشت نہادن ملے اور جب یہ بھی خیال آتا ہے کہ کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے کہ روٹی نہ کھایئے تو بھوکے مریئے اور کھایئے تو ہیضہ میں جان سے گزریئے، ڈرتا ہوں کہ شاید کم فہم نہ سمجھیں اور بیٹھے بٹھلائے گمراہ ہوں، میں اگر نہ لکھوں تو شاید خبر بھی نہ ہو لیکن بایں خیال کہ روٹی کو خداوند کریم نے نفع ہی کے لیے بنایا ہے نقصان ہو جائے تو اتفاقی ہے۔ اس لیے ہیضہ کے اندیشہ سے کوئی کھانا نہیں چھوڑ دیتا، میرا کلام تو کیا چیز ہے۔ خود کلام ربانی میں کلام ربانی کی نسبت یوں فرماتے ہیں: "یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ط" گمراہ کرنا اوّل ہے ہدایت اس کے بعد۔ پھر جب خداوند کریم نے اپنی بات کو کسی سے نہ چھپایا ہو، میں اپنے جی کی بات کیوں چھپاؤں۔

جیسے کلام ربانی اصل ہدایت کے لیے ہے، یوں کوئی اپنی کج فہمی سے بے راہ ہو تو ہو، ایسے ہی وہ باتیں جو کلام اللہ و حدیث سے مستنبط ہوتی ہیں۔ اصل میں وہ ہدایت ہی کے لیے ہیں، یوں کوئی بات کے مغز کو نہ سمجھے اور بہک جائے تو اپنا سر کھائے، بہر حال لکھنا ہی مناسب سمجھ کر لکھتا ہوں۔

ترکہ نبوی کے میراث ہونے پر استدلال اور اس کے جوابات

حدیث مالک بن اوس مذکور میں جس کے بعض مضامین مولوی صاحب نے رقیمہ کریمہ میں

درج فرمائے ہیں اور اس کو روایت صحیح مسلم کہا ہے، یوں مرقوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اسی جلسہ میں جس میں یہ دونوں صاحب جھگڑتے ہوئے آئے تھے۔ بغرض الزام یوں بھی فرمایا تھا۔

فَلَمَّا تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ اَنَا وَلِیُّ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجِئْتُمَا تَطْلُبُ مِیْرَاثَکَ مِنْ اِبْنِ اَخِیْکَ وَیَطْلُبُ ھٰذَا مِیْرَاثَ اِمْرَاَتِہٖ مِنْ اَبِیْھَا فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ. اس کے بعد یہ ہے فَرَاَیْتُمَاہُ کَاذِبًا اٰثِمًا غَادِرًا خَائِنًا.

''حاصل مطلب یہ ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اب میں ہوں ساری باتوں کا ولی اور مولیٰ تو تم دونوں آئے، تم تو اپنے بھتیجے کی میراث مانگتے تھے اور یہ اپنی بیوی کی طرف سے ان کے باپ کی میراث مانگتے تھے، اس پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے "لا نورث ما ترکناہ صدقۃٌ" سو تم نے انہیں کاذب، آثم غادر خائن سمجھا۔ فقط''

اس سے دو باتیں اہل سنت کے قول کے خلاف معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ حدیث "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" کو اہل سنت یوں کہتے ہیں کہ اس کے راوی حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں اور اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خبر بھی نہ تھی ورنہ اہل سنت کے اعتقاد کے موافق حضرت علی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی طرف بھی یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ باوجود یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لیا ہو کہ "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" پھر طلبگار میراث ہوں، دوسرے یہ بات ہے کہ لفظ "میراثک" اور لفظ "میراث امراتہ" اور نیز صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب دینا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ دونوں طالب میراث ہوئے، پھر جب ان دونوں صاحبوں کو حدیث مذکور کی خبر ہی نہ ہوئی تو اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کاذب وغیرہ سمجھنا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے ان کی میراث نہ دی۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس نہ دینے ہی کی تفریع میں یہ بیان فرمایا ہے "فرایتماہ کاذبا الخ". سو اس صورت میں یہ توجیہ ہی غلط ہوگئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بایں وجہ کچھ کشیدگی تھی کہ وہ ان کی تولیت تک کے روادار نہ ہوئے اور

اس کشیدگی ہی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب سمجھتے تھے اور بایں ہمہ جب میراث کے نہ دینے کی وجہ سے ان دونوں صاحبوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب خائن وغیرہ سمجھا تو اب بجز اس کے سمجھ میں نہیں آتا، نہ دل سے کاذب وغیرہ سمجھا ہو کیونکہ کسی کی میراث کا نہ دینے والا بالیقین خائن ہے۔ البتہ اگر اس حدیث میں یوں مذکور ہوتا کہ ان دونوں صاحبوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی تولیت ہی مانگی۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مانگی تھی پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تولیت سے بوجہ مذکورہ یا بوجہ دیگر انکار کیا تو یوں بھی کہنے کی گنجائش تھی کہ تولیت کے نہ دینے میں کچھ ستم نہیں، تولیت کسی کا حق نہیں، خلیفہ کو اختیار ہے، جسے چاہے اپنی سمجھ کے موافق متولی کرے۔

جواب اوّل

اب ان دونوں اعتراضوں کا جواب بگوش ہوش سنئے۔ اوّل تو اگر ہم فرض کریں کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے تولیت ہی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے طلب کی تھی، تب ان الفاظ سے کچھ اس کے مخالف ان شاء اللہ تعالیٰ نہ نکلے گا اور یہی الفاظ جو حدیث میں مذکور ہیں طلب تولیت پر محمول ہو جائیں گے، گو ظاہر میں طلب میراث ہی پر دلالت کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سابق میں معنی میراث کی تحقیق میں گزر چکا ہے کہ میراث کے معنی حقیقی بھی قائم مقام ہونا ہے، پر اصطلاح فقہاء میں میراث بمعنی مشہور میں مخصوص ہو گیا ہے۔

دوسرا جواب

اور اگر معنی حقیقی نہیں تب اس میں تو کلام ہی نہیں کہ مجاز متعارف ہے۔ چنانچہ محاورات قرآنی میں بہت مواقع میں اسی معنی میں مستعمل ہے۔

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ. وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا. نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا

اور سوا ان کے اور بھی آیات میں یہی معنی مراد ہیں۔ اوّل دو آیتوں کا ترجمہ تو گزر ہی چکا ہے اور تیسری آیت کا حاصل یہ ہے "کہ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے ہم زمین کے وارث ہوں گے اور جو زمین پر رہنے والے ہیں ان کے بھی" اور ظاہر ہے کہ بمعنی مشہور خداوند کریم کسی کا وارث نہیں۔ الحاصل ان آیات میں میراث سے میراث بمعنی قائم ہونے کے مراد ہے۔ سو تولیت میں بھی یہی

ہوتا ہے کہ متولی وقف کرنے والے کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اس صورت میں "منو الک من ابن اخیک اور منو اث امراۃ" میں "ابیھا" کے یا تو یہ معنی ہوں گے کہ تم تو اے عباس! اپنے بھتیجے یعنی سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل الصلوات کے قائم مقام ہونے کے اور ان کے ترکہ کے متولی ہونے کے طلبگار تھے اور یہ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ترکہ میں اپنے خسر یعنی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام ہونے کے خواستگار تھے۔

اس تقریر پر تو کلمہ "من جو من ابن اخیک اور من ابیھا" میں ہے صلہ، میراث ہوگا اور مجموعہ صلہ اور موصول کا حاصل قائم ہونا نکلے گا اور یا یوں کہئے کہ قائم مقام ہونا فقط لفظ میراث کا مدلول ہے اور لفظ میراث کا صلہ اگر ہے تو محذوف ہے اور کلمہ من مذکور سببیہ ہے اور حاصل مطلب یہ ہو کہ تم تو بھتیجے کی وجہ سے تولیت کے قائم مقام ہونے کے طالب ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خسر کے طلبگار ہوئے، یہ دو توجیہیں تو بایں نظر ہیں کہ میراث کے یہ معنی نہیں جواب معروف ہیں۔

تیسرا جواب

اور اگر بپاس خاطر شیعہ میراث کو باعتبار معنی حقیقی معنی معروف ہی میں منحصر رکھیں اور پھر اس کو کسی دوسرے معنی کی طرف منقول بھی نہ کہیں یا اس جگہ بجز معنی معروف عوام کے اور معنی مستبعدی معلوم ہوں۔ تب بھی یہ کلام معنی مذکور پر دلالت کرنے میں کمی نہ کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ بطور تشبیہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طلبگاری تولیت کو بوجہ استحقاق قرابت میراث فرمادیا ہو اور بوجہ قرابت استحقاق جتا کر تولیت کے طلب کرنے کو طلب میراث سے جس قدر مشابہت ہے، ظاہر ہے اور یہ توجیہ جب ہی بن پڑتی ہے جبکہ مادہ میراث کو معنی معروف میں منحصر نہ رکھئے بلکہ بدستور معنی معروف غیر معروف میں عام سمجھئے۔ چنانچہ ظاہر ہے باقی اس صورت میں اگر کوئی طالب قرینہ صارفہ ہے جو ارادہ معنی حقیقی سے روکے تو اس سے زیادہ اور کیا قرینہ ہوگا کہ دو چار سطر ہی پہلے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا اقرار گزرا ہے کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **"لا نورث ما ترکناہ صدقۃ"**

لیکن یہ بات قابل بیان باقی رہی کہ ہم نے مانا یہ تینوں توجیہیں صحیح اور حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما تولیت ہی کے طلبگار ہوئے تھے، طالب میراث نہ ہوئے تھے لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس جواب کو کہ **"قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث ما ترکناہ صدقۃ"** طلب تولیت سے کیا علاقہ؟ کیونکہ بالیقین اس حدیث میں میراث سے معنی معروف مراد ہیں، اس صورت میں اس سوال و جواب کا وہی حال ہوگا، جیسا مشہور ہے "سوال از آسماں جواب از ریسماں" یا

جیسے مثل مشہور ہے ''زمین کی کہیں تو آسمان کی سنیں'' اس لیے ہمیں اور بھی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ خیر

ع:...... برسر فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد

اس تحریر کے مشغلہ کی کلفت بھی آخران شاء اللہ ایک روز رفع ہونے والی ہے۔ سو بچشم انصاف اور بگوش ہوش دیکھئے اور سنئے کہ یہ جواب سوال مذکور کے کس طرح مطابق آتا ہے۔

جناب من جواب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مطابقی، دوسرا التزامی، مطابقی کے معنی تو یہ سمجھئے کہ اس کلام کے معنی مطابقی عین جواب ہو اور جواب التزامی کے ہماری اصطلاح میں یہ معنی ہیں کہ اس کے معنی مطابقی کو اقرار یا انکار لازم ہو۔ اس جواب کو در صورت یہ کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی طرف سے طلب میراث بمعنی معروف ظہور میں آتی۔ بمنزلہ جواب مطابقی سمجھنا چاہیے۔ گو حقیقت میں التزامی ہے کیونکہ ان الفاظ میں سے کسی کے معنی مطابقی یہ نہیں کہ میں دوں گا یا نہ دوں گا، مگر چونکہ اس جواب سے انکار ایسا ہی ظاہر ہے جیسے یوں کہہ دیتے ہیں کہ میں نہیں دیتا اس لیے اس جواب کو بمنزلہ جواب مطابقی سمجھئے اور در صورت یہ کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما طالب تولیت ہوئے ہوں، تب اس جواب کو جواب التزامی سمجھئے۔ اس لیے کہ اس صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ تمہارے متولی کر دینے میں یہ اندیشہ ہے۔ مبادا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے طلب میراث کے قرینے سے خلائق کے یہ ذہن نشین نہ ہو جائے کہ تمہیں جو دیا ہے تو بطور میراث دیا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ بات منقول ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے ہمارے بعد اس میں تصرفات مالکانہ ہونے لگیں اور آگے جو پیدا ہونے والے ہیں اس کو میراث سمجھ کر بانٹ بونٹ برابر کریں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے ''**لا نورث ما تر کناہ صدقۃ**'' ہر چند بعد اس تقریر کے اس ایک جواب کے دو مختلف سوالوں پر مطابق آنے میں کسی بلید ہی کو تامل رہے تو رہے مگر بنظر احتیاط و مزید توضیح ایک مثال مرقوم ہے، اگر کوئی بادشاہ کسی امیر کی جاگیر اس کے انتقال کے بعد ضبط کر کے کسی افسر کو یوں حکم دے کہ تم بطور خود لوگوں کو نوکر چاکر رکھ کر اس کا انتظام کر لو تو اگر اس امیر کی اولاد جس کی جاگیر ضبط ہوتی ہے۔ کسی وجہ سے یوں سمجھتے ہوں کہ یہ جاگیر دوام کے لیے تھی اور اس افسر کے اچانک نظم و نسق کو دیکھ کر اس سے یوں کہیں کہ یہ جائیداد تو ہماری ہے تم اسے کیوں دباتے ہو، لازم یوں ہے کہ اسے ہمارے حوالہ کر دو تو اس کا یہ جواب کہ بادشاہ نے اس جاگیر کو ضبط کر لیا ہے تمہیں نہیں مل سکتی، جیسا صحیح ہے، ویسا ہی اس صورت میں بھی صحیح ہے کہ اس امیر کی اولاد اپنی جاگیر کے ضبط ہونے سے مطلع ہوں، پر بضرورت طلب معیشت اس افسر سے اس

رہے کہ تم سچ ہوں کہ تم آ کر کسی بندے کو اس کے احکام کے لیے نوکر رکھو گے اگر ہمارے ہی ہاتھوں ان کو اس کام پر کرا دو تو ہم اس کا استحقاق بھی رکھتے ہیں۔ امیر معاوی کی اولاد ہیں۔

مگر اس صورت میں اور اس صورت میں اتنا فرق ہوگا کہ پہلی صورت میں تو جواب دہ کوئی دیتا ہے اور دوسری صورت میں بعض مقدمات جواب اتر آنا کچھ جاتے ہیں اور حاصل جواب یہ ہے کہ یہ جائیداد ضبط ہو چکی ہے۔ اگر تم کو نوکر بھی رکھا جائے، تب یہ اندیشہ ہے کہ کوئی غماز بادشاہ کے کان میں کچھ جا جڑے اور بادشاہ کے دل میں یہ خیال بیٹھ جائے کہ افسر نے امیر زادوں سے کچھ سازش کر کے جائیداد کو بدستور رہنے دیا ہے، پھر نہ تمہاری خیر نہ میری خیر۔

حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما نے بھول سے مطالبہ کیا اور بھولنا عیب نہیں

دوسرا جواب حضرات شیعہ اپنے حسب دلخواہ لیں یعنی یہ ہی سہی کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما طالب میراث ہی ہوئے تھے لیکن باوجود اس بات کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے کہ "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" پھر اس طلب کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ آدمی تھے، بھول گئے، جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا، تب یاد آیا، سو اس بھول جانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ فرق نہیں آتا، بڑے بڑے رسول بھولے چوکے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی بھول

حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں خداوند کریم فرماتے ہیں "وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ" یعنی ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے سے تقید تاکید سب کچھ کر دی تھی، پھر بھی بھول گئے، جب حضرت آدم جیسے پیغمبر ذیشان ہو کر خود خدا کی تقید و تاکید کو بھول جائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تو امام ہی تھے، وہ بھی پھر حضرت آدم علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں اور بحکم "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِأَبِيْهِ" ان کے نسیان کے وارث، وہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عام بات کو بھول جائیں جس میں کسی قسم کی تاکید اور تقید نہیں، نہ علی العموم نہ بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، تو فرمائیے کیا قباحت ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھول

علیٰ ہذا القیاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حسب ہدایت خداوندی حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جانا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام سے بغرض تعلیم علم ملازمت کی درخواست کرنا اور حضرت خضر علیہ السلام کا بتاکید تمام یوں کہنا کہ تم سے میرے ساتھ نہ رہا جائے گا، یعنی میری باتیں

تمہارے خیال میں نہ آئیں گی، تم خواہ مخواہ اعتراض کیے جاؤ گے، پھر ہماری تمہاری کیسے بنے گی۔

پھر ان سب کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عہد لینا کہ اگر میری ہمراہی مدنظر ہے تو جب تک میں نہ بتاؤں، تم کسی بات کو نہ پوچھو، یہ سارا قصہ سورۂ کہف میں سولہویں سیپارہ کے شروع سے کچھ پہلے مذکور ہے، اس اعتقاد پر کہ خدا کے بھیجے ہوئے گئے اور اس اہتمام پر کہ سفر دور دراز قطع کیا اور پھر کیا کیا انکار اور اقرار ہوئے، حضرت خضر علیہ السلام کی جلالت قدر اور ان کی باتوں کا معقول ہونا یک لخت دل سے نکل گیا اور اس پر اپنا عہد بھی بھول گئے۔

چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام کو مع حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ایک گھاٹ کے ملاحوں نے بوجہ اعتقاد بے لیے دیئے سوار کر لیا اور انہوں نے بیچ میں جا کر اس کشتی کا تختہ توڑ ڈالا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور یہ کہہ اُٹھے: "اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا" یعنی اے خضر کیا تم نے اس کشتی کو اس لیے توڑ دیا کہ بیٹھنے والوں کو ڈبو دو، تم نے بھی عجیب کام کیا کہ کشتی والوں کے احسان کے بدلے یہ نقصان کیا۔ اس کے جواب میں جب حضرت خضر علیہ السلام نے یوں فرمایا "اَلَمْ اَقُلْ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِیَ صَبْرًا" یعنی میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر کیا "لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِيْتُ" یعنی "میں بھول گیا تھا تم مواخذہ نہ کرو۔"

الحاصل اس اہتمام اور اس تقید پر اتنی جلدی حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہوں تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اتنی دیر کے بعد بھول جانا کچھ بات ہی نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول اولوالعزم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ رسول نہ نبی نہ اولوالعزم...... نہ غیر اولوالعزم، بایں ہمہ کوئی اہتمام اور پیش بندی نہ تھی۔ فقط اتفاقاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات چلتی چال سن لی، وہ بھی اس طور پر کہ علی العموم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی۔ کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سنانے کی اس میں تخصیص نہ تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بالخصوص یہ بات پیش آئی کہ خدا کے بھیجے ہوئے گئے اور آگے جو کچھ گزرا سو گزرا۔

سید الخلق صلی اللہ علیہ وسلم کی بھول

اور اگر ناانصافان شیعہ حضرت موسیٰ اور حضرت آدم علیہم السلام کے نسیان پر نہ شرمائیں تو خود سرور کائنات علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات کو جناب باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں "وَاذْكُرْ رَبَّکَ اِذَا نَسِيْتَ" یعنی یاد کر اپنے رب کو جب بھول جایا کرے، اس سے صاف

کے صدق کا یقین نہ رہا تھا مگر چونکہ اس قسم کے خیالات کی وجہ سے (گو تہ دل میں نہ ہوں، اور بے اختیار ہی آتے ہوں) ظاہر نظر میں یوں ہی کہتے ہیں کہ دل میں اعتقاد ہی نہیں، یہ بات بعد تامل ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فقط اوپر کے خیالات ہیں۔

تو خداوند کریم نے بھی برعایت ظاہر بطور مبالغہ متعارف ان خیالات کو بلفظ ظن اور بے قراری اور بیتابی بشری کو (جس کے لوازم میں سے یہ خیالات ہیں) بلفظ یاس تعبیر فرمایا لیکن اسی طرح اگر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کو کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اور مجھ کو کاذب خائن وغیرہ سمجھتے ہو، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی کشیدگی اور شکایت دلی پر (جو بمقتضائے بشریت برخلاف اعتقاد اور محبت قلبی کے جو تہ دل میں جمی ہوئی تھی، اوپر کے دل میں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی) محمول کریں تو اس سے زیادہ اور تو کچھ گناہ نہ ہوگا کہ کلام اللہ کی ایک روش اختیار کی اور یہ بات تو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے منہ سے نکالی بھی نہ تھی، احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی غلط سمجھ گئے ہوں کہ دونوں صاحب کچھ اس قسم کا خیال تہ دل میں یا اوپر کے دل میں رکھتے ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی الفاظ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے کہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی نسبت کہے

ہم تو اس کے یہی معنی سمجھتے ہیں جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بالمواجہ مجمع عام میں اسی جلسہ میں بعینہ یہی الفاظ کہے ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث میں جس کے حوالہ سے مولوی صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو یوں کہنا کہ تم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کاذب اور خائن وغیرہ سمجھتے ہو ثابت کرتے ہیں، موجود ہے مگر اس کو کاہے کو نقل کرتے، یہ تو صدیق اکبر ہی سے ضد ہے۔ بہرحال سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ حق بات یہی ہے جو میں نے عرض کی ورنہ حاشا وکلا جو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے دل میں ذرہ برابر صدیق کی طرف سے بدگمانی ہو مگر افسوس یہ ہے کہ مولوی صاحب اپنی تیرہ درونی کے باعث (حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اگر بلحاظ ظاہر یوں فرمادیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کچھ فرق ہے) تو بے تحقیق اعتبار کرلیں اور حضرت خود اپنی زبان مبارک قسمیں کھا کھا کرایسے کمالات جو لگ بھگ مرتبہ نبوت کے ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں بیان فرمائیں

قال سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حرج ہوا ہو، اس لیے انہوں نے بطور تنبیہ و شکایت ان کے منہ پر کہہ دیا اور اس لیے انہوں نے بنظر انصاف سکوت فرما دیا، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

اس تقریر کے بعد اُمید یوں ہے کہ جن کو خداوند کریم نے عقل سلیم عطا فرمائی ہے اگر کسی نابکار کی صحبت سے بے راہ بھی ہیں تو راہ پر آ جائیں اور جو نہ آئیں تو اپنا سر کھائیں۔ **مَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ** اب الحمدللہ کہ جمیع اُمور متعلقہ حدیث صحیح مسلم کے بیان سے فراغت پائی، لازم یوں ہے کہ بقیہ خرافات خط مولوی صاحب کا بھی جواب دندان شکن جو مولوی عمار علی صاحب اور نیز دیگر پیشوایان شیعہ کے دانت کیا توڑے سے دیئے ان شاءاللہ بیان کر کے صفحہ قرطاس اور قلم و دوات کو ہاتھ سے دھرو بیجئے اس لیے التماس یوں ہے کہ آگے مولوی عمار علی صاحب یوں رقم فرماتے ہیں:

"اور صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ جس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فدک کے دینے سے انکار کیا، فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس پر غضبناک ہوئی اور تمام عمر پھر کبھی اس سے کلام نہ کیا اور صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وقت مرنے کے وصیت کی کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما میرے جنازہ پر نہ آنے پائیں انتہی"

یہ خط کی آخری عبارت ہے اور یہاں مولوی صاحب کی ترکی تمام ہولی مگر اہل فہم پر پوشیدہ نہ رہے گا کہ بعد ثبوت مضامین مسطورہ بالا خصوصاً اشارہ آیت "یوصیکم اللّٰہ" (در بارہ مستحق ہونے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میراث سے) اور صراحت آیت **ما افاء الله** (در بارہ وقف ہونے فدک وغیرہ اموال فئے کے) صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر (بوجہ نہ دینے فدک کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو) کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا، ہاں اُلٹا بطور حضرات شیعہ خوارج و نواصب کو گنجائش لب کشائی ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا باوجود معصوم ہونے کے۔ چنانچہ عقیدہ شیعہ یہی ہے، فدک وغیرہ اموال وقف میں سے کس لیے طلب گار میراث ہوئیں؟ اور پھر وہ بھی اس قدر کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک حق بات کہہ دی تو اُلٹا غصہ کے مارے ملنا جلنا میل ملاقات سب ترک کردی، مگر چونکہ سانچ کو آنچ نہیں، سچی بات ہر طرح درر ہتی ہے، اہلسنّت کو اس مقدمہ میں کچھ دُشواری نہیں، جیسے وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس مقدمہ میں بے قصور سمجھتے ہیں۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جگر گوشۂ سید الوریٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی طرح مورد اعتراض نہیں سمجھتے اور بایں ہمہ کوئی قاعدہ ان کے دین و مذہب کا منقوض نہیں ہوتا، اوّل تو عیاں را چہ بیان۔

قرآن فہمی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اُمتی محتاج ہیں

دوسرے بات کچھ دور نہیں، کان درست کیجئے اور سنئے۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہر چند سیدۃ النساء بلکہ ان کے خاکپا سرمہ اکابر اولیاء، ان کے غلامان غلام مورد افضال کبریا، ان کی محبت جو محبت کے طور پر ہو، باعث نجات اشقیا۔ ان کا اعتقاد جو اعتقاد کی طرح پر ہو باعث ترقی درجات اعلیٰ۔ لیکن پھر بھی اُمتی تھیں، نبی نہ تھیں، فہم قرآن مجید میں کچھ نہ کچھ حاجت تفسیر نبوی رکھتی تھیں کیونکہ فقط زبان دانی اور قوت فہم دقائق معانی سے اس جگہ کام نہیں چلتا۔ تفصیل اجمال کلام ربانی اور شرح اشکال آیات فرقانی، بجز مورد وحی آسمانی اعنی سرور دو جہاں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وازواجہ واہل بیتہ واصحابہ وسلم کے متصور نہیں۔ چنانچہ خود خداوند کریم فرماتا ہے "اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ط" یعنی "بھیجا ہم نے تم میں رسول تمہیں میں سے جو پڑھتا ہے تم پر ہماری آیات اور سنوارتا ہے تم کو اور تعلیم کرتا ہے تم کو قرآن اور حق بات۔ فقط"

اب غور فرمائیے کہ "يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ" کہ جس کے یہ معنی ہیں کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں۔ تعلیم الفاظ قرآنی پر دلالت کرتا ہے اور "يُزَكِّيْكُمْ" جس کے یہ معنی ہیں کہ سنوارتا ہے اور پاک صاف کرتا ہے، تزکیہ باطن کی طرف مشیر ہے۔ بعد میں جو "يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ" فرمایا تو قطع نظر اس کے کہ تعلیم عرف عرب میں معانی ہی سے متعلق ہے بعد "یتلوا علیکم" کے یہ فرمانا اس بات پر دلیل کامل ہے کہ یہ تعلیم معانی کی تعلیم ہے، پھر جب "يُعَلِّمُكُمْ" میں خطاب تمام اُمت کی جانب ہو، خاص کر مسلمانان ملک عرب کی طرف جو صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ چنانچہ لفظ "منکم" سے عیاں ہے تو معلوم ہوا کہ اور سب علم معانی قرآن میں محتاج سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور نیز یہ بھی محقق ہو گیا کہ تعلیم معانی قرآن کی قابلیت بھی ہر کسی میں نہیں جب تک تزکیہ تام نہ ہو، تب تک تعلیم معانی قرآنی بے موقع ہے۔ اسی واسطے "یعلکم" کے بعد "یزکیکم" فرمایا اور شواہد اس دلیل کے قرآن میں بہت ہیں، حافظان علم پر مخفی نہ رہے گا۔ من جملہ ان کے ایک جگہ شان قرآن میں "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" فرماتے ہیں یعنی اُتاری ہم نے تجھ پر کتاب جس میں ہر چیز کی تفصیل اور بیان ہے۔

وَمَا اُوْتِيْتُمْ سے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ ہیں

اور ایک جگہ علاوہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اوروں کو فرماتے ہیں "وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلاَّ

قَلِيْلًا"۔ یعنی ''نہیں دیئے گئے تم علم سے مگر تھوڑا'' اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مستثنیٰ ہونے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ لفظ "قُلِ الرُّوْح" جو اس سے پہلے ہے اس بات پر شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ قاصد اس خطاب اور اس فرمان کے پہنچانے والے ہیں، داخل زمرۂ مخاطبین نہیں اور بایں ہمہ ہم یہ کب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کے دقائق کو خدا کے برابر سمجھتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اوروں سے سب سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ القصہ ناظرین فہمیدہ کو کلام اللہ میں سے اس قسم کے بہت سے مضامین ملیں گے جن سے دعویٰ احقر کی تصدیق ہو اور اگر کوئی بسبب کجی طبیعت کے ان کے موید ہونے میں کسی وجہ سے تکرار کرے تو کرے، بدستاویز آیت "اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رسولاً الخ" جو کچھ بندۂ ہیچمداں نے عرض کیا ہے وہ کسی کے باپ سے رد نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی فہم قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج تھیں

خیر بہر حال حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا درباب فہم معانی قرآنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہونا کلام اللہ سے ثابت ہو نہ ہو، پر اہل سنت کے نزدیک تو یہ بات لاریب مسلم ہے اور اس کے مخالف کسی دلیل عقلی یا نقلی سے آج تک کوئی بات ان کو ثبوت کے ساتھ نہیں پہنچی اور کیونکر پہنچے؟ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا دربارہ فہم قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محتاج ہونا اظہر من الشمس ہے، محتاج دلیل نہیں، اس کے خلاف کا غلط ہونا بھی ہر کسی کے نزدیک روشن، پھر اگر کسی آیت کے فہم میں بسبب اس کے کہ اس کی تفسیر زبان گوہر ریز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی ہو۔ فی الجملہ غلطی ہو جائے اور اس کے کسی اشارہ مخفی کو نہ سمجھیں تو اہل انصاف فرمائیں کہ اس میں کیا محال ہے؟

علیٰ ہذا القیاس اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بلکہ آج کل کوئی شخص اہل فہم میں سے اس اشارہ مخفی کو جو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے رہ گیا ہو، بہ تنبیہ (نسبت وتفسیر نبوی) سمجھ جائے تو کیا قباحت ہے؟ نہ اس بات سے کچھ کسر شان حضرت زہرا رضی اللہ عنہا لازم آتی ہے اور نہ اس وجہ سے دوسروں کو ان پر فوقیت ہو سکتی ہے۔

اگر کسی ایک بات کے جاننے سے کسی کو فضیلت ہو تو حضرت خضر حضرت موسیٰ علیہم السلام سے افضل ہوتے

اگر ایک بات کے سمجھ لینے سے سمجھنے والوں کو نہ سمجھنے والوں پر فوقیت ہوا کرتی تو حضرت خضر کو

حضرت موسیٰ علیہم السلام پر فوقیت ہوتی کیونکہ کشتی کے توڑنے اور لڑکے کے قتل کرنے کی وجہ باوجود یہ کہ یہ سب حضرت خضر علیہ السلام نے بامر خداوندی کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ سمجھے اور حضرت خضر علیہ السلام ان سب کی وجوہ جانتے تھے، چنانچہ واقفان کلام ربانی جانتے ہیں حالانکہ مذہب صحیح یہی ہے کہ حضرت خضر نبی نہ تھے اور اگر تھے بھی تو باجماع اُمت حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہیں۔

ادھر حضرت داؤد علیہ السلام کا کھیتی کے مقدمہ میں غلطی کھانا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حکم خداوندی کا سمجھ جانا معروف ومشہور ہے اور قرآن میں مذکور حالانکہ جس وقت یہ قصہ پیش آیا، اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام پیغمبر وقت تھے اور پیغمبر بھی کیسے اولوالعزم، اور حضرت سلیمان علیہ السلام جب تک نہ نبی ہوئے تھے اور نہ امام تھے اور بایں ہمہ صغیر السن، کیونکہ وقت وفات حضرت داؤد علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر کل بارہ برس کی تھی جب یہ قصہ پیش آیا۔ جب تو اور بھی چھوٹی عمر ہوگی، پھر جب حضرت داؤد علیہ السلام (حالانکہ نبی وقت اور رسول اولوالعزم تھے) ایک مسئلہ میں غلطی کریں اور ایک لڑکا نوعمر بات صحیح کہہ دے۔

تو اسی طرح حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اگر ایک اشارہ بے تعلیم نہ سمجھیں وہ بھی آیت "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ" کا اشارہ، جو من جملہ آیات قرآن مجید ہے، جس کا فہم کامل بجز تفہیم وتعلیم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ممکن نہیں۔ چنانچہ معلوم ہو چکا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بلکہ آج کل کے پڑھنے لکھنے والے جو کسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بلکہ ان کے خاکپا اور ان کے سگ در کے برابر نہیں ہوسکتے، بوجہ تعلیم نبوی سمجھ جائیں تو کچھ حرج نہیں، علیٰ ہذا القیاس ممکن ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اوّل فدک کا فئے ہونا نہ معلوم ہو کیونکہ ایسے قصے اکثر مجاہدین اور غانمیں کو معلوم ہوتے ہیں اور بایں ہمہ آیت ماافاء اللہ سے بھی اراضی فئے کا غیر مملوک ہونا بتامل ہی نکلتا ہے۔ چنانچہ ناظرین وجوہ مسطورہ بالا پر (جو دربارہ تحقیق غیر مملوک ہونے اراضی فئے لکھے گئے ہیں) پوشیدہ نہ رہے گا۔

اور اس نہ سمجھنے اور اس بے علمی کے باعث بعد وفات سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات و اکمل التحیات حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے طالب میراث ہوئیں کیونکہ جب تک اشارہ وجوہ اراضی فئے یوصی اور اشارات مذکورہ پر اور علیٰ ہذا القیاس وجوہ غیر مملوک ہونے اراضی فئے پر جو آیت ماافاء اللہ کے پس وپیش سے مستنبط ہیں، نظر نہ ہو تب تک ظاہر آیت "یوصیکم" اسی طرف ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم بھی حکم میراث میں شریک اُمت ہیں۔

سیدہ رضی اللہ عنہا نے سماع حدیث کے بعد ندامت کے سبب بات چیت بند کی

مگر جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنا دی ہو، تب اس طلب گاری سے ایک گونہ ندامت اور رنج حاصل ہوا ہو کیونکہ انبیاء اور مرسلین اور صدیقین اور کاملین کو لازم ہے کہ اگر کوئی بے اعتدالی ان سے ظہور میں آئے تو بعد اطلاع اس پر ندامت ہوا کرے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کے کھا لینے پر نادم ہونا اور علیٰ ہذا القیاس حضرت نوح علیہ السلام کا دعائے نجات فرزند سے نادم اور پشیمان ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قتل قبطی سے شرمندہ ہونا خود قرآن میں موجود ہے۔

اور اس ندامت کے باعث حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ربط وضبط میں فرق آ گیا ہو اور ملنا جلنا بدستور سابق نہ رہا ہو، نہ یہ کہ ملے پر بھی کلام وسلام کی نوبت نہ آتی ہو کیونکہ اس طرح کی متارکت تین دن سے زیادہ حرام ہے۔ چہ جائیکہ تمام عمر؟ وہ بھی ایسے مسلمانوں میں، بہر حال ترک کلام میں جو بعض روایات میں ہے، اہلسنت کے نزدیک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف کچھ حرف نہیں۔

سماع حدیث کے بعد سیدہ کو کلام کی حاجت ہی نہ رہی

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کلام نہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ جب حدیث "لا نورث" سن لی تو پھر فدک کے مقدمہ میں کچھ چون وچرا نہیں کی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے چھوڑ دینے سے یہ مراد ہے کہ چپکے ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ رہیں اور حدیث مذکورہ سن لینے کے بعد پھر ان کا پیچھا نہیں لیا اور کیونکر لیں؟ اگر ایسا ہو تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دنیاداروں میں کیا فرق رہا۔ مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتقاضائے محبت واعتقاد و نیازمندی وانقیاد اس نہ ملنے کو غصہ پر محمول کر کے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دولت پر حاضر ہوئے ہوں اور علیٰ ہذا القیاس اور لوگ بھی اسے غصہ ہی سمجھتے ہوں اور اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لیے اندر بھیجا ہو اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے تسکین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کیلئے اظہار رضا اور خوشی کر دیا ہو۔

وَجَدَتْ کے لفظ کی

باقی کسی کے دل میں یہ خلجان رہے کہ روایات میں بتصریح مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے غصہ ہو گئیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو روایات صحیحہ مثل روایات مسلم وبخاری میں "فَوَجَدَتْ فَاطِمَةُ" واقع ہے اور "وَجَدَتْ" جیسا بمعنی "غَضِبَتْ"

سیدہ رضی اللہ عنہا نے سماع حدیث کے بعد ندامت کے سبب بات چیت بند کی

مگر جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنادی ہو، تب اس طلب گاری سے ایک گونہ ندامت اور رنج حاصل ہوا ہو کیونکہ انبیاء اور مرسلین اور صدیقین اور کاملین کو لازم ہے کہ اگر کوئی بے اعتدالی ان سے ظہور میں آئے تو بعد اطلاع اس پر ندامت ہوا کرے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کے کھا لینے پر نادم ہونا اور علیٰ ہذا القیاس حضرت نوح علیہ السلام کا دُعائے نجات فرزند سے نادم اور پشیمان ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قتل قبطی سے شرمندہ ہونا خود قرآن میں موجود ہے۔

اور اس ندامت کے باعث حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ربط وضبط میں فرق آ گیا ہو اور ملنا جلنا بدستور سابق نہ رہا ہو، نہ یہ کہ ملے پر بھی کلام وسلام کی نوبت نہ آتی ہو کیونکہ اس طرح کی متارکت تین دن سے زیادہ حرام ہے۔ چہ جائیکہ تمام عمر؟ وہ بھی ایسے مسلمانوں میں، بہر حال ترک کلام میں جو بعض روایات میں ہے، اہلسنت کے نزدیک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف کچھ حرف نہیں۔

سماع حدیث کے بعد سیدہ کو کلام کی حاجت ہی نہ رہی

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کلام نہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ جب حدیث "لا نورث" سن لی تو پھر فدک کے مقدمہ میں کچھ چون وچرا نہیں کی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے چھوڑ دینے سے یہ مراد ہے کہ چپکے ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ رہیں اور حدیث مذکورہ سن لینے کے بعد پھر ان کا پیچھا نہیں لیا اور کیونکر لیں؟ اگر ایسا ہو تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دُنیاداروں میں کیا فرق رہا۔ مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتقاضائے محبت واعتقاد ونیازمندی وانقیاد اس نہ ملنے کو غصہ پر محمول کر کے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دَر دولت پر حاضر ہوئے ہوں اور علیٰ ہذا القیاس اور لوگ بھی اسے غصہ ہی سمجھتے ہوں اور اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لیے اندر بھیجا ہو اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے تسکین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کیلئے اظہار رضا اور خوشی کر دیا ہو۔

وَجَدَتْ کے لفظ کی

باقی کسی کے دل میں یہ خلجان رہے کہ روایات میں بتصریح مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے غصہ ہو گئیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو روایات صحیحہ مثل روایات مسلم وبخاری میں "فَوَجَدَتْ فَاطِمَۃُ" واقع ہے اور "وَجَدَتْ" جیسا بمعنی "غَضَبَتْ"

ہے جو غصہ پر دلالت کرتا ہے ویسا ہی بمعنی "حَزَنَتْ" بھی ہے جو حزن وغم پر دلالت کرے۔ چنانچہ قاموس وغیرہ کتب لغت نایاب نہیں جسے تامل ہو دیکھ لے، پھر کون سی ضرورت ہے کہ "وَجَدَتْ" بمعنی "غَضِبَتْ" ہی لیجیے اور خواہی نخواہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا غصہ ثابت کیجیے۔

وَجَدَتْ کے صلہ پر بحث

اور اگر کوئی وہمی یوں تکرار کرے کہ ہم نے مانا "وَجَدَتْ" دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے لیکن اس کے بعد اگر کلمہ علی ہوتا ہے تو غصہ ہی کے معنی ہوتے ہیں، ہاں اگر اس کے صلہ میں حرف با واقع ہو تو پھر معنی حزن کی گنجائش ہے مگر اس مقام میں بعد "وَجَدَتْ" صحیح مسلم میں فقط علی ابی بکر ہی واقع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "وجدت بمعنی غَضِبَتْ" ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عندیہ کے موافق دوسرے کے کلام کے معنی سمجھتا ہے۔ اسی واسطے روایت بالمعنی، اوّل تو ہر کسی کی مقبول نہیں اور مقبول بھی ہو تو ہم پایۂ روایت باللفظ نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ حقیقت الامر کچھ اور ہو اور راوی کچھ اور سمجھ گیا ہو۔

آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور اپنے معاملات میں اگر آدمی تامل کرے تو اکثر ایسے قصے پیش آتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کہنے والے نے فقط "وجدت" فاطمہ کہا ہو اور سننے والے نے بایں خیال کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی کبیدگی کو جو در حقیقت بوجہ ندامت تھی، بوجہ غضب سمجھ رہا تھا، "وَجَدَتْ" کو بمعنی "غَضِبَتْ" محمول کر کے روایت کے وقت روایت بالمعنی کی ہو اور اپنی سمجھ کے موافق لفظ علی ابی بکر بھی زیادہ کر دیا ہو۔ بہر حال جب تک احتمالات صحیحہ پیدا ہو سکیں تب تک اہل عقل کو لازم یہی ہے کہ اہل کمال کی طرف سے بدگمان نہ ہوا کریں۔

اہل کمال کے کلام کا وہ محمل تلاش کیا جائے جس سے حسن ظن قائم رہے

جناب باری تعالیٰ نے جو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کا سورۂ کہف میں بیان کیا ہے، جس میں حضرت خضر علیہ السلام کا ان ملاحوں کی کشتی کا توڑنا جنہوں نے ان کے ساتھ احسان کیا تھا اور بے لیے دیئے ان کو پار اُتار دیا اور بے گناہ صغیر السن لڑکے کو قتل کر دینا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان دونوں پر اعتراض کرنا مذکور ہے۔ اس کے بیان کرنے میں ایک یہ بھی حکمت ہے کہ مردمان کوتاہ بین کو اگر بزرگانِ دین کا کوئی امر خلاف عقل یا نقل نظر آئے تو اپنی نظر کا قصور سمجھیں اور ان کی نسبت گمان فاسد نہ کریں۔

علیٰ ہذا القیاس پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے "ظُنُّوا الْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا" فرمایا ہے تو اس سے بھی غرض یہی ہے کہ اگر تمہاری نظر میں کسی مؤمن کامل کا کوئی کام خلاف شرع نظر آئے تو گو ظاہر میں روک ٹوک کرو تا کہ اگر واقع میں برا ہو تو اس کا انسداد ہو جائے پر دل سے بدگمان نہ ہو، اپنی طرف سے نیک ہی گمان کرتے رہو، نہ یہ کہ اچھے کاموں کو اچھا سمجھو کیونکہ اچھے کاموں کو ہر کوئی خود بخود اچھا سمجھتا ہے، حکم کی کیا حاجت تھی؟ اس تقریر سے اگر کسی کے جی میں یہ روگ بھی ہوگا کہ ان احتمالات سے کیا کام چلتا ہے۔ ظاہر میں جو کچھ سمجھ میں آوے، ہم تو جانیں وہی بات ٹھیک ہوگی تو ان شاء اللہ مرتفع ہو جائے گا۔ بہر حال گو یہ احتمال بہت سے نظر آتے ہیں مگر عقل سلیم ہو تو پایہ تحقیق سے کم نہیں کیونکہ مناسب حال حضرت فاطمہ اور حضرت صدیق اکبر یہی ہے۔ مع ہذا منصب دعوائے منکران صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ دلیل مدعی جب ہی مفید مطلوب ہوتی ہے کہ کوئی احتمال خلاف مطلوب نہ بن سکے ورنہ مدعا علیہ کی فقط ایک لانسلم میں شیخ چلی کا گھر بنا بنا ڈھ جائے گا۔ سو اگر دشمنانِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یہ منظور ہے کہ لفظ وجدت اور قصہ مندرجہ روایات سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا غصہ ہونا ثابت کریں تو اوّل ان احتمالات کو باطل کریں۔ جب اس طریق سے اپنی عاقبت خراب کرنے کا ارادہ کریں۔

سیدہ رضی اللہ عنہا صدیق رضی اللہ عنہ سے بوجہ غلطی آزردہ ہوئیں

اور ہم نے مانا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس مقدمہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے آزردہ خاطر ہی ہوئیں لیکن اس سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قصوروار ہونا کہاں سے ثابت ہوا۔ نہایت سے نہایت ثابت ہو تو یہ ہو کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بوجہ غلطی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو قصوروار سمجھ کر ان پر غضبناک ہوئی ہوں۔ سو ایسا بسا اوقات انبیاء و مرسلین کو بھی باہم پیش آتا ہے۔ حالانکہ وہ بالیقین معصوم ہیں، چہ جائیکہ صدیق؟ حضرت ہارون علیہ السلام کا بچھڑے کو پوجنے کے مقدمہ میں بے قصور ہونا کلام اللہ سے ثابت ہے اور پھر بایں ہمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان پر غصہ ہونا یہاں تک کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی اور سر کے بال کھینچنے تک کی نوبت آئی، خود کلام اللہ ہی میں موجود ہے۔ سو جیسا حضرت ہارون علیہ السلام تو یوں بے قصور کہ وہ بے قصور تھے ہی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوں کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے عندیہ میں بے جا غصہ نہیں ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰ غلطی سے حضرت ہارون پر ناراض ہوئے

بلکہ بایں نظر کہ ان کا بڑے بھائی پر غصہ ہونے کا کوئی منصب نہ تھا، اگر خدا واسطے کی بات نہ ہوتی تو

حضرت ہارون علیہ السلام ان کا خون بھی کر دیتے تو دم نہ مارتے۔ چہ جائیکہ یوں دست و گریباں ہونے کی نوبت آئی، پر مسلمان کو یقین ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس غیظ و غضب میں اجر عظیم ملے۔ اب لازم یوں ہے کہ اسی طرح حضرت فاطمہ سیدۃ النساء اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہما کی باہم رنجش اور چپقلش کو سمجھئے اور دونوں کو اس مقدمہ میں بے قصور اور دونوں کو ماجور سمجھئے اور ہم نے اسی دن کے لیے اس کی تحقیق آیت محمد رسول اللہ الخ کے ذیل میں بخوبی کی ہے، اگر کسی کو زیادہ تر تسکین مدنظر ہو تو پلٹ کر دیکھ لے۔

بالفرض اگر صدیق ہی کی غلطی تھی تو توبہ کر لی (کتب شیعہ)

اور اس سے بھی در گزر کیجئے، ہم کہتے ہیں، شیعہ ہی سچ فرماتے ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی قصوروار تھے لیکن جب انہوں نے توبہ کر لی تو پھر کیا گناہ باقی رہ گیا؟ جو شیعوں کی زبان نہیں تھمتی۔ مشہور ہے "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ" ہاں توبہ کرنے کا ثبوت اگر مدنظر ہو تو یہ بات معقول، لیکن ہم سند بھی ایسی رکھتے ہیں جسے شیعہ سلمنا سلمنا کہتے کہتے تھک جائیں اور بر سرو چشم رکھتے رکھتے مر جائیں۔ شیخ ابن مطہر حلی منہج الکرامت میں یوں ارشاد فرماتے ہیں "لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَةُ اَبَا بکر فی فدک کَتَبَ لَهَا کِتَابًا وَرَدَّهَا عَلَیْهَا" یعنی "جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو فدک کے مقدمہ میں وعظ و پند کیا تو انہوں نے فدک کو ان کے نام لکھ کر فدک کو ان کے حوالے کر دیا۔"

یہ روایت ہر چند، چند بار گزر چکی ہے لیکن بحکم نقل مشہور "هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهٗ يَتَضَوَّعُ" یعنی "مشک کو جتنا گھسو، یا جتنی بار لگاؤ زیادہ ہی زیادہ خوشبو دے گا" بار بار اس روایت کے نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، یہ بھی ایک حضرت فاطمہ زہرا سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کی کرامت ہے کہ حق نے تہمت رنج ناحق سے شیعوں ہی کے منہ سے ان کو بری کر دیا۔ ادھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نیک نیتی کو ماننا چاہیے کہ کیسے طوفان سے ان کو بچا لیا اور شیعوں ہی کے منہ سے ان کے سب اعتراضوں کا جواب دلوا دیا۔ اب کسی شیعہ مذہب کا یہ منہ نہیں کہ بہ نسبت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بوجہ غصب فدک اہلسنت سے نالشی ہو۔ اس روایت نے شیعوں کے سب دعوؤں کو ڈھس مس کر دیا، ہبہ کا ہو یا میراث کا، وصیت کا یا کسی اور وجہ کا، بہر حال خداوند ذوالجلال نے شان "و کفی اللہ المؤمنین القتال" دکھا دی۔

اور اگر بالفرض بفرض محال یہ روایت شیعوں کی ایسی معتبر کتابوں میں نہ ہوتی، تب دوسری دستاویز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بری الذمہ ہونے کی موجود ہے۔

مجاج السالکین میں جو عمدۂ کتب فرقہ امامیہ ہے اور نیز اور کتابوں میں یہ روایت موجود ہے اور اسی کے لکھنے کا وعدہ بہت دور سے ہم کرتے چلے آتے ہیں، سو آج بفضلہ تعالیٰ اس کا وقت آ پہنچا۔ "کُلُّ اَمرٍ مَرھُونٌ بِوَقتِہٖ" خیر یہ روایت قابل مطالعہ ہے۔

اِنَّ اَبَا بَکر لَمَّا رَایٰ اِنَّ فَاطِمَةَ الْقَبَضَتُ عَنْهُ وَهَجَرَتَهُ وَلَمْ تَتَكَلَّمْ بَعْدَ ذَالِكَ فِيْ اَمرِ فِدَكَ كَبُرَ ذَالِكَ عِنْدَهُ فَاَرَادَ اِسْتَرْضَاءَ هَا فَاَتَاهَا فَقَال لَهَا صَدَقْتِ يَاابْنَةَ رَسول اللّٰه صلى الله عليه وسلّمَ فِيْمَا ادَّعَيْتِ وَلٰكِنِّيْ رَاَيْتُ رَسولَ الله صلى الله عليه وسلّمَ يَقْسِمُهَا فَيُعْطِي الْفُقَراء وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ بَعْدَ اَنْ يُوْتِيَ مِنْهَا قُوْتَكُمْ وَالصَّانِعِيْنَ بِهَا فَقَالَتْ اِفْعَلْ فِيْهَا كَمَا كَانَ اَبِيْ رَسُولُ الله صلى الله عليه وسلّمَ يَفْعَلُ فِيْهَا فَقَالَ ذٰلِكَ اللّٰهُ عَلٰى اَنْ اَفْعَلَ مَا كَانَ يَفْعَلُ اَبُوْكَ فَقَالَتْ وَاللّٰهِ لَتَفْعَلَنَّ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَاَفْعَلَنَّ ذَالِكَ فَقَالَتْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ فَرَضِيَتْ بِذٰلِكَ وَاَخَذَتِ الْعَهْدَ وَكَانَ اَبُوْ بَكْرٍ يُعْطِيْهِمْ مِنْهَا قُوْتَهُمْ وَيَقْسِمُ الْبَاقِيْ فَيُعْطِي الْفُقَراء وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلَ.

"حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سے کشیدہ خاطر ہو کر گئیں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں اور پھر فدک کے مقابلہ میں کچھ گفتگو نہ کی تو یہ بات انہیں دشوار معلوم ہوئی، سو ان کے راضی کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کے پاس حاضر ہو کر یہ عرض کیا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی، تم اپنے دعوے میں سچی ہو، تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبہ کر دیا ہوگا مگر میں کیا کروں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یوں دیکھا ہے کہ اس کی آمدنی کو تقسیم کر دیا کرتے تھے اور تمہارے کھانے پینے کا خرچ اور پھلوں کی مزدوری دے کر جو کچھ بچتا تھا، فقیروں مسکینوں کو دیا کرتے تھے، اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اچھا تم بھی وہی کیے جاؤ جس طرح میرے والد بزرگوار سید الابرار محمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، انہوں نے کہا کہ اس بات پر تم مجھ سے قسم لے لو، میں وہی کرتا رہوں گا جو تمہارے والد بزرگوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ اس پر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے قسم سے پوچھا، کیا تم سچ ہی اس طرح کرو گے؟ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر عرض کی، میں یہی کروں گا، جواب ٹھہرا ہے۔ اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یوں کہا کہ الٰہی تو گواہ رہیو۔ سو اس بات پر راضی ہو گئیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عہد لے لیا۔ سو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ انہیں اس میں سے ان کے کھانے پینے کا خرچ دے کر باقی کو فقراء اور مساکین اور مسافروں کو تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ انتہیٰ"

بسلسلۂ برأت صدیق رضی اللہ عنہ روایت کے چند فائدے

اس روایت سے چند فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دعویٰ ہبہ میں جھوٹا نہیں سمجھا، پر یوں سمجھ کر کہ ہبہ بے قبض موجب ملک نہیں ہوتا۔ چنانچہ متفق علیہ شیعہ و سنی ہے اور اس کی تحقیق سابقاً گزر چکی ہے، دینے سے عذر کیا۔ سو اگر بالفرض والتقدیر روایت ہبہ صحیح بھی ہو جائے تو شیعوں کا یہ تاسف کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو جھوٹا سمجھا۔ چنانچہ حضرت مولوی صاحب نے بھی اس بات کو نامہ اعمی میر نادر علی میں لکھ کر اپنا نامہ سیاہ کیا ہے۔ محض بیجا اور بے موقع ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فدک کی آمدنی میں سے ایک حبہ تک نہیں چھوا بلکہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے خرچ سے جو کچھ بچا، فقراء وغیرہم کو دے دلا دیا۔

سو معلوم ہوا کہ فدک کے نہ دینے میں کوئی غرض دُنیاوی نہ تھی، ہو نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں بیشک کچھ سن لیا تھا، جو باوجود اس بے غرضی اور اس بے طمعی کے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو نہ دیا۔ ان دونوں فائدوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت اُم ایمن اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی گواہی کا قصہ شیعوں کا ڈھکوسلا بنایا ہوا ہے کیونکہ گواہوں کا مطالبہ تو جب ہی ہوتا ہے کہ مدعی کی طرف دروغ کا احتمال ہو۔ ہاں اگر اپنے آپ خورد برد کرنا مدنظر ہوتا تو یوں بھی کہنے کی گنجائش تھی کہ یہ فقط ٹال ٹلاؤ تھی مگر بدگمانوں کو اب بھی شاید یہ گمان ہو کہ اوّل نہ دینا ہی مدنظر ہوگا، اور اس وقت گواہ بھی طلب کیے ہوں، انجام کار خدائے تعالیٰ یا اندیشہ ملامت خلق سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر اپنی بات کے بنانے کے لیے یہ حیلہ برپا کیا ہو۔ سو اس کا جواب اوّل تو یہی ہے کہ:

ع:۔۔۔۔۔ بدگمان وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

دوسرے ہم نے تسلیم کیا یونہی تھا لیکن غصب فدک اگر برا تھا تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی ناخوشی کی وجہ سے برا تھا۔ جب وہ راضی ہو گئیں تو شیعوں کو رنج کیوں ہے؟ مگر اس صورت میں بوجہ مخالفت حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کچھ انہیں پر وبال پڑے تو پڑے، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو تو خدا نے بچا ہی لیا۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ فدک تا حین حیات سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات واکمل التحیات ہی کے قبضہ وتصرف میں رہا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا قابض اور دخیل ہوئی تھیں ورنہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اس بات کے جواب میں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں دیکھا ہے کہ تمہیں تمہارا خرچ اور پھلوں کی گٹھلی دے کر فقراء وغیرہم کو بانٹ

دیا کرتے تھے، یوں نہ فرماتیں کہ اچھا یوں ہی کیا کرو بلکہ اپنا قبضہ جتاتیں جہاں سو، وہاں سوائے۔
جب ہبہ کا دعویٰ کیا حالانکہ یہ ایک مخفی بات ہے، ہر کوئی اسے نہیں جان سکتا تو قبضہ تو کھلی بات ہے، اس کے دعویٰ میں کیا دُشواری ہے، ہبہ کے دو تین ہی گواہ تھے، اس کے تو ہزاروں نکل آتے۔
چوتھا یہ کہ صدیق اکبر تہ دل سے یہی چاہتے تھے کہ فدک سیدۃ النساء ہی کے پاس چلا جائے اور ان کی خاطر مبارک پر کسی طرح میل نہ آئے ورنہ ان کو ان کے ناخوش ہونے میں کیا دُشواری تھی؟ اور ان کے خوش کرنے کی کیا ضرورت ہوتی؟ اور یہ پہلے آیت محمد رسول اللہ کے ذیل میں ثابت ہو چکا ہے کہ طالب رضا بجز محب اور کوئی نہیں ہوتا اور اگر کوئی یوں خیال کرے کہ یہ سارا تملق اور ظاہر داری فقط دفع بدنامی کے لیے تھا تو اوّل تو لفظ "**کبر ذالک علیه فاراد استرضاء ها**" جس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ناخوش ہو جانا انہیں بھاری پڑا اور ان کے راضی کرنے کا ارادہ کیا۔ خود اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ واقعی ابوبکر کو یہ بات بہت شاق تھی اور اسی واسطے ان کے راضی کرنے کی فکر میں تھے۔
دوسرے اگر بدنامی کا اندیشہ تھا تو مخالفین سے تھا، موافقین تو بہر حال ان کی طرف سے مطمئن ہی ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اوّل تو فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مملوک نہ تھا پھر ترکہ نبوی میں میراث نہیں چلتی۔ مگر مخالفین نے اب کون سی کمی کی؟ جو راضی کر کے ان کی زبان بند کرنا چاہتے تھے۔ سو اس سے بہتر تو یہی تھا کہ جب اپنے آپ لینا مدنظر نہیں تو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیتے، اس عقل و نادانی پر کہ موافق مخالف ہندو، مسلمان، یہود و نصاریٰ سب قائل ہیں۔ ایسی حرکت ان سے تصور میں نہیں آتی۔ شیعوں جیسے کم عقل ہوں تو مضائقہ بھی نہ تھا بلکہ عقل سلیم اس روایت کو دیکھ کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صدق و دیانت پر شاہد ہے اور بالیقین ان کو اس مقدمہ میں بری الذمہ سمجھ کر ان کی طرف سے معتذر رہے کہ در صورت صحت روایت ہبہ فدک بلکہ بہر صورت جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فدک دینے میں آمادگی کی حالانکہ حضرت سیدۃ النساء کا یہ منصب نہ تھا کہ کسی طرف ان کا گوشۂ خاطر مائل ہو اور پھر اس کے موافق نہ ہو تو یہ وجہ نہیں ہوئی کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ان کی رضا کی کچھ پرواہی نہ تھی ورنہ اس کے کیا معنی تھے کہ دُنیادار صاحب اختیار ہو کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ناخوشی سے کچھ دُشواری ہو؟ یا ان کا رنجیدہ ہو جانا، ان پر شاق ہو؟ بلکہ تہ دل سے ان کی رضا کے خواہاں تھے، پھر بایں ہمہ جو فدک نہ دیا حالانکہ اپنے لیے بھی نہ رکھا تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کسی حکم خداوندی کی پابندی اور تابعداری پیغمبر صلی

ا

اللہ علیہ وسلم کی ناچاری تھی اور مصلحت ہائے دینی و دُنیوی کی رعایت تھی۔

سو پابندی خداوندی کا تو یہ حال ہے کہ آیت "یوصیکم اللّٰہ" اور آیت ما افاء اللہ خود اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ معلوم ہو چکا اور اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی ہے کہ خدا کی اطاعت کی جائے۔ سو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" فرمایا ہو اور زیادہ اس کی تصدیق کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مصدق اور اس کے موافق روایتیں شیعوں کی معتبر کتابوں سے نقل بھی ہوئی ہیں اور مصلحتوں کی یہ صورت ہے کہ اوّل تو احکام خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا حکمت اور مصلحت ہی ہوتے ہیں۔ ماسوا اس کے اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بپاس خاطر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا فدک ان کے حوالہ کر دیتے اور درصورت صحت روایات ہبہ فدک اس بات کی رعایت نہ کرتے کہ ہنوز دعویٰ ہے، کوئی دستاویز کامل نہیں کیونکہ حضرت علی اور حضرت اُم ایمن رضی اللہ عنہما بلکہ ان کے ساتھ حسنین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی گواہی موافق قانون خداوندی قابل اعتبار نہیں۔

تو اوّل تو عام و خاص کے دل میں یہ بات تہ نشین ہو جاتی کہ خلیفہ سب مستحقیوں کو برابر نہیں سمجھتے۔ رواداروں کو بے ثبوت بھی کامیاب کر دیتا ہے اور سوا ان کے اوروں سے قرار واقعی حجتیں طلب کرتا ہے اور واقعی یہ بات شیوۂ انصاف سے بہت بعید ہے۔ مع ہذا باعث تنفر خلائق اور درہمی اُمورِ خلافت جو موجب ہے انتظامی دین ہے، ہو جاتا اور پھر یہ آگ ہرگز بجھائے نہ بجھتی، اور اگر بالفرض استحکام خلافت میں کچھ فرق نہ تھا تو یہ وبال کس کی گردن پر رہتا کہ قیامت تک حکام اسلام یہی شیوہ برتتے اور ان کے لیے یہ حجت اور دستاویز ہو جاتی کہ خلیفہ راشد نے جب ایسا کیا تو ہم بھی ایسا کریں گے، رواداروں کو منہ مانگے موتی دیں گے، غیروں کی سنیں گے۔

دوسرے اس صورت میں لازم آتا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کے مصداق ہو جائیں "اَلْعَائِدُ فِیْ صَدَقَتِہٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ" یعنی "کسی چیز کو کسی کو اللہ دے کر پھر اس سے لوٹانے والا ایسا ہے۔ جیسا کتا قے کر کے پھر چاٹ لیوے" اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہوں "لا نورث ما ترکناہ صدقۃ" تو جو جو چیزیں وقت وفات آپ کے ملک میں تھیں، سب صدقہ ہو گئیں اور یہ بات باتفاق فریقین ثابت ہے کہ ہبہ بے قبض موجب ملک نہیں ہوتا اور اب اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ تادم وفات فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے قبض و تصرف میں رہا تو اگر ہبہ بھی کیا۔ تب بھی قبضہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نہ ہونے پایا تھا۔ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم ہی کا ہمیشہ قبضہ رہا، تو یہ ہبہ باتفاق فریقین موجب ملک سیدۃ النساء نہ ہوا بلکہ ہمیشہ دم وفات تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک میں رہا تو بیشک یہ بھی صدقہ ہوگیا۔

سو درصورت یہ کہ دعوائے ہبہ کے قبول نہ ہونے کے بعد بزعم شیعہ دعویٰ میراث کیا ہو تو جیسے ہبہ کی صورت میں صدیق بغرض پاس خاطر سیدۃ النساء بوجہ مذکور نہ دے سکے، میراث کی صورت میں اس وجہ سے نہ دے سکے کیونکہ وارث کی ملک نائب ملک مورث ہوتی ہے۔ جب یہ متحقق ہو تو وہ پہلے متحقق ہو۔ سو یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ جو چیز بقول "لا نورث ما ترکناہ صدقة" حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صدقہ ہو چکی ہے اور ملک سے نکل گئی تھی۔ پھر ملک نبوی میں آئے ورنہ جو چیز خارج از ملک مورث ہو۔ اس میں میراث کا جاری ہونا محال ہے، سو ایسی حرکت لغو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کب ہو سکتی تھی؟ جس سے ایسا حرف بیجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہو۔ مع ہذا "لا نورث اور صدقة" ہونا جب صحیح ہو کہ قابل ملک وارث نہ رہے، پھر بھی اگر ملک وارث اس میں جاری ہو تو اجتماع نقیضین لازم لائے۔

علاوہ بریں "لا نورث ماترکناہ صدقة" سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ رضائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ وارثوں کو نہ دیا جائے اور رضاء حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس طرف تھی کہ ان کو دیا جائے، ناچار ہو کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے رضائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مقدم سمجھ کر اول تو ان کے فرمانے کے موافق عمل کیا اور پھر بایں ہمہ جس طرح سے بن پڑا حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو بھی راضی کیا۔ چنانچہ اس حدیث میں مصرح ہے، سو یہ کمال انقیاد اور اطاعت صدیق اکبر پر دلالت کرتا ہے کہ بایں ہمہ رضائے سیدۃ النساء کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور نہ رضائے نبوی کو۔ درصورت یہ کہ موافق رضائے نبوی کرنا ان کی ناخوشی کا باعث ہوا ہو تو عقلاً اور نقلاً ان کے ذمہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا راضی کرنا لازم نہ تھا، چنانچہ ظاہر ہے۔

تیسری مصلحت دنیوی اس میں یہ تھی کہ اگر آپ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو کچھ بھی حوالہ کرتے تو پھر حضرت عباس اور ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین جدا جدا ہر کوئی اپنی جاگیر کے گاؤں مانگتا۔ سو اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا لغو ہی جاتا کیونکہ متروکہ نبوی اس قدر نہ تھا جو اس بات کو وفا کرے کہ ہر کسی کو اس قدر دیجئے۔ دوسرے پھر خلافت ہی کیا ہوئی کہ جو بیت المال کو اس طرح لٹا دیا اور مستحق غیر مستحق کو نہ دیکھا۔ پانچواں فائدہ حدیث مجاج السالکین سے یہ ثابت ہوا کہ گو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ایک بار ناخوش ہوگئی تھیں، پر حضرت صدیق اکبر

رضی اللہ عنہ نے عذر معقول کیے اور اسی سبب حضرت فاطمہ زہرا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راضی ہو گئیں اور خاتمہ بالخیر ہوا اور اسی فائدہ کی غرض سے آج تک اس حدیث کو رکھ چھوڑا تھا اور ظاہر ہے کہ جب رنج مبدل بخوشی ہو جائے تو پھر اس رنج کا زبان پر لانا اہل فہم کے نزدیک نازیبا ہے۔ خیر الحمد للہ کہ امامیوں ہی کی روایت سے حضرت سیدۃ النساء کا صدیق اکبر سے راضی ہو جانا ثابت ہو گیا اور پھر روایت بھی کیسی؟ معتبر کتابوں کی اور وہ بھی ایک کتاب کی روایت نہیں بلکہ سوائے محجاج السالکین کے اور کتابوں میں بھی مروی ہے۔

روایات اہل سنت میں سیدہ کی خوشنودی کا بیان موجود ہے

باقی رہیں روایات اہلسنت، سو مدارج النبوۃ اور کتاب الوفاء بیہقی اور شروح مشکوۃ میں یہ بات موجود ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ناخوش ہو جانا جو بظاہر کبیدگی ظاہر سے معلوم ہوتا تھا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر شاق ہوا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر حاضر ہوئے اور حضرت علی سے سفارش کرائی، یہاں تک کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ان سے خوشنود ہو گئیں بلکہ شیخ عبدالحق نے شرح مشکوۃ میں لکھا ہے کہ اس قضیہ کے بعد صدیق اکبر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر گئے اور دھوپ میں دروازہ پر کھڑے رہے اور عذر معذرت کی اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ان سے خوش ہو گئیں اور ریاض النضرۃ میں یہ قصہ بہ تفصیل مذکور ہے اور فصل الخطاب میں بروایت بیہقی شعبی سے یہ قصہ مروی ہے۔

اور ابن سمان نے کتاب الموافقت میں اوزاعی سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ گرمی کے دن حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے در دولت پر حاضر ہوئے اور یہ عرض کی کہ میں یہاں سے کبھی نہ ٹلوں گا، جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی مجھ سے راضی نہ ہو جائیں۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ اندر تشریف لے گئے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو قسم دی کہ تم راضی ہی ہو جاؤ، سو وہ راضی ہو گئیں۔ علیٰ ہذا القیاس شیعوں میں سے زیدیوں کی روایتیں بھی بعینہ اہل سنت کی روایات کے مطابق اور موافق ہیں۔

ان روایات کے ملاحظہ سے اہل انصاف کو تامل نہ رہے گا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل میں عداوت خاندان نبوی ذرہ برابر نہ تھی بلکہ ان کی محبت اور اعتقاد اور ان کی تعظیم و تکریم میں ایسے فنا تھے کہ باوجود عروج خلافت اور شوکت سلطنت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے سامنے اپنے آپ کو مثل غلامان غلام اور کمترین خدام سمجھتے تھے۔ سو یہ بات بجز اس کے متصور نہیں کہ مرتبہ کمال

صدق وصفا کو پہنچے ہوئے تھے ورنہ اگر دُنیا داری کی ہوتی تو ایسے اُمور ان سے ہرگز ظہور میں نہ آتے، ان کی بلا کو غرض پڑی تھی کہ اس شان وشوکت پر اتنی منتیں سماجتیں کرتے؟ بلکہ خود سیدۃ النساء کا ان سے روٹھ جانا اس بات پر دلیل کامل ہے کہ حضرت سیدۃ النساء کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کمال ہی بھروسہ تھا، ورنہ کس کے تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی فقیر بادشاہان جبار کے سامنے ایسی باتیں کرے اور وہ بادشاہ ان کو ایسی ایسی منتوں سے منائے۔

جنازہ میں شرکت سے روکنے کا افسانہ

اور بالبداہت اس سے یہ واضح ہوگیا کہ اگر بالفرض والتقدیر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے مرتے دم اس بات کی وصیت بھی کی ہو کہ میرے جنازہ پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہ آنے پائیں تو بہ سبب کمال حیاء اور پردہ داری کو یہ وصیت کی ہوگی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو روکنے کی تخصیص اس وجہ سے ہو کہ ان کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا ایسا سمجھتی تھیں کہ یہ خواہ مخواہ حاضر ہی ہوں گے کیونکہ ان کو جس قدر تعظیم وتکریم اہل بیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش نہاد خاطر ہے اوروں کو نہیں۔ مع ہذا ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک بارگی رنجش سے شرمائے ہوئے ہیں۔ اس کے تدارک کے لیے وہ کوئی موقع ایسا نہ چھوڑیں گے جو اس میں غیر حاضری باعث اشتباہ اور موجب بدگمانی اہل بیت ہو۔ علاوہ بریں وہ خلیفہ وقت تھے۔ امامت نماز اور امامت جنازہ دونوں انہیں سے متعلق تھیں، اس لیے بالخصوص ان کا نام لے کر منع کیا ہو۔ غرض اگر تخصیص کہیں سے ثابت ہو بھی جائے تو اس کے یہ وجوہ ہیں۔

سیدہ کی وصیت میں عام ممانعت تھی تخصیص نہ تھی

ورنہ علی العموم مردانِ نامحرم کے حاضر ہونے کی آپ روادار نہ تھیں، اس لیے یہ وصیت کی کہ مجھ کو شب کو دفن کر دینا اور دلیل اس بات کی (کہ بوجہ حیاء وپردہ داری علی العموم ممانعت تھی، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی کچھ تخصیص نہ تھی) یہ ہے کہ بروایت صحیحہ یہ بات مروی ہے کہ حضرت سیدۃ النساء نے اپنے مرض موت میں فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ بعد موت بے پردہ مردوں کے سامنے مجھ کو لائیں اور اس زمانہ کی عادت یہ تھی کہ عورتوں کو مثل مردوں کے بے پردہ یعنی بے گہوارہ دفنانے کو لے جایا کرتے تھے، اس پر اسماء بنت عمیس نے عرض کیا کہ میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ خرما کی شاخوں سے کجاوہ کی صورت کی نعش بناتے ہیں، حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے بنا کر دکھلا، حضرت اسماء نے بنا کر دکھلایا تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بہت خوش ہوئیں اور تبسم کیا اور

ہرگز بعد وفات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کبھی کسی نے تبسم کرتے نہ دیکھا تھا۔

اس وجہ سے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت اسماء کو وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد تو ہی مجھے غسل دیجیو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تیرے ساتھ رہیں، کسی دوسرے کو نہ آنے دیجیو، اب غور کیجئے کہ غسل کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے آنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی بلکہ کسی مرد کے آنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس وقت جو اوروں کے آنے سے ممانعت ہوئی تو یہ مطلب ہوا کہ عورتوں کو بھی نہ آنے دیجیو۔ سوجسے عورتوں سے اس قدر شرم ہو کہ بعد مردن ننگے بدن ان کے سامنے ہونے سے شرمائے وہ مردوں کے جنازہ پر آنے سے کیونکر نہ شرمائے۔ سو اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو رات ہی کو دفن کر دیا اور کسی کو اطلاع نہ کی۔

القصہ بوجہ تستر و بباعث حیا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس بات کی روادار نہ ہوئیں کہ میرے جنازہ پر کوئی مرد حاضر ہو ورنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوئی تخصیص نہ تھی اور ہرگز کسی روایت میں اہل سنت کی روایات میں سے یہ بات نہیں کہ بالخصوص حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نام سے ممانعت ہوئی ہو۔ علی العموم ممانعت ہوئی تھی، یہ شیعوں کی شرارت ہے کہ ممانعت ان کے نام لگا دی اور پھر دلاوری یہ کہ عوام اہل سنت کے سامنے ان کی کتابوں کا حوالہ بتا دیتے ہیں، اس پر مولوی عمار علی صاحب نے تو یہ طوفان جوڑے کہ شرم کی آنکھیں پھوڑ کر صحیح مسلم کا نام لے دیا کہ اس میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے وقت وفات یہ وصیت کی تھی کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما میرے جنازہ پر نہ آئیں۔ خدا جانے یہ بے حیائی کہاں سے اُڑائی ہے یا ایجاد فقیر ہے؟ کہ اصلاً و مطلقاً جھوٹ بولنے سے شرم نہیں آتی۔ صحیح مسلم کوئی نایاب کتاب نہیں، ہزاروں نسخے اس کے موجود ہیں، حذف کرنے کی گنجائش نہیں، اگر یہ روایت ہو تو کوئی کہیں سے نکال دے۔ فقط اس میں اتنی بات ہے۔

”کہ جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو شب ہی کو دفن کر دیا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ کی اور نماز پڑھی، ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے“

چنانچہ تسکین خاطر ناظرین کے لیے عبارت روایت صحیح مسلم منقول ہے۔ اس کا ترجمہ بلا کم و کاست یہی ہے جو میں نے عرض کیا، وہ عبارت یہ ہے: ”فَلَمَّا تُوُفِّيَتْ دَفَنَهَا زَوْجُهَا عَلِيُّ ابْنِ اَبِىْ طَالِبٍ لَيْلاً وَلَمْ يُؤْذِنْ بِهَا اَبَا بَكْرٍ وَصَلّٰى عَلَيْهَا عَلِيٌّ“

اور اس عبارت سے آگے نہ پیچھے کہیں وصیت کا ذکر نہیں، خدا جانے مولوی صاحب نے اس

عبارت میں سے یہ معنی کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے نہ آنے دینے کی وصیت کی تھی کون سی لغت اور کون سی زبان اور کون سے محاورہ کے موافق نکال لیے ہیں۔ سبحان اللہ علماء شیعہ کی یہ امانت و دیانت اور صدق گفتار ہے کہ دیدہ دانستہ ایسے جھوٹ بولتے ہیں۔ غرض صحیح مسلم میں تو فقط اتنی بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدۃ النساء کو شب کو دفن کر دیا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ کی اور اپنے آپ نماز جنازہ پڑھی اور یوں بھی ایک قول ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے چند ایک اہل بیت کے ساتھ نماز پڑھ کر رات ہی کو دفن کر دیا مگر بہرحال صحیح مسلم میں وصیت کا ذکر معلوم نہیں ہوتا۔

اور اگر بالفرض کسی روایت میں اس باب میں کوئی وصیت بھی ہو تو اس بات کی وصیت ہوگی کہ مردوں میں سے میرے جنازہ پر کوئی نہ آئے۔ چنانچہ بعضی روایات میں آیا ہے کہ دوسرے دن جو حضرت صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور سوا ان کے اور اصحاب رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تعزیت کے لیے حاضر ہوئے تو شکایت کی کہ ہمیں آپ نے خبر نہ کی، ہمیں بھی شرف نماز اور شرف حضور میسر آ جاتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ جب میں دُنیا سے اُٹھوں تو مجھے رات ہی کو دفن کر دینا تاکہ میرے جنازہ پر کسی نامحرم کی نگاہ نہ پڑے۔ سو میں نے ان کی وصیت کے موافق عمل کیا ہے۔ غرض اس روایت سے اور یہی روایت مشہور ہے۔ علی العموم نامحرموں کے آنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تخصیص کا اشارہ بھی نہیں۔

مگر شیعوں کی بدگمانی کا یہ حال ہے کہ اہل بیت کی تمام حرکات و سکنات کو مطابق بیٹھیں یا نہ بیٹھیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عداوت پر محمول کرتے ہیں اور عمل و نقل کا کچھ لحاظ نہیں کرتے، ان کی وہی مثل ہے جیسے مشہور ہے سب نے سنا ہوگا۔ شعر:

سگے را چوں کلوخے بر سر آید — زشادی برجہد کیں استخواں است
وگر نعشی دو کس بردوش دارند — لئیم الطبع پندارد کہ خوان است

''کتے کے سر پر جب پتھر آ کر لگتا ہے تو اس کو ہڈی سمجھ کر خوشی سے اُچھلتا ہے اور اگر دو شخصوں کو نعش اُٹھائے ہوئے جاتے دیکھے تو یہ بدطینت اس کو دسترخواں سمجھتا ہے۔''

القصہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ممانعت کی یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ممانعت کی، کہیں تخصیص و تصریح نہیں۔

سیدہ کا جنازہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ [illegible]

بلکہ فصل الخطاب کی روایت سے تو یوں ثابت ہوتا ہے کہ [illegible]
مذکور ہے کہ ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اور حضرت [illegible]
کی نماز کے وقت حاضر ہوئے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی وفات [illegible]
کے دن رمضان شریف کی تیسری تاریخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے [illegible] چھ مہینے بعد ہوئی تھی
اور آپ کی عمر شریف اٹھائیس برس کی تھی، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب [illegible] حضرت علی رضی اللہ
عنہ کے پیش امام ہوئے، چار تکبیروں کے ساتھ نماز پڑھائی۔ اس روایت سے تو قدر شناسان علی رضی
اللہ عنہ کو بھی تحقق ہوتا ہے کہ حضرت سیدۃ النساء نے ہرگز صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نہ آنے دینے کی
وصیت نہ کی تھی کیونکہ جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ یہ عزم رکھتے ہوں کہ سعید بن العاص کو
(حالانکہ وہ کچھ مؤدب نہ تھا) امام نہ ہونے دیں تو حضرت علی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

ادھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ ادب کہ تھوڑے ہی دنوں پہلے کیا کیا ناک رگڑ چکے تھے، سو اگر
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا وصیت کرتیں تو اوّل تو صدیق اکبر کو دھکے دلوا دیتے ورنہ نماز کا تو
ذکر؟ کیونکہ اپنی شجاعت اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ادب کے باعث کوئی وجہ تقیہ کی بھی نہ تھی۔
القصہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ممانعت کی کوئی روایت نہیں، ہاں ایسی روایتیں ہیں جن سے عموم
ممانعت ثابت ہے اور اگر بالفرض تخصیص کر کے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نام [illegible]
ہو تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے منع کی وجوہ تو مذکور ہو لیں، باقی رہے حضرت عمر رضی اللہ
عنہ سو اوّل وجہ میں تو وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے شریک ہی ہیں اور علیٰ ہذا القیاس دوسری وجہ میں
بھی کیونکہ یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے بمنزلہ وزیر مشیر تھے، سو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے
سب کام انہیں کے مشورہ سے ہوتے تھے، سو اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو (بوجہ نہ دینے فدک
کے) کچھ صدیق اکبر سے رنج تھا اور اس سبب سے وہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے شرمائے
ہوئے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے تھا اور یہ ان سے پہلے شرمائے ہوئے تھے۔

باقی رہی تیسری وجہ اس میں بھی حضرت عمر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ایک وجہ سے شریک
ہیں کیونکہ حضرت عمر اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما بمنزلہ لازم وملزوم ہیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بلائے جائیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر نہ ہو۔ سو اگر بالفرض والتقدیر
کسی روایت میں (اہلسنت کی) ممانعت تخصیص نام ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی نکل آئے تو ان کی

وجوہ یہ ہیں جو میں نے عرض کیے، عداوت اور بغض صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہ تھا اور دلیل عقلی اس بات کی (کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے جنازہ پر نہ بلوانا، بوجہ حیاء سیدۃ النساء اور باعث پردہ داری حضرت زہرا رضی اللہ عنہا تھا، نہ بوجہ کدورت اور ناخوشی) یہ ہے کہ اگر بوجہ کدورت اور ناخوشی ہوتا تو اس وجہ سے ہوتا کہ مبادا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان کے جنازہ کی نماز نہ پڑھائیں کیونکہ وہ خلیفہ تھے۔ امامت نماز پنجگانہ اور امامت نماز جنازہ انہی سے متعلق تھا۔ سو یہ بات کسی وجہ سے درست نہیں ہوسکتی۔

اس لیے کہ باجماع مؤرخین طرفین شیعہ سنی جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ باہر لائے، امام حسین رضی اللہ عنہ نے سعید بن العاص کو جو امیر معاویہ کی طرف سے مدینہ کا امیر تھا، نماز پڑھانے کے لیے اشارہ کیا اور یہ فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یوں نہ ہوتی کہ امام جنازہ امیر ہوا کرے، تو تجھے ہرگز آگے نہ بڑھاتا۔ سو معلوم ہوا کہ حضرت سیدۃ النساء نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نماز پڑھانے کے اندیشہ سے یہ وصیت نہ فرمائی تھی ورنہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کس طرح حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے خلاف کرتے اور ظاہر ہے کہ سعید بن العاص ہزاروں مرتبہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کمتر تھے، خاص کر لیاقت نماز میں۔

کیونکہ کوئی چھ ہی مہینہ گزرے تھے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام نماز تمام مہاجر اور انصار کا کیا تھا اور اس باب میں کمال ہی تاکید فرمائی تھی۔ پھر کیونکر احتمال ہو کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اس تھوڑی سی مدت میں یہ تمام واقعات بھول گئی ہوں۔

الحاصل دلائل نقلیہ اور عقلیہ دونوں اس بات پر شاہد ہیں کہ شیعوں کا یہ وہم کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جنازہ پر آنے دینے کی روادار نہ تھیں، عقل نہ ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے اور ان وجوہ کو بھی جانے دو، ہمیں فقط روایت محجاج السالکین جو ابھی مرقوم ہوئی ہے کافی ہے کیونکہ حضرت فاطمہ زہرا سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے (بالخصوص) جنازہ پر آنے کی روادار نہ ہوتیں تو بوجہ رنج روادار نہ ہوتیں۔ سو اس روایت سے یہ بات عیاں ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے دل مبارک میں اگر بالفرض رنج تھا بھی تو وہ زائل ہوگیا تھا اور دونوں باہم راضی خوش ہوگئے تھے۔

مگر کوئی شیعہ منافق پیشہ حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو بھی (نعوذ باللہ) منافق سمجھے اور یوں کہے کہ یہ راضی ہوجانا فقط ظاہرداری کے لیے ہوگا تو یہ بات علیحدہ ہے، پر یہ بات شیعوں ہی کے سمجھنے کی

ہے کیونکہ المرء یقیس علیٰ نفسہ جیسے وہ خود ہیں ایسے ہی بزرگانِ دین کو سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر   گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

''اور بایں ہمہ پھر کیا ہوتا ہے۔ شیعوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، یہ ممکن نہیں۔''

خدا اور رسول راضی ہوں تو سیدہ کی ناراضی سے کچھ نقصان نہیں

اگر بالفرض والتقدیر بزعم شیعہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اس جہان سے ناخوش ہی گئی ہوں تو درصورت یہ کہ خدا اور رسول خوش ہوں، کچھ نقصان نہیں اور جو کچھ نقصان تھا بھی تو اس کی تدبیر اور اس کا بندوبست خود خداوند کریم نے لکھوکھا برس پہلے کر دیا۔ سورۂ حجر میں فرماتے ہیں ''وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُتَقَابِلِيْنَ ط'' اس آیت میں متقیوں کے جنت میں داخل ہونے کی کیفیت بیان فرماتے ہیں، مطلب یہ ہے ''اور نکال ڈالی ہم نے جو کچھ ان کے دلوں میں خفگیاں تھیں وہ بھائی ہوگئے، تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے۔'' اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ متقیوں اور پرہیزگاروں میں آپس میں رنج بھی ہو جایا کرتے ہیں اور وہ رنج ان کو کچھ مضر نہیں ہوتے، بعنایت خداوندی جنت میں جانے کے حارج نہیں ہوتے بلکہ جنتی ہونے کی وجہ سے وہ رنج خود ہی زائل ہو جاتے ہیں۔

سو اگر بالفرض بزعم شیعہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے رنجیدہ ہی اس جہان سے گئی ہوں، تب اس آیت بشارت آمیز نے صدیق اکبر اور ان کے ہوا خواہوں کی تسلی کر دی اور شیعوں کی آنکھوں میں خاک ڈال دی، مگر شاید کوئی شیعی چہ پوزیوں میں سے تکرار کرے کہ ہر چند اس آیت میں یہ بشارت ہے جو مذکور ہے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوروں ہی کے لیے یہ بشارت ہے جن سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ناخوش ہوں۔ ان کے لیے اس بشارت میں حصہ نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان میں یوں ارشاد فرمایا ہے اور یہ حدیث متفق علیہ طرفین ہے: ''الاانّ فَاطِمَةَ بِضْعَةٌ مِنِّي يُؤْذِيْنِيْ مَا اٰذاهَا وَيُرِيْبُنِيْ مَا رَابَهَا فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ'' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے'' کہ یاد رہے یہ بات کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرے بدن کا ٹکڑا ہے جس سے اسے تکلیف ہو، اس سے مجھے بھی تکلیف ہو، جس بات سے وہ گھبرائے اس سے میں بھی گھبراتا ہوں، سو جو شخص اسے غصہ کرے گا وہ مجھے غصہ کرے گا۔ فقط'' اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ کرنے والا کون ہوتا ہے۔

بضعۃ منّی سے اشکال اور اس کے جوابات

سو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پہلے ہی رعایت کر گئے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ" جس کے یہ معنی ہیں کہ جو اسے غصہ کرے گا وہ مجھ کو غصہ کرے گا اور یوں نہیں فرمایا "مَنْ غَضَبَتْ عَلَيْهِ غَضَبتُ عَلَيْهِ" یعنی جس پر وہ غصہ ہوں گی اس پر میں بھی غصہ ہوں گا۔ ظاہر ہے کہ کسی کو غصہ کر دینے کی یہ صورت ہے کہ دیدہ و دانستہ کسی بات یا کلام سے کوئی شخص اسے غصہ دلانے کا ارادہ کرے، سو کمال نادانی کی بات ہے کہ کوئی شخص صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ بات منسوب کرے کہ انہوں نے بالقصد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غصہ دلایا تھا جو جانتے تھے، وہ تو جانتے ہی تھے، پر وہ جو نہ جانتے تھے، اب تو ان پر بھی واضح ہو گیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس قصہ میں معذور تھے، اور بایں ہمہ پھر عذر معذرت کیا کیا کچھ نہ کیا۔

روایات کو ٹٹولئے تو معلوم ہو جائے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکرر یوں عرض کیا کہ "وَاللّٰهِ يَاابْنَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِنَّ قَرَابَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اَحَبُّ اِلَيَّ اَنْ اَصِلَ مِنْ قَرَابَتِيْ" یعنی "اللہ کی قسم! اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے ساتھ صلہ کرنا، اور ان کی خدمت کرنا بہت ہی زیادہ محبوب ہے، میرے نزدیک اپنے قرابتیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے" اور جب ان کی طرف سے اغضاب ہی نہ ہوا، یعنی انہوں نے بالقصد ان کو غصہ نہ دلایا بلکہ حتی المقدور اس کا بچاؤ ہی کیا ہو تو وہ پھر کس طرح اس وعید میں داخل ہوں گے۔ اگر بالفرض کچھ ہوا بھی ہو تو اتنا ہوا ہو کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بمقتضائے بشریت غصہ ہو گئی ہوں، اس کو اگر ہم مان لیں اور ان توجیہات کا جو مذکور ہو لیں، کچھ خیال نہ کریں تو بیش بریں نیست کہ موافق وعدہ "وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ" قیامت کو سینہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے وہ رنج نکالا جائے اور دونوں میں سے کسی کو وہ آپس کی شکر رنجی مضر نہ ہو۔

بضعۃ منی کا شان ورود اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سیدہ رضی اللہ عنہا کو بارہا غضبناک کرنا

اور اگر قطع نظر غصہ کرنے سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا خود بخود غصہ ہو جانا بھی اس وعید میں داخل کر دیں تو شیعوں کو ہم سے زیادہ مشکل پڑے گی کیونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو معصوم نہیں، اگر ان سے کوئی حرکت بیجا ہو جائے اور اس سبب سے کسی وعید میں شامل ہو

جائیں تو کچھ بعید نہیں، پر حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ تو شیعوں کے نزدیک معصوم تھے، ان سے جو بارہا مقدمات خانگی میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو رنج ہوگیا ہے تو اس کا کیا سبب؟ بلکہ اس فرمانے کا "الا ان فاطمه بضعة منی یوذینی الخ" سبب یہی ہوا تھا کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اس وجہ سے فی الجملہ نا چاقی ہوگئی تھی کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا پیام بھیجا تھا، اس میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا روتی ہوئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس تقریب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خطبہ یہ ارشاد فرمایا "الا ان فاطمة بضعة الخ" سو اگر فقط حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے غصہ ہو جانے کے باعث صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وعید مذکور میں داخل ہو جائیں تو حضرت امیر پہلے داخل ہوں گے کیونکہ اوّل تو خطبہ انہیں کے سمجھانے سنانے کو فرمایا تھا، دوسرے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تو بوجہ ارشادات خداوندی اور ارشاد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فدک کے نہ دینے میں معذور تھے اور پھر با ایں ہمہ باشارہ حدیث محاج یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکم خداوندی نہ ہوتا، تب بھی ان کے تہ دل میں یہی تمنا تھی کہ فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کے پاس رہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا تو ان کو کیا دُشواری تھی؟ اور پھر یہ ہی نہیں کہ تہ دل سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ہی کے موافق ہوں۔

علیٰ ہذا القیاس ایک بار حضرت امیر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے رنجیدہ ہوکر گھر سے باہر تشریف لے آئے اور مسجد میں زمین ہی پر بدون تکیہ بچھونے کے سوگئے۔ جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قصہ کی خبر ہوئی، آپ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ تیرے چچا کا بیٹا یعنی علی مرتضیٰ کہاں ہیں؟ عرب میں ایسے موقع میں اکثر ایک دوسرے کو چچا کا بیٹا بولتے ہیں، خیر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ مجھ سے لڑ کر نکل گئے اور دوپہر کو بھی یہاں نہیں سوئے اور یہ دونوں روایتیں کچھ سنیوں ہی کی کتابوں میں نہیں، شیعوں کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔

پیغام نکاح کوئی گناہ نہ تھا مگر
سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو بشریت کی وجہ سے غصہ آیا

باقی روایت اوّل سے سوائے مطلب پیش آمدہ کے ایک اور بات بھی نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آخر بشر تھیں۔ بمقتضائے بشریت غصہ آجاتا تھا اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو

ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا تو انہوں نے موافق حکم خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی گناہ یا کسی گناہ کا ارادہ نہ کیا تھا۔ پھر اب غصہ کی وجہ بجز مقتضائے بشریت اور کچھ نہیں بلکہ دونوں روایتوں سے اتنی بات نکلتی ہے کہ معصوم کو بمقتضائے بشریت غصہ آ جانا محال نہیں بلکہ بسا اوقات پیش آ جاتا ہے کیونکہ حضرت علی اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا دونوں ہی معصوم تھے، پھر جو آپس میں رنج ہو جاتا تھا تو تصور وار کسی کو بھی نہیں کہہ سکتے، بجز اس کے کہ بمقتضائے بشریت ایک کو دوسرے کی نسبت کچھ خیال فاسد دل میں آ جائے اور اس سبب سے بے اختیار غصہ چڑھ جائے اور اس غصہ میں دوسرے کی معصومیت کا بھی لحاظ نہ رہے اور کوئی صورت نہیں۔ سواسے ہی ہم بمقتضائے بشریت کہتے ہیں۔

اسی طرح اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر بھی بمقتضائے بشریت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے غصہ ہو جانے سے، بے اس کے کہ کوئی دیدۂ و دانستہ بے وجہ ان کو غصہ دلائے، آدمی وعید مذکور میں داخل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بشریت کی وجہ سے حضرت ہارون علیہ السلام پر جو ان کے بڑے بھائی تھے اور نبی مقرب تھے غصہ ہوئے یہاں تک کہ سر اور ڈاڑھی کے بال پکڑ کر کھینچنے کی نوبت آئی اور یہ سب کو یقین ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا کیونکہ نبی کا بالقصد غصہ دلانا کفر ہے مگر تاہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ ہونے میں کچھ شک نہیں، پس اگر اتنے غصہ ہو جانے کو یوں کہیے کہ یہ بھی اغضاب ہے یعنی انہیں کی طرف سے ہے تو نعوذ باللہ حضرت ہارون علیہ السلام کو یوں کہنا پڑے کہ اس وقت کافر تھے۔

اس سے انصافاً معلوم ہو گیا کہ فقط بمقتضائے بشریت کوئی شخص کسی پر غصہ ہو جائے تو اسے اغضاب نہیں کہتے اور یہی قضیہ بعینہٖ حضرت صدیق اکبر اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اغضاب نہیں۔ فقط حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے اگر تھا تو غضب تھا۔ ہاں ہم کہتے ہوئے ڈرتے ہیں اغضاب ہوا ہے تو بظاہر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا ہوگا کیونکہ وہ خاوند تھے ان کو اتنا ادب نہ ہوگا جتنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوگا۔ علاوہ بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بوجہ معلوم سنا کر خطبہ کا پڑھنا جس میں لفظ "اَغْضَبَهَا" اس بات پر گونہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اغضاب پیش آیا ہو اور جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اغضاب ہی نہیں تو پھر ان کو وعید "فمن اغضبها اغضبنی" میں داخل سمجھنا اپنے آپ اس میں داخل ہونا ہے۔

کیونکہ عقیدہ باطل سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور خود بدولت جناب رسالت مآب صلی

اللہ علیہ وسلم بھی بیشک ناخوش اور غصہ ہوتے ہیں تو اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو وجہ سے رنج اور غصہ ہوگا، ایک اپنے آپ؟ دوسرا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سبب سے اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ یہ اغضاب ہے، فقط بمقتضائے بشریت ہی نہیں، اس سبب سے بالیقین معلوم ہوتا ہے کہ بدگویان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بایں طور کہ وہ وعید "فمن اغضبها" میں داخل ہیں، آپ اس وعید میں داخل ہوتے ہیں سو جو لوگ بدگویان مذکور میں سے اس دارِ دُنیا سے چل دیئے، وہ تو چل دیئے، پر مولوی عمار علی صاحب وغیرہ باقیان شیعہ تو اپنا فکر کریں اور اس عقیدہ بد سے باز آ کر توبہ واستغفار سے تدارک مافات کریں، آئندہ نہ مانیں تو وہ جانیں۔

ماںصیحت بجائے خود کردیم	روزگارے درین بسر بردیم
در نیار دبگوش اندر کس	بر رسولاں بلاغ باشدوبس

اب لازم یوں ہے کہ بس کیجئے کیونکہ کوئی بات مولوی صاحب کی خرافات میں سے باقی نہیں رہی جس کا جواب شافی بفضلہٖ تعالیٰ اس رسالہ میں درج نہیں ہوا اس لیے ان کلمات طیبات پر ختم کرتا ہوں۔

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیّد المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ واھل بیتہ وذرّیتہ اجمعین. والمرجو منک یا ارحم الراحمین ان تتقبل ھٰذہِ الرسالۃ منی وتجعلہ وسیلۃ لی الیٰ رضائک ورضاء رسولک صلی اللّٰہ علیہ وسلّم رضاء اھل بیتہ ورضاء صاحبہ فی الغار سیّدنا ابی بکر الصدیق رضی اللّٰہ عنہ ومن سواہ من اصحابہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم رضوان اللّٰہ علیھم اجمعین وان تغفرلی وترحمنی بھذہ الاوراق فی الدنیا والآخرۃ مغفرۃ ورحمۃ تحیط بھا والدی وآبائی الماضیین ذرّیتی واقاربی واحبابی خصوصاً من امرنی بالقیام لھٰذا الامر العظیم برحمتک یا ارحم الراحمین ط

خلاصہ جواب طعن فدک

جو صاحب مذہب تشیع کی حمایت کریں اور بوجہ ہبہ فدک یا میراث فدک اوّل الخلفاء کی شکایت کریں تو ان کو در صورت دعویٰ ہبہ یہی تین مقدموں کا اثبات لازم ہے اور در صورت ادعائے میراث بھی تین باتوں کی تحقیق واجب، ہبہ کی صورت میں تو اوّل مملوک نبوی ہونا فدک کا، دوسرے وقوع ہبہ۔ تیسرے حصول قبض، علیٰ ہذا القیاس در صورت میراث اوّل مملوک نبوی ہونا فدک کا۔ دوسرے زوال حیات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور انقطاع تعلق روح پر فتوح حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، جو جسم اطہر

سے حاصل تھا۔ تیسرے عموم خطاب "یو صیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین" یہاں تک کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل زمرہ مخاطبین ہوں اور یہ خطاب مثل دیگر اشخاص مؤمنین اُمت آپ کو بھی شامل ہو لیکن واقفان فن مناظرہ اور دانشوران فنون دانش مندی پر واضح ہوگا کہ اہل سنت کو جو اس مقدمہ میں مدعا علیہ ہیں، قبل استماع دلیل دعویٰ فقط "لانسلم اعنی" محض انکار اور عدم تسلیم ہی کافی ہے۔ دونوں دعوؤں کے تینوں مقدموں میں سے اگر ایک مقدمہ کو بھی تسلیم نہ کریں تو نہ خود مورد طعن ہوسکیں اور نہ طعن مذکور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر واقع ہوسکے۔ چہ جائیکہ تینوں مقدموں کو نہ مانیں؟ اور اگر مقدمات ثلثہ مذکورہ کو بدلائل واضحہ باطل کردیں، ان کے نقائض کو بدلائل قوی ثابت کردیں تو پھر تو میدان ان سے کون لے سکتا ہے؟

ناظران ہدیۃ الشیعہ پر مخفی نہ رہے گا کہ ہبہ کے تین مقدموں میں سے آخر کے دو مقدمے تا ہنوز اہل تشیع سے ثابت نہ ہوئے بلکہ موافق اُصول اہل سنت ان کی نقیض ثابت ہے اور میراث کے دعوے کے لیے جو تین مقدمے موقوف علیہ ہیں ان میں سے دوسرے مقدمہ کا ابطال اگرچہ بظاہر دُشوار ہے، پر اس ہیچمدان نے اس باب خاص میں ایک رسالہ مسمّی باب حیات لکھا ہے، جس کی ضخامت پانچ چھ جز سے کم نہ ہوگی اور ان شاء اللہ اگر منشی محمد حیات صاحب کی عنایت ہے تو وہ بھی قریب ہی مطبوع ہوکر مطبوع طبائع ہوتا ہے، اس کے دیکھنے کے بعد اُمید خدا سے یوں ہے کہ شیعوں میں سے بھی جو صاحب انصاف پرست ہوں، حق بول اُٹھیں ورنہ اہل حق یعنی اہل سنت کا تو کام یہی ہے کہ حق کو حق مانیں اور باطل کو باطل جانیں۔

رہا اوّل مقدمہ ہبہ اور میراث کا اور تیسرا مقدمہ میراث کا، ان کا ابطال اور ان کی نقیضوں کا اثبات رسالہ ہدیۃ الشیعہ میں بتفصیل تمام مرقوم ہے۔ خصوصاً مقدمہ اولیٰ ہبہ و میراث کا بطلان تو ایسا واضح ہے کہ بجز تیرہ دروں کور باطن اس میں اور کوئی متامل نہ ہوگا، یہی وجہ ہوئی کہ ۱۲ ہجری میں جو مرکز دائرہ تشیع نصیر الدین طوسی ثانی نور اللہ شوستری مکانی مفتی محمد قلی کے قرۃ العین مولوی حامد حسین جو اثناء سفر لدھیانہ وارد میرٹھ ہوئے اور میر مہدی علی فرزند ارجمند عمر دراز علی خان کے مکان پر تشریف لائے اور یہ پریشان روزگار جو بوجہ پابندی علاقہ مطبع مجتبائی وہاں ان دنوں شب و روز گزارتا تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ اس قسم کا مذکور آیا تو مولوی صاحب موصوف کو کچھ جواب نہ آیا۔ "واللہ لا یھدی القوم الظلمین" فقط

مقالاتِ حجۃُ الاسلام 17 جلدوں پر ایک نظر

جلد 1
حضرت حجۃ الاسلام رحمہ اللہ کی سوانح پر مشتمل اہم مضامین و مقالات

جلد 2
اسرار قرآنی
انتباہ المؤمنین
تحذیر الناس
مناظرہ عجیبہ
تصفیۃ العقائد
انتصار الاسلام

جلد 3
آب حیات

جلد 4
تحفہ لحمیہ
مصابیح التراویح
الحق الصریح فی اثبات التراویح
توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام

جلد 5
الدلیل المحکم مع شرح اسرار الطہارۃ
افادات قاسمیہ
اجوبۃ الکاملۃ
لطائفِ قاسمیہ

جلد 6
اجوبہ اربعین

جلد 7
ہدیۃ الشیعہ

جلد 8
تقریر دلپذیر

جلد 9
قصائد قاسمی
فیوض قاسمیہ
روداد چندہ بلقان
حجۃ الاسلام

جلد 10
گفتگوئے مذہبی (میلہ خداشناسی)
مباحثہ شاہ جہاں پور
جواب ترکی بترکی
براہین قاسمیہ

جلد 11
قبلہ نما
تنویر النبراس
الحظ المقسوم من قاسم العلوم

جلد 12
فرائد قاسمیہ
فتویٰ متعلق دینی تعلیم پر اُجرت

جلد 13
مکتوب کرامی
مضامین و مکتوب الیہ "انوار النجوم"
اُردو ترجمہ قاسم العلوم
مکتوب اوّل
تخلیق کائنات سے پہلے اللہ کہاں تھا؟
یعنی مکتوب دوم

جلد 14
مکتوب سوم
مکتوب چہارم
مکتوب پنجم

جلد 15
مکتوب ششم
مکتوب ہفتم
مکتوب ہشتم

جلد 16
مکتوب نہم
مکتوب دہم
مکتوب یازدہم
مباحثہ سفر رڑکی

جلد 17
جمال قاسمی
مکتوبات قاسمی (متعلق اسرار الطہارۃ)
حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے علم و فضل اور حالات وواقعات پر متفرق مضامین
حکمت قاسمیہ
سند حدیث (عربی)
علمی خدمات

Our online Islamic Bookstore:
Email Address: talefat@gmail.com
www.taleefat.com
Like us: facebook.com/taleefat

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
0322-6180738, 061-4519240